سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

# سرگزشت
کراچی

2014

عکس: تصویرتاں کی تاریخ پیدائش، ایک مختصر سا مگر دلچسپ قصہ

قوازن: محبت حد سے بڑھ جائے تو تباہی لاتی ہے، افروز کی سچ بیانی

شیں: وہ سائنسدان جس نے ثابت کرنا چاہا کہ ہم بندر کی اولاد ہیں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 24 ❖ شمارہ 06 ❖ مئی 2014ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبہ اشتہارات

| | | |
|---|---|---|
| نیجر اشتہارات | محمد شہزاد خان | 0333-2256789 |
| نمائندہ کراچی | محمد رمضان خان | 0333-2168391 |
| | راناظہر حمید | 0323-2895528 |
| نمائندہ لاہور | فراز علی بخش | 0300-4214400 |

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرسالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

اخبار کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی خبر دیکھی کہ ایک سرکاری اسکول کی عمارت کو علاقے کے وڈیرے نے بھینسوں کا باڑا بنا رکھا ہے۔ یہ کہانی کسی ایک علاقے کی نہیں ہے۔ اگر تلاش کیا جائے تو سیکڑوں کی تعداد میں ایسے اسکول مل جائیں گے جو بھینسوں کے باڑے یا اوطاق میں بدل چکے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ قرآن پاک کا پہلا لفظ ''اقراء'' یعنی پڑھ کو ہم نے کُلی طور پر فراموش کرنے کا عہد کرلیا ہے۔ تبھی تو اسکول کی عمارتوں کو دھماکے سے اُڑانے کی کوشش بھی کرلیتے ہیں۔ یہ تو رہا دور افتادہ گاؤں گوٹھ کا قصہ، شہروں کا حال بھی الگ نہیں ہے صرف انداز جدا ہے۔ یہاں سرکاری اسکول تکذیب کا نشان ہیں۔ ان اسکولوں میں پڑھنے والوں کو حقیر نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور پرائیویٹ اسکولوں کو کاروبار کا درجہ دے دیا گیا ہے جہاں تعلیم دینے کے بہانے پیسا کمانا نصب العین ہے۔ تعلیم کے ساتھ ایسا مذاق دیکھ کر ہم تو یہی سمجھنے پر مجبور ہیں کہ آنے والی نسل کو ''اقراء'' کے حلقے سے نکال باہر کیا جائے مگر ہم کیا کریں کہ چپ نہیں رہ سکتے۔ بقول فراق گورکھپوری۔

آنے والی نسلوں کو کچھ نغمے دے کر اٹھ جاؤں گا
بار بار گائیں گے لیکن جی نہ بھرے گا، جی نہ بھرے گا

معراج رسول

# ادب کا سپاہی

سرگزشت

پٹنہ (بہار) کے ایک صاحبِ علم گھرانے میں اس نے جنم لیا۔ گھرانا پڑھے لکھے لوگوں کا تھا اس لیے بچے کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ ابتدا میں مروجہ تعلیم دی گئی۔ عربی فارسی کی جانب تو خصوصی توجہ دی گئی۔ حفظِ قرآن بھی جاری رہا۔ صرف ونحو پر خصوصی توجہ دی گئی۔ پھر انگریزی تعلیم کی جانب سفر شروع ہوا اور محمڈن اینگلو اسکول میں داخل کرایا گیا مگر وہاں زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ اسے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ علی گڑھ کے اسکول میں ڈیڑھ سال ہی ہوا تھا کہ میجر سید حسن بلگرامی کے کہنے پر بلگرامی ٹیوٹوریل کالج میں آگیا۔ اس کالج میں لڑکے جونیئر اور سینئر کیمبرج کی تیاری کرتے تھے، مسٹر لیسن ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہاں کا ماحول بالکل انگلینڈ کے طرز کا تھا۔ تاکہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ جانے پر کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ ان دنوں دوسری جنگِ عظیم عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اپنی انگلش کی استعداد بڑھانے کے لیے وہ ایک ایک دن میں پندرہ پندرہ اخبارات پڑھتا۔ ابھی تعلیمی سلسلہ جاری تھا کہ میجر حسن بلگرامی کا انتقال ہوگیا۔ اسے واپس پٹنہ آنا پڑ گیا۔ پٹنہ پہنچ کر اس نے کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دینے کی تیاری شروع کردی۔ امتحان پاس کرنے کے بعد اس کا ارادہ تھا کہ انگلینڈ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرے مگر جنگِ عظیم چھڑی ہوئی تھی۔ ان حالات میں انگلینڈ جانا ناممکن سی بات تھی اس لیے اس نے پٹنہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ چار برس میں بی اے بھی پاس کرلیا۔ انہی دنوں والد کا انتقال ہوا اور وہ گھر کا ہو کر رہ گیا۔ گھر پر رہتے ہوئے بھی وہ مطالعہ کرتا رہا۔ سر سید احمد خان اور شبلی کی مذہبی تصنیفات میں اس نے دلچسپی لی۔ حسرت موہانی کی شاعری کا مطالعہ کیا۔ سیاسی طور پر وہ کانگریس سے قریب ہوتا جارہا تھا۔ مظہر الحق، ابوالکلام آزاد اور محمد علی جوہر کا معتقد بنتا جارہا تھا۔ الہلال کے ہر شمارے کا اسے انتظار رہتا۔ 1922 میں اس کی شادی شاہ رشید اللہ کی بیٹی سے ہوئی۔ رشید اللہ پٹنہ کے بڑے وکلا میں شمار ہوتے تھے اس لیے اس کی عزت خوب بڑھ گئی۔ شادی کے اگلے برس وہ مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ چلا گیا۔ وہاں مڈل ٹمپل میں اسے داخلہ ملا۔ پھر کچھ دنوں کے لیے جرمنی چلا گیا۔ جرمنی میں وقت گزار کر لوٹا تو اس نے کیمبرج میں داخلہ لیا۔ ابھی آخری امتحان باقی تھا کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ اسے سینیٹوریم میں داخل کردیا گیا۔ چھ ماہ علاج کرنے کے بعد سوئٹزرلینڈ چلا گیا اور موتھانہ کے استقانو سینیٹوریم میں داخل ہوگیا۔ وہاں مسز جواہر لعل نہرو بھی علاج کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ اچھا وقت گزر رہا تھا۔ چھ ماہ کے علاج سے وہ مکمل طور پر صحت یاب ہوگیا اور واپس کیمبرج آگیا۔ یہاں آ کر اس نے امتحان دیا اور کامیاب ٹھہرا پھر وہ 1929ء میں واپس برصغیر آگیا اور یہاں پہنچ کر اس نے تصنیف وتالیف میں دل لگالیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا شمار بڑے مصنفین میں ہونے لگا۔ اس نے ادارہ تحقیقاتِ اردو قائم کیا اور اردو کتب کی اشاعت کا اہتمام کرنے لگا۔ سب سے بڑا کام اس نے یہ کیا کہ غالب کی کُل تصنیفات کا صد سالہ ایڈیشن ڈاکٹر ذاکر حسین کے مشورے سے ترتیب دے کر شائع کیا جس کے لیے رقم بھی ڈاکٹر ذاکر حسین کے فنڈ سے ملی۔ ادب اردو کے اس سپاہی کو دنیا قاضی عبدالودود کے نام سے پہچانتی ہے۔

# شہرِ خیال

☆عبدالخالق بھٹی کا سندیسہ اللہ آباد بہاولپور سے ”شمارہ اپریل نظر نواز ہوا۔ درویش عالم میں جس طرح مولانا میمنی کو پیش کیا گیا ایسا لگا کہ قبلہ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ بہت قابل انسان تھے۔ پاکستان کو ان پر فخر ہے۔ پُراسرار پسینا بھی لاجواب تحریر تھی۔ شاعر اعظم پڑھ کر بے ساختہ دل سے شاہد جہانگیر شاہد کے لیے دعائیں نکلیں۔ ماضی کی قبر سے ایک جوہر آبدار نکال لائے ہیں۔ بیدل عظیم آبادی کا اب تک نام سنا تھا ان کے کلام سے روشناس نہ تھی۔ اب پڑھا تو تجسس بڑھا اور اتفاق سے دفتر فون کرلیا جہاں سے بیدل لائبریری کا پتا ملا اور پھر ان لوگوں سے کئی کتابیں منگوالیں۔ ان کتابوں میں شامل بیدل کے اشعار پڑھ کر چونک گیا۔ علامہ اقبال نے ان کے بے شمار اشعار کو تضمین کیا یا ہو بہو اپنی نظم میں شامل کرلیا۔ کئی اشعار تو سو فیصد اردو ترجمہ نظر آئے۔ اتنا بڑا شاعر اور اس وقت کی سیاست اسے کھا گئی۔ مغل بادشاہوں نے اس کی صحیح قدر نہ کی۔ جہاز بینی بھی دلچسپ لگی و یادِ ماضی کو کس لیے شامل کیا گیا سمجھ نہ آئی۔ صفحات کی بربادی تھی۔ قلمی الف لیلہ نے بہت مزہ دیا۔ آفاقی صاحب کو اللہ تعالیٰ عمر خضر عطا فرمائے۔ عمر شریف سو سوتھی۔ یہ مجذوب اردو مختصر ہوتے ہوئے بھی ایک اہم تحریر ثابت ہوئی۔ اصلی ہیرو نے بھی مزہ دیا۔ ترکی ٹی دا تم کو اب ختم ہو جانا چاہیے۔ اپریل معلوماتی مضمون تو ہے لیکن اختصار کی وجہ سے صحیح مزہ نہیں آرہا ہے۔ سراب کے کیا کہنے۔ بزدل کون نے دل کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ عورتیں جب بہادر بننے کی کوشش کرتی ہیں تو یہی ہوتا ہے۔ سانحہ بھی مزے کی لگی۔ شارٹ کٹ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اپنا خون سبق آموز رہی۔ فوبیا مجھے پسند نہیں آئی کہ پسند اپنی اپنی۔ خاطر دنیا، بھیدی اور کوچوان گزارے لائق تھی۔ مادرِ وطن اس ماہ کی حاصلِ مطالعہ تحریر تھی۔“

☆رانا محمد شاہد بورے والا سے رقم طراز ہیں ”اداریہ میں معراج رسول صاحب نے ایک حساس اور اہم موضوع کا چناؤ کیا۔ مختلف تہوار منانے کا مقصد معاشرے میں رہنے والے بھی لوگوں خصوصاً غریب لوگوں کو بھی خوشیوں میں شریک کرنا ہے۔ جون کے آخر میں رمضان المبارک آرہا ہے۔ یہ ہمارا دکھ نہیں المیہ ہے کہ رمضان المبارک کے قریب آتے ہی کھانے پینے کی اشیا ذخیرہ کرکے مہنگی کردی جاتی ہیں اور عید کے قریب کپڑوں اور جوتوں کی شامت آجاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے ہم صرف اپنے لیے جینا چاہتے ہیں۔ انوکی محمد حسین کی یک صفحی سرگزشت جدوجہد سے بھرپور تھی۔ یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد جاپان میں لوگوں کی اسلام سے دلچسپی بڑھنے لگی۔ منشی محمد عزیز کرسی صدارت پر تھے، آپ واقعی سرگزشت کے عاشق ہیں۔ میں سدرہ بانو ناگوری، بشریٰ افضل، طاہرہ گلزار، ڈاکٹر قرۃ العین اور قیصر عباس خان کے ساتھ تمام پڑھنے والوں کا مشکور ہوں جنہوں نے میرے ابو کی صحت یابی کے لیے دعا کی۔ سدرہ بانو! ایک سپاہی مقبول حسین ہی کیا، ہمارے ہاں تو محسنوں کو فراموش کرنے کی روایت بہت دیر سے چلی آرہی ہے۔ ہم تو اپنے محسنوں کو مخصوص دنوں میں ہی یاد کرتے ہیں یا ان پر گویا احسان کرتے ہیں۔ مشاہیر پاکستان ہوں یا دفاع وطن کے لیے جانوں کا نذرانہ دینے والے لوگ، انہیں مخصوص ایام میں ہی یاد کیا جاتا ہے۔ بشیر احمد بھٹی کے خط سے یاد آیا آپ صرف کہانیوں یا سچ بیانیوں کا ہی اعزازیہ دیتے ہیں یا تحقیقی و معلوماتی مضامین کا بھی دیتے ہیں؟ (جی ہاں تحقیقی مضامین پر اعزازیہ زیادہ دیا جاتا ہے) میرے خیال میں ناقابلِ اشاعت کی بجائے قابلِ اشاعت کا صفحہ ہونا چاہیے۔ بشریٰ افضل! صحیح کہا آپ نے دنیا کی سب سے خوبصورت چیز احساس ہے اور اچھی بات ہے کہ شہرِ خیال کے باسی ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ آفتاب احمد نصیر! دعائیں واقعی زندگی بدل دیتی ہیں۔ انور عباس شاہ، یہ محکمہ ڈاک کی یقیناً مہربانیاں ہیں کہ ڈاک بروقت تو کیا کئی کئی دن بلکہ ہفتوں کے بعد پہنچتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوریئرز کی درجنوں کمپنیاں ہمیں نظر نہ آتیں۔ فاطمہ زہرا! شہرِ خیال میں خوش آمدید۔ طاہرہ گلزار! چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہم لا تو سکتے ہیں مگر کیسے لائیں؟ ہم جانتے ہیں کہ معاف کرنا بہت بڑی عبادت ہے۔ سبھی کہتے ہیں لیکن جب معاف کرنے کی نوبت آتی ہے تو دل سے نہیں کرتے، یعنی ہم خود اپنے اندر چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں نہ لاکر زندگی کو مشکل بنا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر قرۃ العین! ہمارے اور مغرب کے تعلیمی معیار کے فرق کو تو ایک طرف رکھیں۔ صرف ہمارے ہاں ہی طبقاتی تعلیم میں جس انداز سے فاصلے بڑھ رہے ہیں۔ کبھی کوئی عام طالب علم ترقی



کی وہ منازل طے کرپائے گا جس پر ہمیشہ ایک مخصوص طبقے کا قبضہ رہا ہے۔ ایک طبقہ اے لیول اور او لیول کر رہا ہے جبکہ دوسرا ایف اے، بی اے، وہ بھی ناقص سہولیات کے ساتھ۔ کیا یہ طریقہ تعلیم معاشرے کو جوڑے گا یا تقسیم کرے گا۔“

☆سدرہ بانو ناگوری، کراچی سے فرماتی ہیں ”اداریے میں معراج انکل اپنے مخصوص طرزِ تحریر کے ساتھ ہمیں آنے والی مہنگائی کے طوفان سے ہوشیار کرتے نظر آئے، واقعی سوچنے کا مقام ہے لیکن صرف کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر سوچنے اور غور و فکر کرنے سے مسائل کا حل نکل سکتا ہے؟ کیونکہ ہم اس سرزمین پر جی رہے ہیں کہ جہاں صرف ہمیں ہی نہیں بلکہ ہماری آنے والی نسلوں کو بھی ان گنت مسائل کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے، اگر ہم اپنی غلطیوں سے سبق سیکھ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے تو شاید ہمارا شمار بھی ان ممالک میں ہوتا کہ جن کی فراخدلی اور حب الوطنی کا جذبہ ہمیں شرمندگی سے دوچار کردیتا ہے۔ شہرِ خیال کی محفل کی طرف بڑھے تو منشی عزیز مئے اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ صدارت کی کرسی پر براجمان تھے۔ عزیز بھائی آپ کی سرگزشت سے محبت، جذبات اور خوبصورت تبصرے کو داد نہ دینا سراسر زیادتی ہوگی ہماری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے۔ رخسار افضل، خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ کو ہمارا تبصرہ پسند آیا۔ غضنفر علی، آپ نے لکھا ہے کہ آپ سرگزشت کو پہلے شمارے سے پڑھ رہے ہیں لیکن لگتا ہے آپ ابھی تک سرگزشت پڑھنے والوں کے مزاج کو سمجھ نہیں سکے۔ وحید ریاست بھائی، ہم آپ کی رائے سے سو فیصد متفق ہیں اور ہم بھی اپنے پیارے اور محترم انکل کی سرگزشت پڑھنے کے خواہش مند ہیں۔ رانا شاہد بھائی، کامیابی حاصل کرنے پر ہماری طرف سے ڈھیروں مبارکباد قبول کیجیے۔ ہم نے ایک میگزین میں آپ کی اور عزیز مئے کی تصاویر دیکھی ہیں۔ واقعی آپ کی تحریریں آپ کی شخصیات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ احسان سحر نے بھی خوب لکھا اور دیگر ساتھیوں کے تبصرے پسند آئے۔ ابن کبیر کی تحریر پڑھ کر تو ہم حیران رہ گئے کہ ایسے پُراسرار مرض نے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کی جان لی۔ قلمی الف لیلہ میں فیض احمد فیض کا زندگی نامہ پڑھ کر مزہ آگیا۔ فیض صاحب کی بیٹی کی زبانی اس عظیم شاعر کی زندگی کے ان پہلوؤں کو جاننے کا موقع ملا کہ جو شاید تاعمر ہمارے حافظے سے پوشیدہ ہی رہتے۔ مجذوب اردو، ایاز راہی کے قلم سے منٹو کے فن کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے ہمیں بے انتہا دکھ نے آگھیرا کہ اپنے علم و فن سے تاریخ رقم کرنے والا بعد مرنے کے وہ مقام وہ پہچان نہیں حاصل کرسکا جو اردو ادب کے اس عظیم ادیب کا حق تھا اور منٹو کا یہ دعویٰ کہ سعادت حسن تو مر سکتا ہے مگر منٹو نہیں، سو فیصد درست ہے۔ واقعی اردو ادب کو تاریخ میں اپنے فن سے زندہ رکھنے والا منٹو کبھی مر ہی نہیں سکتا، وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ شاعر اعظم ایک لاجواب تحریر تھی۔ دلچسپ انداز تحریر تھی۔ بیت بازی میں فہد خان کا شعر پسند آیا۔ پہلی سچ بیانی بزدل کون میں سعدیہ کا عبرتناک انجام پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ شاید سعدیہ کے اس انجام کا ذمہ دار اس کا اپنا شوہر ہی تھا کیونکہ ایک مرد اپنی بیوی، بہن اور بیٹی کا محافظ ہوتا ہے اور اسلام بھی سختی سے حکم دیتا ہے کہ اپنی عورتوں کو سات پردوں میں چھپا کر رکھو لیکن جب وہی مرد عورت کی آزادی کا قائل ہو تو پھر ایسی ہی دردناک کہانیاں جنم لیتی ہیں جو بے اعتباری، اذیت اور دکھ کا باعث بنتی ہیں۔“

☆اعجاز حسین سٹھار کا نور پور تھل سے مکتوب ”تین ہفتے پاک سرزمین پر گزارنے کے بعد بخیریت گھر واپس آگیا ہوں۔ خانۂ خدا اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب اور سامنے کھڑے ہوکر اپنے اور تمام احباب کے لیے دعائیں مانگیں جن ساتھیوں نے عمرہ کی سعادت حاصل ہونے پر مبارکباد پیش کی ہے میں خلوصِ دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔ وقت کی کمی اور اپنی دلچسپی کو مدِنظر رکھتے ہوئے نظریں ”قلمی الف لیلہ“ پر آکر ٹھہر گئیں اس بار قدرے خشک مواد ہے۔ ایک تشنگی سی باقی ہے۔ امید ہے آنے والے ماہ اس کا مداوا ہو جائے گا۔ سراب، کی 84 ویں قسط ہے وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ سات سال گزر گئے لیکن کل کی بات لگتی ہے۔ پہلی سچ بیانی بزدل کون، سوچوں کے کئی در کھول رہی ہے۔ کسی بھی خونخوار درندے سے خالی ہاتھ مقابلہ کرنا بے وقوفی میں شمار ہوگا۔ جو لوگ کسی ایسے کام کے لیے اکساتے ہیں وہی تنقید کرنے والوں کی پہلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ سعدیہ کو حد سے بڑھی خود اعتمادی لے ڈوبی۔ سانحہ، میں آفتاب نے جس سچائی سے واقعات بیان کیے ہیں یہاں کسی کی برائی کی نیت نہ تھی۔ البتہ یہ غلطی ضرور ہے کہ ایسے موسم اور سچویشن میں مکان میں تنہا نہیں ہونا تھا لیکن وہ اسے اپنانے کو آمادہ تھے۔ اس واقعہ کو کھیل سمجھ رہے تھے نہ اپنی کامیابی پر نازاں تھے۔ ان واقعات کے تناظر میں نورین کا آگ میں جلنا حادثہ تھا ان کی مرضی کا دخل نہ تھا۔ شارٹ کٹ، کے سلطان کو حالات نے پچھاڑ دیا تھا۔ اس کی ذہانت اور مستقبل کی منصوبہ بندی گواہ ہے وہ غیر معمولی بچہ تھا۔ اس کی کاٹ چھانٹ اور نگہداشت کی جاتی تو معزز شہری بن جاتا۔ بس رہنمائی سے دیر ہوگئی اور وہ دھوکے میں غلط ہاتھوں میں چلا گیا۔ اپنا خون، میں مناسب طریقہ استعمال کرتے ہوئے فولاد خان جیسے سرپھرے انسان کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنے اپنے شعبے میں انسانی جانوں کو مقدم رکھا جائے تو مخلوقِ خدا کے ساتھ خود اپنے ساتھ بھی بھلا ہوگا۔ فوبیا، میں عجیب صورتِ حال سامنے آئی ہے حالانکہ میں نے سعودی عرب میں کئی بار لوگوں کو پون گھنٹے تک لفٹ میں پھنسے دیکھا جو لوہے کا چاروں طرف سے بند کیبن ہوتا ہے لیکن کسی کو بے حال یا گھبرایا ہوا نہیں دیکھا اور ان میں زیادہ تعداد ان پڑھ اور دیہاتیوں کی تھی۔ وہ ہوٹل انتظامیہ کے ناقص انتظام پر چیخنے چلانے کے سوا کوئی احتجاج نہ کرسکے۔ خاطر دنیا، خودغرض رشتوں کے کردار کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہم کیسے معمولی پریشانی کو بھی سر پر سوار کرکے ٹینشن لے کر کھانا پینا تک چھوڑ بیٹھتے ہیں لیکن فاریا ہر حال میں خوش رہنے والی لڑکی ہے پھر صحت اور جوشِ جوانی بھی ہے۔ جب عمر ڈھلے گی، بچوں کی ذمہ داریاں آئیں گی تب شاید سوچیں بے بس کردیں کیونکہ کوئی حقیقی رشتہ اور ہمدرد قریب نہ ہوگا۔ آج کسی سے اچھے برتاؤ کا لگایا گیا پودا آنے والے دنوں میں سایہ دے گا ورنہ مصیبت کے وقت دور تک کوئی سہارا نظر نہ آئے گا۔ بھیدی، ایک آئیڈیا پر صرف خیال آرائی دی ہے۔ اتنا ضرور ہوا ہے کہ ذہنی تناؤ ختم ہوا ہے اور چہرے پر چند لمحوں کے لیے ہی سہی مسکراہٹ آئی

ہے۔کوچوان، پڑھنے کے بعد کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوجائیں کوئی جھٹکا بھی کسی ڈاکٹر کو انسانی ہمدردی پر آمادہ نہیں کرسکتا۔فیس کے علاوہ دواؤں اور خاص طور پر مختلف ٹیسٹوں کے نام پر عوام کو لوٹا جاتا ہے اور دوا کی قیمت پر سیاہی پھیر دی جاتی ہے۔گولیاں ڈبی سے نکال کر دی جاتی ہیں یوں من مانی رقم وصول کی جاتی ہے اور بدقسمت مریضوں کی قسمت میں شفا بھی نہیں ہوتی۔ مادرِ وطن، کے ایک ایک لفظ سے حب الوطنی، بہادری اور عملی زندگی کی لگن بول رہی ہے پڑھتے ہوئے آخری سطروں تک پہنچتے ہوئے بے ساختہ آنکھیں بھیگ گئیں، واقعی موت زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ جب ایسے جاں نثار جوان اور حوصلہ مند مائیں زندہ ہیں پاکستان کی ایک انچ زمین کی طرف بھی کوئی بری نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔مارچ کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔پاکستان نے انڈیا کو ہرایا، میں عمرہ کے سلسلے میں مکہ مکرمہ میں تھا تو یقین کریں عربی ہم سے پاکستانی ہونا کنفرم کرنے کے بعد پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاتے اور شاہد آفریدی کو سراہتے۔ان کی چوکے چھکوں کی گونج وہاں تک سنائی دیتی رہی اور ہم تمام ساتھی فخر سے سینہ پھلائے پھرتے رہے۔یہ ذہن میں رہے کہ مقامی لوگ بلاضرورت چاہے کوئی کتنی تکلیف اور مشکل میں ہو، گفتگو نہیں کرتے لیکن پاکستان کی فتح پر ان کی زبانوں کے تالے کھل گئے تھے۔پاکستان زندہ باد! منشی محمد عزیز مے نے مسندِ صدارت پر فائز ہونے کا اعزاز حاصل کیا اور لکھاریوں میں بھی شامل ہوگئے ہیں۔دو میدان مارنے پر مبارک باد قبول کریں۔"

☆ ڈاکٹر قرۃ العین کا خلوص نامہ اسلام آباد سے "معراج صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس کا مشاہدہ ہم سالہا سال سے کررہے ہیں۔مغربی اقوام میں کمی صرف کلمہ طیبہ کی ہے ورنہ باقی خوبیاں تو انہوں نے اسلام سے ہی لی ہیں۔برائیاں آپ ان کی انگلیوں پہ گن سکتے ہیں۔لیکن اچھائیاں بے شمار ہیں۔اس کے مقابلے میں ہمارے پاس صرف کلمہ ہے باقی باتوں کو ہم لوگ اہمیت نہیں دیتے۔پہلوان مبلغ، میں انو کی کے متعلق یہ سن کر خوشی ہوئی کہ وہ مسلمان ہیں۔منشی محمد عزیز، انور عباس شاہ، طاہرہ گلزار اور وحید ریاست بھٹی، آپ لوگوں کا بہت شکریہ کہ آپ نے شہرِ خیال میں مجھے خوش آمدید کہا۔منشی محمد عزیز سرگزشت کے پرانے شمارے کہیں نہیں ملتے۔میں نے بھی Old book shops کی بہت خاک چھانی مگر یہ رسالے نہیں ملتے۔میرے تصور میں وہ الماری آرہی ہے جہاں آپ نے اتنی محنت سے پیدا کردہ چوبیس شمارے رکھے ہیں۔ویسے آپ کو مبارک کہ تبصرہ پہلے نمبر پر آیا۔طاہرہ گلزار آپ کو سالگرہ مبارک۔مضامین میں درویشِ عالم ایک بہت علمی تحریر ہے۔مولوی عبدالعزیز میمن کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ڈاکٹر ساجد امجد صاحب سے درخواست ہے کہ آپ ڈاکٹر "این میری شمل" جو کہ ایک جرمن اسکالر تھیں کے بارے میں مضمون لکھیں۔انہوں نے اسلامی علوم پر پی ایچ ڈی کی تھی۔قرآن کریم کا جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ آثارِ قدیمہ پر بھی مضامین شائع کریں، مہربانی ہوگی۔پُراسرار پسینا، بہت دلچسپ تحریر تھی۔کیسی حیرت انگیز بیماری تھی جس کے بارے میں سائنس بھی کچھ بتانے سے قاصر ہے۔ شاعرِ اعظم، کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، یادِ ماضی، اور مجذوبِ اردو، بھی اچھی تحریریں ہیں۔شکیل صدیقی نے ہالی ووڈ میں بھی ایک عمر شریف دریافت کرلیا ہے۔ہمارے لیے تو یہ ایک انکشاف ہے (جبکہ لارنس آف عربیہ کی وجہ سے عمر شریف کا نام زیادہ مشہور ہے) سچ بیانیوں میں بزدل کون، نے رونگٹے کھڑے کردیے۔ویسے بھی اخبارات ایسی کہانیوں سے بھرے پڑے ہوتے ہیں۔مگر ہم لوگ ان کے عادی ہوگئے ہیں۔ان کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیتے اور سرسری سا پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔سانحہ میں آفتاب نے کمال کی بے حسی دکھائی۔نورین کو موت کی دہلیز پر کھڑا کرکے مزے سے ایک مہینے کے لیے پورے ملک کی سیر کو چلے گئے۔یہ تو حقوق اللہ اور حقوق العباد کا معاملہ ہے۔اللہ تو اپنے حقوق توبہ سے معاف کرلیتا ہے۔مگر اس معاملے میں جب تک نورین آپ کو خود معاف نہ کرے معافی نہیں مل سکتی۔شارٹ کٹ، میں یہ جملہ بہت پسند آیا، جب کوئی چیز اللہ سے ضد کرکے مانگی جائے اس کے ساتھ آزمائش بھی ساتھ آتی ہے۔بات تو سو فیصد سچی ہے۔خاطرِ دنیا، میں فاریا کا کردار دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔بعض لوگ فطرتاً خودغرض ہوتے ہیں۔ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں فطرت کے لحاظ سے مشرق مغرب کا فاصلہ ہوتا ہے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے لوگ کبھی خوش نہیں رہتے۔دیسی وکی لیکس صاحب نے بہت ہنسایا۔کوچوان ایک مختصر مگر سبق آموز تحریر تھی۔منشی صاحب آپ کے دوست کے والد صاحب کے ایک جملے نے ڈاکٹر صاحب کی کایا پلٹ دی۔ویسے انسانیت کی خدمت کرنے والے ڈاکٹر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ان کی اکثریت لالچ میں گرفتار ہے۔دیگر سچ بیانیاں، اپنا خون، فوبیا اور مادرِ وطن، درمیانے درجے کی تھیں۔"

☆ ناصر حسین کا مکتوب خاص بہاول پور سے "واقعی رجب میں معراج کا واقعہ، شعبان میں شب برات جب فرشتے برات کا پیغام لے کر زمین پر اترتے ہیں اور رمضان المبارک جب شب قدر جیسی عظیم رات جس میں مغفرت کی عام منادی کردی جاتی ہے۔لیکن اگر کوئی معافی چاہے۔واقعی ہم ان تمام نعمتوں کو پامال کردیتے ہیں۔بہت کم لوگ ان تین مہینوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔یک علمی سرگزشت میں محمد حسین انو کی کا ذکر جس خوب صورت طریقے سے کیا گیا ہے وہ صرف آپ کا خاصہ ہے اور ساتھ میں محمد علی کلے کا ذکر دو عظیم مسلمانوں کا ذکر ایک ساتھ۔اکرم اور انو کی کی یادگار کشتی آج بھی ہمارے بزرگوں کو یاد ہے، ان دونوں کی پاکستان سے محبت ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔شہرِ خیال کی صدارت منشی عزیز مے کو مبارک ہو۔منشی عزیز مے ایک ٹکٹ، میں دو مزے لیتے نظر آئے یعنی 60 روپے کی ٹکٹ ایک صدارت کا مزہ اور دوسرا اچھی کہانی کوچوان کا مزہ۔عزیز میاں کاش ہم آپ کی اس خواہش کو پورا کرسکتے کہ آپ کو 2012 کے پہلے شمارے کسی بھی قیمت پر درکار ہیں۔ کیا کریں ہم بھی سرگزشت کے اتنے عاشق ہیں جتنے کہ آپ۔آفتاب احمد نصیر اشرفی، کسی زمانے میں آپ صرف آفتاب احمد نصیر لکھا کرتے تھے۔آپ کے خط سے



واضح ہوا کہ آپ اشرفی کیوں لکھتے ہیں ہمارا تجسس بھی دور ہوا۔ڈاکٹر قرۃ العین، روحوں کے شکاری آپ کو بہت پسند آئی۔اور یہ پڑھ کر بہت اچھا لگا کہ آپ کو ہماری طرح پُراسرار کہانیاں پڑھنے کا بے حد شوق ہے، ویسے روحوں کے شکاری میں شیطان روحوں کو قید کرلیتا ہے۔اگر اس بات کا تجسس کسی قاری کو ہو کہ وہ روحوں سے کیا کرتا ہوگا تو وہ فلم Haunted دیکھے۔کافی سارے قارئین پُراسراریت نمبر کا پھر سے تقاضا کررہے ہیں۔کچھ کو تو معلوم بھی نہیں کہ پُراسراریت نمبر 1 اگست 2011 اور پُراسراریت نمبر 2 جنوری 2012 کو شائع ہوچکا ہے۔پُراسراریت نمبر 2 تو ہمیں اس قدر پسند آیا تھا کہ ہم نے اس کی دو عدد کاپیاں خرید کر رکھ لی تھیں۔ایک سنبھال کر رکھنے کے لیے دوسری پُراسرار کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے۔ڈیئر وحید ریاست بھٹی۔آپ کے خط سے لگ رہا تھا کہ ابھی تک آپ پر صدارت کا نشہ باقی ہے۔ہماری تجویز ہے کہ ہر مہینے صدارت کرنے والے کی تصویر خط کے ساتھ شائع کی جائے جس کا خط سال کا بہترین خط ہو اس کا ایک علمی تعارفی صفحہ ہونا چاہیے۔ویسے خاص نمبروں کے بارے میں آپ کی تجویز کتاب نمبر اور سائنس نمبر زبردست آئیڈیا ہے۔غضنفر علی نے لکھا ہے کہ سرگزشت صرف معلوماتی اور علمی حد تک محدود ہو۔اگر ان کی اس تجویز پر عمل کردیا جائے تو سرگزشت کا نام بھی معاشرتی علوم رکھنا پڑے گا۔ملک جاوید خان سرکانی درانی آپ کی آمد کی انتہائی خوشی ہوئی۔ویسے ہماری تجاویز کا خیر مقدم کرنے کا بے حد شکریہ۔پُراسرار پسینا، کسی عذاب سے کم نہ تھا۔شاعرِ اعظم، ہمارے سرگزشت کے ساتھی شہنشاہ جہانگیر سوری جناب شاہد جہانگیر شاہد کی انتہائی محنت سے لکھی گئی تحریر تھی جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہوگی۔اگر اس تحریر کا نام شاعرِ اعظم کی بجائے شاعرِ ولی، ہوتا تو کیا خوب ہوتا۔(ہند میں فارسی شاعری میں بیدل کا جتنا نام ہے اتنا کسی اور شاعر کا نہیں۔کراچی میں بیدل لائبریری جو پاکستان بھر میں پرچوں کا سب سے شاندار کلیکشن رکھتی ہے انہی کے نام پر ہے) یادِ ماضی، بدرالدین عظیم آبادی کی ماضی کی یادوں سے بھی انتہائی پُرفکر تحریر تھی۔فلمی الف لیلیٰ میں عظیم اداکار دلیپ کمار، امیتابھ بچن اور شاہ رخ خان کے انٹرویو کے ساتھ ان کی یادگار تصویروں کا ذکر بھی پسند آیا۔عمر شریف کی سرگزشت شکیل صدیقی کی عمدہ تحریر تھی۔ہم نے عمر شریف کی صرف ایک مووی دیکھی ہے 10,000 بی سی جو یادگار اور تاریخی موی ہے۔مجذوبِ اردو، محمد ایاز راہی صاحب یک ورقی تحریر میں سعادت حسن منٹو کو خراجِ تحسین پیش کرتے نظر آئے، بہت اعلیٰ تحریر ہے۔اپریل' منظر امام کا ہماری معلومات میں اضافہ کرنے پر بے حد شکریہ، پچھلے دنوں نفسیاتی اور اس مہینے فوبیا جیسی تحریر شائع کرکے معلومات میں اضافہ کیا کہ اس طرح کے لوگ ہمارے معاشرے میں رورہے ہیں اور ہمیں پتا بھی نہیں ہوتا۔آگاہی کا بے حد شکریہ، اور یہ سرگزشت کا خاصہ ہے۔مادرِ وطن اور بزدل کون اچھی تھی۔جنوری 2014 میں ہم نے پُراسرار تحریروں کی فہرست لکھی تھی جون میں اکتوبر 2012 کی ایک زبردست سچی پُراسرار تحریر نادیدہ عشق، میری فہرست میں شامل ہونے سے رہ گئی تھی۔پُراسرار تحریریں پسند کرنے والے نوٹ فرمالیں۔عبدالخالق بھٹی کا مختصر نامہ؟ رانا سجاد اور تفسیر عباس بابر کہاں کھو گئے ہیں۔"

☆ محمد اشفاق کا خلوص نامہ سرائے عالمگیر سے "شروع سراب، سے کیا۔میری نظر میں یہ کہانی دیوتا، موت کے سوداگر، بازی گر، شکاری اور تاوان کے بعد بہترین کہانی ہے۔امید ہے اگلی قسط میں ہیرو وادی کی جانب روانہ ہوجائے گا۔آپ نے ابن سید ڈونگہ بونگہ کے سوال کے جواب میں کہا ہے کہ سراب ابھی کتابی شکل میں شائع نہیں ہورہی، پھر کب ہوگی؟ (کتابی صورت میں دوسرے پبلشر شائع کرتے ہیں اس لیے جواب دینا مشکل ہے) دوسری بات پہلے کتابیات پبلی کیشن والوں کا اشتہار شائع ہوتا تھا جس سے معلوم ہوجاتا تھا کہ کون سی سلسلے وار کہانی کتابی شکل میں شائع ہوچکی ہے۔مہربانی فرماکر ان کا اشتہار دوبارہ شروع کریں (اشتہار دیں گے تو ضرور شائع ہوگا) اب اناڑی کے بارے میں آپ نے ابن سید صاحب کو بتایا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ وہ کتابی شکل میں شائع ہوگئی ہے۔ایک ضروری درخواست یہ کرنی تھی کہ سیراب کو کتابیات پبلی کیشن والوں سے کتابی شکل میں شائع کروائیں۔سچ بیانیوں میں بزدل کا نام بزدل کون نہیں بلکہ بیوقوف کون ہونا چاہیے تھا۔عرفان اور سعدیہ صرف بیوقوف نہیں تھے بہت بڑے بیوقوف تھے۔سعدیہ کا جو حشر ہوا اگر نہ ہوتا تو حیرت ہوتی۔آخری سچ بیانی مادرِ وطن، بہت اچھی رہی۔ایک تجویز ہے کہ اگر ہر سال اگست میں صرف اس ٹائپ کی سچ بیانیاں شائع کی جائیں کہ یہ ملک کیسے حاصل کیا گیا تھا تو نئی جنریشن کو بھی معلومات پہنچتی رہے گی۔کراچی کے غضنفر علی نے انتہائی احمقانہ تجویز پیش کی جس طرح کا ادبی رسالہ غضنفر علی صاحب چاہتے ہیں، وہ بے شمار شائع ہورہے ہیں۔آپ نے خوب بات کی کہ آپ کی فرمائش اعلیٰ ہے، یہ اعلیٰ فرمائش ہے؟ معراج رسول صاحب نے اپنا خون دے کر جو رسالہ شائع کرنا شروع کیا تھا اس کا بیڑا غرق کرنے کا خیال تھا (ہمارے لیے ہر قاری کی بات اہمیت رکھتی ہے اور ہر ایک کی بات کو اہم سمجھتے ہیں) ڈاکٹر قرۃ العین نے اسلام آباد سے خوب سندیسہ بھیجا، اگر آپ کو پُراسرار کہانیاں پڑھنے کا شوق ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سرگزشت والے ہر ماہ پُراسرار نمبر شائع کریں۔کچھ عرصہ پہلے تو خاص نمبر شائع ہوئے تھے۔"

☆ قیصر عباس کا نامۂ خلوص بھکر سے "مہنگائی، قومی یا مذہبی تہواروں پر ہوجانا عام سی بات ہے، گندم 2800 کی بڑی مشکل سے بکی رہی تھی اور اب تک ریٹ 4200 کا ہے۔نئی گندم 15 اپریل کے بعد آجائے گی۔ریٹ حکومت پنجاب نے فکس نہیں کیا۔منشی محمد عزیز مے صاحب کو صدارت مبارک ہو۔آپی سدرہ بانو کا تبصرہ اچھا لگا اور بشریٰ افضل آپی، آپ کو کس نے کہا کہ آپ غلط کہہ سکتی ہیں۔آپ کے تبصرے کمپیوٹر بھی دوبار چھاپ دیتا ہے، ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ پی ایچ ڈی فزکس ہیں، اچھا لگا کہ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کی طرح ایک اور ڈاکٹر ہمارے درمیان ہیں تبصرہ اچھا پڑھنے کو ملے گا۔آفتاب احمد نصیر اشرفی۔انور عباس شاہ، بھکر رانا محمد شاہد کے علاوہ سب کے خطوط اچھے تھے۔سب کو میرا سلام۔آپی طاہرہ گلزار صاحبہ کو بہت بہت مبارک باد، اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے، کافی عرصہ کے بعد حاضر تھیں لیکن مزیدار نوک جھوک کے ساتھ

بھرپور تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ وحید ریاست صاحب ہماری رائے ادارہ کو پسند نہیں آئی لیکن خوشی کی بات ہے چھپ گیا۔ عمران صاحب تھے نہیں اور ڈاکٹر صاحبہ کا تاخیر میں بھی نام نہیں تھا۔ اور ساتھ میں توحیدی صاحب بھی شامل نہیں جو کہ اپریل کے شمارے کو پھیکا کر گیا۔ سب نئے لکھنے والے بہت اچھے خطوط سے حاضر تھے اب کہانی سے پہلے محمد عامر ساحل سے التجا ہے، لگتا ہے وہ پھر غصے میں آ گئے ہیں جو کہ ہمیں مایوس کر گئے۔ اللہ کرے خیریت سے ہوں آمین، کہانیاں اچھی تھیں ساری کی ساری۔"

☆ بشریٰ افضل کی بہاولپور سے تشریف آوری "انکل جی کی باتیں سن کر تو تمام صورتحال کا پتا چل جاتا ہے۔ "پہلوان مبلغ" پڑھ کر بہت کچھ معلوم ہوا۔ اپنی محفل میں پہنچے تو منشی محمد عزیز کو کرسی صدارت پر ڈٹے پایا، بہترین تبصرہ تھا۔ اعجاز حسین سٹھار دوبارہ خدا کے حضور حاضری مبارک ہو۔ خوش قسمت ہیں آپ اور خدا آپ پر مہربان ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ خوش رہیں۔ بشیر احمد بھٹی ہمارے شہر کے ہی باسی ہیں۔ مظہر سلیم کہاں غائب ہیں۔ آپ کی غیر حاضری لگ گئی۔ ڈاکٹر قرۃ العین کا اندازہ بالکل صحیح ہے۔ بچے انگلش میں تیز ہو جاتے ہیں اور مادری زبان میں کمزور۔ وحید ریاست بھٹی کو ہم سے بڑی شکایت ہے لیکن میں ان کی بات سے متفق ہوں کہ انکل معراج نے زندگی میں اتنی محنت کی ہے کہ چار چار میگزین ان ٹائم چلا رہے ہیں۔ ان کی عظمت کو سلام پیش کرتی ہوں۔ رانا محمد شاہد کنڑ کے ڈھکن بھی اب تو چوری ہونے لگے ہیں۔ اتنی مہنگائی جو ہو گئی ہے۔ چوہدری مدثر حسین نے خاصا معلوماتی تبصرہ لکھا ہے۔ اچھا لگا۔ سچی کہانی پیش خدمت ہے، اگر قریبی اشاعت میں جگہ ملے تو حوصلہ افزائی ہو گی (اس پرچے سے فارغ ہو کر دیکھ لیتا ہوں)۔ "اپنا خون" میجر نے بڑے خوبصورت انداز میں ڈرائیور کو عملی قدم اٹھا کر غلطی کا احساس دلایا اور ہلکے پھلکے انداز میں سمجھا بھی دیا۔ یہ نیکی ہے۔ فوبیا، شہریار کے ضمیر نے اس کو جھنجوڑ دیا کہ قتل جیسا جرم کر کے کیسے جی سکتا ہے۔ اگر جرم کا اقرار کر لے تو صحت کی طرف لوٹ جائے۔ کوچوان میں ڈاکٹر کی آنکھیں ایک کوچوان نے کھول دیں کہ وہ کس طرح لوگوں کو لوٹ رہا ہے۔ قلمی الف لیلہٰ میں کافی معلومات تھیں بیت بازی میں تمام اشعار معیاری تھے۔ زاہد حیات کا شعر بہت خوب تھا ترکی نمی دانم، گھر بیٹھے ہی ترکی کی سیر کروا دی بزدل کون میں نصیحت کا پہلو پنہاں تھا عرفان اگر وسیم کی بات مان لیتا تو یوں زندگی بھر نہ روتا اور نہ ہی بچوں کی ماں غائب ہوتی۔ سلطان نے شارٹ کٹ کا راستہ اپنا کر غلط کیا۔ اگر ایک اور اتوار انتظار کر لیتا تو یہ قدم اٹھانے پر مجبور نہ ہوتا۔ رمیز کو اور اس کی بیوی کو نیک نیتی کا پھل مل گیا، خدا نے ان کی دعا سن لی۔ خاطر دنیا، میں ماریہ نے بہن کی خاطر قربانی دی۔ ماریہ کو خدا نے اس کی نیکی کا ایسا اجر دیا کہ اب خوش وخرم اپنے گھر میں آباد ہے۔"

☆ محمد عمران جونانی کا تبصرہ کراچی سے "تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد بندہ حاضر ہے۔ سب سے پہلے معراج صاحب کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے ہم بھی یاد دلانا چاہیں گے کہ مہنگائی کے ساتھ ساتھ برکتوں کے مہینے آ رہے ہیں، کمر کس کر ثواب کمانے کے لیے تیار ہو جائیں کہ اجر کئی گنا بڑھ جائے گا۔ اسلام کی قدر وہ زیادہ بہتر جانتے ہیں جو سوچ سمجھ کر مطالعہ کر کے ایمان لائے اور ان کا اسلام لانا لاکھوں کی ہدایت کا سبب بنا، الو کی موجودہ تبلیغی کاوشیں ماں کی کوکھ سے مسلمان پیدا ہونے والوں کے لیے لمحہ فکریہ ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد! اس مرتبہ آپ پورے جوبن پر نظر آئے، علامہ یمن سے متعلق تحریر کا مطالعہ عصر حاضر کی اہم ضرورت ہے، انسان چاہے تو اس مختصر زندگی میں کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ میں خود بھی میمن ہوں اپنے بزرگوں سے کاٹھیاواڑ، گجرات، اجکوٹ وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے، وہی باتیں دوران مطالعہ ذہن میں گھومتی رہیں۔ سسرالی جھگڑے میمنوں میں نسبتاً زیادہ ہیں۔ میرے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی کہ والد کی ضد کے آگے بیوی کو طلاق دینا پڑی۔ علی گڑھ میں حضرت کے مکان میمن منزل، وہاں کے معمولات، اوقات کی پابندی اور وفادار بیوی کے ذکر نے دل خوش کر دیا۔ شاعر اعظم شاہد جہانگیر شاہد کا ایسا شاہکار ہے کہ اس پر دو لفظ لکھنا بھی بھاری ہے۔ نہایت گہرائی کے ساتھ تحقیق کر کے عقیدت وخلوص کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے، ہم خوش قسمت ہیں کہ شہر خیال میں ان کی رفاقت نصیب ہوتی ہے۔ جب کوئی صاحب طرز بزرگ اپنا ماضی کریدتا ہے تو سنتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس نہیں رہتا۔ اس ضمن میں یوسفی صاحب کی زرگزشت اور آفاقی صاحب کی تحریریں مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔ یاد ماضی، سید بدر الدین صاحب کا لہجہ مزہ دے گیا۔ منشی صاحب کے دوست کی کہانی کوچوان، اچھی کوشش ہے۔ مولا کب کسی کے ایک جملے سے ہدایت کا سامان کر دے وہی جانتا ہے۔ بزدل کون نے دل بوجھل کر دیا۔ بہادر وہ ہے جو اپنے غصے اور جذبات پر قابو رکھے۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے۔ وقت اور صلاحیتوں کا درست استعمال جانتا ہو۔ اللہ سعدیہ بھابی کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، انسانی تاریخ ایسی ظلم وبربریت سے بھری پڑی ہے۔ مولانا طارق جمیل صاحب درست فرماتے ہیں کہ ہمارا امیر بھی ظالم ہے اور غریب بھی، بس جس کا داؤ چل جائے۔ منشی محمد مئے کے لیے اپریل 14 کا شمارہ یادگار رہے گا۔ کرسی صدارت، ایک شعر اور کوچوان ساتھ ساتھ، پورا شمارہ بڑی خوبصورتی سے Cover کیا۔"

☆ وقار الرحمٰن نے لاہور سے لکھا ہے "شب عروسی کی ایک ناقابل فراموش ناقابل یقین داستان جس امرت نے میری زندگی میں زہر گھول دیا، وہ درد کی رات، کی صورت میں پیش خدمت ہے۔ قبول کیجیے۔ (پرچے سے فارغ ہو کر پڑھ لیں گے)"

☆ ملک رحمت کا خط میانوالی سے "میں تقریباً 6 سال سے سرگزشت کا باقاعدہ قاری ہوں اور پرانے سرگزشت کی تلاش میں رہتا ہوں۔ مجھے سرگزشت جیسا رسالہ دوسرا نہیں ملا، آپ ایسے مضامین شائع کرتے ہیں کہ جو کہیں اور مل ہی نہیں سکتے۔ خطوں کی محفل مجھے بہت پسند ہے اس بار منشی محمد عزیز



مئے کے لیے دو خوشیاں تھیں ایک کرسی صدارت اور دوسری کہانی کا شائع ہونا۔ بہت مبارک ہو۔ میری بھی عادت آپ سے ملتی ہے کہ میں بھی بہت پیسہ خرچ کر کے پرانے شمارے تلاش کرتا ہوں۔ طاہرہ گلزار صاحبہ آپ تو اپریل فول ہو گئیں 1-4-2014 بہرحال سالگرہ مبارک ہو۔ آپ نے اپنی عمر بتا دی ہمارے لیے اور قابل احترام ہو گئیں آپ۔ انکل ایک موضوع میرے ذہن میں بھی ہے خاص نمبر کے لیے "تیزاب گردی"۔ میں ایک کہانی بھی ساتھ بھیج رہا ہوں جواب ضرور دیں۔ ویسے آپ جلد ہی کوئی خاص نمبر پیش کریں۔ مجھے محی الدین نواب اور احمد اقبال کی آپ بیتی سرگزشت پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ مجھے پتا ہے کہ محی الدین نواب صاحب کی سرگزشت شائع ہو چکی ہے مگر تلاش کے باوجود وہ شمارہ آج تک نہیں مل سکا۔ پلیز ہماری درخواست پر سوچئے گا ضرور۔ میں سب سے پہلے سچ بیانیاں پڑھتا ہوں، اس بار بزدل کون پہلے نمبر پر رہی پھر شارٹ کٹ اور تیسرے نمبر پر خاطر دنیا، چوتھے پر فوبیا اور پانچویں نمبر پر کوچوان۔ بھیدی جانے کیوں حقیقت سے ہٹ کر لگی۔ پراسرار پینا دل دہلا دینے والی تحریر تھی اور آخر میں تو ہماری بھی جان نکال دی رائٹر نے یہ کہہ کر کہ یہ بیماری دوبارہ بھی آ سکتی ہے۔ اللہ پاک سب کو حفظ وامان میں رکھے آمین۔ قلمی الف لیلہٰ کو ابھی زیادہ عرصہ جاری رہنا چاہیے۔ قلمی الف لیلہٰ میں بتائے گئے پرانے گانے میں انٹرنیٹ پر تلاش کر کے سنتا ہوں۔ سراب میری پسندیدہ تحریر ہے۔ میں سفرنامے نہیں پڑھتا لیکن ترکی نمی دانم شوق سے پڑھتا ہوں انداز تحریر اچھا ہے۔"

☆ محمد عارف قریشی نے بھکر سے لکھا ہے "میں چھوٹا سا تھا تاہم میری یادداشت میں ہے کہ ان دنوں کراچی سے ع غ شیخ نامی ایک صاحب "سراغ رساں" کے نام سے ایک ماہنامہ نکالتے تھے۔ بہت بعد میں مجھے پتا چلا کہ موصوف آپ کے والد محترم تھے۔ عبدالغفار شیخ، ایسا ہی ہے نا؟ آپ نے اپنے والد کی میراث کو جس احسن طریقے سے سنبھالا، اس کے لیے آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس دور میں چار رسائل باقاعدگی سے شائع کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے لیکن آپ نے دودھ کی یہ نہر نکال ہی لی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ سرگزشت، کے حالیہ شمارے اپریل 2014 میں دریا خان ضلع بھکر کے ایک قاری انور عباس شاہ نے شکایت کی ہے کہ معروف گلوکار مجیب عالم جن کا تعلق بھکر سے تھا، کے بارے میں سرگزشت میں کوئی معلومات فراہم نہیں کی گئیں۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ماہنامہ سرگزشت کے شمارہ جولائی 2007 میں علی سفیان آفاقی صاحب نے اپنے سلسلہ وار مضمون قلمی الف لیلہٰ میں مجیب عالم مرحوم کے متعلق خاصی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ شاید یہ شمارہ ان کی نظر سے نہیں گزرا ورنہ انہیں سرگزشت سے یہ گلہ نہ ہوتا۔ علاوہ ازیں راقم الحروف کی مرتب کردہ ایک کتاب مشاہیر میانوالی، بھکر، کے نام سے عنقریب منظر عام پر آ رہی ہے جس میں مجیب عالم کی شخصیت اور فن پر مضمون شامل ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے ان کا یہ شکوہ یقیناً دور ہو جائے گا کہ مجیب عالم ہمارے ہی علاقے کے تھے اور ہم ہی ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔"

☆ آفتاب احمد قصیر اشرفی لاہور سے رقمطراز ہیں "سرگزشت عالمی جریدہ ہے اور اس میں شائع ہونے والی تحریریں بھلے نثری انداز میں ہوں لیکن کبھی کبھی اس کا انداز شاعرانہ ہو جاتا ہے۔ منظر امام کے اپریل میں بہت کچھ تھا لیکن ہمیں اپریل کا شمارہ کسی عالمی مشاعرے کی طرح لگا جس میں شائع ہونے والے مواد پر داد دینے کو دل چاہنے لگا۔ چیف صاحب کا سپاس نامہ ہماری اجتماعی بے حسی کا شاخسانہ تھا۔ قومی ومذہبی تہواروں پر معاشی لوٹ مار پر جناب رضی اختر بھی آپ کے ہم خیال ہیں، کہتے ہیں کہ "کیسے کئے قصیدہ گو حرف وروں کے درمیان، کوئی تو سر کشیدہ ہو اتنے سروں کے درمیان" درویش عالم کی عربی زبان پر کی گئی عرق ریزی اور عالم عرب کی پذیرائی کے باوجود ہماری بے حسی پر منظر بھوپالی کا یہ شعر حسب حال ہے کہ "اپنے پرکھوں کی وراثت کو سنبھالو ورنہ۔ اب کے بارش میں یہ دیوار بھی گر جائے گی۔" ہماری یادداشت کے نہاں خانے میں موجود کیفی اعظمی صاحب کا یہ شعر کہ "بیلچے لاؤ کھولو زمیں کی تہیں۔ میں کہاں دفن ہوں کچھ پتا تو چلے۔" شاعر اعظم مرزا عبدالقادر بیدل کے لیے ہے جن کا مزار مبارک حادثات زمانہ کی نذر ہو گیا۔ شاہد جہانگیر شاہد نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کرامت نما کوشش کی ہے جس کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ شہر خیال کا یہ نگینہ بھی روبینہ نفیس انصاری صاحبہ کی طرح تراش کر آپ نے ہیرا بنا دیا، بالکل محمد ایاز راہی کی طرح جن کے مجذوب اردو کی شان میں بھارت کے جناب کنور مہندر سنگھ بیدی کا یہ شعر کافی ہے کہ "صاحب ایمان نمائش کیوں کریں ایمان کی۔ آؤ ہم انسان ہیں باتیں کریں انسان کی۔" سعادت حسن منٹو ایک انسان ہی تھا۔"

☆ منشی محمد عزیز مئے نے لندن وہاڑی سے لکھا ہے "حاصل پور فون کیا۔ بک اسٹال والے کا جواب اثبات میں پا کر فوراً لاری اڈے کی طرف لپکا اور یوں اکتیس مارچ کے روز پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق پندرہ بج کر چھپن منٹ اور بیالیس سیکنڈ پر سرگزشت کا جہاز میرے ہاتھوں کے ایئرپورٹ پر لینڈ کر چکا تھا۔ اشتہارات سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے پیارے انکل معراج رسول کے اداریے تک پہنچے۔ بہت شکریہ انکل جی! ہوشیار کرنے کا لیکن غریب بیچارے کریں تو کیا کریں۔ ان دنوں یہ حالت ہے کہ ادھر آٹا نایاب ہو چکا ہے اور بلیک میں مل رہا ہے۔ دو ہزار روپے فی من کے حساب سے۔ رمضان شریف میں تو خصوصی پیکج ہو گا ناں یعنی ہر چیز ڈبل ریٹ پر ملے گی کیونکہ ہم ہیں پاکستانی مسلمان، سر شرم کے مارے جھک جاتا ہے ایسی باتوں پر۔ کاش ہم تھوڑا سا بھی اپنے گریباں میں جھانک لیں کہ ہم کیا سے کیا ہو کر رہ گئے ہیں۔ پہلوان مبلغ میں الو کی محمد حسین کی عظمت وشجاعت کو سلام۔ ہانپتے کانپتے شہر خیال تک پہنچ ہی گئے ہیں لیکن پہلے ایک چھوٹی سی بات بلکہ اسے چھوٹی سی نہیں کہنا چاہیے۔ شہر خیال میں خلاف توقع مجھ ناتواں کو زبردستی اٹھا کر کرسی صدارت پہ بٹھا دیا گیا۔ اس خوشی سے مر نہ جاؤں اے خدا! دل پہ ذرا ہاتھ رکھ دیں کہ دھڑکن معمول سے بہت تیز ہو چکی ہے۔ آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔ آپ کی اس ذرہ نوازی پر۔ شہر خیال میں جنوری کے شمارے میں سولہ میل

چارفیصل خطوط، فروری میں تیرہ + تین (یعنی تین میں نہ تیرہ میں والا محاورہ کا بالکل الٹ) مارچ میں سترہ، چار اکیس خطوط شامل تھے جبکہ اپریل کے شہرِ خیال میں نسبتاً مختصر تر مگر تعداد میں زیادہ یعنی اٹھارہ + آٹھ کل چھبیس خطوط شامل تھے۔ درویش عالم محترم عبدالعزیز میمن پہ خوب لکھا ڈاکٹر صاحب نے۔ ویسے ایک بات کا افسوس ہوا کہ آج کل کے جاہلوں کی طرح عزیز صاحب کے والد محترم نے بلاوجہ بھتیجی کو طلاق دلوائی۔ گویا شریکے، والی بات بہت پرانی ہے آج کی نہیں۔ پراسرار پسینا ابن کبیر کی یہ تحریر پڑھ کر بے اختیار استغفراللہ پڑھنے لگا۔ اللہ محفوظ رکھے ہر قسم کی زمینی و آسمانی آفتوں بلاؤں سے۔ شاہد جہانگیر شاہد نے شاعرِ اعظم کے عنوان سے حضرت بیدل پر بہت خوبصورت اور معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ میرے مرشد فرماتے ہیں کہ عربی زبان اللہ تعالیٰ کی ہے اور فارسی اولیاء اللہ کی زبان ہے۔ سبحان اللہ۔ شاہد صاحب آپ کو ہم خصوصی طور پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ عمر شریف ہم تو سمجھے تھے پاکستانی اداکار کا تذکرہ ہے لیکن یہ کوئی مصری نژاد ہیں ہالی وڈ کے اداکار۔ ان کے غصے پر حیرت ہوئی۔ حالانکہ شوبز والے عموماً تحمل مزاج ہوتے ہیں کم از کم ظاہری طور پر۔ مجذوب اردو پڑھ کر لاہور جانے کی میری خواہش سوا ہوگئی ہے۔ (خط مختصر اور جامع ہو تو دیگر احباب کو بھی جگہ مل جاتی ہے۔)"

☆عزیز اللہ کی آمد لکھتے ہیں "محترم معراج رسول آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے ہمیں خبردار کیا۔ مہنگائی کا عفریت آج بھی پورے جوبن پر ہے، بھنڈی 100 روپے کلو، آلو 60 روپے کلو، گوشت اور مچھلی؟ ہماری ایسی شکل کہاں۔ ملاوٹ شدہ کاروبار پورے عروج پر ہے۔ غریبوں کا کچومر پہلے ہی نکل گیا ہے۔ آنے والی خوفناک مہنگائی کا سن کر ہمارا نازک دل ٹوٹے ٹوٹے ہو جاتا ہے۔ تاجر خدا کرے ہمیشہ خسارے میں رہو۔ شہرِ خیال میں سب بھائی بہنوں کے تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے بس ایک خرابی ہے گھما پھرا کر مہنگائی کا رونا رونے لگتے ہیں۔ پہلی سچ بیانی بزدل کون پڑھ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ نسرین کا قصور کیا تھا۔ اپنے پیارے شوہر سے ملنا پردیس میں گناہ تو نہیں۔ دشمنوں سے یہ برداشت نہ ہوسکا۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں نسرین کا قتل پولیس کے گندے ہاتھوں سے ہوا ہے۔ ثبوت مٹانے کے لیے ڈیڈ باڈی کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ جاہل دماغ درندو، وقت کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ دوسری سچ بیانی سانحہ کے آفتاب احمد نمک حرام۔ جس گھر کا نمک کھایا اس گھر کی معصوم لڑکی کی عزت لوٹی، خود کو مظلوم سمجھنا بند کردو۔ رحم کی اپیل بھی کرو۔ عمر قید کی سزا تجھے ضرور ملنی چاہیے۔ نورین کی جدائی کی آگ میں جلتے رہو۔ حور شمائل نسرین، پری وش نورین خدا آپ دونوں کو جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔ تیسری سچ بیانی شارٹ کٹ پڑھ کے جذبات کے آخری اسٹیج پر پہنچ گیا۔ رمیز انصاری آپ کو ایک پھر اچھنے والے افغانی لڑکے میں ایسی کیا خاصیت نظر آئی۔ یقیناً آپ کو بے اولاد ہونے کا شدت سے احساس ہوا ہوگا۔ وقت ضائع کیے بغیر سلطان کو ترس کھا کر اپنے گھر لائے۔ بیشک آپ کی نیت صاف تھی۔ رمیز انصاری، مہربان ہونے کی بھی حد ہوتی ہے۔ آپ مولانا عبدالستار ایدھی، انصار برنی تو نہ بن سکے لیکن قاتل ضرور بن گئے۔ لیکن وہ یتیم بچہ جاتے جاتے آپ کی آخرت سنوار گیا۔ آپ کو بچہ پالنے کا شوق تھا تو تھر چلے جاتے جہاں حکومت کی بے حسی کی وجہ سے 200 پھول جیسے بچے اس ظالم دنیا کو ترک کر گئے۔ بے شمار جانور بھوک اور پیاس سے مر گئے۔ ان سب کا خون پاکستان کی 20 کروڑ آبادی پر ہوگا۔ قیامت کے دن یہ معصوم بچے اللہ تعالیٰ سے پوچھیں گے یا اللہ تیری دنیا میں ہم بھوک پیاس سے مر گئے ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔"

☆ڈاکٹر خالد شفیع ملک بھکر سے لکھتے ہیں "اپریل 2014 کا سرگزشت میں جتنے بھی مضامین ہیں بہت ہی اعلیٰ اور نصیحت آموز ہیں۔ سرگزشت علم و ادب کی یونیورسٹی ہے۔ لوگوں کے تجربات سے ہمیں آگاہی ہوتی ہے اسی طرز کے مضامین پرنٹ ہوتے رہے تو ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ مادر وطن کی آپ بیتی بہت ہی دکھ بھری کہانی ہے۔ فلمی الف لیلہ ماضی کے جھروکوں سے لیا گیا معلوماتی تحریر ہے۔"

☆انور عباس شاہ حوریا خان بھکر سے رقمطراز ہیں "سب سے پہلے آپ کی صاف اور کھری باتیں یا نصیحتیں پڑھنا نہیں بھولے لیکن مجبوری یہ ہے کہ ہم کس کس بات سے ہوشیار رہیں۔ کمرتوڑ مہنگائی، قتل و غارت، لوٹ مار اور خودکش حملے جیسی چیزیں ہمارے ملک میں عام ہو چکی ہیں۔ خدا ہم سب کو ان مصیبتوں سے محفوظ رکھے آمین، بھائی بہنوں کے تبصرے بھی خوب تھے۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ کا خط پڑھ کر یاد آیا کہ میں نے بھی پچھلے خط میں آپ سے گزارش کی تھی کہ ایک اور پراسرار نمبر ضرور نکالیں کیونکہ مجھے بھی حقیقت پر مبنی پراسرار کہانیاں پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ رمیز انصاری کی سچ بیانی ایک اچھی کاوش تھی۔ سلطان جیسے کردار اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور اسی قسم کا سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا رہے گا۔ ہمیں ان جیسے کرداروں سے بھی تو ہوشیار رہنا چاہیے۔ منشی عزیز مے کی تحریر کوچوان بھی بہت پسند آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک کوچوان سے سبق حاصل کیا اور راہ راست پر آگئے۔ یہ بھی بڑی بات ہے۔ منشی صاحب کی تحریر پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب لکھ سکتے ہیں۔ خداوند کریم ان کو کامیابی عطا فرمائے (آمین)۔ یادِ ماضی کی کردار خالہ جیسی خاتون کا رویہ کم از کم میں نے تو اپنی زندگی میں کہیں نہیں دیکھا۔ ترکی نمی دانم تو دن بدن ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی جارہی ہے۔ اصلی ہیرو، بھی ایک خون گرما دینے والی تحریر تھی۔ جم نے واقعی ہیرو بن کر دکھایا اور اتنے انسانوں کی جان بچائی۔ جہاز بیتی ایک نہایت دلچسپ اور معلومات سے بھرپور تحریر تھی۔ فلمی الف لیلیٰ کا سلسلہ بھی ہمیشہ کی طرح دلچسپ اور معلومات سے بھرپور تھا۔ گراموفون کے متعلق مختصری معلومات بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ہمارے بچپن کے دور میں تو خیر سے یہ دم توڑ چکا تھا۔ ٹیپ ریکارڈ ہی صرف بچتے تھے۔ اب تو ٹیپ ریکارڈر بھی ختم ہو رہے ہیں کیونکہ آڈیو کیسٹس کی کمپنیاں اب تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔ اب ان کی جگہ کارڈز آگئے ہیں۔ ایک ہی کارڈ میں نہ جانے کتنے گانے اور فلمیں سما سکتی ہیں۔ اب آیندہ نہ جانے کیا کیا ہوگا۔ بہرحال جو بھی ہو ہماری ثقافت، ہماری تہذیب ختم نہیں ہونی چاہیے۔ ترقی کے تو بہت راستے ہیں۔ خوفناک تحریر پراسرار پسینا نام کی طرح پراسرار تھی۔ درویش عالم اور شاعرِ اعظم بے مثال تحریر تھی۔ شاعرِ اعظم



کے مصنف کو مزید تحریر بھیجنا چاہیے۔ بیت بازی کا سلسلہ میں نہیں پڑھتا کیونکہ شعر و شاعری سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ قسط وار کہانی سراب اچھی جارہی ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر اس کی اگلی قسط کا ہمیں شدت سے انتظار رہتا ہے۔ منظر امام صاحب کی ماہ اپریل کے بارے میں معلومات بھی خوب تھیں امید ہے یہ سلسلہ دسمبر تک اسی طرح دلچسپ اور مفید معلومات سے مزین چلتا رہے گا۔"

☆فہیم خان گنڈہ پور ڈیرہ اسماعیل خان سے رقمطراز ہیں "آج سے تقریباً دو سال پہلے شہرِ خیال کے دروازے پر دستک دی تھی۔ اب یہ کوشش ہوگی کہ ہر ماہ لکھوں کیونکہ قاری جو اتنا پرانا ہوں۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ کب سے سرگزشت کا قاری ہوں لیکن اتنا یاد ہے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے سرگزشت پڑھ رہا ہوں کیونکہ اسے میرے والد پڑھ رہے ہیں۔ سرگزشت کے علاوہ میں کوئی بھی کہانیوں، افسانوں کی کتابیں نہیں پڑھتا کیونکہ اس میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ جس طرح ایک بیج میں پورا درخت چھپا ہوا ہوتا ہے ٹھیک ویسے ہی سرگزشت میں پوری لائبریری چھپی ہوئی ہے۔ اب کہانیوں کی بات کریں۔ کہانیوں میں جو کہانی میرے دل کے سب سے قریب ہے وہ ہے سراب، اگر میں ڈائریکٹر یا پروڈیوسر ہوتا تو اس پر ایک فلم بنا دیتا۔ ویسے تو اس کہانی کے 10 میں سے 10 نمبر بنتے ہیں لیکن میرا پسندیدہ سلسلہ ہونے کے باوجود میں اسے 10 میں سے 9 نمبر دوں گا۔ وہ اس لیے کہ شوبی خواہ مخواہ لڑکیوں کے پیچھے قتل و غارت کرتا پھرتا ہے۔ جس طرح اس نے شاہین کے قاتلوں کو مارا تھا اور اب ایک ہندو لڑکی کے سابقہ شوہر کو مار ڈالا۔ جبکہ شوبی کے پاس فتح خان کو مارنے کے لیے ایسے کئی مواقع تھے لیکن اس نے فتح خان کو تو کچھ نہیں کہا۔ خیر یہ تو کاشف زبیر صاحب ہی جانیں دوسرا اہم نقطہ آفاقی صاحب کا ہے۔ آفاقی صاحب جس زمانے کی باتیں، یادیں قلم کی نوک سے سنوارتے ہیں اس زمانے کے کردار تو کیا ان کے مداح بھی ایک ایک کر کے آنکھیں بند کر چکے ہیں۔ آپ آج کل کی فلم انڈسٹری کی باتیں کیا کریں۔ پرانی باتیں تو ہمارے سر سے گزر جاتی ہیں۔ جو بات مجھے زیادہ چبھتی ہے، میں کیا ہر محبِ وطن کو چبھتی ہوگی وہ یہ کہ ایک آفاقی صاحب اور دوسرا رمیز راجا انڈیا والوں کی تعریفیں کرتے اور پاکستانیوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ان لوگوں کے منہ نہیں تھکتے۔ رمیز راجا تک تھری کے معاملے میں ایک نجی ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتا ہے کہ انڈیا والے پاکستانیوں کو دانہ ڈال رہے ہیں۔ پاکستانیوں کو یہ دانہ اٹھالینا چاہیے اور ایشیا کپ کے پاکستان اور انڈیا میچ کے دوران کمنٹری کرتے وقت بھی پاکستانیوں کی خامیاں بتائے جارہا تھا۔ پتا نہیں ہم پاکستانی خاص کر ہم عام لوگ کب سدھریں گے۔ جس طرح بچہ کھلونے سے کھیلتا ہے جب تھوڑا بڑا ہوتا ہے تو کوئی اور کھیل کھیلتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی چاہے عمر کے کسی بھی حصے میں ہو کسی نہ کسی چیز سے کھیلتا ہے لیکن ہمارے سیاست داں، بیوروکریٹ، بابو کوئی اور کھلونوں سے نہیں بلکہ ہم سویلین سے کھیلتے ہیں وقفے وقفے سے ہمارے جذبات، جذبوں اور ہمارے ایمان کو ٹھیس پہنچائی جاتی ہے۔ کبھی گستاخانہ فلم تو کبھی فیس بک پر ہم مسلمانوں کو ٹھیس پہنچانے کے لیے مقابلے کیے جاتے ہیں۔ حال ہی میں امریکی عدالت نے گوگل کو گستاخانہ مواد ہٹانے کا حکم دیا لیکن گوگل نے اس حکم کے خلاف اپیل کی لیکن گوگل کی اپیل رد کر دی گئی۔ آپ خود غور کریں اتنے مہینے جو گستاخانہ مواد ان ویب سائٹ پر پوری دنیا کے سامنے رہا اس وقت عدالت کو ہوش نہیں تھا اور ہم ہیں کہ ان گھٹیا ویب سائٹ یوٹیوب کو سب سے زیادہ استعمال کرتے ہیں، جانتے ہوئے بھی کہ کتنا سخت گناہ ہے اور کتنی گھٹیا یہ ویب سائٹ ہیں۔ جانتے ہوئے بھی ہم انجان بنے ہوئے ہیں ہم سب اپنے ملک کو سدھارنے کی بات کرتے ہیں۔ ہم خود سدھر جائیں ہمارا دین اور ملک خود بخود سدھر جائے گا۔"

☆تہمی فردوس احمد گوجرانوالہ سے وارد ہیں "میں سرگزشت اور سسپنس کی عرصہ دس سال سے خاموش قاری ہوں۔ خصوصاً سرگزشت کے بغیر تو میں زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ پورا مہینا دن گن گن کر کیم تاریخ کا انتظار کرتی ہوں۔ سرگزشت ہاتھ میں آتے ہی دو دن میں پورے کا پورا شمارہ چٹ کر جاتی ہوں۔ باقی اٹھائیس دن پھر اس کے انتظار میں گزرتے ہیں۔ آج سے چھ مہینے پہلے سرگزشت پر تبصرہ کرنے کے لیے قلم اٹھانے کی جسارت کی تھی۔ تبصرے کے ساتھ دو سچ بیانیاں بھی ارسال کی تھیں۔ اس سے اگلے ماہ کا شمارہ لینے بھاگم بھاگ بک اسٹال پر پہنچی۔ گھر آکر دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے ڈائجسٹ کھولا دیوانہ وار شہرِ خیال میں اپنا خط ڈھونڈنے لگی۔ سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ دل دکھ سے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس کے بعد بھی لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حالانکہ کئی بار دل چاہا کہ لکھوں۔ شہرِ خیال کے سبھی دوستوں کے شاندار اور جاندار تبصرے پڑھتی اور زیر لب مسکراتی رہتی۔ ڈاکٹر روبینہ انصاری، سدرہ بانو ناگوری اور بشریٰ افضل صاحبہ آپ سب کو نئی دوست کی جانب سے آداب۔ اپریل کے شہرِ خیال میں نظر دوڑا رہی تھی کہ نظریں ایک جگہ جم کر رہ گئیں۔ مارے حیرت کے گنگ ہوگئی۔ آنکھیں اور منہ دونوں کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ہمارے سامنے چھ ماہ پہلے کا لکھا ہوا ہمارا خط جگمگا رہا تھا۔ (مبارک باد دیں محکمہ ڈاک کو ہم نے بھی اسے نیا خط سمجھ کر لگا دیا) چند لمحوں تک بے حس و حرکت ان چند سطور کو گھورتی رہی۔ سکتے سے باہر نکلی تو خوشی سے نہال ہوگئی۔ معراج انکل سے جتنی شکایات یا شکوے تھے۔ سب دور ہوگئے۔ میرے لکھے گئے لفظوں سے اپنایت اور محبت کی جو خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ وہ بالآخر مدیرِ اعلیٰ کے دل پر اثر کر ہی گئی۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس خوشبو نے اثر کرنے کے لیے اتنی مدت کیوں لگائی۔ اس وقت یہ مصرع ذہن میں آرہا ہے بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ چلیں کوئی بات نہیں دیر آید درست آید۔ معراج انکل پلیز میری دونوں کہانیاں پڑھ کر بتائیں کہ وہ سرگزشت میں شائع ہونے کے قابل ہیں یا نہیں۔ (ابھی آپ مزید مطالعہ کریں)۔"

# عقل نشین

ڈاکٹر ساجد امجد

جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے یعنی ازمنہ قدیم سے انسان اس تلاش میں سرگرداں ہے کہ کرۂ ارض پر انسان آیا کہاں سے۔ اس کی پیدائش کب ہوئی۔ انسان کی اس فاسق سوچ کے سدِّباب کی خاطر تمام ادیان نے صاف لفظوں میں بتایا ہے کہ انسان جنت سے زمین پر آیا۔ زبور، توریت، انجیل اور فرقان الحمید نے کھل کر کہا ہے کہ جنت سے آدم وحوّا کو زمین پر بھیجا گیا ہے۔ دیگر مذاہب میں بھی یہی کہا گیا ہے مثلاً ہندو مذہب نے کہا کہ منو سے منش پیدا ہوا۔ چینی مذہب میں بھی اسی قسم کی باتیں بتائی گئی ہیں مگر اس سائنسداں نے مسلسل غور وفکر کے بعد یہ خیال پیش کیا کہ انسان بندر کی ترقی یافتہ نسل ہے۔ جس طرح ڈریگون وڈائناسور وقت کی تبدیلی کے بعد مگرمچھ، گرگٹ، چھپکلی میں بدل گئے ہیں اسی طرح بندر کی ایک خاص نسل وقت کی تبدیلی کے بعد انسان کے روپ میں ڈھل گئی ہے۔ اس فاسد خیال کو اس نے بڑے طنطنے سے پیش کیا مگر لوگ اسے جھوٹ کا پلندا کہتے ہیں۔

## ایک نامور سائنسداں کا احوالِ زیست

رابرٹ ڈارون نے ذاتی استعمال کے لیے چھوٹی سی بگھی خرید لی تھی۔ کچھ رقم پس انداز کرکے اسکاٹ لینڈ کے امیروں جیسے لباس کے چند جوڑے بھی بنوالیے تھے جسے پہن کر وہ اس بگھی پر سوار ہوتا تھا اور یوں سفید پوشی کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھا۔ یہ بگھی بھی کبھی کبھی ہی نکلتی تھی یعنی اُس وقت جب وہ کسی رئیس کے علاج کے لیے گھر سے نکلتا تھا۔ اس طرح وہ بڑی خوبصورتی سے یہ تاثر دینے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ وہ خود بھی اسکاٹ لینڈ کا چھوٹا موٹا نواب ہے۔ اس کی اسی چالاکی سے اس کا مطب چل رہا تھا۔ اس نے امیر خاندانوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرلیے تھے۔ ان کا ذاتی معالج بن کر اتنا کمانے لگا تھا کہ اپنے بہت سے بچوں کے تعلیمی اخراجات اچھی طرح برداشت کرلیتا تھا۔

اس کی وضع قطع بناوٹی تھی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک خاندانی طبیب تھا۔ اسکاٹ لینڈ کے دوسرے بڑے شہر ایڈنبرگ کے لوگ جہاں وہ مطب کرتا تھا اس کے خاندان کی اس انفرادیت سے اچھی طرح واقف تھے۔

اس کے والد اریسمس ڈارون بھی طبیب تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے فکری مجالس میں شریک ہوتے رہے۔ دانشوروں میں انہیں صائب الرائے سمجھا جاتا تھا۔ ''حیاتیاتی ارتقا'' ان کا خاص موضوع تھا۔ اس موضوع پر انہوں نے ایک کتاب ''زرتومیا'' کے عنوان سے تحریر کی تھی۔

اس کے بیٹے رابرٹ ڈارون نے اپنے والد سے طب تو خوب جی لگا کر سیکھی اور اسے بطور پیشہ اختیار کیا لیکن ان کے نظریات سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے لیے نئی راہ کا انتخاب کیا یا یوں کہیے کہ اسے حیاتیاتی ارتقا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انسان ہمیشہ سے ہی ایسا تھا یا اس کی موجودہ شکل و صورت کسی ارتقا کا نتیجہ ہے؟ ان خیالات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تاریخ وادب سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی دلچسپی معاشی جدوجہد تک محدود تھی یا امیروں سے تعلقات بڑھانا اس کا مشغلہ تھا۔ یہ مشغلہ بھی دراصل معاشی جدوجہد ہی کا ایک حصہ تھا۔ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا تھا تاکہ انہیں وہ سخت جدوجہد نہ کرنی پڑے جو وہ کررہا تھا اور اس کے بعد بھی مڈل کلاس سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔

بگھی دروازے پر کھڑی تھی۔ اسے جانے کی جلدی بھی تھی لیکن پُرتکلف پوشاک پہننے میں کچھ دیر تو لگتی ہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بچوں کو بھی ہدایات دیتا جارہا تھا کہ اس کے جانے کے بعد وہ کھیل کود میں نہ لگ جائیں، اپنے اسکول کا سبق یاد کرنے بیٹھ جائیں۔ وہ جب بھی گھر سے باہر جاتا تھا یہ ہدایات دینا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ یہ ہدایات تمام بچوں پر اثر انداز ہوتی تھیں لیکن سب سے چھوٹے بیٹے چارلس ڈارون پر ان نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس نے گھر سے باہر قدم رکھتے ہوئے خاص طور پر اس کے کان مروڑے۔ ''نالائق بچے! جب میں واپس آؤں تو تمہارے ہاتھ میں کتاب ہونی چاہیے۔''

اسے چارلس ڈارون کی طرف سے ہمیشہ کی طرح سرد مہری کے سوا کچھ نہیں ملا تھا لیکن وہ رک نہیں سکتا تھا۔ اس نے جڑی بوٹیوں سے تیار کی ہوئی دواؤں کا تھیلا اٹھایا اور بگھی میں بیٹھ گیا۔

چارلس ڈارون 1809ء میں پیدا ہوا تھا اور آٹھ سال کی عمر میں اسکول جانے لگا تھا لیکن اسکول جانے میں محض باپ کا خوف شامل تھا ورنہ اسے نصابی کتابوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسکول سے چھٹی بھی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس کی بہن کیتھرائن بھی اسی اسکول میں داخل تھی۔ اگر چھٹی کرتا تو فوراً گھر میں خبر ہوجاتی البتہ چھٹی ہوتے ہی وہ آزاد تھا۔ اسکول سے نکلتے ہی یا گھر آنے کے بعد وہ ساحلوں پر نکل جاتا یہاں اس کی تفریح کے بہت سے سامان تھے۔ کیڑے مکوڑے، سیپیاں اور مختلف اقسام کے پتھر اس کی توجہ اپنی
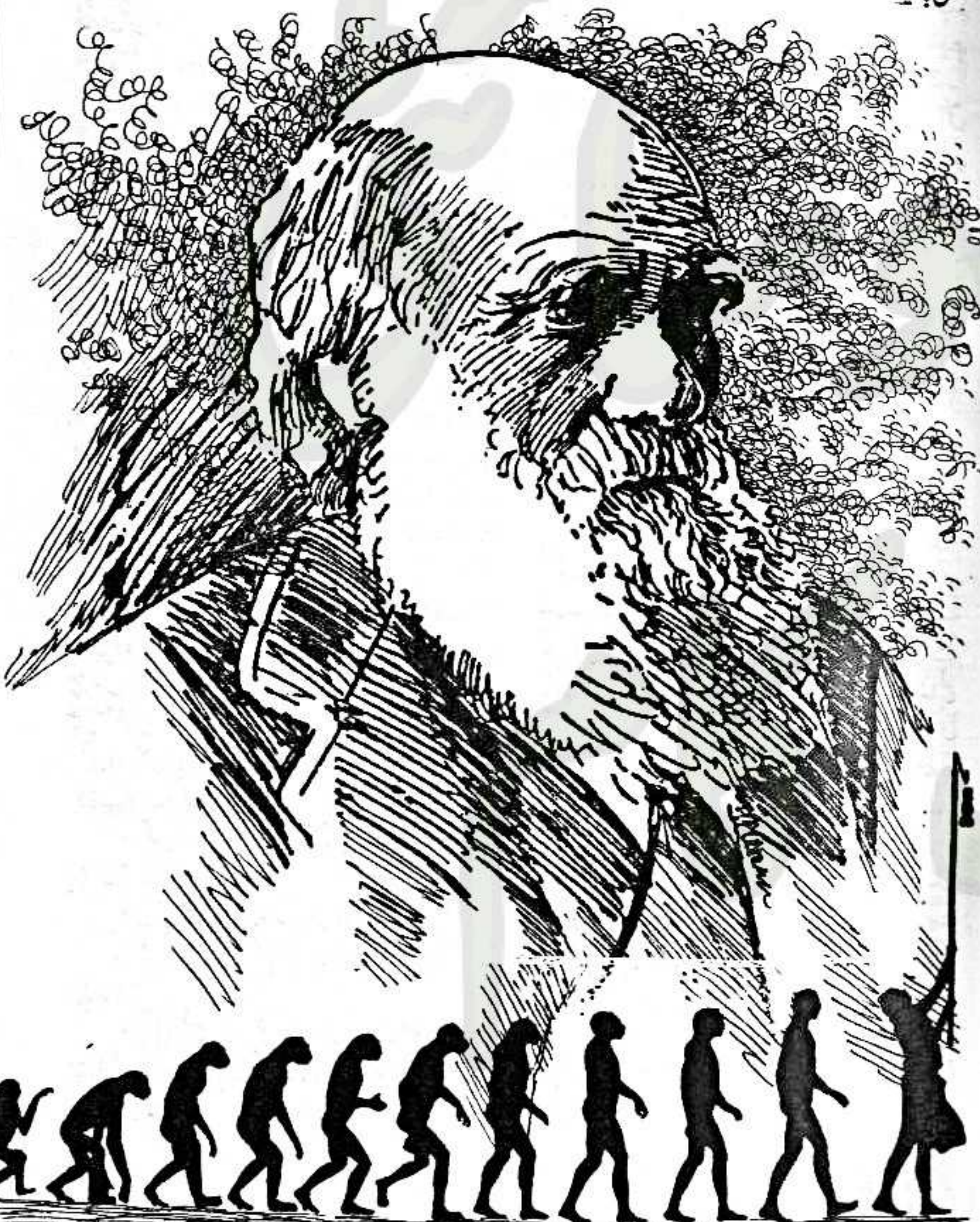
طرف کھینچ لیتے۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا کہ فطرت نے جو کچھ بنایا ہے کس طرح سے بنایا گیا ہے۔ سوال یہ نہیں تھا کہ اس نے یہ سوال کرکے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دے لیا تھا۔ یہ سوال نیا نہیں تھا لیکن اس کی کم سنی نے اسے بڑا بنادیا تھا۔ یہ سوال کسی پروفیسر نے اس کے دل میں نہیں ڈالا تھا۔ وہ نیچرل ہسٹری کا طالب علم نہیں تھا کہ کتابوں میں پڑھ لیا ہو۔ یہ سوال تو اس کے ذہن نے تشکیل دیا تھا۔ یہی اس کی اہمیت تھی اور اس سے بڑی بات یہ کہ اس کا جواب بھی وہ خود ہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسکول میں کون تھا جو اس کے سوال کا جواب دیتا۔ یہ پتھر ہمیشہ سے ایسا ہے یا اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں؟ پرندے سب ایک طرح کے ہیں لیکن بعض کے پر بعض سے مختلف کیوں ہیں؟ بعض کی چونچ ٹیڑھی اور بعض کی سیدھی کیوں ہے؟ مچھلیوں کی اقسام کیا ظاہر کرتی ہیں؟ انسانوں میں بعض امیر کیوں ہیں، بعض غریب کیوں ہیں؟ ایک ہی چہرہ رکھتے ہوئے ہر انسان دوسرے سے مختلف کیوں ہے؟ یہ سوال ہرگز ایسے نہیں تھے کہ آٹھ سال کے بچے کے ذہن میں ابھرتے مگر اس کے ذہن میں تھے۔ اتنے سوالوں میں گھرا ہوا ڈارون کتابوں کی طرف سے غافل ہوگیا تھا۔ اسکول کا پروفیسر جب اس سے کوئی سوال کرتا تو دوسرے بچوں کے قہقہوں کے سوا اسے کچھ سنائی نہیں دیتا جو اس پر ہنس رہے ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ اسے غبی اور کند ذہن سمجھا جانے لگا تھا۔

اس روز بھی یہی ہوا تھا۔ باپ کی بگھی جیسے ہی روانہ ہوئی وہ گھر سے نکل گیا۔ اسے آج مختلف گھونسلوں سے چڑیوں کے انڈے جمع کرنے تھے۔ وہ جب ایسے کاموں میں مشغول ہوتا تھا تو اسے یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ وہ گھر سے کتنی دور نکل آیا ہے۔ اس وقت بھی اسے یاد نہیں رہا کہ اس کا باپ لوٹ کر گھر بھی آئے گا۔

وہ گھر واپس آیا تو اس کے باپ کا غصہ اس کے سامنے تھا۔ ”کہاں گئے تھے؟“

اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”میں تمہیں کہہ کر گیا تھا کہ اسکول کا سبق یاد کرنے بیٹھ جانا۔“

اس کی مسلسل خاموشی نے رابرٹ کے غصے میں مزید اضافہ کردیا۔ رابرٹ نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو اس کے دامن میں بھرے ہوئے تمام انڈے زمین پر گر گئے۔ وہ ان انڈوں کو اس لیے اپنے ساتھ لایا تھا کہ ان کے ذریعے پرندوں کی شناخت کرے گا۔ ہر پرندے کے انڈے ایک سے لگتے ہیں لیکن ان میں معمولی سا ہی سہی، کیا فرق ہوتا ہے وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا۔ ان انڈوں کا یہ حشر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رابرٹ ڈارون اس کی کیفیت سے بے خبر اسے سمجھانے پر تلے ہوئے تھے۔

”تمہارے سب بھائی بہن پڑھنے میں دل لگاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تمہارے پروفیسر مجھے راستے میں ملے تھے۔ تمہاری شکایت کررہے تھے کہ تم پڑھنے میں قطعی دلچسپی نہیں لیتے۔“ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہہ رہے تھے کہ تم ایک نالائق لڑکے ہو۔ ”جانتے ہو مجھے کتنی شرمندگی ہوئی ہوگی؟ وہ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ تمہارے ہاتھ سے کتابیں لے کر تمہیں کسی کام پر لگادوں۔ تم نے کچھ سوچا بھی ہے کہ آگے جاکر کیا کروگے۔ کیوں بے کار کاموں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ اور یہ دیکھو، انڈے گر کر ٹوٹ گئے ہیں۔ تمہاری وجہ سے سارا فرش گندا ہوگیا ہے۔ تم نے کتنی جانیں ضائع کردی ہیں۔ اس کا گناہ تمہیں ملے گا۔ چلو، اسے صاف کرو اور اپنے کمرے میں جاکر پڑھنے بیٹھ جاؤ۔“

ڈارون نے دھندلی آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا اور فرش صاف کرنے بیٹھ گیا۔

اسے حکم ملا تھا کہ وہ کمرے میں جائے اور اپنا سبق یاد کرے۔ وہ کمرے میں گیا ضرور۔ اس نے کتاب بھی ہاتھ میں لے لی۔ اگر کوئی آجائے تو یہی ظاہر ہو کہ وہ پڑھ رہا ہے لیکن اس کا دھیان اب بھی انڈوں کی طرف تھا جو ٹوٹ گئے تھے۔ اسے ڈر ہو رہا تھا کہ اس کا باپ کہیں وہ اشیا بھی ضائع نہ کردے جو اس نے اپنے کمرے میں جمع کرکے چھوٹی سی لیبارٹری بنالی تھی۔ وہ کتاب کا سبق زور زور سے پڑھنے لگا تاکہ اس کا باپ مطمئن ہوکر اس کے کمرے کا رخ نہ کرے۔

پورے گھر میں یہی ایک کمرا تھا جہاں اسے سکون ملتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا بھائی بھی آکر اس کے تجربات میں شریک ہوجاتا تھا۔ مسٹر رابرٹ بچوں کے کاموں میں بہت کم دخل دیتے تھے۔ انہیں تو بس اس سے غرض تھی کہ وہ پڑھتے رہیں۔ اس کے بعد وہ جو جی چاہے کریں۔

وہ پابندی سے اسکول جاتا رہا لیکن اس کی آوارگیاں اسی طرح جاری رہیں۔ اسکول سے شکایتیں بھی اسی طرح آتی رہیں۔

ایک دن اس کے باپ نے اس کی حرکتوں کو دیکھ کر اس سے صاف صاف کہہ دیا ”تمہارے رویوں کو دیکھ کر



مجھے لگتا ہے تم خاندان کے لیے بدنامی کے سوا کچھ نہیں کماؤ گے۔“

رابرٹ اس کی طرف سے فکر مند تھے لیکن خود اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ اس کی عمر ایسی تھی بھی نہیں کہ وہ زندگی کو ایسے رخ سے دیکھتا۔

ایک روز ڈارون کی بہن کیتھرائن مسٹر رابرٹ کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

”میں چارلی (پیار کا نام) کے ساتھ اسکول میں پڑھنے کو تیار نہیں۔ اس کی شرارتیں بڑھتی جارہی ہیں اور سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔“

”تمہیں اس سے کیا ہے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔“

”وہ سبق یاد نہیں کرتا۔ پروفیسر اسے ڈانٹتے ہیں اور مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ آپ یا تو مجھے کسی اور اسکول میں داخل کرادیں یا چارلی کو میرے اسکول سے نکال دیں۔ ہم دونوں ایک ساتھ نہیں پڑھ سکتے۔“

یہ بات ایسی تھی کہ رابرٹ کو اس پر سنجیدگی سے سوچنا تھا۔ کیتھرائن کا تعلیمی ریکارڈ اچھا تھا۔ اسے کسی اور اسکول میں بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ یہ قدم ڈارون کے لیے اٹھایا جاسکتا تھا۔ مسٹر رابرٹ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ ممکن ہے اس اسکول میں چارلی کا دل نہ لگ رہا ہو۔ یہاں کے اساتذہ سے وہ مطمئن نہ ہو۔ سوال یہ تھا کہ اسے اب کس اسکول میں داخل کرایا جائے۔ مسٹر رابرٹ کئی دن برابر اس کی نئی درس گاہ کے بارے میں سوچتے رہے۔

اس دوران چارلس کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اسے زیادہ صدمہ اس لیے نہیں ہوا کہ ایک تو وہ کم عمر تھا دوسرے یہ کہ اس نے ہوش سنبھالتے ہی ماں کو بیمار دیکھا تھا لہٰذا اس سے وہ زیادہ قریب نہیں تھا۔ ڈارون کا خیال تھا، اس کا باپ بھی اس کی ماں سے زیادہ خوش نہیں تھا۔ گھر میں زیادہ دن سوگ کی فضا برقرار نہ رہ سکی۔ اس عرصے میں مسٹر رابرٹ یہ بھی طے کرچکے تھے کہ چارلس کو کہاں داخل کرایا جائے۔ گھر سے ایک میل کے فاصلے پر گرامر اسکول تھا۔ اس اسکول کے پرنسپل ایڈنبرگ کے مشہور عالم اور استاد ڈاکٹر بٹلر تھے۔ مسٹر رابرٹ کی ان سے اچھی دوستی تھی۔ ایک روز مسٹر رابرٹ ان کے پاس پہنچ گئے۔

”میں اپنے بیٹے کو آپ کے اسکول میں داخل کرانا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن آپ کے گھر سے میری درس گاہ کا فاصلہ اچھا خاصا ہے اور آپ کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔“

”آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ وہ اب بھی گھر سے اسکول جانے کے لیے اتنا ہی فاصلہ طے کرتا ہے۔“

”کیا مطلب۔“

”مطلب یہ کہ وہ جس اسکول میں اس وقت پڑھ رہا ہے وہ بھی شریوس بری ٹاؤن ہی میں قائم ہے۔ صرف اسکول بدلے گا فاصلہ وہی رہے گا۔“

”آپ اسکول کیوں بدلنا چاہتے ہیں۔ اس بچے کی یکسوئی میں فرق پڑے گا۔“

”وہاں کے اساتذہ کا خیال ہے کہ وہ پڑھائی میں اچھا نہیں ہے۔ تعلیم سے زیادہ کھیل کود میں لگا رہتا ہے۔“

”آپ کیا سمجھتے ہیں؟“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ عجیب عجیب شوق ہیں اس کے۔ پودے اور چڑیوں کے انڈے جمع کرتا رہتا ہے۔“

”اس عمر میں بچوں کو ایسے شوق ہو ہی جاتے ہیں۔“

ڈاکٹر بٹلر نے کہا۔ ”ایک بات اور بتادوں۔ اسے اس کے اس شوق سے روکیے گا نہیں۔ میرا مطلب ہے زبردستی نہ روکیے گا۔ اس کا ذہن کسی اور طرف موڑنے کی ضرورت ہے۔“

”وہ تعلیم کی طرف آتا ہی نہیں تو میں کیا کروں۔ اب تو اس کی ماں بھی اس دنیا میں نہیں رہی جو اس کی نگرانی کرلے گی۔“

”میں آپ کو ایک مشورہ دوں۔“

”اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”ہمارے اسکول میں ہاسٹل بھی ہے۔ آپ اسے ہاسٹل میں داخل کرادیں۔ گھر سے دور رہے گا تو اس میں سنجیدگی آجائے گی۔ میری نگرانی میں بھی رہے گا۔ آپ کے خاندان کا بچہ کند ذہن نہیں ہوسکتا۔ بس ذرا اس کے ذہن کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔“

”آپ ہاسٹل میں اس کی رہائش کا انتظام کرادیجیے۔ میں فیس دینے کو تیار ہوں۔“

چارلس کے لیے کیا فرق پڑتا تھا۔ یہ اسکول نہ سہی وہ اسکول سہی۔ اسے نہ یہاں پڑھنا تھا نہ کہیں اور بلکہ ایک لحاظ سے تو اسے اچھا ہی لگا کہ وہ باپ کی نظروں سے دور رہے گا۔ پھر اسے ان چیزوں کا خیال آیا جو اس نے اپنے کمرے میں جمع کررکھی تھیں۔ سیپیوں کے نمونے تھے۔ کیڑے اور دوسرے کیڑے مکوڑے تھے۔ انڈوں کے چھلکے تھے۔ پودوں کی جڑیں تھیں۔ بڑے بڑے شیشے کے مرتبانوں میں مچھلیاں تھیں۔ اسے ان چیزوں کا خیال آیا۔ اگر وہ ہاسٹل

میں رہنے لگا تو ان چیزوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ وہ پہلی مرتبہ فکرمند ہوا تھا لیکن زیادہ دیر فکرمند ہونا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کا حد سے بڑھا ہوا اعتماد یہاں بھی کام آیا۔ ایک میل کا فاصلہ ہوتا ہی کتنا ہے۔ میں ہاسٹل سے روز گھر آجایا کروں گا۔ مچھلیوں کو چارا ڈال کر اور کچھ دیر اپنی تجربہ گاہ میں گزارنے کے بعد دوبارہ چلا جایا کروں گا۔ اتنا فاصلہ تو میں بھاگ کر بھی طے کرسکتا ہوں۔

مسٹر رابرٹ نے ایک روز اسے ساتھ لیا اور اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر بٹلر کے پاس پہنچ گئے۔ ڈاکٹر بٹلر نے اسے ایک شرمیلا لڑکا پایا۔ ایک ایسا لڑکا جو بہت کم بولتا ہے۔ جو لوگ کم بولتے ہیں وہ عملی لوگ ہوتے ہیں۔ انہوں نے مسٹر رابرٹ سے کہا تھا۔ ”آپ چارلس کی طرف سے مایوس نہ ہوں۔ یہ بہت جلد کتابوں میں دلچسپی لینے لگے گا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ دس سال کا بچہ ہی تو ہے۔ آپ فکر مت کریں۔ میں اس کا پورا خیال رکھوں گا۔ آپ کو رپورٹ بھی کرتا رہوں گا۔“

مسٹر رابرٹ نے اس کے کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان ہاسٹل کے اس کمرے میں پہنچادیا جو اسے الاٹ ہوا تھا۔ اس کی بہن کیتھرائن کو اب احساس ہوا کہ اس کا بھائی اس سے دور چلا جائے گا۔ وہ خود کو مجرم سمجھ رہی تھی کیونکہ اسی کی شکایت پر اس کے باپ نے اسے ہاسٹل بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”چارلی، مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہاری شکایت کی اور ڈیڈی نے تمہارا اسکول بدل دیا۔ مجھے معاف کردو۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ چارلس نے کہا۔ ”جو کچھ ان اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے وہ مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا۔ ان کتابوں سے نہ مجھے اس اسکول میں کوئی سروکار تھا نہ وہاں ہوگا۔ ہاں یہ افسوس ضرور ہوگا کہ جو چیزیں میرے کمرے میں ہیں ان کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کرسکوں گا۔“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری کوئی چیز ادھر سے اُدھر نہیں ہونے دوں گی۔“

”خبردار، جو تم میرے کمرے میں گئیں۔“

”میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ تمہارے کمرے کی صفائی کردیا کروں گی۔“

”میں ہمیشہ کے لیے نہیں جارہا ہوں۔ میں روز گھر آیا کروں گا۔ اپنی چیزیں خود دیکھ لیا کروں گا۔“

”تم ہاسٹل سے روز گھر آیا کروگے۔“

”بشرطیکہ تم ڈیڈی سے شکایت نہیں کروگی۔“

”اب تو میں تمہاری کوئی شکایت نہیں کروں گی، دیکھ لینا۔“

”میری اچھی بہن۔ آج رات میں تمہارے ساتھ اور ہوں۔ پھر تو ہاسٹل میں ہی سونا پڑے گا۔ یہ پابندیاں مجھے قطعی پسند نہیں تھیں لیکن کیا کروں ڈیڈی کا حکم ہے۔ وہ مجھے نہ جانے کیا بنانا چاہتے ہیں۔“

”وہ چاہتے ہیں تم اسکول میں طب کی تعلیم حاصل کرو اور ڈاکٹر بنو۔“

”انہیں یہ فضول سی فکر نہ جانے کیوں ہے۔ بھئی ضروری تو نہیں کہ اگر وہ طبیب ہیں تو میں بھی طبیب بنوں۔ آیندہ سے میں اس سوال کا جواب بھی تلاش کروں گا کہ کسان کا بیٹا کسان اور طبیب کا بیٹا طبیب ہی کیوں بنتا ہے۔ کم از کم یہ کہ اس کے ماں باپ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔“

وہ رات اس نے بہن بھائیوں کے ساتھ گزاری۔ مسٹر براؤن بڑی دیر تک اسے سمجھاتے رہے کہ نئے اسکول میں اسے کس طرح رہنا ہے۔ کس طرح اپنی پڑھائی پر توجہ دینی ہے اور کس طرح اپنے مستقبل کو تابناک بنانا ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ اسے لے کر ڈاکٹر بٹلر کے پاس چلے گئے۔ کچھ دیر اسے وہ بھی اسی طرح سمجھاتے رہے جس طرح مسٹر رابرٹ نے سمجھایا تھا۔

”دیکھو بچے! اگر میں بھی تمہاری طرح کھیل کود میں وقت ضائع کردیتا تو آج اس اسکول کا پرنسپل نہ ہوتا کہیں مزدوری کررہا ہوتا۔ اب تم خود طے کرلو کہ اس طرح پرنسپل بننا پسند کروگے یا مزدور۔ یقیناً پرنسپل بننا پسند کروگے۔ تو پھر آج سے پڑھنے میں دل لگانا شروع کردو۔ میں تمام اساتذہ سے کہہ دوں گا۔ تمہاری شکایت میرے پاس نہیں آنی چاہیے۔

چارلس ان نصیحتوں سے تنگ آگیا تھا۔ اس لیے اس نے ضروری نہیں سمجھا کہ ان باتوں کا کوئی جواب دے۔

پرنسپل نے ہاسٹل کے وارڈن کو بلایا اور اسے اس کا کمرا دکھنے کے لیے بھیج دیا۔

”تم آج اپنے ہاسٹل کے کمرے میں آرام کرو۔ کل تمہیں تمہاری کلاس دکھادی جائے گی۔ باقاعدگی سے کلاس میں بیٹھنا۔ چھٹی والے دن تم اپنے گھر جاسکوگے۔“

اسے اس کا کمرا دکھا دیا گیا۔ اس کمرے میں ایک



پلنگ پڑا ہوا تھا۔ ایک لکھنے کی ٹیبل تھی اور ایک چھوٹی الماری تھی جس میں وہ اپنی کتابیں اور کپڑے رکھ سکتا تھا۔ ہاسٹل میں ہر طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے یہ کمرا اچھا لگا۔ یہاں کی تنہائی میں وہ اپنے خیالات پر اچھی طرح غور کرسکتا تھا۔

ابتدائی آدمی کے پاس چارپائی کہاں تھی وہ تو زمین پر سوتے تھے۔ بس اس نے چارپائی چھوڑی، زمین پر لیٹ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا اور اِدھر اُدھر کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا۔ ہاسٹل کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ کمرے میں آیا اور فل بوٹ پہن لیے۔ باہر نکلا اور گیٹ پر پہنچ گیا۔ چوکیدار نے اسے روکا تو نہیں لیکن یہ ضرور تاکید کردی کہ وہ ہاسٹل بند ہونے سے پہلے واپس آجائے ورنہ دروازہ نہیں کھلے گا۔ اس نے کچھ سنا کچھ نہیں سنا اور باہر نکل آیا۔ وہ آج یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ گھر تک پہنچنے اور واپس آنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ اس نے ایک میل کا فاصلہ کچھ بھاگ کر کچھ چل کر طے کیا اور گھر پہنچ گیا۔ اس کی چھوٹی سی تجربہ گاہ اس کا انتظار کررہی تھی۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اس کے بہن بھائی اسکول گئے ہوئے تھے۔ صرف ایک بہن گھر پر تھی۔

اس نے کچھ وقت گھر میں گزارا اور پھر ہاسٹل کی طرف چل دیا۔

اسے اندازہ ہوگیا کہ گھر تک آنے اور واپس جانے میں کتنا وقت لگتا ہے۔

صبح سو کر اٹھا اور اپنی کلاس میں پہنچ گیا۔ جہاں روایتی نصاب کا آغاز ہوگیا جس کا مظاہرہ وہ پچھلے اسکول میں دیکھ چکا تھا۔ اسے کلاس میں خالی ذہن بیٹھنے کی عادت ہوگئی تھی، یہاں بھی بیٹھا رہا۔

کلاسیں ختم ہوئیں تو وہ اپنے کمرے میں آیا۔ اپنے فل بوٹ پہنے اور انڈوں، پھولوں اور پتھروں کی تلاش میں نکل گیا۔ فطرت اس کا دامن تھامے ہوئے تھی اور وہ ایک ایک چیز کا مشاہدہ کررہا تھا۔

اس نے بہت سی اشیا جمع کیں اور گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچ کر اس نے ان اشیا کو ایک خاص ترتیب سے رکھا۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ ہاسٹل کا دروازہ بند ہونے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا۔ وہ افراتفری میں گھر سے نکلا اور سڑک پر آتے ہی بے تحاشا دوڑنا شروع کردیا۔ وہ بہت تیز دوڑتا تھا اور پھر لانگ بوٹ اس کی مدد کررہے تھے۔ ہاسٹل تک پہنچا تو گیٹ بند ہونے ہی والا تھا۔ وہ وقت پر پہنچ گیا تھا۔

اس دن کے بعد سے اس کا معمول بن گیا تھا۔ اسکول میں جب اسے کچھ وقت مل جاتا، وہ باہر گھومنے نکل جاتا اور کلاس شروع ہونے سے پہلے بھاگ کر وقت سے پہلے اسکول پہنچ جاتا۔ وہ اکثر ہاسٹل سے غائب رہنے لگا تھا۔ فطری اشیا جمع کرنے اور ان کو ترتیب دینے کا سلسلہ اس نے جاری رکھا ہوا تھا۔ گھر میں اس کا کمرا مختلف چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ اس کی لیبارٹری تھی اور اسے دیکھ بھال کے لیے روز گھر جانا پڑتا تھا اور واپسی میں یہ فاصلہ اسے بھاگ کر ہی طے کرنا پڑتا تھا۔

اسکول کے بچے جس عمر میں قاعدہ یاد کرتے ہیں، وہ پودوں کی خصوصیات کا مطالعہ کرکے ان کی درجہ بندی کرنے لگا تھا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا ماہر حیاتیات پیدا ہوچکا تھا جو کہ فطرت کے تیار کیے ہوئے اسٹیج پر غور و فکر کرنے لگا تھا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ اسے پس پردہ حقائق معلوم ہوسکیں۔

اس کے پہلے اسکول کا استاد اسے غیر ذمے دار بچہ قرار دے چکا تھا۔ دوسرے اسکول کا حال بھی کچھ اچھا نہیں تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اسکولوں میں صرف اتنا ہی معلوم ہوسکتا ہے جتنا کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ تاریخ اور جغرافیے کی کتابوں میں جو کچھ تحریر تھا اس کے ساتھیوں کو زبانی یاد تھا۔ اسے ان رٹے ہوئے جوابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کلاس میں بے زار شکل بنائے بیٹھا رہتا تھا۔ بس اتنا پڑھنا ضروری سمجھتا تھا کہ امتحان میں پاس ہوسکے۔ اس کے بعد وہ اپنے خیالوں میں کھوجاتا تھا اور کلاس ختم ہونے کا انتظار کرتا تھا۔ اس کے مطابق یہاں اس کے لیے سیکھنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ کلاس ختم ہوتے ہی وہ پودوں، انڈوں، مچھلیوں، کیکڑوں، سیپیوں اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کی تلاش میں نکل جاتا تھا۔ البتہ رات میں اس کے لیے کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ نصاب کی کتابوں میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اس نے رات گزارنے کے لیے ایک نئے مشغلے پر عمل شروع کردیا۔ اسے کہیں سے شیکسپیئر کے کچھ ڈرامے ہاتھ لگ گئے۔ اس نے انہیں لہک لہک کر پڑھنا شروع کردیا۔ ہاسٹل کے اکیلے کمرے میں اسے پوری آزادی تھی کہ ڈائیلاگ کو بلند آواز میں پڑھ سکے۔ وہ رات گئے تک ان ڈراموں کو ٹہل ٹہل کر پڑھتا رہتا۔ کچھ ہی دن میں اسے یہ فخر ہوگیا کہ وہ شیکسپیئر کی معیاری انگریزی کو بخوبی سمجھ سکتا ہے جبکہ اس کے ساتھی ایسا نہیں کرسکتے تھے۔ وہ رٹے رٹائے سبق پڑھ سکتے تھے اور بس۔

ان ڈراموں کے ذریعے اسے مطالعے کا ایسا چسکا ہوا کہ وہ بائرن اور اسکاٹ کی نظمیں لے کر بیٹھ گیا۔ ہاسٹل کی کھڑکی میں بیٹھا رہتا اور یہ نظمیں پڑھتا رہتا۔ اسکول میں غائب دماغ اور سنکی مشہور ہو چکا تھا۔ کسی طالب علم نے بھی اس کی طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھایا۔ وہ اپنی تنہائی کو کتابوں سے بہلاتا رہا۔

قریب تھا کہ وہ شاعر قسم کی کوئی چیز بن جاتا کہ اچانک ایک کتاب "دنیا کے عجوبے" اس کے ہاتھ لگ گئی۔ وہ اس کتاب کا ایسا دیوانہ ہوا کہ ہر کتاب ہاتھ سے رکھ دی۔

اس کتاب کو پڑھ کر اسے یہ شوق ہوا کہ کچھ عملی تجربے کیے جائیں۔ اس کا ایک بڑا بھائی کیمسٹری پڑھ رہا تھا، ڈارون بھی اس کے تجربات میں شامل ہونے لگا۔ دونوں بھائیوں نے مل کر ایک چھوٹی سی لیبارٹری گھر کے اندر بنالی تھی جہاں وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر گھنٹوں گیسوں کی تیاری میں مگن رہتا تھا۔ ڈارون کے لیے یہ نہایت دلچسپ مشغلہ تھا۔ وہ ہر روز کچھ نہ کچھ نیا تیار کرلیتا تھا اور پھر اپنے کارنامے اسکول کے دوستوں سے بیان کرتا تھا۔ جب ہر وقت اس کی زبان پر "گیسوں" کا نام رہنے لگا تو دوستوں نے اس کا نام ہی "مسٹر گیس" رکھ دیا۔ وہ پورے اسکول میں اسی نام سے مشہور ہو گیا۔

جب اس کی یہ حرکتیں عروج پر پہنچ گئیں اور وہ ایک اوسط درجے کے طالب علم سے آگے نہ بڑھ سکا تو ڈاکٹر بٹلر کو اپنا فرض یاد آیا۔ وہ پرنسپل تھے۔ ایک ایک طالب علم پر نظر نہیں رکھ سکتے تھے لیکن انہیں چارلس ڈارون کے والد مسٹر رابرٹ سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا کہ وہ چارلس کی نگرانی کریں گے۔ انہوں نے ایک روز اسے اپنے آفس میں بلایا۔

"تمہیں معلوم ہے تم اسکول میں کس نام سے پکارے جاتے ہو؟"

"جس نام سے کوئی سائنس داں پکارا جاسکتا ہے۔"

"یہ تمہارا گمان ہے۔ تم ایک نالائق طالب علم کے سوا کچھ نہیں ہو۔ تم فضول حرکتیں کرکے اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔ اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ تمہیں اپنی پڑھائی پر توجہ دینی چاہیے۔"

وہ اب دس سال کا بچہ نہیں رہ گیا تھا۔ اسے گرامر اسکول میں پڑھتے ہوئے چھ سات سال گزر چکے تھے۔ وہ اب ڈاکٹر بٹلر کی بات کا جواب دے سکتا تھا۔

"ڈاکٹر بٹلر! میں نصاب میں کیا دلچسپی لوں۔ آپ سات سال ہو گئے تھے کہ پرنسپل نے اسے نکال دیا۔ وہ گھر آ گیا۔

"تم جانتے ہو تم نے اپنی زندگی کے سات سال کس طرح برباد کیے ہیں۔" اس کی بہن نے اس سے کہا۔

"تم یہ جان ہی نہیں سکیں کہ وہاں گزارے ہوئے یہ سات برس میرے لیے کتنے بیزارکن تھے۔ اسکول اس لیے ہوتے ہیں کہ ذہنی نشوونما کو فروغ ملے لیکن اس اسکول میں تو میری ذہنی نشوونما ہی رک گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اساتذہ بھی چند چیزیں رٹ کر آجاتے ہیں اور انہیں کلاس میں آکر اگل دیتے ہیں۔ طالب علم ان کے اگلے ہوئے کو دوبارہ رٹ لیتے ہیں۔ بس اسکول میں رہ کر یہ فائدہ مجھے ضرور ہوا کہ میں نے شیکسپیئر، بائرن اور دوسرے شعرا کو ضرور پڑھ لیا۔ یہ بھی بے کار چیزیں تھیں لیکن انہیں پڑھ کر میری انگریزی ضرور اچھی ہوگئی۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟ تمہارے لیے جنت سے کون سا اسکول اتر کر آئے گا؟" اس کی بہن نے پوچھا۔

"میں بھائی کے ساتھ مل کر تجربات کرتا رہوں گا۔ شاید کوئی نئی چیز بنالوں۔"

وہ پھر اس کمرے تک محدود ہو کر رہ گیا جو اس کی تجربہ گاہ تھی۔ ان تجربات میں اسے مادّے کی بدلتی ہوئی حالتیں دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ وہاں ایک گیس دوسری نوعیت میں کے اسکول میں گھسے پٹے مضامین کے سوا پڑھایا ہی کیا جاتا ہے۔ یہ تو ایسا اسکول ہے جو علم اور تعلیم سے بالکل خالی ہے۔"

اس جواب پر ڈاکٹر بٹلر کا چراغ پا ہونا لازمی تھا۔ انہوں نے اس کے والد رابرٹ ڈارون کو بلایا اور ان سے صاف صاف کہہ دیا۔ "بچے کی ذہنی سطح بلند نہیں۔ اس لیے آپ کتنی ہی کوشش کرلیں یہ تعلیم میں دلچسپی لے ہی نہیں سکتا۔"

"مسٹر بٹلر، آپ دیکھ رہے ہیں میں کتنی کوشش کر رہا ہوں۔ اب یہ پڑھنا ہی نہ چاہے تو میں کیا کروں۔"

"اس میں اس کا قصور بھی نہیں۔ یہ ذہنی طور پر کمزور ہے۔ اسے آپ اسکول سے اٹھالیں۔ یہ ہمارے اسکول کا نام بھی بدنام کرے گا۔"

"کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔ اس سے تو بہتر تھا یہ کوئی کام ہی سیکھ لیتا۔" رابرٹ ڈارون نے کہا۔

"چارلس ڈارون کو اس اسکول میں پڑھتے ہوئے



بدل جاتی۔ نئی گیس کے اوصاف بھی بدل جاتے۔ جو کچھ نیا بن جاتا پہلی حالت سے مختلف ہوتا۔ دونوں حالتوں میں ایک تعلق اور تبدیلی بھی ہوتی۔ تبدیلی کا عمل طریقہ کار کے بغیر تو نہیں۔ یہ کیسے اور کس طرح ہو رہا ہے یہی تو سوال تھا جو ڈارون فطرت سے پوچھ رہا تھا۔ جب ہوا تبدیل ہوسکتی ہے تو یہ سوال لازمی تھا کہ ہوا پہلے کیسے ہوا کرتی تھی۔ یہی حال دوسری اشیا کا بھی ہے اور انسان کا بھی۔ کیا انسان ہمیشہ سے اسی طرح خوبصورت تھا؟ وہ اس کی کھوج میں لگا ہوا تھا کہ انسان کن مدارج سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ فطرت سے پوچھ رہا تھا کہ بتا تو پہلے کیسے ہوا کرتی تھی۔

وہ اپنی دنیا میں مگن تھا لیکن اس کے والد اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ چارلس کو اچھی تعلیم سے دلچسپی نہیں۔ اسے ایڈنبرگ یونیورسٹی میں داخل کرادیا جائے جہاں وہ طب کی تعلیم حاصل کرے اور خاندانی پیشے کو زندہ رکھے ورنہ اگر وہ ان بے کار کاموں میں مشغول رہا تو مستقبل کا کیا ہوگا۔ وہ کس طرح اپنی روزی پیدا کرے گا۔

اس کی عمر سولہ سترہ سال ہو چکی تھی کہ اسے ایڈنبرگ یونیورسٹی میں میڈیکل کی تعلیم کے لیے داخل کرادیا گیا۔ اسے اس تعلیم سے بھی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ باپ کے سامنے کچھ نہ بول سکا۔ اس کا بڑا بھائی اسی یونیورسٹی میں پہلے سے طب کے شعبے سے وابستہ تھا۔

چارلس ڈارون یونیورسٹی چلا تو گیا لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہاں بھی وہ اپنا وقت ہی ضائع کرے گا۔ ایسے بے مغز لیکچر سننے سے تو بہتر ہے کہ کوئی اچھی سی کتاب پڑھ لی جائے۔ اس نے یہی کیا۔ یونیورسٹی کے نصاب کو چھوڑ کر وہ نظریۂ ارتقا پر پہلے سے موجود تصورات کا بغور مطالعہ کرنے لگا کیونکہ یہ اس کا موضوع بھی تھا۔ وہ اس نتیجے پر تو پہنچ چکا تھا کہ کائنات تغیر پذیر ہے۔ تبدیلی کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے لیکن اسے دنیا کو سمجھانے کے لیے ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت تھی۔ اس نے ان تصورات کا مطالعہ کیا تو اس پر یہ واضح ہوا کہ اس مسئلے پر دو گروہ قابلِ ذکر ہیں۔ ایک گروہ مذہبی تھا۔ اس گروہ کا خیال تھا کہ کائنات کا نظام مکمل اور متعین ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوسکتی۔ خدا نے جو کچھ پیدا کیا ہے اس کے بارے میں اصول وضوابط متعین ہیں۔ لوگ دیوتا کو ناراض کرتے ہیں تو سزا پاتے ہیں۔ اسے تاریخ کے مطالعے نے بتایا کہ گلیلیو نے ایک سچائی سے پردہ اٹھایا تھا۔ اس نے آگاہ کیا کہ زمین ایک سیارہ ہے جو سورج کے گرد گھومتا ہے۔ اس انکشاف پر اسے پادریوں کی طرف سے سزائے موت سنائی گئی حالانکہ بعد میں ثابت ہوا کہ وہی سچا تھا۔

پیدائش وارتقا کا بھی یہی حال تھا۔ دانشور یہ کہتے ضرور تھے کہ کائنات تغیر پذیر ہے لیکن اسے ثابت کرنے کے لیے تحقیق کی ضرورت تھی جو سائنس کا کام ہے۔ ڈارون نادانستگی میں اس طرف گامزن تھا۔ نادانستگی میں اس لیے کہ ابھی وہ بالکل ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا۔ اس نے سائنس کی کوئی تعلیم باقاعدگی سے حاصل نہیں کی تھی۔ صرف یہ کہہ دینے سے کام نہیں چل سکتا تھا کہ کائنات تغیر پذیر ہے۔ یہ کن مراحل سے گزری اور کب سے گزرنا شروع ہوئی، یہ تحقیق طلب تھا۔ باشعور انسان کب سے اس کرۂ ارض پر موجود ہے، اس مدت کا تعین آسان نہیں تھا۔ کیا انسان ہمیشہ سے اتنا ہی خوبصورت تھا؟ یہ سوال چارلس کو اس عمر میں پریشان کر رہا تھا۔

اس کی اس پریشانی کو اس کی نالائقی سمجھا جا رہا تھا۔ اس کے باپ نے یہ سوچ کر اسے اپنے ساتھ مطب پر بیٹھنے کو کہا کہ اس طرح اسے طب کی عملی تعلیم کا موقع بھی ملے گا اور وہ اِدھر اُدھر گھومنے سے بچ جائے گا۔

چارلس کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ جو غریب مریض آتے ہیں اور فیس کم دیتے ہیں وہ ان کا علاج کرے۔ اس طرح اس کو اچھی طرح پریکٹس ہو جائے گی۔ مشورے کے لیے مسٹر رابرٹ موجود تھے۔ چارلس کو یہ کام اس لیے اچھا لگا کہ اس کے مریض غریب تھے اور غریبوں سے اسے ہمدردی تھی۔ وہ دلجمعی سے ان کا علاج کرنے لگا۔ انہیں دل لگا کر چیک کرنا اور بہتر سے بہتر دوا تجویز کرتا۔ اس کی اس دلچسپی کو دیکھتے ہوئے مسٹر رابرٹ نے پہلی مرتبہ اسے شاباش دی۔

"بیٹا، اچھا ڈاکٹر وہ ہوتا ہے جو مریضوں کا اعتماد حاصل کرلے۔ تم نے یہ اعتماد حاصل کرلیا ہے۔ مجھے امید ہے تم اچھے ڈاکٹر بنو گے۔"

مسٹر رابرٹ نے اسے اسی امید کے ساتھ مطب پر بٹھایا تھا اور وہ اس کی کارکردگی سے خوش تھے۔ مسٹر رابرٹ کا خیال تھا کہ وہ طب میں دلچسپی لے رہا ہے لیکن دراصل وہ غریبوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔

وہ مطب پر بیٹھا تو اسے اپنے باپ کی صحیح آمدنی کا علم ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ اچھے خاصے پیسے کما رہا

ہے اور مرنے سے پہلے اچھی خاصی جائداد بنالے گا۔ جو کچھ وہ چھوڑ کر مرے گا اور جو کچھ میرے حصے میں آئے گا وہ یقیناً اتنا ہوگا کہ میں آرام سے زندگی گزار لوں اس لیے مجھے مزید کمانے کے لیے طب سیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے تو بہتر ہے مجھے دنیا اور فطرت کو سمجھنے کے لیے وقت نکالنا چاہیے۔

وہ ایڈنبرگ یونیورسٹی میں طب کی تعلیم حاصل ضرور کر رہا تھا لیکن اس کی دلچسپی کہیں اور تھی۔ اسے کیمسٹری اچھی لگتی تھی کیمسٹری کے پروفیسر مسٹر ہوپ تھے۔ ان سے اس کی خوب بنتی تھی۔ ان کی کلاسوں میں بھی خوشی سے جاتا تھا۔

طب کی تعلیم کے دوران اسے آپریشن کے عملی تجربہ کے لیے آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ یہاں ایک بچے کا آپریشن ہو رہا تھا۔ ان دنوں کلورو فارم کے ذریعے مریضوں کو بے ہوش کرنے کا رواج نہیں تھا لہٰذا مریض کے لیے آپریشن نہایت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ ڈارون اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ اس آپریشن کو دیکھ رہا تھا۔ بچہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ ڈارون سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا۔ وہ آپریشن تھیٹر سے بھاگ آیا اور پھر کبھی وہاں نہیں گیا اور یہ طے بھی کرلیا کہ وہ اس پیشے کو کبھی اختیار نہیں کرے گا۔

بڑی مشکل سے اس نے ایک سال گزارہ۔۔ اور دوسرے سال وہ نیچرل سائنس میں چلا گیا۔ وہ ان نوجوانوں کے گروپ میں شامل ہوگیا جو نیچرل سائنس کے مطالعے اور تحقیق میں پُرجوش تھے۔

اس کی معلومات، قابلیت اور دلچسپی نے اساتذہ کو اس کا پرستار بنادیا۔ انہیں تعجب ہوتا تھا کہ جس لڑکے نے ابھی نیچرل سائنس کے مضامین پڑھنے شروع کیے ہیں، وہ اتنی معلومات کیسے رکھ سکتا ہے۔ جو کچھ اسے کلاس میں پڑھایا جاتا ہے وہ اس سے آگے چل رہا تھا۔ ایک دن پروفیسر گرانٹ نے اسے اپنے پاس بلایا۔

"چارلس، تم فطری اشیا کے بارے میں اتنا کیسے جانتے ہو جبکہ یہ مضمون تم نے پہلی مرتبہ اختیار کیا ہے۔"

"نیچرل سائنس میرا مشغلہ ہے جس پر میں بچپن سے غور کرتا چلا آرہا ہوں۔ میں نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں بھی پڑھی ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے کتابوں سے وہ سب کچھ نہیں آسکتا جو تم سیکھ چکے ہو۔"

"پروفیسر صاحب، دیوانگی سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ میں نے اپنے کمرے میں تجربہ گاہ بنائی تھی جس میں مری ہوئی مچھلیاں بھی تھیں، زندہ مچھلیاں بھی۔ پرندوں کے انڈے بھی تھے اور مختلف اقسام کے پھول بھی۔ کیکڑے اور سیپیاں بھی تھیں۔ میں بہ آسانی بتا سکتا ہوں کہ فلاں انڈا کس پرندے کا ہے۔ اب تو میں یہ بھی جان گیا ہوں کہ فلاں پرندہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ مجھے گمان ہے کہ انسان بھی کبھی گھوڑے اور بندر سے مشابہت رکھتا ہوگا لیکن کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے تحقیق سے ثابت کرنا ہوگا ورنہ گھوڑے اور بندر کو اپنے آباؤاجداد کون تسلیم کرے گا۔"

"چارلس، تم بہت خطرناک راستے پر جارہے ہو۔ اگر تم اس میں کامیاب بھی ہوگئے تو پادری تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔"

"جیت بالآخر سچائی کی ہوتی ہے۔" چارلس ڈارون نے کہا۔ "کیا آپ نے نہیں سنا کہ گلیلیو کو سزائے موت دے دی گئی تھی محض اس جرم میں کہ اس نے کہا تھا، زمین ایک سیارہ ہے اور وہ سورج کے گرد گھومتی ہے۔ بعد میں یہ نظریہ سچا ثابت ہوا اور سب نے مان لیا۔"

"میں تو اس خطرے کی بات کر رہا تھا جو تمہیں درپیش ہے۔"

اس ملاقات کے بعد پروفیسر گرانٹ سے اس کی قربت بڑھتی چلی گئی۔ یہ ملاقاتیں دوستی میں بدل گئیں۔ مسٹر گرانٹ اکثر مشکل مسئلوں میں اس سے مشورہ کرنے لگے۔ اس نے مسٹر گرانٹ کو کبھی مایوس نہیں کیا۔

پروفیسر گرانٹ حیاتیات کے نہایت قابل استاد تھے اور اس موضوع پر معیاری تحقیقات شائع کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ وہ جاندار اکٹھے کرنے کے لیے ساحلِ سمندر پر جاتے رہتے تھے۔ چارلس کی شکل میں انہیں ایک اچھا مددگار مل گیا۔ وہ بھی ان کے ساتھ جانے لگا۔ ان کا سامان اٹھائے ساتھ ساتھ پھرتا۔ وہ دونوں سمندری حیاتیات بھی اکٹھی کرتے جاتے اور ان کے درمیان ارتقا کے موضوع پر گفتگو بھی جاری رہتی۔ یہ گفتگو کبھی کبھی تکرار کی صورت اختیار کرلیتی۔ دونوں سامان رکھ کر ایک طرف بیٹھ جاتے اور بحث کرنے لگتے۔ پروفیسر گرانٹ ارتقا پسند مفکر لامارک کے نظریات سے متفق تھے جبکہ ڈارون کو لامارک کے نقطہ نظر سے اختلاف تھا۔ یہی اتفاق و اختلاف دونوں کے درمیان بحث کا موضوع بن جاتا تھا۔ لامارک کہتا تھا کہ تمام جاندار انواع نامیاتی و حیاتیاتی نظام کے ذریعے سے ایک دوسرے



سے منسلک ہیں۔ اس نے حیاتیاتی نظام کو مربوط قرار دیا تھا جبکہ ڈارون کہتا تھا کسی ایک نوع میں تمام جاندار ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پودوں اور جانوروں کی کسی ایک نسل میں شامل تمام ارکان ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہوتے ہیں۔ یہ اختلاف رنگ، قد، وزن، آواز، چلنے کی رفتار اور چہرے کے خط وخال کی مخصوص نوعیت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر کوئی گڈریا اپنے ریوڑ کی تمام بھیڑوں کو پہچانتا ہے۔ کسی ایک خاندان میں بہن بھائی ایک جیسے نہیں ہوتے حالانکہ والدین نہیں بدلتے۔ یہ تغیرات ہیں جو ہر نسل میں وجود رکھتے ہیں جو عملِ تولید کے ذریعے نئی نسلوں میں منتقل ہوجاتے ہیں۔

یہ سلسلہ دلچسپ بھی تھا اور معلومات افزا بھی لیکن زیادہ دن قائم نہ رہ سکا۔ پروفیسر گرانٹ لندن یونیورسٹی چلے گئے۔ ان کے چلے جانے سے چارلس ڈارون اکیلا ضرور رہ گیا لیکن اس نے ساحل پر جانا نہیں چھوڑا بلکہ اس نے وہ راہ اختیار کی جو وہ پروفیسر گرانٹ کی موجودگی میں اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے ملاحوں سے دوستی گانٹھ لی۔ جب وہ مچھلیاں پکڑنے کے لیے جانے لگتے تو وہ بھی ان کے ساتھ کشتی میں سوار ہوجاتا۔ واپسی پر اسے بہت سی سمندری مخلوق مل جاتی جس کی اسے ضرورت تھی۔

ان مخلوقات کے بہ غور مطالعے کے بعد وہ بعض نتائج تک پہنچ گیا اور اپنی یادداشتیں جمع کرنے لگا۔

ایڈنبرگ یونیورسٹی میں، پروفیسر جیمسن نے حیاتیات کے طلبہ کے لیے "پلانی سوسائٹی" قائم کی تھی۔ یہ ایک ایسا پلیٹ فارم تھا جس پر طلبہ حیاتیات کے موضوع پر سائنسی اور تحقیقاتی مقالات پیش کرتے تھے اور ان پر بحث کرتے تھے۔ ڈارون نے بھی اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا جس پر بحث کرنے والوں نے ملے جلے خیالات کا اظہار کیا۔ بعض نے اختلاف کیا بعض نے اتفاق لیکن اس کی محنت پر سب نے اتفاق کیا۔ ہر زبان کہہ رہی تھی کہ کسی محقق کو اتنی ہی محنت کرنی چاہیے۔

اس وقت اس کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

اسی سال اس نے اپنا دوسرا تحقیقی مقالہ "پلانی سوسائٹی" کے پلیٹ فارم پر پیش کیا۔

اس کے علاوہ وہ رائل میڈیکل سوسائٹی کا بھی رکن بن گیا لیکن جلد ہی اکتا بھی گیا۔ اس کے خیال میں یہاں کے اکثر لوگ روایتی تھے۔ پھر وہ ورنیرین سوسائٹی کا ممبر بن گیا۔ یہاں کا ماحول اسے خوشگوار معلوم ہوا کیونکہ سوسائٹی کے اجلاسوں میں نیچرل ہسٹری پر مقالے پڑھے جاتے تھے اور صحت مند بحثیں ہوا کرتی تھیں۔

اب اس کی قابلیت کو تسلیم کیا جانے لگا تھا اور اسے طالب علم محققوں میں اہم مقام حاصل ہوگیا تھا۔ اسی قابلیت کے اعتراف کے طور پر اسے ایڈنبرگ کی رائل سوسائٹی کا رکن نامزد کردیا گیا۔ اس سوسائٹی میں یورپ کے نامور دانشور اور سائنس دان شامل ہونے کی تمنا کرتے تھے اور اسے کسی سفارش کے بغیر اس کی رکنیت کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اسے دانشور تسلیم کرلیا گیا تھا اور اس کے "نظریۂ ارتقا" کے کاموں کو سراہا گیا تھا۔

اس عرصے میں وہ طب کو پوری طرح نظرانداز کرچکا تھا۔ اب وہ پوری طرح تحقیق ومطالعہ میں معروف تھا۔ حیاتیات کے موضوع پر اس نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔

ایڈنبرگ میں اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جارہا تھا اور توقع کی جارہی تھی کہ ایک دن وہ اپنے تفکرات سے دنیا کو چونکا دے گا۔ لیکن اس کے والد مسٹر رابرٹ اس کی ان کامیابیوں سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ اب بھی اس کی طرف سے ناامید تھے۔ وہ مسلسل کوشش کر رہے تھے کہ ڈارون راہِ راست پر آجائے۔ اس کے والد کی نظر میں وہ راستے سے بھٹک گیا تھا۔ وہ اسے اٹھتے بیٹھتے ٹوکنے لگے تھے۔ ڈارون کا یہ حال کہ وہ فطرت اور فطری قوانین کی تلاش میں سرگرداں تھا اور اس کا باپ یہ سوچ سوچ کر پریشان تھا کہ اس کے مستقبل کا کیا ہوگا۔

اس کے والد اس کی طرف سے اتنے مایوس ہوچکے تھے کہ وہ اس کا نام ہی بھول چکے تھے۔ وہ اسے "نکما" کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ ان کی نظر میں "طب" ایک اچھا پیشہ تھا۔ انہوں نے چاہا بھی یہی تھا کہ وہ ایک اچھا طبیب بن جائے لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ طب میں ناکام ہوچکا ہے۔ پھر اسے کیا بنایا جائے کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہے اور ایک دولت مند شخص بن جائے۔ پھر انہوں نے یہی سوچا کہ ڈارون کو پادری بنادیا جائے۔ پادری سرکاری ملازم ہوتے تھے۔ ان کو بھی ترقیاں اور مراعات ملتی تھیں۔ انہوں نے اپنے کسی بچے کو مذہبی تعلیم کی طرف راغب نہیں کیا تھا۔ یہ شعبہ صرف ڈارون کے لیے منتخب کیا کیونکہ ان کی نظر میں وہ نااہل اور نکما تھا۔

"تم اسکول میں بھی نالائق تھے۔ طب کی تعلیم بھی تم

حاصل نہ کرسکے۔ اب ایک باعزت شعبہ یہی رہ جاتا ہے کہ تم پادری بن جاؤ۔ سرکاری ملازم بن جاؤ گے۔ آئندہ زندگی میں ترقی بھی پاتے رہوگے۔ میں مر بھی گیا تو میری روح کو سکون ملے گا کہ تم کسی قابل بن گئے۔"

"میں جو کچھ بننا چاہتا ہوں مجھے بننے دیجیے۔"

"میں تمہیں مچھیرا بنانا نہیں چاہتا کہ ملاح بن کر کشتی میں جاؤ اور مچھلیاں پکڑ کر لے آؤ۔ گھونسلوں میں جھانکنے کے دن گئے۔ اب تم کچھ کر کے دکھاؤ تاکہ ڈارون خاندان کا نام روشن ہو۔"

"اسی نام کو روشن کرنے کے لیے تو اتنی تگ ودو کر رہا ہوں۔"

"کیا حاصل۔"

"مجھے رائل سوسائٹی کا ممبر بنالیا گیا۔ یہ ایسا اعزاز ہے کہ بڑے بڑے دانشور اور سائنس داں اس کی آرزو کرتے ہیں۔"

"یہ بس اعزاز ہی اعزاز ہے۔ پیٹ بھرنے کے لیے تمہیں کوئی کام کاج بھی کرنا پڑے گا۔"

"میری خواہشات اتنی نہیں ہیں کہ مجھے زیادہ مشقت کی ضرورت ہو۔"

"تمہاری نہ ہو میری خواہش ضرور ہے کہ تم باعزت کہلاؤ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم پادری بن جاؤ۔ میں نے بات کرلی ہے۔ تمہیں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کیمبرج جانا ہوگا۔ میں نے کہہ دیا ہے تو بس جانا ہوگا۔"

چارلس ڈارون نے معمولی سی مزاحمت کی اور پھر باپ کی بات مان لی۔ فرماں برداری اس کی فطرت میں تھی۔ وہ کبھی باپ کی بات نہیں ٹالتا تھا۔ اب بھی اس نے باپ کی ہدایت پر عمل کیا۔ مذہب کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ جو کچھ اس نے اسکول میں پڑھا تھا سب بھول گیا تھا۔ اس نے مناسب سمجھا کہ کیمبرج میں جانے سے پہلے مذہب پر کلاسیکل کتب کا مطالعہ کرلے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے پادری نہیں بننا ہے لیکن دلچسپ بات ہے کہ پادری بننے کے لیے کیمبرج چلا گیا حالانکہ اسے بعد میں کہنا پڑا۔ "میری زندگی کے تین برس ضائع ہوگئے جو میں نے کیمبرج میں مذہبی تعلیم کے حصول پر لگادیے۔ ایک اسی پر منحصر نہیں۔ وہاں بہت سے ایسے تھے جنہیں مذہب یا مذہب کی تعلیم سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ یہ تعلیم صرف ملازمت کے حصول کے لیے حاصل کر رہے تھے۔"

اس نے بہت جلد مستقبل کے ایسے پادریوں کو ڈھونڈ نکالا جو مذہب سے برائے نام دلچسپی رکھتے تھے۔ کلاس میں وہ مذہبی بنے رہتے تھے لیکن کلاس کے بعد جی بھر کے شراب پیتے تھے اور تاش کھیلتے تھے۔ وہ ایک دن اس محفل کے ایک رکن سے ملنے کے لیے پہنچ گیا۔

"ہیلو! میرا نام چارلس ڈارون ہے۔"

"ہمیں تمہارے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ معلوم ہوچکا ہے۔"

"کیا معلوم ہوچکا ہے۔"

"یہی کہ تم نیچرل سائنس کے طالب علم تھے اور یہاں زبردستی بھیجے گئے ہو۔"

"تو کیا تم اپنی مرضی سے یہاں آئے ہو۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے کہ زبردستی بھیجا گیا ہوں۔ ہمیں کوئی باعزت پیشہ تو اختیار کرنا ہی تھا۔"

"تم کہہ سکتے ہو کہ تم دل سے مذہبی ہو۔"

"ہماری عمریں ایسی نہیں کہ ہم خشک زندگی گزاریں۔ جب تک ہم ڈگری لے کر کسی چرچ میں نہیں پہنچ جاتے اس وقت تک تو آزاد ہیں۔"

"یہی میرا بھی خیال ہے۔" ڈارون نے کہا۔

"مجھے خوشی ہوئی کہ میرے گروپ میں ایک اور کا اضافہ ہوا۔"

چارلس اس گروپ میں شامل ہوگیا۔ اپنی ذہانت اور دلچسپ باتوں سے اس گروپ میں اپنے لیے ایک خاص جگہ بھی بنالی۔ یونیورسٹی کے ایک الگ تھلگ حصے میں جی بھر کے شراب پی جاتی۔ تاش کی بازیاں لگتیں اور میوزک سنا جاتا۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ اس نے یہاں بھی اپنی دلچسپی کی پیروی شروع کردی۔ فرصت کے اوقات میں وہ فطرت کے مطالعے کے لیے دور تک نکل جاتا۔ اس کی اسی دلچسپیوں نے اس کی ملاقات پروفیسر ہنسلو سے کرادی۔ ان سے ملاقات کے بعد اس نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ اس کا اچھا وقت گزر سکتا ہے۔ اسے اس یونیورسٹی میں "تھیالوجی" پڑھنے کے لیے بھیجا گیا تھا جبکہ اس کی دلچسپی نیچرل ہسٹری تک محدود تھی۔ اس نے اپنے لیے راستہ نکال لیا۔ اس نے پروفیسر ہنسلو کی کلاسوں میں جانا شروع کردیا۔

پروفیسر ہنسلو پودوں کے بارے میں عملی تجربے کے لیے فیلڈ میں لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ڈارون نے سنا کہ وہ اپنے شاگردوں کو کہیں باہر لے جارہے ہیں تو وہ بھی ان کے ساتھ چلا گیا۔ دریا کے کنارے کنارے چلتے ہوئے پروفیسر ہنسلو جس طرح نایاب پودوں اور جانوروں کے بارے میں معلومات فراہم کر رہے تھے اور طلبہ کے سوالوں کے جوابات خوش دلی سے دے رہے تھے، ڈارون کے لیے یہ منظر نہایت دل خوش کن تھا۔ ڈارون نے جب اس گفتگو میں دخل دیا تو پروفیسر موصوف پر بھی اس کے جوہر کھلے۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ڈارون اس قدر معلومات اپنے ذہن میں لیے پھر رہا ہے۔

جب ایسے کئی دورے ہوچکے اور پروفیسر ہنسلو کو یقین ہوگیا کہ ڈارون محض ایک شاگرد نہیں بلکہ اپنی قابلیت کے اعتبار سے نامور سائنس دانوں میں بیٹھنے کے لائق ہے تو انہوں نے دوستی کا دائرہ بڑھادیا۔

"کیا تم اتنا وقت نکال سکتے ہو کہ ہفتے میں ایک دن میرے گھر آسکو۔"

"یہ تو میرے لیے عظیم عزت افزائی ہوگی۔"

"چھٹی کے دن میرے پرانے شاگرد اور سائنس میں دلچسپی رکھنے والے احباب جمع ہوتے ہیں۔ اس محفل میں ادبی شخصیات بھی ہوتی ہیں۔ گپ شپ ہوتی ہے، فکرو فلسفہ پر بحثیں ہوتی ہیں۔ تمہیں ان محفلوں میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔"

وہ ان کی دعوت پر ایسی ہی ایک یادگار شام کو پروفیسر صاحب کے گھر چلا گیا۔ اس نے اس سے پہلے اتنے اہلِ علم ایک جگہ جمع ہوتے ہوئے نہیں دیکھے تھے۔ ڈارون نے محفل میں شریک ہوتے ہی بحث کا رخ ارتقا کے موضوع کی طرف موڑ دیا تاکہ وہ اپنی معلومات سے اہلِ محفل کا رخ اپنی طرف موڑ سکے اور اس کا تعارف اچھی طرح ہوسکے۔

محفل کا اختتام ہوا تو ہر زبان پر اسی کی باتیں تھیں۔ تمام لوگ خوش تھے کہ پروفیسر ہنسلو نے ایک اچھے ساتھی کا اضافہ کیا ہے۔ اس بات کا افسوس بھی تھا اور سب نے اس کا اظہار بھی کیا کہ وہ پادری بننے کے لیے مذہب کی تعلیم حاصل کر رہا ہے جبکہ وہ فلسفہ اور سائنس کی دنیا میں بہت سے کارنامے انجام دینے کا اہل ہے۔

ان محفلوں نے اس کے احباب میں اضافہ کردیا۔ اب وہ اکثر اپنی کلاسوں سے غائب رہنے لگا۔ اس کا وقت فلسفیوں اور دانشوروں کے ساتھ گزرنے لگا۔ ان صحبتوں نے اسے اپنے نصاب اور اپنی کلاسوں سے بالکل ہی برگشتہ کردیا۔ اس سے پہلے وہ خاموشی سے لیکچر سن لیا کرتا تھا لیکن اب وہ دوستوں کی محفلوں میں ان لیکچروں کا مذاق بھی اڑانے لگا۔ مذہبی سوچ اور اس کی فکر میں زبردست ٹکراؤ تھا جو اب کھل کر سامنے آگیا تھا۔ پادری کہتا تھا قدرت نے جو چیز جس طرح بنائی ہے آج تک اسی طرح ہے۔ اس میں کوئی ردوبدل نہیں کرسکتا۔ جبکہ ڈارون یہ کہتا تھا کہ ہر چیز ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے۔ ارتقائی سفر ابھی رکا نہیں۔ یہ بہت بڑا فاصلہ تھا جو کسی طرح طے نہیں ہوسکتا تھا۔

ہفتے میں دو دن اسے اپنی کلاس کے دوسرے طلبہ کے ساتھ چرچ میں جانا پڑتا تھا۔ یہاں موسیقی کی دھن پر ایک نغمہ گایا جاتا تھا جس کے بول تھے "گاڈ سیو دی کنگ" (God save the king) ڈارون موج میں آکر کہا کرتا تھا، خدا بادشاہ کی حمایت نہیں کرے گا کیونکہ لوگوں کو بادشاہ کی سلامتی عزیز نہیں۔ بعد میں ایسا ہی ہوا۔ تاجروں اور صنعت کاروں کا سرمایہ دار طبقہ بادشاہ کے خلاف ہوگیا۔ کسانوں کے دلوں میں جاگیرداروں، سرکاری افسروں اور مذہبی عالموں کے خلاف نفرت بھری ہوئی تھی۔ ایسے سماجی ماحول میں خدا نے بادشاہ کی سلامتی پر توجہ نہیں دی۔

ڈارون کی بے رغبتی بڑھتی جارہی تھی۔ پروفیسر ہنسلو سے اس کی دوستی گہری ہوگئی تھی۔ وہ اب اپنا زیادہ وقت پروفیسر ہنسلو کے ساتھ گزارتا تھا۔ اب وہ ان کے فیملی ڈنر میں بھی شریک ہونے لگا تھا۔ گویا اب وہ ان کا فیملی ممبر بن گیا تھا۔ وہاں آنے والے نابغہ روزگار شخصیات سے اس کے تعلقات گہرے ہوگئے تھے۔ انہی میں ایک صاحب سر جے۔ ہرشل تھے۔ ان کی ایک کتاب نے بہت شہرت پائی تھی۔ یہ کتاب نیچرل فلاسفی کی تاریخ کا ایک مطالعہ تھا۔ ڈارون کی ملاقات جب سے پروفیسر ہنسلو سے ہوئی تھی وہ اس کتاب کے بارے میں سنتا رہا تھا۔ گفتگو کے دوران اس کتاب کے حوالے اور اقتباسات سنتا رہا تھا۔ اب جو مصنف سے ملاقات ہوئی تو اس کتاب کے پڑھنے کا جذبہ جاگا۔ مصنف سے تعلقات بھی ہوگئے تھے۔ مطالعہ کے دوران اگر کوئی مشکل ہوتی تو ان سے پوچھا جاسکتا تھا۔ اس نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کردیا۔ جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا تھا اسے معلوم ہوتا تھا وہ کسی دریا سے سمندر میں آگیا ہے۔ اسے اپنا علم بہت چھوٹا نظر آنے لگا لیکن قابلِ ذکر بات یہ تھی

کہ اب تک فطرت کے مطالعہ سے جو نتائج اس نے اخذ کیے تھے اس کتاب کا مصنف بھی انہی نتائج تک پہنچا تھا۔ ڈارون کو خود پر اطمینان ہونے لگا کہ وہ صحیح سمت کی طرف جارہا ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر اس کے دل میں تحقیق کا ایک نیا شعلہ بھڑکا۔ ایک جذبہ پیدا ہوا کہ مجھے نیچرل سائنس میں کچھ نیا اضافہ کرنا چاہیے۔ چاہے یہ معمولی نوعیت ہی کا کیوں نہ ہو۔

اس کی بے پناہ دلچسپی کو دیکھتے ہوئے پروفیسر ہنسلو نے اسے ''جیالوجی'' کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ جیالوجی کی کلاسوں میں جانے لگا۔ یہاں اس کی ملاقات پروفیسر سیجوک سے ہوئی۔ یہ پروفیسر قدیم چٹانوں پر تحقیق کی غرض سے فیلڈ اسٹڈی پر جاتے رہتے تھے۔ ان کے ساتھ وہ بھی جانے لگا۔

مذہب میں بی اے کی ڈگری لینے کے لیے تعلیم بھی جاری رہی۔ وہ اس سے پہلے ہی یونیورسٹی چھوڑ کر چلا آتا لیکن دوسری دلچسپیاں اسے یہاں رکنے پر مجبور کرتی رہیں۔ پروفیسر ہنسلو اور پروفیسر سیجوک کی دوستیاں اسے مجبور کرتی رہیں اور اس نے تین برس کا سلیبس مکمل کرکے مذہب میں بی اے کی ڈگری لے لی۔

پادری بننا اس کے مقدر میں نہیں تھا۔ شاید باپ کے کہنے سے وہ ایک ناکام پادری بن بھی جاتا کہ ایک پیش کش اس کے سامنے آگئی۔

برطانیہ کی رائل نیوی کا ایک جہاز ''بیگل'' تحقیقی دورے پر روانہ ہورہا تھا۔ یہ بحریہ طاقتور ترین بحریہ سمجھی جاتی تھی۔ سمندروں پر اس کا راج تھا۔ بیگل کا سفر دراصل ایک فوجی مہم تھی۔ دوسرے ملکوں پر طاقت کا اظہار کرنا، مقبوضہ کالونیوں پر فوجی قوت کا رعب جمانا اور ساحلی علاقوں سے متعلق جغرافیائی معلومات جمع کرنا ''بیگل'' کے مقاصد تھے۔

اس جہاز کے کیپٹن فٹنرائے سے پروفیسر ہنسلو کے اچھے تعلقات تھے۔ پروفیسر ہنسلو نے جب سے سنا تھا کہ ایک جہاز دنیا کے سمندری دورے پر روانہ ہونے والا ہے وہ اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح چارلس ڈارون اس جہاز کے ساتھ چلا جائے اور اپنی تحقیق مکمل کرکے اس کا نچوڑ دنیا کے سامنے پیش کرے۔ ایسا عظیم موقع انفرادی طور پر کبھی حاصل نہیں ہوسکتا تھا لیکن اس موقع کا حصول آسان بھی نہیں تھا کیونکہ اس جہاز پر صرف فوجی افسران ہی سوار تھے۔

پروفیسر ہنسلو اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح چارلس ڈارون کو موقع مل جائے۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح کیپٹن رائے تک رسائی حاصل کرلی۔ ''آپ کے اس دورے کے مقاصد کیا ہیں۔''

''دنیا کو برطانوی رائل نیوی کی طاقت سے مرعوب کرنا اور جغرافیائی معلومات حاصل کرنا۔''

''کیپٹن رائے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے اس جہاز پر کوئی سائنس داں بھی سوار ہے؟''

''نہیں، ایک بھی نہیں۔''

''اس طرح تو آپ ایک اہم حقیقت کو نظر انداز کررہے ہیں۔ کسی سائنس داں کو ساتھ لیے بغیر آپ اہم معلومات حاصل نہیں کرسکیں گے۔ آپ کے ساتھ تو سائنس کے ماہرین کی ایک ٹیم ہونی چاہیے تھی۔ کسی سائنس دان کے بغیر آپ ان پانچ برسوں کے طویل سفر میں چند نقشوں کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں کرسکیں گے۔''

''آپ کی بات تو میری سمجھ میں آگئی ہے لیکن بات یہ ہے کہ آپ نے یہ بتانے میں بہت دیر کردی۔ اب تو تمام انتظامات مکمل ہوگئے۔ کوئی کمرا ایسا نہیں جس میں کسی سائنس دان کو ٹھہرایا جاسکے۔''

''آپ کو کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا ورنہ آپ کا یہ دورہ ضائع چلا جائے گا۔ آپ اپنی کالونیوں پر رعب تو جمالیں گے لیکن دنیا کے بیش قیمت ساحلوں سے معلومات اکٹھی نہیں کرسکیں گے۔ اگر سائنس دانوں کی ٹیم ساتھ نہیں لے جاسکتے تو کم از کم ایک ماہر حیاتیات جہاز پر ہونا چاہیے۔''

''مسٹر ہنسلو، ایک ہی صورت ہوسکتی ہے۔ میں اپنے کیبن کا کچھ سامان کم کرلوں اور اس شخص کو وہاں ٹھہرالوں۔ مگر ایک آدمی یہ مشکل سفر کرسکے گا۔ کوئی بھی معقول شخص ایسے چھوٹے کیبن میں اتنے عرصے تک کیسے سفر کرسکے گا؟''

''آپ فکر نہ کریں، میں اس شخص کو تیار کرلوں گا۔''

پروفیسر ہنسلو نے ڈارون سے ذکر کیا تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ کشتیوں میں سوار ہوکر سمندروں میں جاتا رہا تھا لیکن کشتیاں اتنی دور نہیں جاسکتی تھیں۔ یہ خیال ہی اسے بے چین کرنے کے لیے بہت تھا کہ وہ پوری دنیا کے گرد چکر لگائے گا اور نئے نئے ساحلوں پر نئی نئی مخلوقات کا مطالعہ کرسکے گا۔



''مشکل یہ ہے کہ تمہیں یہ تمام سفر چھوٹے سے کیبن میں کرنا پڑے گا۔ جہاز میں کوئی کمرا نہیں جہاں تم آرام سے رہ سکو۔''

''میں ہر حال میں تیار ہوں۔ بے آرامی کی مجھے پروا نہیں۔ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ میں معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کرلوں گا۔''

ڈارون تیار ہوگیا تھا۔ اب ایک مرحلہ یہ تھا کہ اس کے والد کو کیسے تیار کیا جائے کہ وہ اسے اجازت دے دیں۔ اس کے لیے ڈارون نے یہ تجویز پیش کی کہ پروفیسر ہنسلو خود اس کے والد سے ملیں۔

''میرے والد کی یہ عادت ہے کہ وہ بڑے اور باعزت لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کی بات پر عمل بھی کرتے ہیں۔ آپ میری سفارش ان سے کریں گے تو وہ ضرور مان جائیں گے۔ آپ کی موجودگی میں مجھے ڈانٹ بھی نہیں سکیں گے۔ انہیں یہ احساس بھی نہیں ہوگا کہ میں دوسرے نوجوانوں کی طرح سیر سپاٹے کے لیے نہیں جارہا ہوں بلکہ یہ ایک علمی دورہ ہے۔''

پروفیسر ہنسلو نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور مسٹر رابرٹ سے ملاقات کے لیے اسکاٹ لینڈ گئے۔ ڈارون بھی کسی سعادت مند شاگرد کی طرح ان کے ساتھ تھا۔

پروفیسر ہنسلو اس کے ملاقاتی کمرے میں بیٹھے تھے۔ ڈارون نے اپنے والد کو بتایا کہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ان سے ملاقات کے لیے آئے ہیں تو حسبِ توقع وہ تقریباً اچھل پڑے۔

''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ آدمی کو باعزت ہونا چاہیے۔ باعزت لوگ اسی وقت اس سے ملنے آتے ہیں۔ میں اگر ماہر طبیب نہ ہوتا تو پروفیسر ہنسلو مجھ سے ملنے آتے؟ تم انہیں بٹھاؤ۔ میں وہ لباس پہن کر آتا ہوں جو بڑے لوگوں کے سامنے پہن کر جانا چاہیے۔'' انہوں نے لباس تبدیل کیا اور پروفیسر ہنسلو سے ملاقات کے لیے پہنچ گئے۔

''آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ چارلس ڈارون آپ کا بیٹا ہے۔''

''یہ آپ کہہ رہے ہیں۔ آپ جیسا ذہین پروفیسر۔ اب تک تو اسے جتنے اساتذہ ملے ان کا خیال یہی تھا کہ یہ ایک نالائق طالب علم ہے۔''

''اس وقت ہوگا مگر اب نہیں ہے۔''

## منشی محمد دین فوق

**1877ء 1945ء**

کوٹلی ہرزائن ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد سیالکوٹ میں پٹوار کا کام سیکھنے لگے۔ کچھ عرصہ جموں میں ملازمت کی پھر لاہور چلے آئے۔ ابتدا میں کئی اخبارات کے ایڈیٹر رہے۔ آخر میں اپنا اخبار ''کشمیری'' جاری کیا۔ ابتدائی تعلیم کے دوران ہی شعر گوئی کی ابتدا ہوئی۔ آپ نے بہت سی تاریخی کتابیں لکھیں۔ جن میں کشمیر کی مشاہیر خواتین، یادرفتگاں، کلام فوق، نغمہ دلگزار، تاریخ کشمیر، اقوام کشمیر اور تاریخ بڈشاہی بہت مشہور ہیں۔

## فوق لدھیانوی

**14 نومبر 1914ء 30 دسمبر 1999ء**

اردو کے ممتاز غزل گو شاعر۔ اصل نام خواجہ سکندر رفیق علی تھا۔ لدھیانہ میں پیدا ہونے کی نسبت سے فوق لدھیانوی کہلائے۔ ان کے شعری مجموعوں میں زخم جاں اور متاعِ جاں شامل ہیں۔ ماہنامہ ہمسفر کے مدیرِ اعلیٰ بھی تھے۔ راولپنڈی میں انتقال کیا۔ یہیں ان کی آخری آرام گاہ ہے۔

مرسلہ: نذر حسین، راولپنڈی

''ہاں، یہ تو میں نے بھی محسوس کیا ہے۔ اس نے پادری بننے کے لیے ڈگری لے لی ہے لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ میری طرح ماہر طب ہوتا۔ خیر اس کا پادری ہونا بھی اس کے روشن مستقبل کے لیے اچھا ہی ہوگا۔''

''دراصل کوئی بھی طالب علم اس فیلڈ میں جائے تو اچھا ہوتا ہے جس میں اسے دلچسپی ہو۔''

''مجھے تعجب ہے کہ اسے پادری بننے میں دلچسپی تھی۔''

''میں اس سے بھی بڑی خوش خبری آپ کو سنانے آیا ہوں۔''

''کیا بہ حیثیت پادری اس کا تقرر ہوگیا ہے؟''

''اس سے بھی بڑی خوش خبری ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک برطانوی جہاز تحقیقاتی دورے پر روانہ ہورہا ہے۔''

''ہاں سنا تو ہے لیکن اس کا ڈارون سے کیا تعلق۔''

''اس کا تعلق یہ ہے کہ ماہرِ طبیعات کی حیثیت سے

اس کا تقرر ہوگیا ہے۔ اسے اس جہاز کے ساتھ جانا ہوگا۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے جو اسے مل رہا ہے۔"

"پروفیسر ہنسلو! اس قسم کے سیر سپاٹے نوجوانوں کو بگاڑنے کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ پھر کوئی سنجیدہ کام کرنے کے لائق نہیں رہتے۔ چارلس بھی اپنا وقت ہی برباد کرے گا۔"

"مجھے معلوم ہے آپ اپنے بیٹے کے مستقبل کی طرف سے پریشان ہیں۔ ایک باپ کو ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ دورہ اس کے مستقبل کے لیے شاندار ہوگا۔ یہ ایسے کارنامے انجام دے سکے گا کہ رہتی دنیا تک اس کا نام رہے گا۔"

اس کے بعد پروفیسر ہنسلو اس کے والد کو تنہائی میں لے گئے اور نشیب و فراز سمجھاتے ہوئے ان سے کہا۔ "آپ کا بیٹا آپ کا نہایت فرماں بردار ہے۔ وہ آپ سے اجازت لیے بغیر بھی جا سکتا تھا لیکن وہ آپ کی اجازت کا طالب ہے اور اس نے مجھے ذریعہ بنایا ہے۔ ممکن ہے یہ آپ کی اجازت کے بغیر بھی چلا جائے اس لیے بہتر ہے کہ آپ اسے اجازت دے دیں تاکہ یہ آپ کا احسان مند رہے اور تاریخ میں بھی آپ کا نام زندہ رہ جائے کہ آپ نے ڈارون کو اجازت دی تھی۔"

مسٹر رابرٹ نے بھی سوچا کہ لڑکا جوان ہوگیا ہے اگر روکنے کے باوجود چلا گیا تو وہ کیا کرلیں گے۔ انہوں نے اجازت دے دی۔

27 دسمبر 1831ء کی شام برطانوی بحریہ کا خوبصورت جہاز "بیگل" لندن سے روانہ ہوا۔ بندرگاہ پر میلے کا سماں تھا۔ الوداع کے رومال ہلنے لگے۔ ہاتھوں کے اشاروں سے بوسے دیے گئے اور جہاز نے لنگر اٹھایا۔ کسے معلوم تھا کہ ایک عظیم نظریہ ساز بھی اس جہاز پر سوار ہے۔

جہاز روانہ ہوا تو کیپٹن رائے اس کے پاس آیا۔

"جہاز میں کوئی جگہ نہیں۔ بس اپنی کتابیں لے کر کہیں بیٹھ جاؤ۔"

"مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا" ڈارون نے کہا اور کیبن میں جگہ بنا کر بیٹھ گیا۔

جب وہ ہر طرف سے مطمئن ہوگیا تو پروفیسر ہنسلو کو خط لکھنے لگا۔

"میں جو کچھ کتابوں میں پڑھتا تھا اور جو کچھ سوچتا تھا وہ ساری چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ بیگل کے سفر نے سیکھنے اور سمجھنے کے لیے میرے سامنے ایک بڑی کتاب کھول دی ہے۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ بیگل کا سفر میری زندگی کا اہم ترین سفر ہے۔ اس سے قبل میں نے چھوٹی چھوٹی جگہوں کے مشاہدات کیے تھے۔ کبھی ویلز کے ساحل پر اور کبھی ایڈنبرگ کے مضافات میں فطرت کی تعمیری و تخریبی سرگرمیوں کی کھوج لگانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اس مشق سے مجھے جو تجربہ حاصل ہوا کام آرہا ہے۔ آتے وقت میں کچھ کتابیں ساتھ لے آیا تھا۔ کچھ کتابیں تو جیالوجی کے بارے میں ہیں۔ ان میں مجھے پروفیسر لائل کی تصنیف "اصولِ ارضیات" سے بہت مدد مل رہی ہے۔ زمین اور چٹانوں کے بارے میں پروفیسر لائل کی تحقیقات بہت عمدہ ہیں۔"

"بیگل" نے پہلا پڑاؤ جنوبی امریکا کے مشرقی ساحل پر کیا۔ اب مشاہدات کا وقت آگیا تھا۔ وہ جہاز سے اترا اور اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ اس کی زیادہ دلچسپی ساحل کے ساتھ جزیروں میں تھی۔ اس کی رائے میں جزیرے بعد میں نمودار ہوئے تھے اور ان جزیروں پر پودے اور جانور "مین لینڈ" سے ہجرت کرکے آباد ہوگئے تھے۔ اس نے جزیروں کی ساخت، ماحول اور حیات میں ربط تلاش کرنے کی کوشش کی۔

فوجی اپنی موج مستی میں لگ جاتے اور ڈارون جزیرے پر گھومنے کے لیے دور تک نکل جاتا۔ اس نے جزیرے پر پائے جانے والے پودوں اور جانوروں کی مختلف انواع اکٹھی کرلیں۔ ساحل سے سمندری مخلوق کا بڑا ذخیرہ بھی اس کے ہاتھ لگ گیا۔

جب جہاز روانہ ہوا تو اس نے جہاز کے کیبن میں بیٹھ کر جزیرے کی ساخت اور ماحول کے بارے میں اپنے خیالات مرتب کیے۔

اپنا تجزیہ لکھا اور پروفیسر ہنسلو کو ارسال کردیا۔

"ڈی وردے جزیروں کی جیالوجی کا مطالعہ کرتے ہوئے میری رائے ہے کہ اس موضوع پر پروفیسر لائل نے سب سے اچھا لکھا ہے۔ میں نے اس موضوع پر جو کچھ پڑھا ہے اور جتنی کتابیں میرے پاس موجود ہیں ان سب میں پروفیسر لائل کی کتاب "اصولِ ارضیات" میری نظر میں بہترین معاون ثابت ہو رہی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ جزیرے سمندری آتش فشانی اور کورل سے مل کر وجود میں آئے ہیں۔ میری سمجھ کے مطابق "کورل" (مونگا)



جو کہ مرتے ہوئے سمندر کی تہ پر یوں بیٹھ گئے جیسے چٹائی کے اوپر دوسری چٹائی بچھا دی۔ اس طرح طویل عرصے تک جاری رہنے والی تہ داری کے نتیجے میں کورل جزیروں کی تعمیر ہوتی رہی۔ ان جزیروں کی تعمیر میں دوسرا عنصر سمندری آتش فشانی ہے۔ سمندر میں آتش فشانی کے نتیجے میں بننے والا لاوا جب کورل تہوں میں شامل ہوا تو کورل تہیں اور لاوا سفید رنگ کی زمین میں تبدیل ہوگئے۔ ان جزیروں کا کچھ حصہ سفید ہے جو کہ نیچے ہے جبکہ اوپر والا حصہ سفید کی بجائے سیاہ ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اوپر والے حصے میں لاوے کی مقدار زیادہ ہے۔ سمندر کا یہ حصہ کورل سے بھرپور ہے۔ یہاں کورل بڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ساحلِ سمندر اور جزیروں کے اطراف میں کورل چٹانیں بڑی تعداد میں دکھائی دیتی ہیں۔

"چلی" اور "ایکواڈور" میں ڈارون نے کئی دن کام کیا۔ اس نے جانوروں اور پودوں کے بارے میں مشاہدات اپنی ڈائری میں درج کیے۔

ایکواڈور سے اس نے بڑے بڑے فاسلز کھود نکالے۔ یہ بڑی بڑی ہڈیوں کے ڈھانچے تھے۔ یہ ڈھانچے قدیم جانوروں کے تھے جو بہت پہلے مر گئے تھے مگر ان قدیم نسلوں کی اولاد زندہ تھی۔ چلی اور ایکواڈر کے جنگلوں میں "سلوتھس" (دودھ پلانے والا ایک جانور جس کے پیر پنجوں کی طرح ہوتے ہیں) اور "آرمڈیلو" (ایک جانور جس پر ہڈی کا خول چڑھا ہوتا ہے) نہایت اطمینان کے ساتھ سرگرم تھیں جبکہ سلوتھس اور آرمڈیلو خود ناپید ہوگئے تھے۔

ڈارون دیکھ رہا تھا کہ قدیم ڈھانچوں اور ان کی جدید نسلوں میں کئی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ اس نے ڈھانچوں کو زمین سے نکالا، صاف کیا اور بوریوں میں ڈال کر جہاز پر لے آیا۔

آرکی پلاگو جزیروں میں ڈارون کی خصوصی دلچسپی اور توجہ کا مرکز چڑیاں اور کچھوے تھے۔ چڑیاں ایک جیسی نظر آتی تھیں لیکن ڈارون کی نظر میں سب ایک جیسی نہیں تھیں۔ اس نے اس فرق کا کھوج لگایا۔ دیکھا کہ ایک نسل کی دکھائی دینے والی چڑیوں میں فرق موجود تھا۔ ایک ایک جزیرے میں کئی کئی اقسام کے جھنڈ تھے جن میں کہیں واضح اور کہیں بہت معمولی تغیرات تھے۔ ایک واضح فرق چڑیوں کی چونچ میں تھا۔ لمبی چھوٹی اور درمیانی چونچ۔ کہیں ٹیڑھی سیدھی چونچ اور کہیں طوطے کی طرح نیچے کی طرف مڑی ہوئی چونچ۔ اس سفر میں ایک خاص بات یہ بھی نظر آئی کہ ہر جزیرے کا اپنا مخصوص حیاتیاتی رنگ تھا۔

سارے جزیرے کورل اور لاوے سے بنے تھے مگر ہر جزیرے پر کچھوؤں، کیکڑوں، پودوں اور چڑیوں کی اقسام مخصوص تھیں یعنی ایسا نہیں تھا کہ تمام جزیروں پر ایک قسم کے پودے اور پرندے مل جائیں۔ ایک جیسے ماحول میں ایک جیسی حیات کا بسیرا ہونا چاہیے مگر یہاں صورت مختلف تھی۔ حیاتیاتی اعتبار سے کوئی جزیرہ دوسرے جیسا نہیں تھا۔

وہ جب سامان سے لدا پھندا جہاز پر آتا تھا تو کیپٹن رائے اور دوسرے فوجی افسران اسے گھیر لیتے تھے اور اس کی تحقیقات کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔

نشے میں ڈولتے فوجی افسران کو اس کی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔

"مسٹر ڈارون، ایک ہی ماحول اور ایک ہی سمندر کا حصہ ہونے کے باوجود ہر جزیرہ دوسرے سے مختلف کیوں ہے۔ یہی حال ان جزیروں میں پائی جانے والی مخلوقات کا ہے؟"

کیپٹن نے اس سے پوچھا اور ڈارون نے دن بھر کی تھکن اتارنے کے لیے جام ہونٹوں سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ سمندری فاصلوں نے جزیروں کو مستقل طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ کر رکھا ہے اس لیے ہر جزیرہ اپنے باسیوں کے لیے اپنی دنیا ہے۔ جزیروں پر سرگرم و متحرک حیات ان جزیروں پر پیدا نہیں ہوئی بلکہ پرانے وقتوں میں جنوبی امریکا سے ہجرت کرکے یہاں پہنچی ہے۔ جزیروں پر مہاجر آباد ہیں۔ ان کے اجداد کی اولاد جنوبی افریقا کے ملکوں میں آباد ہے۔ ہر جزیرے پر آباد حیات کی انواع وقت کے ساتھ بدل گئی ہیں اس لیے ان میں مشابہت کا بنیادی رنگ گہرا ہے۔"

اس نے ایک اور مرتبہ گفتگو کرتے ہوئے کہا "ماحول ایک ایسی قوت ہے جو انواع کی تبدیلی میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔"

اس نے انواع کی تبدیلی کا اصول دریافت کرلیا تھا۔ اس کو بعد میں اس نے پیدائش انواع کے نظریے میں تبدیل کردیا۔

اگلے چار برسوں میں اس نے دنیا کے گرد چکر لگایا۔ بڑے سکون کے ساتھ وہ جنوبی امریکا کے ساحلوں پر کنارے کنارے چلتا رہا۔ دور دراز گلاپیگوز جزیروں پر تحقیقی کام کیا۔ بحرالکاہل کے دیگر جزیروں کی سیر کی۔ وہ بحیرہ عرب اور جنوبی بحراوقیانوس بھی گیا۔ اس طویل وقفے کے سفر میں اس نے بڑے فطری عجائبات کا مشاہدہ کیا۔ قدیم قبائل سے ملاقات کی۔

وہ اپنے مشاہدوں کو تفصیلاً لکھتا رہا اور یہ تحریریں پروفیسر ہنسلو کو بھیجتا رہا۔ پروفیسر ہنسلو یہ مقالے سائنسی انجمنوں میں پیش کرتے رہے جن پر ماہرین بحث وتنقید کرتے تھے۔ اس کے مضامین سائنسی جرائد میں بھی شائع ہوتے رہے۔

اکتوبر 1836ء میں بیگل لندن کے ساحل پر آ گیا۔

تقریباً ساڑھے چار برسوں کے دوران ڈارون نے مطلوبہ نمونے جمع کیے اور تحقیقی مقالے مرتب کیے۔ بیگل واپسی کی تیاری کر رہا تھا اور ڈارون نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا۔ یہ ''بیگل'' جہاز ہی تھا جس نے ڈارون کو نظریہ ارتقا دریافت کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس نے یہ مواقع ضائع نہیں کیا تھا چنانچہ جب یہ جہاز لندن کے ساحل پر واپس آیا تو فوجیوں کے ہاتھوں میں نقشے تھے اور ڈارون کے دماغ میں نظریہ ارتقا۔

وہ جب گیا تھا تو چند کتابیں اس کے ساتھ تھیں اور وہ چھوٹے سے کیبن میں مقید تھا۔ واپس آیا تو جہاز اس کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔

پروفیسر جان ہنسلو اس کے استقبال کے لیے ساحل پر موجود تھا۔ ڈارون جو سامان اپنے ساتھ لایا تھا وہ اتنا بیش قیمت تھا کہ کروڑوں روپے خرچ کرکے بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ڈارون نے اشیائے فطرت کے تمام نمونے پروفیسر ہنسلو کے سپرد کردیے۔

''یہ تمام نمونے کسی جگہ محفوظ کردو مگر اس طرح کہ میری دسترس میں رہیں۔ میں ان پر مزید کچھ کام کرکے دنیا کو حیران کرنا چاہتا ہوں۔''

پروفیسر ہنسلو نے یہ تمام نمونہ جات نیچرل ہسٹری میوزیم کو عطا کردیے۔ ان کے خیال کے مطابق نیچرل ہسٹری پر تحقیق کے حوالے سے یہ اشیا بہت اہم تھیں۔

ڈارون کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے جمع کردہ نمونہ جات کے قریب رہے تاکہ ان پر کام کرنے میں آسانی ہو۔ وہ دنیا کے سامنے نظریہ ارتقا پیش کرنے والا تھا۔ وہ اسے محض تخیل کا حصہ نہیں بنانا چاہتا تھا بلکہ سائنس میں تبدیلی کرنا چاہتا تھا۔ اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے ٹھوس شواہد کی تلاش میں تھا۔ اپنے نظریے کی صداقت پر اصرار کرنے سے پہلے ارتقا کے اصول دریافت کرنا چاہتا تھا جن پر اس کے نظریے کو پرکھا جائے۔ اس کا پیش رو لامارک بھی ''ارتقا'' کا قائل تھا۔ وہ اپنے موقف میں غلط نہیں تھا لیکن اپنے موقف کی وضاحت کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ڈارون یہ غلطی دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ فکر کو سائنس بنا دینا چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ تجربے کا قائل تھا۔ وہ جتنے نمونے جمع کرکے لایا تھا ان کی چھان پھٹک کے بعد اسے ثابت کرنا تھا کہ ماحول کی تبدیلی نے ان پر کیا اثرات مرتب کیے۔ ان اشیا کے بعد اسے انسان تک پہنچنا تھا۔ اسے ثابت کرنا تھا کہ انسان ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ ٹھوس شواہد کے بغیر کون مان سکتا تھا کہ موجودہ انسان بندر کی ارتقا کی شکل ہے۔ یہ الگ بات کہ اسے پھر بھی نہیں مانا گیا۔

''پست قد، لمبوتری کھوپڑی، گھوڑے جیسا منہ، چپٹی ناک، نوکیلے دانتوں اور ریچھ کے مانند جسم پر بالوں کی چادر والا بے ڈھنگا انسان ہمارا جدِامجد ہے۔''

یہ کون مانتا۔

سب سے پہلے اس نے ان پتھروں پر کام کیا جو اس نے جنوبی امریکا کے مختلف جزیروں سے اکٹھے کیے تھے۔ اس نے پروفیسر ملر سے درخواست کی کہ وہ ان پتھروں کی ساخت اور تبدیلیوں کے بارے میں تجزیہ کرنے میں اس کی علمی معاونت کرے۔

جب وہ ایک خاص نتیجے پر پہنچ گیا تھا تو یونیورسٹی کا ایک پروفیسر لائل اس کے کام سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے خیال کے مطابق ڈارون کو چاہیے کہ وہ اپنے سفر کا حاصلِ مطالعہ ایک مضمون کی صورت میں پیش کرے۔ ڈارون نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور اپنی ڈائری کے صفحات کھول کر بیٹھ گیا۔ راتیں اس کی آنکھوں میں جلتی بجھتی رہیں۔ اس نے نہایت جانفشانی سے مضمون مرتب کیا اور جیالوجیکل سوسائٹی کے ایک اجلاس میں پیش کردیا۔ اس مضمون کا بنیادی موضوع ارضی مشاہدات تھا۔ اس کے ایک سال بعد وہ کیمبرج سے لندن منتقل ہوگیا۔

لندن کی مارلبرو اسٹریٹ میں کرائے کا فلیٹ لے کر اس فلیٹ میں تقریباً بند ہوکر بیٹھ گیا۔ اس کی بیرونی سرگرمیاں کم ہوگئیں۔ اب وہ اپنے کرائے کے فلیٹ تک محدود ہوکر رہ گیا تھا۔ ماہرین اور دانشوروں سے اس کے رابطے ضرور تھے لیکن تحقیق کے سوا اب اس کا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔

اب وہ اپنے تحقیقی خاکوں کو مقالوں اور کتابوں کی صورت دینے میں مشغول تھا۔

اب وہ اس خیال پر پوری طرح متفق ہوگیا تھا کہ حیوانی اور نباتاتی انواع غیر لچک پذیر نہیں ہیں بلکہ یہ طبقات الارض کی طویل تاریخ میں طویل عرصے میں ارتقا پذیر ہوئیں۔ اسی دوران اسے تھامس مالتھس کا مقالہ ''آبادی کے قوانین پر ایک مقالہ'' پڑھنے کو ملا۔ اس مضمون کے مطالعہ سے اسے یہ اشارہ ملا کہ تنازع البقا کے نتیجے میں فطری انتخاب عمل میں آتا ہے۔ اس واضح اشارے کے باوجود اس نے اپنے نظریات کی اشاعت میں عجلت نہ برتی۔ اسے احساس تھا کہ اس نظریہ سے شدید تنازعات پیدا ہوجائیں گے لہٰذا اس نے ایک طویل عرصہ احتیاط سے شواہد اکٹھے کرنے اور اپنے مفروضے کے حق میں دلائل کو ترتیب دینے میں صرف کیا۔

جب تک وہ سفر میں تھا اس کا طریقہ کار یہ رہا تھا کہ وہ زیرِمطالعہ موضوع کا ایک خاکہ تیار کرلیتا تھا۔ اس سے متعلق پرندے، کیکڑے، پودے اور پتھروں کے نمونے جمع کرلیتا تھا۔ وہ ابتدائی طور پر معلومات کو ایک خاکے کی صورت میں ترتیب دیتا اور پھر اس میں تفصیلات شامل کرکے مقالہ یا پھر کتاب کی صورت مرتب کردیتا۔

دو برس تک گھر میں بیٹھ کر وہ یہی کرتا رہا تھا۔ اس دوران اس نے اپنے سفری مشاہدات کیے۔ سائنسی انجمنوں میں تحقیقی مقالے بحث وتنقید کے لیے پیش کیے۔

اب اسے معروف ومتنازع سائنس داں تسلیم کیا جارہا تھا۔

ڈارون کے والد مسٹر رابرٹ ابھی تک اسے راستے سے بھٹکا ہوا لڑکا کہتے تھے۔ ایک ایسا آدمی تصور کرتے تھے جسے سب مل کر بےوقوف بنا رہے ہوں۔ جس کا نام تو بہت ہوگیا ہے لیکن آمدنی کے ذرائع محدود ہیں۔ وہ ایک متنازع شخص بن کر رہ گیا ہے۔ وہ اب بھی اس آرزو کا اظہار کرتے رہتے تھے کہ کاش وہ ایک اچھا طبیب بن گیا ہوتا۔ وہ اسے راہِ راست پر لانے کے لیے تمام حربے استعمال کرتے رہے تھے۔ اب ایک ہی حربہ باقی رہ گیا تھا کہ اس کی شادی کردی جائے لیکن اس بے روزگار آدمی کو بیٹی دے گا کون؟ یہ سوال سامنے آیا تو وہ اس کے سوا کیا کرسکتے تھے کہ وقت کا انتظار کریں۔ انہوں نے ڈارون سے یہ کہا ضرور۔

''اگر تم نے کوئی اچھی نوکری کرلی ہوتی تو میں کہیں بھی تمہارا رشتہ لے کر جاسکتا تھا۔''

''آپ فکرمند نہ ہوں۔ مجھے کوئی اچھی سی نوکری مل جائے تو کہیں شادی کرا دیا ورنہ کوئی ضروری بھی نہیں۔''

''تمہیں نوکری کون دے گا۔ میں تو تمہاری شادی کا ارمان لے کر ہی موت کی نیند سو جاؤں گا۔ کیا تم میرے کہنے سے پادری نہیں بن سکتے؟''

''ڈیڈی، میں ایک تحقیق میں مشغول ہوں۔ اس کے بعد میں پادری بن کر بھی دیکھ لوں گا۔''

مسٹر رابرٹ نے اسے ایک موقع اور دے دیا۔

وہ لندن واپس آ گیا اور پھر سے مارلبرو والے فلیٹ میں بند ہوگیا۔ وہ اپنی ایک کتاب Journal of reserches مرتب کر رہا تھا۔ اس کتاب میں اس نے پانچ سالہ سفر کے دوران پیش آنے والے مختلف واقعات بیان کیے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے تحقیقی موضوعات کا اجمالی جائزہ بھی اس میں شامل کرنا تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ اس دوران کوئی اس سے ملنے نہ آئے لیکن ایک روز اس کے دروازے پر اجنبی دستک ہوئی۔ اس نے بے دلی سے دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے اس کی کزن ایما ویج وڈ کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر پریشان ہوگیا تھا۔ اسی لیے ایما ویج وڈ کو کہنا پڑا۔ ''چارلی، کیا تم مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، یہ تمہارا ہی تو گھر ہے۔ گھر کی حالت تمہارے شایانِ شان نہیں تھی اس لیے پریشان ہوگیا تھا۔''

''مجھے معلوم ہے سائنس دانوں کے گھروں کی حالت کیا ہوتی ہے۔'' ایما نے کہا اور اندر چلی آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ڈارون بھی آ گیا۔

فلیٹ میں ہر طرف کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ ایک طرف چائے کے برتن پڑے تھے جو شاید کئی دن سے ایک جگہ پر تھے۔ شب خوابی کا لباس چارپائی پر تھا۔ زمین پر ایک گدا پڑا ہوا تھا جس پر بچھی ہوئی چادر بے ترتیب تھی۔

''اُفوہ، چارلی تم تو بہت ہی بے ڈھنگے ہو۔''

''لاؤ یہ چائے کے برتن اٹھا کر کچن میں رکھ دوں۔

اس کے بعد تمہارے بیٹھنے کے لیے جگہ ہو جائے گی۔ یا ایسا کرو اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"

ایما گھوم پھر کر اس کے چھوٹے سے فلیٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔

"فلیٹ اچھا ہے اگر اس میں کوئی عورت ہو جو اسے صاف ستھرا رکھ سکے۔ چارلی تم کوئی ملازمہ کیوں نہیں رکھ لیتے۔"

"وہ نکمّی میری کتابوں کو اٹھا کر اِدھر اُدھر رکھ دے گی اور یہ مجھے برداشت نہیں ہوگا۔"

"تمہیں اب شادی کر لینی چاہیے۔ ایسی بیوی گھر میں ہو جو تمہیں بھی سنبھال کر رکھے اور تمہاری کتابوں کو بھی۔"

"یہ بتاؤ تم کتنے دن کے لیے آئی ہو۔"

'گھبراؤ مت' میں لندن گھومنے آئی ہوں اور ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں البتہ جب تک ہوں تمہارے ساتھ گھومنا اچھا لگے گا۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ میرے پاس اتنا وقت ہے؟"

"تم جس انداز سے زندگی گزارتے ہو میں بچپن سے دیکھتی آ رہی ہوں۔ مجھے کچھ بھی برا نہیں لگے گا۔ اگر تم میرے ساتھ باہر نہیں جاسکو گے تو میں یہیں تمہارے سامنے بیٹھ کر وقت گزار لیا کروں گی۔ سمجھوں گی میں لندن تم سے ملنے آئی تھی۔"

"اب میں اتنا بھی بے مروت نہیں ہوں۔ کہو کہاں چلنا ہے۔"

"آج رات ہم کسی نائب کلب میں چلیں گے۔"

ایما نے اس کے فلیٹ کی صفائی کی۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کافی پی اور پھر وہ رات کا کہہ کر چلی گئی۔ ان دونوں کو نائٹ کلب چلنا تھا۔

ڈارون کو یہ سب اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ ایما کی طرف سے آنکھیں بھی نہیں پھیر سکتا تھا۔ وہ پھر سے لکھنے بیٹھ گیا تاکہ وہ ایما کے دوبارہ آنے سے پہلے جتنا کام کر سکتا ہے کر لے۔

وہ شام تک لکھتا رہا اور پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد زمین پر پڑے ہوئے گدے پر لیٹ گیا۔ اس نے پوری طرح کمر سیدھی بھی نہیں کی تھی کہ ڈور بیل نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ایما اسے لینے آئی تھی۔ "چارلی تم تیار نہیں ہوئے۔"

"تم نے تو نائٹ کلب چلنے کو کہا تھا۔"

"کچھ دیر بازاروں میں آوارہ گردی کریں گے۔ کسی جگہ اچھا سا کھانا کھائیں گے۔ اس وقت تک نائٹ کلب چلنے کا وقت ہو چکا ہوگا۔"

"ایما، تم دیکھ رہی ہو ان بے کار کاموں کے لیے میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم اپنا کام کر لو' ہم ڈائریکٹ نائٹ کلب چلیں گے۔"

"نہیں میں تمہیں یہ سزا نہیں دے سکتا کہ میں کام کرتا رہوں اور تم بیٹھی رہو۔ میں لباس تبدیل کر لوں۔ ہم ابھی چلیں گے۔"

لباس تبدیل کرتے وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی سخت بات سننے کے بعد بھی ایما نے کسی خفگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ کتنی اچھی ہے۔ مجھے اس کے لیے وقت نکالنا چاہیے۔ کام تو ہوتا ہی رہے گا۔

وہ تیار ہو کر نکلا اور ایما کے ساتھ باہر نکل گیا۔

بازار میں گھومتے ہوئے ایما نے محسوس کیا کہ اکثر لوگ ڈارون کو جانتے ہیں۔ اسے لوگ غور سے دیکھ رہے ہیں۔ کئی لوگوں نے آ کر اس سے ہاتھ بھی ملایا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ پر کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو ویٹر ڈارون کو جانتا تھا۔

"چارلی تم تو یہاں بہت مشہور ہو گئے ہو۔"

"اگر ویٹر مجھے پہچان گیا ہے تو تم اسے مشہور ہونا کہتی ہو۔"

"مجھے یقین ہے کہ پڑھے لکھے طبقے میں تمہاری اور بھی عزت ہوتی ہوگی۔"

"اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو ڈیڈی کو بھی سمجھاؤ۔ وہ مجھے اب تک نکما اور نالائق ہی سمجھتے ہیں۔"

"میں انہیں ضرور بتاؤں گی کہ آپ کا بیٹا عنقریب کوئی کارنامہ انجام دینے والا ہے۔"

ریسٹورنٹ سے نکل کر وہ دونوں نائٹ کلب گئے۔ کچھ دیر وہاں گزارنے کے بعد باہر نکلے۔ رات گہری ہو گئی تھی اور غضب یہ ہوا کہ بارش بھی شروع ہو گئی۔ ان کے پاس کوئی سواری تو تھی نہیں۔ بارش میں کھڑے بھیگ رہے تھے کہ پروفیسر ہنسلو فرشتہ بن کر آ گئے' وہ بھی کلب آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ڈارون کو ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا تو گاڑی روک لی۔



"ڈارون، یہاں کھڑے کیا بھیگ رہے ہو۔ جلدی گاڑی میں بیٹھو۔" وہ ایما کو لے کر ان کی کار میں بیٹھ گیا۔

"یہ میری کزن ایما ہے۔" ڈارون نے تعارف کرایا۔

"ایما تمہارا شکریہ" پروفیسر ہنسلو نے کہا۔ "تم نے اس قیدی کو پنجرے سے نکالا اور نائٹ کلب تک لے آئیں۔"

اب اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اسے اس کے ہوٹل تک چھوڑتا۔ وہ اسے لے کر اپنے فلیٹ پر آ گیا۔ کچھ دیر کے لیے پروفیسر ہنسلو بھی ان کی محفل میں شریک ہو گئے۔ وہ رات ایما نے ڈارون کے بے ترتیب فلیٹ میں گزاری۔ صبح ہوئی تو وہ اسے کیمبرج میوزیم دکھانے لے گیا جہاں وہ اشیا رکھی ہوئی تھیں جو وہ مختلف ساحلوں سے جمع کر کے لایا تھا۔ ایما یہ سب چیزیں دیکھتی جا رہی تھی اور اس کی محنت کی داد دے رہی تھی۔ یونیورسٹی میں جو اس کی عزت ہو رہی تھی وہ اسے بھی بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔

صرف دو دن اس نے ڈارون کے ساتھ گزارے تھے کہ وہ اس سے بے حد متاثر ہو گئی۔ ڈارون کی تنہائی دیکھ کر کڑھتی بھی تھی۔ وہ سوچنے لگی تھی کہ اگر ڈارون شادی کر لے اور اسے کوئی معقول عورت مل جائے تو ڈارون کو کام کرنے میں کتنی آسانی ہو جائے۔ بالآخر اس نے ڈارون کو کریدنے کے لیے پوچھ ہی لیا۔

"چارلی، شادی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔"

"بقائے نسل انسانی کے لیے شادی بہت ضروری ہے۔"

"اگر تمہیں شادی کرنی پڑ جائے؟"

"میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں کوئی لڑکی میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی۔ کسی کو ناخوش کرنا کون سی عقل مندی ہے۔"

"اگر کوئی ایسی لڑکی مل جائے جو تمہاری بے ترتیب زندگی سمیت تمہیں قبول کر لے؟"

"پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

رابرٹ نے یہ کہتے ہوئے اچانک اس کی طرف دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ اپنے لیے بات کر رہی ہو۔ اس کے چہرے پر وہی شرم تھی جو ایسی باتیں سنتے یا کہتے ہوئے لڑکیوں کے چہرے پر ہوتی ہے۔ رابرٹ نے اس وقت کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا بلکہ ایک لمحے کو یہ سوچنے لگا کہ اگر ایسا ہو جائے تو کیا برائی ہے۔ ایما اسے کبھی اتنی اچھی نہیں لگی تھی جیسی اس وقت لگ رہی تھی۔

اس کے بعد وہ اس کے ساتھ گھومنے نکلا تو اس نے غیر ارادی طورر پر ایما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایما نے اس تبدیلی کو محسوس ضرور کیا لیکن اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

"چارلی، تم بہت ترقی کرو گے، اگر تمہیں ذہنی سکون مل جائے۔ یہ سکون تمہیں شادی کے بغیر نہیں مل سکتا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو ایما۔ اب مجھے کچھ سوچنا ہوگا۔"

ایما کے چلے جانے کے بعد وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایما اس میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اس نے اپنے بارے میں سوچا تو وہاں سے بھی جواب "ہاں" میں آیا۔

وہ اپنی طرف سے کوئی بات کر کے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو ایما پھر مجھ سے ملاقات کرے گی۔

وہ تو نہیں آئی لیکن خلافِ توقع ایما کے والد مسٹر جوشوا وڈ ویج اس سے ملاقات کے لیے آئے اور ایما کا پیغام اسے پہنچایا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔

"آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ میں ایک بے روزگار آدمی ہوں۔"

"اس کے باوجود ایما تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔"

"پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے آپ کو میرے والد سے بات کرنی چاہیے۔"

"ان سے بھی بات کر لوں گا اس وقت تو مجھے تمہاری رضامندی درکار تھی۔"

ڈارون شادی کے لیے تیار تھا تو اس کے والد کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو خود یہی چاہتے تھے کہ ڈارون شادی کر لے۔ چند بڑوں کے درمیان نہایت سادگی سے اس کی شادی ایما سے ہو گئی۔

ایما اس کے مزاج سے واقف تھی اور پھر اس نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی لہٰذا اسے ڈارون سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اس نے آتے ہی ڈارون کو بھی سنبھال لیا اور اس کے بکھرے ہوئے گھر کو بھی۔ وہ اس کی بہترین مددگار ثابت ہوئی۔

بیگل جہاز سے واپسی کے بعد ڈارون کی زندگی میں تحقیق کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ایما کے آجانے کے بعد زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا تو تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے متعدد تحقیقی مقالے لکھے اور سائنسی وادبی انجمنوں میں بحث وتنقید کے لیے پیش کیے۔ لیکن اسے جلد ہی یہ احساس ہوگیا کہ کسی بڑی تحقیق کے لیے یہ چھوٹا سا فلیٹ موزوں نہیں۔ ایک بیٹا پیدا ہوگیا تھا۔ اس کی آوازیں فلیٹ میں گونجتی رہتی تھیں۔ ملاقاتوں کا سلسلہ بھی بڑھ گیا تھا۔ پورا فلیٹ سامان سے اٹا پڑا تھا۔ مہمانوں کو بٹھانے تک کی جگہ نہیں تھی۔ اس نے اہم موضوعات پر کام شروع کر رکھا تھا جس میں پیدائش انواع Origin of species جیسی اہم ترین کتاب بھی شامل تھی مگر وہ صرف تحقیقی مقالے مرتب کرسکا۔ ایما اس کی بے بسی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اگر اس کے شوہر کو پُرسکون رہائش گاہ نہیں ملی تو بہت سے خیالات کاغذ پر منتقل ہونے سے پہلے ہی دم توڑ جائیں گے۔ اس نے ڈارون کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی رہائش تبدیل کرلے۔ ڈارون نے اس کی تجویز پر عمل کیا اور مارلبرو اسٹریٹ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے لندن کے مضافاتی قصبے ڈاون میں ایک اچھا سا گھر خرید لیا۔ یہ نہایت پُرسکون جگہ تھی۔ شور کی بجائے خاموشی اور مختلف انواع کے پودوں سے سجا ہوا یہ گھر ڈارون کو اچھا لگا۔ اس گھر میں منتقل ہوتے ہی اس کا تحقیقی کام مناسب طور پر توازن میں آگیا۔

یہاں رہ کر اس نے بڑے معرکے کے مقالے تحریر کیے۔ دانش وروں، سائنس دانوں اور نوجوانوں میں اس کے مقالوں کی مانگ بڑھتی رہی۔ نہ صرف برطانیہ بلکہ پورے یورپ میں علم دوست حلقہ زندگی وارتقا کے بارے میں ڈارون کے سائنسی نقطہ نظر کو پسند کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اس کی کتاب جرنل آف تحقیقات فرانسیسی وجرمن زبان میں ترجمہ ہوئی اور بڑی تعداد میں فروخت ہوئی۔ امریکا میں خاص طور پر پذیرائی ملی۔

ان کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے اس کی ہمت ہوئی کہ وہ اس کتاب پر کام شروع کردے جس کا آغاز اس نے مالبرو اسٹریٹ کے فلیٹ میں کیا تھا لیکن وہاں کی پُرشور زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ کام ادھورا چھوڑنا پڑا تھا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کتاب کی اشاعت سے زبردست تنازع اٹھ کھڑا ہوگا۔ مذہبی طبقہ زبردست طریقے سے اس کے خلاف ہوجائے گا۔ اس لیے ازحد احتیاط کی ضرورت تھی۔

ذرا سی عجلت کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ اسے ایسے مضبوط دلائل تلاش کرنے تھے جن کا جواب اس کے مخالفوں کے پاس نہ ہو۔ اس نے ان دلائل کی ترتیب میں دس سال لگا دیے۔ وہ اب جس قصبے میں رہائش پذیر تھا وہاں کی پُرسکون زندگی اس کا پوری طرح ساتھ دے رہی تھی۔

جب وہ اپنی عظیم کتاب "پیدائش انواع" مکمل کرنے اور ضروری ترامیم اور اضافوں کے بعد منظرِ عام پر لانے ہی والا تھا کہ اسے ایک انگریز ماہر طبیعیات الفرڈ رسل ویلاس کا ایک خط موصول ہوا۔ اس میں ویلاس نے اپنے نقطۂ نظر (ارتقا کے بارے میں) سے ڈارون کو آگاہ کیا تھا۔ ہر اعتبار سے ویلاس کا نقطہ نظر ڈارون سے مختلف نہیں تھا۔ ویلاس نے اپنا نظریہ کلیتاً آزادانہ طور پر وضع کیا تھا اور مسودے کو اشاعت سے ہمکنار کرنے سے پہلے ایک معتبر سائنس دان کی حیثیت سے اس کی رائے لینے کے لیے ڈارون کے پاس بھیجا تھا۔ یہ طویل خط پڑھ کر ڈارون کے ہوش اُڑ گئے۔ یہ ایک پریشان کن صورتِ حال تھی۔ یہ جھگڑا کھڑا ہوسکتا تھا کہ اس نظریے تک پہنچنے میں پہل کس نے کی۔

ویلاس کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ وہ ماہرِ حیاتیات تھا جس نے ڈارون کی طرح اپنی زندگی ارتقا کے اصولوں کی کھوج کے لیے وقف کردی تھی۔ جب ڈارون بیگل نامی جہاز پر سمندری سفر کے لیے روانہ ہوا، ویلاس مشرق بعید کی جانب نکل گیا۔ دونوں نے اپنے طور پر ارتقا کے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور ایک ہی نتیجے پر پہنچے۔

ڈارون نے ویلاس کے مقالے اور ڈارون کی کتاب کے خاکے کو ایک مشترکہ مضمون کی صورت میں ایک سائنسی تنظیم کے رُوبرو پیش کردیا۔ سوسائٹی کے اجلاس میں دونوں مقالے پڑھے گئے اور ان پر بحث وتنقید ہوئی۔ اجلاس میں دونوں مقالوں پر بحث ہوئی اور اکثریتی رائے ڈارون کے حق میں آئی جبکہ کچھ دانش وروں نے ویلاس کو ڈارون کا ہم پلہ قرار دیا اور یہ رائے دی کہ دونوں کو نظریہ ارتقا کے بانیوں کی حیثیت دی جائے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے ویلاس کو ڈارون پر ترجیح دی۔ بات تو وہاں پیچیدہ ہوگئی جب کچھ دانشوروں نے ڈارون کی بجائے ویلاس کو نظریہ ارتقا کا بانی قرار دیے جانے پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ ویلاس پہلا سائنس داں ہے جس نے نظریہ ارتقا کا اصول دریافت کیا۔ کچھ لوگوں نے سارا معاملہ ہی تربتر کردیا۔ انہوں نے کہا کہ اولیت کا سہرا نہ تو ڈارون



کے سر باندھا جاسکتا ہے نہ ویلاس کے سر۔ ان سے پہلے تو لامارک اسی نظریے کو دریافت کرچکا۔ سائنس سوسائٹی اس مسئلے پر تین دھڑوں میں تقسیم ہوگئی لہٰذا کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ عوامی حلقوں میں اس کی کوئی خاص بازگشت سنائی نہیں دی۔ ڈارون کا خیال تھا کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔

وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ڈنر کی میز پر بیٹھا تھا اور بہت دن بعد یہ موقع اسے مل سکا تھا۔ اس لیے سب خوش تھے لیکن ڈارون اداس نظر آرہا تھا۔ اس اداسی کو دور کرنے کے لیے ایما نے اس کے مقالے کا ذکر چھیڑ دیا۔

"چارلی، کیا تم یہ سمجھنے لگے ہو کہ تمہارے مقالے پر بحث کرنے والے تم سے زیادہ لائق ہیں؟"

"میں ایسا کیوں سمجھنے لگا۔ کیونکہ میں نے اب تک کی پوری زندگی اس نظریے کی کھوج میں لگائی ہے۔ اتنی محنت کسی نے نہیں کی۔ میں نے جو کچھ تحریر کیا ہے میں اس کا عینی شاہد ہوں۔"

"یہ دعویٰ تو ویلاس بھی کرسکتا ہے۔"

"بے شک! لیکن وہ اپنے موقف کی اس طرح وضاحت نہ کرسکا جس طرح میں نے کیا ہے۔ اس لیے اب یہ بحث نہیں ہونا چاہیے کہ پہل کس نے کی بلکہ بحث یہ ہونی چاہیے کہ ٹھوس دلائل کس کے پاس ہیں۔ سوسائٹی نے اس پر غور نہیں کیا۔"

"چارلی، تم اتنے مایوس کیوں ہو۔ اگر تمہیں خود پر اتنا ہی یقین ہے تو اپنے مقالے کو کتابی صورت میں سب کے سامنے لے آؤ۔ دیکھو عوام اور دوسرے سائنس داں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔"

ڈارون کھانا چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

"ایما تم مجھ سے بڑی سائنس داں ہو۔ مجھے اپنا کیس عوامی عدالت میں لے کر جانا چاہیے۔ تم کتنی ذہین ہو۔"

اس دن کے بعد سے ڈارون اپنی معرکۃ الآرا کتاب پیدائش انواع Origin of Species مرتب کرنے میں مشغول ہوگیا۔ 1859 میں اس کی یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اس نے ارتقائی اصولوں پر تفصیل سے بحث کی تھی۔

اس کتاب نے ایک انقلاب برپا کردیا۔ سائنسی موضوعات پر چھپنے والی کسی بھی کتاب کی نسبت اس کتاب کو زیادہ بڑے طبقے نے نہایت جوش وجذبے کے ساتھ موضوعِ بحث بنایا۔ ان لوگوں میں عوام بھی تھے اور سائنس داں بھی۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے قدامت پسند رجحان رکھنے والے سائنس داں ڈارون کے خلاف سرگرم ہوگئے۔ ان لوگوں کے پاس ڈارون کے نظریات کو غلط ثابت کرنے کے لیے زیادہ دلائل نہیں تھے لہٰذا انہوں نے یہی ضروری سمجھا کہ ڈارون کی اہمیت کو کم کیا جائے۔ اس کے مقابلے میں ویلاس کو پہلا نظریہ ساز ثابت کرنے کے لیے کوششیں کی جانے لگیں۔ وہ شاید اس کوشش میں کامیاب ہو بھی جاتے لیکن ویلاس کے ایک خط نے ان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ اس نے اس خط کے ذریعے ڈارون کا موقف درست اور مناسب ترین تسلیم کرلیا۔ اس کے بعد یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جانا چاہیے تھا لیکن رجعت پسند سرگرم رہے۔

ارتقائی عمل کا مطالعہ کرنے کے لیے ڈارون نے چار اصول وضع کیے تھے۔ نیچرل ہسٹری میں کسی بھی منتخب موضوع کا مطالعہ کرنے کے لیے ڈارون کے اصول اوزاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ بحران ممکن ہے ٹل جاتا اور ڈارون کی جان چھوٹ جاتی لیکن اس نے اپنے لیے گڑھا خود کھود لیا۔ اس کی ایک کتاب "پیدائش آدم" Descent of man شائع ہوئی۔ کہا جاتا ہے اس کتاب پر اس نے تیس برس تک کام کیا تھا۔ اس میں اس نے کہا "دورِ حاضر کے جدید انسان اور بن مانسوں کے آباؤ اجداد کی تلاش میں نکلیں تو ہم قدیم بن مانس ڈرائیو وپتھی کس تک پہنچ جاتے ہیں جس کی نسل تقریباً ڈیڑھ کروڑ برس قبل ناپید ہوگئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں ڈارون نے کہہ دیا کہ انسان کا ارتقا بندر نما مخلوق سے ہوا۔ "زندہ بن مانسوں اور انسان کے مشترکہ آباؤ اجداد "ڈرائیو وپتھی کس" بن مانس ہیں" (ڈارون)

ڈارون کے مطابق جب یہ نسل معدوم ہوئی تو اس کی مختلف شاخیں یا انواع زمین پر بسی رہیں۔ انہی میں ایک نسل "آسٹرالوپتھی کس" تھی جسے ڈارون پہلا انسان نما کہتا ہے۔ اس کے مطابق آسٹرالوپتھی کس دو ٹانگوں پر سیدھا چلنے والا انسان نما تھا۔ اس کے کولھوں کی ہڈیاں ایسی ترتیب میں آچکی تھیں کہ اسے سیدھا چلنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔"

اس نے یہ نظریہ پیش کیا تو ایک بھونچال آگیا۔ یورپ کے پادری اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے خلاف فتوے آنے لگے۔ پوری تیاری کی جانے لگی کہ کلیسا کی عدالت سے اسے سزا سنائی جائے جس طرح گلیلیو کو سزائے موت سنائی گئی تھی لیکن چارلس خوش قسمت تھا۔ اب

زمانہ بدل چکا تھا۔ جاگیرداری کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ رجعت پسندی کی حامی معاشرتی قوتیں ناکامی سے دوچار ہورہی تھیں۔ ترقی پسندوں کا طبقہ سامنے آچکا تھا جو ڈارون کے نظریہ ارتقا کے دفاع کے لیے سامنے آگیا۔ مزدور، تاجر اور صنعت کار موثر قوتیں بن چکے تھے لہٰذا پادری کے اختیار میں نہیں رہا تھا کہ پھانسی کا پھندا ڈارون کے گلے میں ڈال دے۔ ڈارون کے دوستوں میں پروفیسر، سائنسداں اور سماجی دانشور شامل تھے۔

پادریوں کی ہنگامہ آرائی جاری رہی۔ جگہ جگہ مباحثے ہونے لگے۔ ان مباحثوں میں اس کے خلاف تقاریر ہونے لگیں اور ڈارون پر زور دیا جانے لگا کہ وہ اپنے اس نظریے سے تائب ہوجائے لیکن عجب بات ہے کہ ڈارون نے ان مباحث میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس کی صحت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے اپنے دوستوں پر بھروسا تھا کہ وہ اس کے نظریات کا پرچار کریں گے۔ خصوصاً اپنے دوست تھامس ایچ ہکسلے پر اسے ناز تھا کہ ہکسلے جیسا مشاق مناظرہ باز اس کے محافظ کے طور پر موجود ہے چنانچہ جب آکسفورڈ یونیورسٹی میں مباحثہ ہوا اور اس میں بشپ سموئیل نے ڈارون کے لیے یہ الفاظ ادا کیے۔

"ڈارون کہتا ہے انسان بندر کی ترقی یافتہ نسل ہے اس طرح وہ ملحد ہماری توہین کررہا ہے۔ خدا کرے ڈارون کی بات سمجھ میں نہ آئے۔"

تو ہکسلے سامنے آیا۔

"یہ ڈارون کا موقف نہیں جو بشپ بیان کررہے ہیں بلکہ یہ نظریہ ارتقا کے خلاف پروپیگنڈا ہے۔" لیکن ہجوم کو پادری کی بات آسانی سے سمجھ میں آگئی۔ ہکسلے کو شکست ہوئی۔

پادری اپنی بات کہتے رہے۔

"پیدائشِ آدم کے بارے میں ڈارون کا نقطۂ نظر مذہبی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں ڈارون غلط ہے۔ ہم ارتقا کو نہیں مانتے۔"

آکسفورڈ یونیورسٹی میں مباحثے ہوتے رہے۔ پادری اپنی بات کہتے رہے۔ ہکسلے وضاحتیں پیش کرتا رہا۔ وہ ڈارون کا دفاع کرتے ہوئے اتنا بدنام ہوا کہ "ڈارون کا کتا" کہلایا جانے لگا۔

اس بحث و تکرار کے سلسلے میں جب وہ معاملہ علمی حلقوں تک پہنچا تو صورتِ حال بدل گئی۔ فیصلہ ڈارون کے حق میں ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پادریوں میں بھی پھوٹ پڑ گئی۔ ایک گروہ اپنے پرانے موقف پر قائم رہا۔ دوسرے گروہ نے اتنی رعایت کردی کہ اس کے نظریے کو تسلیم کرلیا لیکن ڈارون کو غلط قرار دے دیا۔

"بائبل ارتقا کو تسلیم کرتی ہے۔ ارتقا غلط نہیں ڈارون غلط ہے۔ ارتقا کے بارے میں ساری تفصیل بائبل میں موجود ہے۔ اس لیے ڈارون کا موقف درست نہیں۔"

اس موقف کا فائدہ یہ ہوا کہ مذہبی افراد نے سائنس کو تسلیم کرلیا، کیونکہ پادریوں نے ارتقا کے بارے میں سائنس کو تسلیم کرلیا سائنس کی تشریح مذہبی بنیادوں پر ہونے لگی۔

ڈارون نے اپنے نظریہ کی تشکیل علم خلق (Geneties) سے استفادہ کے بغیر کی کیونکہ ڈارون کے دور میں کوئی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ کس کس عجیب طریقے سے خاص اوصاف ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے ہیں۔

انسانی فکر پر ڈارون کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ خالصتاً سائنسی نقطہ نگاہ سے اس نے حیاتیات کے علم میں انقلاب برپا کردیا۔ اس کے نظریے نے علم آثار قدیمہ، عمرانیات، سیاسیات اور معاشیات پر بھی اثرات چھوڑے۔

ایک لادینی سطح پر بھی ڈارون کے نظریات نے دنیا کے متعلق انسانی نقطہ نظر میں عظیم تغیرات برپا کیے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ڈارون کے نظریات کی قبولیت سے مراد مذہبی عقائد کی بے حرمتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے نظریے نے سائنس دانوں کے لیے بہت سی راہیں کھول دیں۔ خصوصاً علم آثار قدیمہ میں اس سے بہت مدد ملی اور سماجی تبدیلیوں کے لیے راہ ہموار ہوئی۔

اس متنازع سائنس داں کی وفات 1882ء میں ہوئی۔ اس وقت تک اہم سائنس دانوں کی اکثریت ڈارون کے نظریات کی درستی پر ایمان لاچکی تھی۔

یہ بات اب بھی عوام کو قبول نہیں کہ انسان کبھی انسان نما بندر تھا۔ ڈارون کے پیش کردہ ثبوتوں کو چرچ نے ماننے سے انکار کردیا اس لیے عام لوگ بھی ان ثبوتوں کو جھوٹ کا پلندا قرار دے کر خاموش ہوگئے۔

**ماخذات**

چارلس ڈارون، پروفیسر طفیل ڈھانہ
سو عظیم آدمی، مترجم: عاصم بٹ۔



# تاریخِ عکس

مریم کے خان

عکاسی ایک فن کا درجہ رکھتا ہے لیکن اس فن نے کس طرح ترقی کے مدارج طے کیے یہ جاننے کے لائق ہے۔ تصویر کشی جو کبھی مصوری تک محدود تھی اس نے علمِ کیمیا کے سہارے فوٹو گرافی کا زینہ طے کیا۔

**صاحب علم کے لیے ایک معلومات بھری تحریر**

انسان نے سب سے پہلے اپنی صورت یقیناً پانی کے کسی شفاف اور ٹھہرے ہوئے تالاب میں دیکھی گی اپنا عکس دیکھ کر وہ شروع میں ڈرا ہوگا اور اسے دشمن تصور کیا ہوگا لیکن رفتہ رفتہ وہ جان گیا کہ پانی میں نظر آنے والا دوسرا انسان حقیقت میں وہ خود ہے اور یہ اس کا عکس ہے۔ ابتدائی دور کے سادہ انسان کا ذہن پیچیدگیوں سے پاک تھا اور وہ سامنے نظر آنے والی چیز کو من و عن قبول کرلیتا تھا۔ وہ یہ نہیں سوچتا تھا کہ چیز کیوں ہے اور کس وجہ سے ہے؟ پھر انسان

نے تمدن کی طرف قدم بڑھائے۔ شہر بسائے اور زندگی گزارنے کے نئے ڈھنگ سیکھے، نئی نئی چیزیں دریافت کیں اور ایجاد کیں۔ ان میں سے ایک ایجاد آئینہ تھا۔ جو عکس پانی میں کسی قدر دھندلا اور مشکل سے نظر آتا تھا وہی آئینے میں نہایت واضح اور آسانی سے نظر آنے لگا۔ یقیناً آئینہ اس وقت ایک حیران کن ایجاد ہوگا۔

انسان نے مزید ترقی کی اور یہ دریافت کیا کہ پانی اور آئینے میں نظر آنے والا عکس اصل میں روشنی کا انعکاس ہے۔ تاریکی میں یہ عکس نظر نہیں آتا.... اور جب کسی چیز پر روشنی پڑتی ہے تو اس کا عکس آئینے میں نظر آتا ہے، بے شک آئینہ مکمل تاریکی میں رکھا ہو۔ اس سائنسی دریافت سے انسان نے عملی طور پر کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اپنا اور دوسری چیزوں کا عکس محفوظ کرنے کے لیے انسان نے مصوری کا سہارا لیا۔ رنگوں کی مدد سے وہ چٹانوں، دیواروں اور دوسری اشیا پر تصویریں بنانے لگا۔ جب تک کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا انسان کھال، کپڑے اور مٹی کی تختیوں پر مصوری کے نمونے بناتا رہا تھا۔ کوئی پانچ ہزار سال پہلے جب انسان متمدن ہو رہا تھا تب ہی اس نے رنگوں سے کھیلنا بھی شروع کیا تھا۔

مگر مصوری کرتے ہوئے انسان کے ذہن میں ہمیشہ یہ رہا کہ وہ اصل کی مکمل نقل نہیں کر پا رہا ہے۔ کسی شخص یا منظر کو بالکل اسی طرح کینوس پر منتقل کرنا کسی ماہر ترین مصور کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ بہت سارے خوابوں کی طرح عکس کو مکمل طور پر منتقل کرنا بھی انسان کا پرانا خواب تھا۔ اس کا ثبوت ہمیں اس دور کی کہانیوں میں ملتا ہے جب انسان اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے الفاظ کا سہارا لیتا تھا۔ ان کہانیوں میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو آج ہمارے روزمرہ کے استعمال میں ہیں لیکن اس وقت انہیں ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ آج ہم جو ناممکن سمجھتے ہیں اسے فکشن کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے آنے والے دور میں یہ بھی اسی طرح سچ ہو جائے جیسے آج ہوائی جہاز، ٹی وی اور وائرلیس سے کام کرنے والے مواصلاتی آلات ہیں۔ آج سے کئی سو سال پہلے ہمیں ان کا ذکر کہانیوں میں ملتا ہے۔

بالکل اسی طرح عکس محفوظ کرنا بھی انسان کا پرانا خواب تھا۔ اپنی کہانیوں میں وہ جادوگروں کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ اس نے کسی انسان یا چیز کا بالکل ویسا ہی عکس کسی پتھر کی دیوار یا شیشے میں محفوظ کردیا جیسا کہ اصل انسان یا منظر تھا۔ یا کسی مخصوص وقت کی مووی بنا کر محفوظ کر لی اور بعد میں شیشے کے گولے یا آئینے میں دکھا دی۔ یہ سب چیزیں جادوگروں سے منسوب تھیں کیونکہ سائنس کس چڑیا کا نام ہے اس وقت لوگ جانتے نہیں تھے۔ صنعتی انقلاب سے پہلے سائنس ویسے بھی عام آدمی کے لیے نہیں تھی۔ یہ صرف ایک خاص طبقے تک محدود تھی اور وہی اس کی پرورش کر رہے تھے۔ علم وفنون پر مذہبی پابندیاں تھیں۔ عیسائی دنیا میں اسے مسلمانوں کی بدعت سمجھا جاتا تھا اور اس سے مکمل پرہیز کیا جاتا تھا۔ مزے کی بات آج یہ دور الٹ گیا ہے اب مسلمانوں کے مذہبی طبقات میں اسے مغرب کی بدعت سمجھا جاتا ہے۔

خیر یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ بات ہو رہی تھی عکس محفوظ کرنے کی۔ مغرب میں جب صنعتی ترقی کے بعد نت نئی چیزیں اور ان کے استعمال سامنے آنے لگے تو عکس کو بھی مستقل محفوظ کرنے کے بارے میں سوچا گیا۔ اس سلسلے میں تحقیق کرنے والوں کی دل چسپی کا مرکز وہ عناصر تھے جن کی کوٹ کی ہوئی پلیٹ پر کوئی بھی عکس آسانی سے اور طویل مدت کے لیے محفوظ کیا جاسکتا تھا۔ اس سلسلے میں شیشے، ٹن اور فولادی پلیٹ پر تجربات کیے گئے۔ کیمیا کے ماہروں نے سترھویں صدی میں ایسے کیمیائی عناصر کی نشان دہی کر دی تھی جن پر روشنی پڑتی تو ان کا رنگ بدل جاتا تھا۔ ایسے کیمیائی عناصر پر تحقیق بھی جاری تھی۔ کیونکہ اس شعبے میں بہت سارے افراد مصروفِ عمل تھے اس لیے آج ہم یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ درحقیقت کون ہے جو فوٹوگرافی کا موجد ہے۔

اس معاملے میں دو نام تقریباً ایک ہی وقت میں سامنے آتے ہیں۔ پہلا ایک فرانسیسی سائنس دان لوئیس جیکوئیس منڈے ڈی گورے تھا۔ قارئین حیران نہ ہوں اس زمانے میں ایسے ہی طویل نام رکھنے کا رواج تھا۔ اس فرانسیسی ماہر نے 1839 میں اعلان کیا کہ اس نے فوٹوگرافی ایجاد کرلی ہے یعنی کسی چیز یا شخص کا عکس بالکل ویسا ہی ہمیشہ کے لیے محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ اسی سال ایک برطانوی سائنس دان ولیم ہنری فوکس ٹالبوٹ نے بھی کچھ ایسا ہی کرکے دکھایا۔ اتفاق سے اس وقت یہ دو ممالک سائنس کے شعبے میں سب سے آگے تھے اور ان سائنس دانوں میں چیزوں کی ایجاد اور دریافت کی دوڑ لگی رہتی تھی۔ فرانس اور برطانیہ اس وقت شدید قسم کے دشمن تھے اور ان میں سو سالہ جنگ بھی جاری تھی۔ یہ جنگ دنیا کے مختلف علاقوں پر قبضے کی



دوڑ میں بھی بدل گئی تھی۔

لوئیس نے اپنی ایجاد کو Daguerre type (ڈی گورے ٹائپ) کا نام دیا۔ جب کہ ولیم نے اپنی ایجاد کا نام Calo type (کالوٹائپ) رکھا۔ ایک ہی کام کے لیے دونوں کا طریقہ کار بالکل مختلف تھا اس لیے آج ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے دوسرے کی نقل نہیں کی تھی اور وہ اپنے اپنے شعبے میں الگ مصروفِ عمل رہے تھے۔ یقیناً وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز ایجاد کی۔ لوئیس کی ڈی گورے ٹائپ میں دھات کی ایک پالش کی ہوئی پلیٹ پر کیمیائی عناصر کی تہ چڑھا کر اس پر عدسے کی مدد سے کسی شخص، منظر یا چیز کا عکس ڈالا جاتا تو وہ اسی وقت پلیٹ پر محفوظ ہو جاتا۔ اس طریقے میں عکس الٹا یعنی دائیں سے بائیں ہو کر محفوظ ہوتا تھا اور فی الحال اسے سیدھا کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ اس خرابی کے ساتھ اس میں تصویر کا معیار بھی اچھا تھا اور دھاتی پلیٹ پر عکس طویل عرصے برقرار رہتا تھا۔ اس میں ایک خرابی اور تھی کہ تصویر کو دوبارہ حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بس جو ایک بار پرنٹ ہو جاتی تھی وہی تصویر حاصل ہوتی۔

کالوٹائپ میں ولیم پازیٹو عکس کو ایک کاغذ پر نیگٹو اتار لیتا اور یوں درست تصویر حاصل ہوتی تھی۔ اس میں تصویر کا معیار بھی بہت اچھا ہوتا تھا اور اسے بار بار پرنٹ کیا جاسکتا تھا۔ خرابی اس میں وہی تھی کہ تصویر کچھ عرصے بعد دھندلانے لگتی تھی۔ یہ ہوا اور روشنی کا اثر تھا جس سے عکس محفوظ رکھنے والے کیمیائی عناصر رنگت تبدیلی کا عمل جاری رکھتے تھے جس سے تصویر اپنا اصل عکس کھو دیتی تھی۔ ابھی تک کیمیائی عناصر کو تبدیلی سے روکنے کا کوئی طریقہ ایجاد نہیں ہوا تھا۔ لوئیس اور ولیم کی یہ ایجادات فوری مقبول ہوگئیں۔ لوئیس نے اپنا پیٹنٹ فرانس کی پارلیمینٹ کو فروخت کردیا جس نے اسے مفادِ عامہ کے لیے عام اور مفت کردیا۔ اس کے مقابلے میں ولیم اپنی ٹیکنالوجی رقم کے عوض کمپنیوں کو دینے لگا اور اس نے پیٹنٹ اپنے پاس رکھا تھا۔

کالوٹائپ بہتر ہونے کے باوجود عوام میں ڈی گورے ٹائپ مقبول ہونے لگا۔ اس کی ایک وجہ تو تصویر کا بہت زیادہ حقیقی ہونا تھا۔ دھات کی پلیٹ دیرپا ہوتی تھی۔ مگر اس میں یہ مسئلہ بھی تھا کہ اس کے کیمیائی عناصر بہت حساس تھے اور اگر اپرچر ذرا سی دیر کے لیے بھی کھلا رہ جاتا تو پلیٹ جل اٹھتی تھی اور عکس ضائع ہو جاتا۔ تصویر لینے کے بعد بھی یہ عکس روشنی اور دھوئیں سے حساس تھا۔ اس لیے تصویر کو تاریکی میں اور ہوا بند جگہ رکھنا ہوتا تھا۔ اسے کم روشنی میں دیکھنا پڑتا تھا۔ ان خرابیوں کے باوجود ڈی گورے ٹائپ عوام میں مقبول تھا۔ اس کی بنیادی وجہ اس کا سستا ہونا تھا۔ پیٹنٹ فری ہونے کی وجہ سے بے شمار لوگوں نے اس کے کیمرے بنا بنا کر بیچنا شروع کردیے تھے۔ دھاتی پلیٹ بھی مہنگی نہیں تھی۔ کالوٹائپ محدود تھا اور اس کا استعمال بھی محدود تھا اسے عوام میں پذیرائی نہیں ملی تھی۔ کیونکہ جو کمپنیاں ولیم سے استعمال کا لائسنس لیتی تھیں وہ لوگوں کی کھال کھینچتی تھیں۔ برطانوی ویسے بھی تاجر قوم ہیں۔

ایک دفعہ فوٹوگرافی حقیقت بن کر سامنے آئی تو مزید سائنس دان اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ ان میں ایک انگریز سائنس دان فریڈرک اسکاٹ آرچر بھی تھا۔ اس نے فوٹوگرافی کا ایک نیا طریقہ نکالا۔ یہ کولوڈین کی گیلی پلیٹ تھی۔ اصل میں یہ شیشے کی پلیٹ تھی جس پر کولوڈین کا گیلا مسالا لگایا جاتا تھا۔ یہ مسالا نائٹروسیلیلوس کو الکوحل یا اسی جیسے کسی سلوشن میں حل کرکے تیار کیا جاتا تھا۔ اس کی حساسیت کم کرنے کے لیے اسے سلور نائٹریٹ میں ڈبو کر رکھا جاتا تھا۔ مگر اس میں ایک خرابی تھی جیسے ہی پلیٹ کو محلول سے نکالا جاتا اور اسے ہوا لگتی تو یہ بہت تیزی سے ڈیولپ ہو جاتی تھی اور اس سے مزید کاپیاں بنانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس میں ایک مسئلہ اور تھا شیشے کی پلیٹ نازک اور وزنی ہوتی تھی۔ اسے بہت احتیاط سے رکھنا پڑتا تھا مگر اس سے تصویر کے وقت کے ساتھ دھندلانے کا مسئلہ حل ہوگیا تھا اور اگر تصویر کی حفاظت کی جاتی تو برسوں بعد بھی عکس ویسا ہی ہوتا۔ یہ ایجاد اس لحاظ سے قابلِ قدر تھی۔

چند سال بعد 1856 میں ایک ماہرِ فوٹوگرافی ہملٹن اسمتھ نے دریافت کیا کہ کولوڈین کا مسالا صرف شیشے کی پلیٹ ہی نہیں بلکہ تمام ہموار سطح رکھنے والی اشیا جیسے دھات یا چمڑے پر بھی یکساں آسانی سے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اسمتھ نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت باریک ٹن کی پالش کی ہوئی پلیٹ لی اور اس پر کولوڈین کا مسالا لگا کر اسے کیمرے میں رکھا اور جب تصویر لی تو نتیجہ بہترین نکلا۔ شیشے کے مقابلے میں بہت پتلی اور ہلکی ٹن کی شیٹ پر تصویر اتر آئی تھی۔ یہ سستی بھی تھی اس لیے اسمتھ کا طریقہ چل نکلا اور چند برسوں میں عوام و خواص سب

تصویریں لینے لگے اور اپنے گھروں میں سجانے لگے۔ تصویر سازی کی صنعت بن گئی۔ فیکٹریوں میں بڑی سینریاں اور تصاویر بننے لگیں جنہیں عام لوگ بھی آسانی سے خرید سکتے تھے۔

یہ پہلا موقع تھا جب عکس بندی صنعت کے طور پر سامنے آئی۔ ہوشیار لوگوں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور سلائیڈ شوز چلانے شروع کر دیے۔ ان سلائیڈ شوز میں آوازوں اور تصویروں کی مدد سے پوری کہانی یا واقعہ بیان کیا جاتا تھا۔ فوٹو گرافر ساری دنیا میں گھومنے لگے اور نادر و نایاب چیزوں کی تصاویر بنا کر مغربی دنیا میں بیچنے لگے۔ لوگ ان سلائیڈ شوز پر ٹوٹ پڑے تھے اور بالکل وہی حال ہوا تھا جو آج کسی نئی فلم کی ریلیز کے موقع پر ہوتا ہے۔ مغربی دنیا میں جنسی آزادی اور بے راہ روی شروع ہو چکی تھی۔ وہاں سلائیڈ شوز کرنے والوں نے عریاں اور فحش سلائیڈ شوز چلانے شروع کر دیے۔ مخصوص ذہنیت کے لوگ اس پر بھی ٹوٹ پڑے تھے۔ تھیٹرز بھی اس صنعت سے استفادہ حاصل کرنے لگے۔ ہاتھ کی بنی سینریوں کی جگہ تصاویر نے لے لی۔ اس طرح تھیٹرز کی پبلسٹی بھی آسان ہو گئی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے پہلے یہ سب بہت مقبول ہو چکا تھا۔ مغربی دنیا کے لوگ یہ ٹیکنالوجی لے کر مشرقی ممالک میں بھی آئے۔ آج برٹش میوزیم میں برصغیر کی جنگِ آزادی کی اصلی تصاویر موجود ہیں۔

عکس بندی کی اتنی ترقی کے باوجود ابھی اس کے پھیلاؤ میں کئی رکاوٹیں تھیں۔ اول یہ سستی نہیں تھی۔ مغرب میں بھی ہر شخص فوٹو گرافی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری آسان نہیں تھی۔ تصویر سازی کے لیے باقاعدہ فیکٹریاں لگائی گئی تھیں۔ تیسرے ابھی تک اسے کاغذ پر منتقل نہیں کیا جا سکا تھا۔ ہاں موٹے گتے پر تصویر بنتی تھی۔ اس وجہ سے تصاویر اب تک اخبارات اور رسائل کی زینت نہیں بنی تھیں۔ ابھی تک کوئی ایسا پریس ایجاد نہیں ہوا تھا جو تصاویر کو اخبار یا رسالے کے کاغذ پر چھاپ سکتا۔ ایک صدی گزرنے کے بعد آج یہ کہنا مشکل ہے کہ سب سے پہلے کس اخبار یا رسالے نے تصویر چھاپی اور وہ کس ملک سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اولین تصویر جس کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ کسی اخبار یا رسالے میں چھپی، ایک نامعلوم فوٹو گرافر نے امریکی فوج کے دستوں کی لی تھی۔ یہ دستہ 1847 میں فلپائن میں تھا اور یہ تصویر بعد میں متعدد رسالوں اور اخبارات میں شائع ہوئی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ سب سے پہلے کب شائع ہوئی تھی۔ ممکنہ طور پر یہ 1880 سے 1897 کا درمیانی وقت ہے جب لیتھو پریس کی ٹیکنالوجی سامنے آ رہی تھی۔

سابق سوویت یونین کے دور میں دعویٰ کیا جاتا رہا کہ اولین تصویر جو کسی رسالے یا اخبار میں چھپی وہ رومانیہ کے ایک فوٹو گرافر صحافی کارل زیتھ میری کی تھی جو اس نے جنگ کریمیا کے دوران لی تھی۔ یہ جنگ روس اور سلطنتِ عثمانیہ کے درمیان 1853 سے 1856 کے درمیان جاری رہی تھی۔ کارل صحافی کی حیثیت سے اس جنگ کی کوریج کر رہا تھا۔ سوویت یونین کے دعویٰ کے مطابق یہ تصویر 1880 میں ماسکو کے ایک اخبار نے شائع کی تھی مگر اس دعویٰ کا کوئی حتمی ثبوت نہیں ہے کیونکہ اس اخبار کی تصویر والی صرف ایک کاپی ماسکو میوزیم میں موجود ہے۔ مغربی دنیا کے ماہرین نے اسے سوویت یونین کی جعل سازی قرار دیا تھا جو اس نے یہ اعزاز حاصل کرنے کے لیے کی تھی۔

اسمتھ کے ایجاد کردہ طریقے نے تصویر سازی کو عروج بخشا تھا کیونکہ ٹن سستا، ہلکا اور آسانی سے بن جانے والی دھات ہے۔ اسے کسی بھی سائز میں بنایا جا سکتا ہے۔ اس پر تصویر کا معیار بھی بہت اعلیٰ آتا تھا۔ اس وقت فوٹو گرافی کے ماہرین کا خیال تھا کہ اس شعبے میں اب ترقی کی گنجائش بہت کم رہ گئی ہے اور اس نے جتنی ترقی کرنی تھی وہ کر لی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کاغذی تصویر کا دور بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ تصویر بلیک اینڈ وہائٹ تھی اور ابھی کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی رنگین تصویر بھی آئے گی۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس وقت ماہرین کی سوچ کتنی محدود تھی۔ وہ ٹن پر عکس اتارنے کو اس فن کی معراج تصور کر رہے تھے۔ جب کہ فوٹو گرافی کے فن میں نئی ایجادات کا سلسلہ ابھی رکا نہیں تھا۔

1888 کا سال فوٹو گرافی کے فن میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اسی سال ایک امریکی جارج ایسٹ مین نے اپنی کمپنی ایسٹ مین کوڈک کے نام سے کھولی۔ ابتدا میں اس کمپنی نے جلیٹن ڈرائی پلیٹ بنا کر فوٹو گرافی کے فن کو ایک نئی جدت دی۔ یہ خشک پلیٹ محفوظ تھی، آگ نہیں پکڑتی تھی اور اس پر اتارا جانے والا عکس تادیر قائم رہتا تھا جس سے اس کی مزید کاپیاں بنائی جا سکتی تھیں۔ بظاہر یہ بہت انقلابی قسم کی ایجاد تھی جس سے فوٹو گرافی کی صنعت کئی گنا بڑھ سکتی تھی مگر جارج ایسٹ مین کے دماغ میں کچھ اور ہی تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تصویر سازی کو دو الگ مراحل میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگرچہ اس وقت بھی یہ کام دو مراحل میں ہو رہا تھا لیکن حقیقت میں یہ دونوں مراحل گتھے ہوئے بھی تھے۔ انہیں مکمل طور پر الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جارج ایسٹ مین نے ولیم ہنری فوکس ٹالبوٹ کے ایجاد کردہ فوٹو پروسیس کا جائزہ لیا اور اس نے محسوس کیا کہ اسے مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد لچک دار ہے۔ اگر تصاویر کے لیے حساس مادوں کو کسی نرم اور شفاف مادّے پر لگا کر تصویر لی جائے تو نتیجہ بہتر نکل سکتا تھا۔ جارج ایسٹ مین کی کوششوں سے ایک نئی ٹیکنالوجی سامنے آئی۔ یہ فلم رول تھا جس پر ایک کے بجائے متعدد تصاویر بنائی جا سکتی تھیں۔ چاول کے چھلکے سے تیار ہونے والا یہ مادّہ بہت سستا آسان اور کم جگہ گھیرنے والا تھا۔ اس پر آنے والا نیگیٹو آسانی سے کسی کاغذ پر پازیٹو کی صورت میں اتارا جا سکتا تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسے کیمرے میں کس طرح استعمال کیا جائے۔ کیونکہ مروجہ کیمرے صرف مخصوص قسم کی پلیٹس استعمال کر سکتے تھے۔ یہ بہت بڑے اور بھاری بھرکم ہوتے تھے۔ انہیں ہاتھ سے اٹھانا بھی ممکن نہیں تھا بلکہ انہیں ٹرالی اسٹینڈ پر رکھا جاتا تھا۔

جارج ایسٹ مین نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ اس نے ایک ایسا کیمرا ایجاد کیا جس میں فلم رول آسانی سے استعمال ہو سکتا تھا۔ یہ کیمرا استعمال میں اتنا آسان تھا کہ ایک بچہ بھی اس سے تصویر اتار سکتا تھا۔ یہ چھوٹا اور کم وزن کیمرا تھا جسے آسانی سے کہیں بھی لے جایا جا سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات تھی کہ اب لوگ بڑی فلم پلیٹوں کے محتاج نہیں رہے تھے۔ ٹن کی پلیٹ بھی بڑی ہوتی تھی۔ اسے کیمرے میں لوڈ کرنا اچھا خاصا مشکل کام تھا اور تصویر لینا بھی آسان نہیں ہوتا تھا۔ جارج ایسٹ مین کے کوڈک کیمرے نے یہ تمام مشکلات دور کر دی تھیں۔ اب کیمرا جدید، ہلکا اور استعمال میں آسان ہونے کے ساتھ ایک ہی فلم رول میں سو سے بھی زیادہ تصاویر محفوظ کر سکتا تھا۔

پس منظر کے لحاظ سے جارج ایسٹ مین ایک ناکام اسکول گریجویٹ لیکن تکنیکی اور کاروباری لحاظ سے نہایت ذہین شخص تھا۔ اس نے فلم رول اور کیمرا ایجاد کر لیا تھا لیکن وہ جانتا تھا جب تک عوام کو یہ سہولت نہیں ملے گی کہ ان کی کھینچی ہوئی تصاویر جلد پرنٹ ہو کر مل جائیں تب تک کیمرے اور فلم رول کی افادیت بیکار تھی۔ اس لیے جارج ایسٹ مین نے شروع میں جو کیمرے بنائے ان میں فلم رول اس کی فیکٹری میں لوڈ ہوتا تھا اور پھر یہ کیمرا ایک بار کسی شخص کو فروخت کر دیا جاتا تھا۔ خریدنے والا جب پورا رول استعمال کر لیتا تو وہ کیمرا واپس کوڈک کی ایکسپریس شاپ پر لے جاتا جہاں سے اسے فیکٹری بھیج دیا جاتا۔ فیکٹری میں رول نکال کر ڈیولپ کیا جاتا اور پھر اس سے تصاویر بنا کر واپس مالک کے لیے بھیج دی جاتیں اور اگر وہ فرمائش کرتا تو کیمرے میں نیا رول بھی لوڈ کر دیا جاتا۔

جارج ایسٹ مین کی یہ ترکیب کامیاب رہی اور لوگوں نے دھڑا دھڑ کوڈک کا کیمرا اور فلم رول خریدنا شروع کر دیا۔ جب بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوا تو امریکا اور باقی دنیا میں فلم رول کیمرا مقبول ہو چکا تھا۔ خاص طور سے امریکا میں تو یہ ایک فیشن کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ وہاں لاکھوں لوگوں نے یہ کیمرے خریدے اور استعمال کیے۔ کوڈک نے اپنا سلوگن رکھا تھا۔ ”آپ بس بٹن دبایئے اور باقی کام ہم پر چھوڑ دیں۔“

لوگوں نے سچ مچ باقی کام کوڈک کمپنی پر چھوڑ دیا۔ اس کا کیمرا اور فلم پروسیس اتنا سستا تھا کہ غریب آدمی بھی برداشت کر سکتا تھا۔ شروع میں فلم رول بہت حساس ہوتے تھے اور معمولی سی بے احتیاطی سے خراب ہو جاتے تھے اس لیے فیکٹری میں انہیں مخصوص طریقہ کار کے تحت ڈیولپ کیا جاتا تھا۔ مگر جلد کوڈک کمپنی نے ایسے فلم رول بنا لیے جو پائیدار تھے اور ایک عام آدمی بھی انہیں آسانی سے کیمرے میں ڈال سکتا تھا اور پھر نکال کر خود ڈیولپ کر سکتا تھا۔ بہ شرطیکہ اس کے پاس اس کام کے لیے مناسب جگہ اور سامان ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ نیا رول اور نئے کیمرے مقبول ہو گئے۔ ان لوگوں کی آسانی کے لیے جو خود سے فلم ڈیولپ نہیں کر سکتے تھے جگہ جگہ کوڈک کی لائسنس یافتہ فوٹو شاپس کھل گئیں۔ یہ اعلیٰ معیار کے کاغذ پر بہترین تصاویر کم داموں میں دینے لگیں۔

ماہرین کا خیال تھا کہ اس نئی ایجاد سے کوڈک کمپنی کا منافع کم ہو جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس کمپنی پہلے سے کئی گنا زیادہ نفع کمانے لگی۔ اس نے اپنی ساری توجہ کیمرا سازی اور فلم سازی پر مرکوز کر لی۔ اس کی فروخت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اسی لحاظ سے اس کا نفع بھی بڑھ گیا۔ کمپنی جلدی

جلدی نئے ڈیزائن کے اور نئی سہولیات کے ساتھ کیمرے نکالنے لگی۔ صرف عام لوگوں کے لیے ہی نہیں بلکہ مختلف شعبوں میں کام کرنے والے ماہروں کے لیے ان کی ضرورت کے لحاظ سے کیمرے بنانے لگی۔ جلد امریکی فوج کوڈک کی سب سے بڑی گاہک بن گئی تھی۔ حکومتی شعبوں کے سارے ٹھیکے بھی کوڈک کے پاس تھے۔ جارج ایسٹ مین دیکھتے ہی دیکھتے امریکا کے امیر ترین آدمیوں میں شامل ہوگیا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ فوٹوگرافی کا تمام کام سمٹ کر کوڈک کمپنی کے پاس آگیا ہے۔ ساری دنیا میں اس کے کیمرے چل رہے تھے۔ اس کے بنائے ہوئے فلم رول استعمال ہو رہے تھے اور فوٹو شاپس والے اپنی دکان کے نام میں فخر سے کوڈک کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ کوڈک کمپنی نے عام لوگوں کو اپنے کاروبار میں شامل کیا اور طویل عرصے تک اس شعبے پر حکمرانی کی۔ خاص بات یہ تھی کہ کمپنی کے کارپردازوں نے بروقت لوگوں کی ضروریات کو بھانپ کر اسی لحاظ سے نئی چیزیں متعارف کرائیں۔ کمپنی نے فوج کے ساتھ اشتہاری اور اخباری صنعت کی ضرورت کو مدِنظر رکھ کر بہترین کیمرے متعارف کرائے۔ جو بہت ہائی ریزلیوشن تصویر لے سکتے تھے۔ اسی طرح اسپائی کیمرے اور انڈر واٹر کام کرنے والے کیمرے بھی بنائے۔

1935 میں کوڈک نے جدت کی دنیا میں ایک قدم اور بڑھایا اور دنیا کا پہلا کلر تصویر اتارنے والا کیمرا اور فلم رول منظرِ عام پر آیا۔ اسے کوڈک کروم کا نام دیا گیا اور اس وقت یہ ٹیکنالوجی کسی قدر پیچیدہ تھی اس لیے فلم رول دھلنے اور کیمرے میں لوڈ ہونے کے لیے کوڈک کی فیکٹری جاتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم تک یہ سلسلہ جاری رہا اس کے بعد کلر فلم کا پروسیس بھی عام فوٹو شاپس پر ہونے لگا۔ دوسری جنگ عظیم نے جہاں ایک طرف امریکا کو سپر پاور بنا دیا وہیں ٹیکنالوجی کے میدان میں اس کی قیادت جو بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوئی تھی اس سے چھننے لگی اور دوسرے ممالک اب جدت سازی میں آگے نظر آنے لگے۔

خاص طور سے جاپان جسے امریکی فوج نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اسی بربادی کی راکھ سے ایک نئے جاپان نے جنم لیا۔ اس نے سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں اپنے فاتح کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔ چند سالوں میں دنیا بھر میں سستے جاپانی کیمرے اور فلم رول گردش کرنے لگے۔ جاپانی کیمرے استعمال میں آسان، سستے اور بہت اسٹائلش تھے۔ سب سے پہلے جاپانیوں نے کیمرے میں فلش لائٹ متعارف کرائی اور ڈرائی بیٹری سے چلنے والے کیمرے وجود میں آئے۔ ان سے تصویر لینا سچ مچ بہت آسان ہوگیا۔ ایک چار پانچ سال کا بچہ بھی تصویر اتارنے لگا تھا۔ آج جاپان کیمرا سازی میں لیڈر ہے۔ دوسرے ممالک کی کمپنیاں جاپان کی کمپنیوں سے کوسوں پیچھے ہیں۔

عکس کی دنیا میں ایک انقلاب تو عکس کو کسی چیز پر محفوظ کرنا تھا لیکن ایک دوسرا خواب عکس کو حرکت میں منتقل کرنا تھا یعنی جیتا جاگتا، بولتا اور حرکت کرتا ہوا عکس۔ یہ اصل میں ٹی وی کا خواب تھا جو قدیم دیومالائی داستانوں نے انسان کو دکھایا تھا۔ اس کو حقیقت کا روپ جان لوگی بیریڈ نے دیا۔ اس نے 1926ء... میں پہلی بار برقی سگنل کو تصویر کی منتقلی کے لیے استعمال کیا۔ اس تجربے میں اس نے اپنے دوست اور کاروباری شریک اولیور ہیکن سن کی مووی کو ٹرانسمٹ کیا۔ اس سادہ سے تجربے نے برقی عکس کی بنیاد رکھی جو آج ترقی کرتے ہوئے ڈیجیٹل فوٹوگرافی تک آپہنچا ہے۔ پچاس کے عشرے میں ٹی وی کا آغاز ہوا۔ جان لوگی بیریڈ جنگ عظیم کے فوراً بعد موت کی نیند سو گیا تھا لیکن اس کی ایجاد آگے بڑھتی رہی اور یہ عشرہ ختم ہونے سے پہلے ٹی وی کی کمرشل نشریات کا آغاز ہوگیا تھا۔

اسی عشرے میں عکس یا کسی بھی معلومات کا اینالوگ ریکارڈر وجود میں آیا۔ یہ اسی میٹریل کو بہ طور ریکارڈر استعمال کرتا تھا جس سے فلم بنتی تھی۔ بعد میں یہ چیز ویڈیو کیسٹ کی صورت میں سامنے آئی جس میں ریکارڈنگ ٹیپ ہوتی تھی۔ سی ڈی کی آمد سے پہلے یہ سب سے زیادہ استعمال ہونے والی چیز تھی۔ مقناطیسی طریقے سے کسی بھی معلومات کو اس ٹیپ پر محفوظ کرلیا جاتا تھا اور پھر اسے دوبارہ سے واپس حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اس ایجاد نے ٹی وی کی نشریات کو ممکن بنا دیا۔ یوں عکس اب بغیر کسی مادّی وسیلے کے بھی صرف ریڈیائی مقناطیسی لہروں کی صورت میں بھی محفوظ کیا جاسکتا تھا اسی ٹیپ نے کمپیوٹر کی ایجاد کو بھی ممکن بنایا تھا۔ ساٹھ کے عشرے میں ٹی وی کی ٹیکنالوجی نے مزید ترقی کی اور رنگین ٹی وی سامنے آیا۔

اس ترقی کے باوجود ابھی عکس بندی کا ڈیجیٹل طریقہ سامنے نہیں آیا تھا۔ عکس بندی کی دنیا اور فلم سازی میں فلم رول کا راج تھا۔ اس نے معیار بہت اعلیٰ دیا تھا اور یہ سستا

بھی تھا کیونکہ اس کا خام مال چاول سے حاصل کیا جاتا تھا اور چاول دنیا میں سب سے زیادہ اگنے والی فصل ہے۔ حیرت انگیز طور پر فلم رول تقریباً سوا صدی تک عکس بندی کی دنیا پر راج کرتا رہا۔ بلکہ بہت ساری صورتوں میں اب بھی کر رہا ہے۔ بے شک ڈیجیٹل کیمروں نے اب اس کی جگہ لے لی ہے۔ عام تصویر لینی ہو یا کوئی ملٹی ملین ڈالرز کی مووی بنانی ہو ہر دو جگہ ڈیجیٹل کیمرے ہی استعمال ہو رہے ہیں۔ فلم رول کا استعمال تقریباً متروک ہو گیا ہے بلکہ سینما میں ریلیز کے لیے فلم رول بھی ڈیجیٹل مووی سے تیار کیا جاتا ہے۔ کچھ سال بعد سینما بھی ڈیجیٹل ہو جائیں گے تب رول فلم کا استعمال بالکل متروک ہو جائے گا۔ ابھی بھی کچھ شعبوں میں اس سے کام لیا جا رہا ہے۔

عکس کو ڈیجیٹل سگنل کی صورت میں بھیجنے کا آغاز ناسا کے ایک پروجیکٹ سے ہوا۔ ناسا ایک خلائی گاڑی جسے پروب بھی کہتے ہیں چاند پر بھیج رہا تھا۔ گاڑی کی روانگی کے بعد یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اینالوگ سگنل صحیح کام نہیں کر رہے تھے، تصویر خراب آ رہی تھی اور آوازوں میں شور بہت تھا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے سگنل کو کمپیوٹر سے گزار کر بھیجا گیا اس کا نتیجہ حیرت انگیز نکلا۔ چاند سے آنے والے سگنل ایک دم صاف ہو گئے۔ تصویریں نمایاں ہو گئیں اور آوازوں میں شور غائب ہو گیا۔ یہ ڈیجیٹل سگنل کا آغاز تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے متعدد نئی ایجادات سامنے آئی تھیں جیسے میزائل یا راکٹ ٹیکنالوجی اور جیٹ انجن وغیرہ۔ اسی طرح سرد جنگ کے دوران بھی بہت ساری ٹیکنالوجیز پر کام ہوا، ان میں ایک معلومات کو محفوظ کرنے کا ڈیجیٹل طریقہ بھی تھا۔ مگر اسے منظرِ عام پر آنے اور عام زندگی میں اپنی جگہ بنانے میں بہت طویل عرصہ لگا تھا۔ مقناطیسی اینالوگ سگنل نصف صدی تک دنیا پر حکومت کرتا رہا جس کی نشانی مقناطیسی ٹیپ تھی۔ اب ڈیجیٹل اسٹوریج کا دور ہے۔

نوے کے عشرے میں سی ڈی کی آمد نے ڈیجیٹل ریکارڈنگ کی راہ ہموار کر دی۔ معلومات چاہے وہ ٹیکسٹ ہوں، تصاویر ہوں یا مووی کی صورت میں ہوں، ایک سی ڈی پر محفوظ ہونے لگیں۔ سی ڈی ڈرائیو کی لیزر سی ڈی پر معلومات لکھتی بھی ہے اور پڑھ بھی لیتی ہے۔ شروع میں اس کی گنجائش محدود تھی لیکن پھر ڈی وی ڈی اور اب سولڈ سرکٹ میموری نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ ہتھیلی کے برابر یو ایس بی ہارڈ ڈسک ٹیرا بائٹ ڈیٹا محفوظ کرتی ہے اور یہ کمپیوٹر استعمال کرنے والے ہر شخص کی پہنچ میں ہے۔ گیگا بائٹ کی یو ایس بی تو اتنی عام ہو گئی ہے کہ بچہ بچہ لیے گھومتا ہے۔ امید ہے چند سال بعد سالڈ سرکٹ میموری ہارڈ ڈرائیو کو اسی طرح ختم کر دے گی جیسے ہارڈ ڈرائیو نے بھی مقناطیسی ٹیپ کو ختم کیا تھا۔

ان ایجادات نے ڈیجیٹل کیمرے اور ڈیجیٹل فوٹوگرافی کی راہ ہموار کر دی۔ آج ڈیجیٹل کیمرے بنانے والی کمپنیوں کی تعداد ہزاروں میں جا چکی ہے۔ ہر روز درجنوں کے حساب سے نئے ماڈل سامنے آ رہے ہیں۔ لیکن اولین ڈیجیٹل کیمرے کی ایجاد کا سہرا جاپانی کمپنی کینن کے سر جاتا ہے۔ اس کا بنایا ہوا ڈیجیٹل کیمرا تجرباتی طور پر 1984 کے لاس اینجلس اولمپک میں استعمال ہوا اور اگلے روز اس کیمرے سے لی گئی تصاویر جاپان کے اخبارات میں شائع ہوئیں کیونکہ اس کیمرے کی تصاویر فون لائن کی مدد سے سیکنڈ سے بھی پہلے جاپان بھیج دی گئی تھیں۔ ان تصاویر کا معیار اتنا شاندار تھا کہ کینن نے فوری طور پر اپنی ایجاد کو مارکیٹ میں لانے کا فیصلہ کیا۔ آج کینن ڈیجیٹل فوٹوگرافی میں لیڈر ہے۔

1988 میں دنیا کے پہلے ڈیجیٹل اسکینر کی ایجاد سے یہ ممکن ہو گیا کہ اب کسی بھی فلم یا تصویر کو اسکین کر کے ڈیجیٹل صورت میں محفوظ کر لیا جائے۔ اس ایجاد نے قدیم ترین تصاویر اور فلموں کو محفوظ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے کیونکہ فلم رول یا کاغذ پر چھپی تصویر کی ایک زندگی ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر ڈیجیٹل صورت میں آنے کے بعد یہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے ہیں۔ آج سے ہزار سال دس ہزار سال بعد بھی ان چیزوں کو دیکھا جا سکے گا۔ نوے کا عشرہ ڈیجیٹل فوٹوگرافی کے لیے موسمِ بہار لے کر آیا۔ متعدد کمپنیوں نے سستے، استعمال میں آسان اور اعلیٰ درجے کی تصویر کھینچنے والے ڈیجیٹل کیمرے متعارف کرائے اور یہ دیکھتے ہی دیکھتے عوام میں مقبول ہوتے گئے۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں نئے معلومات ذخیرہ کرنے والے آلات سامنے آئے۔ ان کی مدد سے ڈیجیٹل فوٹوگرافی مزید آسان ہو گئی۔ کمپیوٹر مانیٹرز، لیپ ٹاپ، ٹیب اور اسمارٹ موبائل فون کی آمد سے تصویروں کو پرنٹ کرنے کے جھنجھٹ سے بھی نجات مل گئی۔ اب اپنی تصاویر بہ آسانی ان چیزوں کی اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں اور اپنی مرضی کا سائز اور انداز کر کے۔

☆☆☆



جس وقت لوئیس اور ولیم عکس کو کسی سطح پر منتقل کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے اس وقت کچھ لوگ اس سے بھی آگے کی سوچ رہے تھے۔ وہ صرف سادہ تصویر کو محفوظ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ متحرک منظر کو محفوظ کرنا اور پھر اسے چلا کر دکھانا چاہتے تھے۔ دنیا میں جس شخص نے سب سے پہلے آنکھ کے عمل کی وضاحت کی وہ مصر کا مسلم سائنس دان الہیثم تھا۔ اس نے روشنی، بصارت اور آئینوں پر نہایت جامع کتاب لکھی۔ اس میں اس نے وضاحت کی کہ انسان کی آنکھ روشنی کی مدد سے دیکھتی ہے۔ جب روشنی کسی چیز سے ٹکرا کر آنکھ میں داخل ہوتی ہے تو پردہ شکلیہ پر اس منظر کی تصویر کچھ دیر کے لیے جم جاتی ہے۔ جب یہ تصویر ہٹتی ہے تو اس کی جگہ دوسری تصویر لیتی ہے اور ان مسلسل تصویروں سے ہمیں لگتا ہے کہ منظر جاری ہے۔ الہیثم نے ایک پن ہول کیمرا بھی ایجاد کیا تھا جو کسی منظر کو ایک پردے پر دکھا سکتا تھا۔ بہ شرطیکہ منظر اس کیمرے کے لینس کے سامنے ہو۔ اسے آپ اس دور کا سادہ ٹی وی بھی کہہ سکتے ہیں۔ افسوس کہ اس عظیم سائنس دان سے مسلم دنیا نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

بعد میں ایک پرتگالی گیم بٹسٹا ڈیلا پورٹو نے ابن الہیثم کے پن ہول کیمرے کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ایک پروجیکٹر ایجاد کیا۔ اس پروجیکٹر میں ایک باریک سوراخ کے سامنے ایک طاقتور عدسہ لگا تھا۔ جب روشنی کوئی منظر لیے اس سوراخ سے داخل ہو کر عدسہ سے گزرتی تو سامنے پردے پر اس منظر کو من و عن پیش کر دیتی تھی۔ منظر کی کوالٹی کا انحصار اس بات پر ہوتا تھا کہ جو منظر دکھایا جا رہا تھا اس پر کتنی تیز روشنی تھی اور لینس کتنا طاقتور تھا۔ لینس سے گزارنے سے پہلے روشنی کو ایک آئینے سے منعکس کیا جاتا یوں شبیہ الٹی ہو جاتی اور لینس سے گزرتے ہوئے یہ ایک بار پھر الٹی یعنی حقیقت میں سیدھی ہو جاتی۔ یوں پردے پر ایک حقیقی منظر کی مووی چلنے لگتی۔ مگر اس وقت منظر کو محفوظ کرنے والی کوئی چیز نہیں تھی اس لیے مووی بس ایک ہی بار چلتی تھی۔

درحقیقت متحرک تصاویر کو پیش کرنے کا سلسلہ ساکت عکس کو محفوظ کرنے کی کوششوں سے خاصا پہلے شروع ہو گیا تھا۔ سولہویں صدی کے دوران ڈیوڈ ہم نامی شخص نے سینما کا تصور پیش کیا۔ یہی نہیں اس نے پن ہول کیمرے کے مناظر میں شیشے پر لکھے الفاظ شامل کر کے ایک طرح سے فلم کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ واضح رہے کہ آغاز میں فلم خاموش ہوتی تھی اور اسکرین پر سب ٹائٹل لکھے ہوئے آتے تھے۔ مگر یہ سب چیزیں یوں ناکام رہیں کہ یہ کسی منظر کو ہی پردے پر پیش کر رہی ہوتی تھیں تو لوگ پردے کے بجائے اصلی منظر کیوں نہ دیکھ لیتے۔ اس دوران میں سائمن وون اسٹیمفر نامی شخص نے ایک انوکھی چیز پیش کی۔ اس نے ایک گول ڈرم پر ایسی تصاویر لگائیں جو ایک منظر کی یکے بعد دیگرے لی گئی تھیں۔ یہ سب ہاتھ سے بنے اسکیچ تھے۔ اس وقت تک فوٹوگرافی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اس نے جب ڈرم کو گھمایا تو ایسا لگا جیسے منظر حرکت میں آ گیا ہو۔ پھر اس نے ایسے ہی متعدد مناظر گھومنے والی ڈسک پر بنا کر لوگوں کو دکھائے۔ یہ مووی کا آغاز تھا۔ درحقیقت سائمن نے لوگوں کو بتایا کہ مووی ایک ہی منظر کی مسلسل تصویروں کا نام ہے۔ بدقسمتی سے آج دنیا اس شخص کے بارے میں بہت کم جانتی ہے۔

جون 1872 کے تاریخی دن دنیا کی پہلی مووی شوٹ کی گئی۔ فوٹوگرافر ایڈورڈ مے برج نے لیلینڈ اسٹین فورڈ کی سرپرستی میں ایک دوڑتے گھوڑے سلی گارڈنر کی مختصر سی فلم بنائی۔ یہ محفوظ کی جانے والی اولین مووی تھی۔ اس وقت کوئی ایسا کیمرا نہیں تھا جو اس منظر کو ریکارڈ کر سکتا اس لیے منظر کو ریکارڈ کرنے کے لیے چوبیس ساکت کیمرے ایک قطار میں رکھے گئے اور ان سے یکے بعد دیگرے دوڑتے گھوڑے کی تصاویر لی گئیں اور جب انہیں تیز رفتاری سے پروجیکٹر کی مدد سے دکھایا گیا تو ایسا لگا جیسے گھوڑا دوڑ رہا ہے۔ یہ سین پریس کی موجودگی میں کیلی فورنیا کے ایک فارم میں فلم بند کیا گیا تھا اور اس کے لیے نہایت انوکھا طریقہ اختیار کیا گیا۔ تصویروں کو بالکل درست انداز میں یکے بعد دیگرے اتارنے کے لیے کیمروں کے بٹن ڈوریوں سے منسلک کر کے انہیں اس راستے پر تان دیا گیا جس سے گھوڑے کو دوڑتے ہوئے گزرنا تھا۔ اس کے اگلے پیر جس کیمرے کی ڈوری سے ٹکراتے وہ اس کی تصویر لے لیتا اور یوں گھوڑے نے خود ہی اپنے دوڑنے کے منظر کو درست انداز میں ریکارڈ کرنے میں مدد کی۔

اس کے چند سال بعد اٹینے جولیس میری نے ایک شوٹنگ گن ایجاد کی۔ یہ گن ایک سیکنڈ میں بارہ تصویریں لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اٹینے ماہرِ حیاتیات تھا اور وہ اس گن کو انسانوں اور جانوروں کی حرکات کا مشاہدہ کرنے میں استعمال کرتا تھا۔ ہم اسے دنیا کا پہلا مووی کیمرا بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اٹینے نے اس کا نام کرونو فوٹوگرافک گن

رکھا تھا۔ لیکن اس نے کبھی اسے فلم بنانے کے لیے استعمال نہیں کیا۔ متحرک فلم بنانے کا دوسرا تجربہ انگلینڈ کی کاؤنٹی یارک شائر کے علاقے لیڈز کے قصبے راؤنڈہے میں کیا گیا۔ اس فلم کا نام راؤنڈہے گارڈن سین تھا اور اسے اکتوبر 1888 میں لوئیس لی پرنس نامی شخص نے بنایا تھا۔ یہ پہلی مووی ہے جو آج بھی محفوظ ہے۔

مووی کیمرا بنانے میں ایک اہم پیش رفت ولیم فریس گرین نامی شخص نے 1890 میں کی۔ یہ برطانوی ایک ایسا کیمرا ایجاد کرنے میں کامیاب رہا جو کولائڈ فلم کو استعمال کرتے ہوئے ایک سیکنڈ میں دس تصویریں لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کیمرے کے بارے میں ایک مضمون برٹش فوٹوگرافک نیوز میں شائع ہوا۔ گرین نے اس مضمون کی ایک کاپی امریکی موجد تھامس ایڈیسن کو بھیجی اور اس نے اپنی تجربہ گاہ میں اس تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے ایک مووی کیمرا بنایا۔ جسے اس نے کینیٹو اسکوپ کا نام دیا تھا۔ مگر ایڈیسن خود اس سے زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا۔ بعد میں اس کے بارے میں سائنس امریکا نامی رسالے میں بھی چھپا اور اگلے سال اپریل میں ولیم نے اپنی ایجاد کا عوامی مظاہرہ کیا۔ لیکن کم رفتار اور کم معیار کی وجہ سے یہ لوگوں کی توجہ حاصل نہیں کر سکا تھا۔

اسٹینے، ایڈورڈ اور ولیم جیسے لوگوں کی کاوشوں سے تحقیق دان اس طرف متوجہ ہوئے اور اس بات پر یقین کیا جانے لگا کہ جلد ایک مووی کیمرا جیسا کہ آج ہم استعمال کرتے ہیں معرضِ وجود میں آجائے گا۔ بے شمار لوگوں نے اس سلسلے میں کوششیں کیں لیکن کامیابی ڈبلیو ایل کے ڈکسن کے حصے میں آئی جو تھامس ایلوا ایڈیسن کا ایک شاگرد اور اس کی تجربہ گاہ میں کام کرتا تھا۔ اس نے دنیا کا پہلا مکمل اور کامیاب مووی کیمرا ایجاد کیا۔ اس ایجاد کا نام کینیٹوگراف رکھا گیا تھا۔ 1891 میں یہ ایجاد پیٹنٹ ہوئی اور اس کے فوراً کوڈک کی شاپس کے باہر لوگوں کا ہجوم نظر آنے لگا جو اس کیمرے میں لگنے والے پینتیس ایم ایم کا فلم رول خریدنا چاہتے تھے۔ یہاں بھی کوڈک بازی لے گئی۔ اس نے پہلے ہی مووی کیمرے کے لیے فلم رول تیار کر لیا تھا۔ مگر پینتیس ایم ایم کا یہ رول ایڈیسن کی ایجاد تھا جو کوڈک نے خرید لیا اور اب وہی اسے بنا رہی تھی۔

اس ایجاد میں ایک خامی تھی۔ فلم بننے کے بعد اسے ایک وقت میں صرف ایک آدمی دیکھ سکتا تھا اور وہ بھی ایک چھوٹے سے سوراخ میں سے جھانک کر۔ کیونکہ اس وقت تک نہ تو فلم پروجیکٹر وجود میں آیا تھا اور نہ ہی سینما بنے تھے۔ یہ چھوٹا بکس نما آلہ جس میں آدمی کبڑا ہو کر مووی دیکھتا تھا ایڈیسن کی ایجاد کینیٹو اسکوپ کے نام سے پکارا گیا۔ حالانکہ یہ ایڈیسن کی ایجاد سے مختلف تھا اور اسے بھی ڈکسن نے بنایا تھا۔ بالآخر ایک فرانسیسی چارلس فرانسس جینکیز نے دنیا کا پہلا عملی فلم پروجیکٹر ایجاد کیا اور اسے فینٹو اسکوپ کا نام دیا گیا۔ 1895 میں پیرس میں اس کا پہلا مظاہرہ ہوا۔ سینما میں ایک ٹرین کے آنے کا منظر اسکرین پر پیش کیا گیا اور اس وقت لوگوں کے لیے یہ اتنی انوکھی شے تھی کہ وہ ٹرین کی آمد کو سچ سمجھے اور سینما میں اپنی سیٹیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

اس وقت تک کئی اور لوگوں نے بھی فلم پروجیکٹر بنا لیے تھے۔ اس میں سب نے اپنے اپنے تجربات کیے تھے۔ بعض نے تیز رفتار پروجیکٹر بنائے تھے اور بعض مختلف سائز کا فلم رول استعمال کرتے تھے۔ لیکن بالآخر ایڈیسن کا بنایا پینتیس ایم ایم کا فلم رول اور ایک سیکنڈ میں سولہ تصاویر کا پروجیکٹر اسپیڈ معیار بن گیا۔ آنے والی ایک صدی تک سینما اسی معیار پر شائقین کو فلم دکھاتے رہے اور اس میں بہت کم ہی تبدیلی آئی تھی۔ 1893 میں شکاگو میں ورلڈ کولمبین ایکسپوزیشن نامی تھیٹر میں جانوروں کی حرکات پر لیکچر کی ایک سیریز کا اہتمام ہوا جس میں لوگوں کو پردے پر جانوروں کی فلمیں بنا کر دکھائی جاتی تھیں۔ یہ سائنسی لیکچر تھا لیکن عام لوگوں نے بھی اس میں بہت دل چسپی لی اور مہنگے ٹکٹ خرید کر اسے دیکھنے آتے تھے۔ یہ کمرشل سینما کا آغاز تھا۔ بعد میں اس تھیٹر کو مستقل سینما گھر میں بدل دیا گیا اور یہاں باقاعدگی سے فلموں کی نمائش ہونے لگی تھی۔

فلم سازی میں ایک رکاوٹ ابھی بھی موجود تھی اور وہ فلم رول کی طوالت تھی۔ اس وقت فلم رول بہت چھوٹے ہوتے تھے اور ان پر مشکل سے ایک دو منٹ کی مووی بن پاتی تھی۔ اس مشکل کو فلم پروجیکٹر کے خالق ڈکسن نے دور کیا۔ وہ اس وقت ایڈیسن کی لیب میں بہ طور انچارج کام کر رہا تھا۔ اس نے بہت طویل فلم رول تیار کیا۔ طویل فلم رول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ رول گھومنے کی رفتار تھی جس سے حرارت پیدا ہوتی تھی اور یہ حرارت فلم رول کو ضائع کر دیتی تھی۔ ڈکسن نے کچھ نئے کیمیکلز استعمال کر کے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ اب طویل فلم رول بن سکتا تھا اور یہ



حرارت سے متاثر بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران ایسے کئی رول استعمال ہوتے تھے لیکن ایک ہی رول پر آرام سے گھنٹوں کی مووی بن سکتی تھی۔ جب ایک رول تیار ہو جاتا تو اس سے بیک وقت ہزاروں رول اسی معیار کے تیار کیے جا سکتے تھے۔

جس وقت امریکا میں فلم رول، کیمروں اور پروجیکٹرز پر کام جاری تھا اس وقت اوقیانوس کے دوسری طرف یورپ میں بھی اس کام کے لیے دوڑ لگی ہوئی تھی۔ 1887 میں ایک جرمن اوٹومر آنس شوٹز نے ایک شیشے کے ڈرم میں چوبیس تصاویر لگا کر اسے گھما کر دکھایا تو لوگوں کو تصویر حرکت کرتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے چند سال بعد فرانس میں چارلس نے دنیا کا پہلا عملی پروجیکٹر بنا کر اس کی نمائش بھی کر دی۔ یورپ اور امریکا کے سائنس دان اور ماہر ایک دوسرے کی کاوشوں سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کا جائزہ بھی لے رہے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک یورپ کو امریکا پر سائنس و ٹیکنالوجی میں برتری حاصل تھی حالانکہ اس وقت تک کئی اہم ایجادات جیسے ہوائی جہاز امریکا میں ہی ایجاد ہوئے تھے اس کے باوجود ٹھوس سائنس میں یورپ کا پلڑا بھاری تھا۔

مگر پہلی اور دوسری جنگِ عظیم نے یورپ کو شدید نقصان پہنچایا اور دنیا پر اس کی سیادت ختم کر دی۔ وہ سائنس دان جو یورپ کا افتخار تھے وہ امریکا چلے گئے اور اب وہاں کام کرنے لگے اس سے امریکا سائنس و ٹیکنالوجی کی دنیا کی بھی سپر پاور بن گیا۔ ان دو جنگوں اور ان کے درمیانی وقفوں میں یورپ شدید انتشار کا شکار رہا اس کے باوجود وہاں سائنسی سرگرمیاں بھی جاری رہی تھیں۔ خاص طور سے جرمنی میں بہت کام ہو رہا تھا۔ اگرچہ کیمرا، فلم رول اور پروجیکٹرز کے معاملے میں جرمنوں کا کردار نہ ہونے کے برابر تھا لیکن اس کے باوجود دنیا کا پہلا معیاری اور مکمل سینما بنانے کا اعزاز جرمنوں کو حاصل ہوا۔ میکس اور ایمل نامی دو افراد نے اپنا پروجیکٹر "بایو اسکوپ" کے نام سے ایجاد کیا اور برلن میں اولین کمرشل سینما بنایا۔ جس میں پہلی فیچر فلم کی نمائش کی گئی۔ جرمن اس معاملے میں بازی لے گئے تھے۔ یہ فلم 1 نومبر 1895 میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ بعد میں دنیا بھر میں سینما گھر اسی پروجیکٹر کی مدد سے فلمیں دکھانے لگے۔ مزے کی بات ہے اس دور میں سینما کو بایو اسکوپ ہی کہا جاتا تھا جو اس کے موجدوں کے لیے اعزاز ہے۔ طویل عرصے تک یہی پروجیکٹرز کام کرتے رہے۔

آغاز میں فلمیں کسی ایک واقعے پر اور ایک ہی سین میں ایک ہی کیمرے سے بنائی جاتی تھیں۔ اسٹوڈیوز کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ساری شوٹنگ آؤٹ ڈور ہوتی تھی۔ نہ لائٹ ہوتی تھی اور نہ ہی فلم سازی کے دوسرے آلات ہوتے تھے۔ فلم بھی مشکل سے ایک سے دو منٹ کی ہوتی تھی اور عام طور سے کسی کھیل یا چھوٹے سے واقعے کی عکاسی کرتی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز تک باقاعدہ فلمیں بننا شروع ہوئیں جن کی طوالت پندرہ منٹ سے آدھے گھنٹے تک ہوتی تھی۔ اس میں انڈور شوٹنگ بھی ہوتی تھی۔ لائٹ کے ساتھ کئی کیمروں کا استعمال بھی شروع ہو گیا۔ ڈائریکشن اور ایڈیٹنگ کے شعبے وجود میں آ گئے۔ فلم سازی کے لیے نت نئے آلات بننے لگے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو اس شعبے میں ... دلچسپی ہوئی تو اس کا معیار خود بہ خود بڑھنے لگا تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں فلم سازی ایک باقاعدہ صنعت کی حیثیت اختیار کر گئی تھی اور فلم دیکھنا رواج ہو گیا تھا۔

یوں عکس کو ساکت حالت میں محفوظ رکھنے سے لے کر اسے متحرک حالت میں دیکھنے کا انسان کا پرانا خواب پورا ہوا۔ ساکت عکس فوٹوگراف کی صورت میں اور متحرک عکس مووی کی صورت میں سامنے آیا۔ منظر کو براہِ راست کہیں دیکھنے کے دیومالائی خیال نے ٹی وی کی صورت اختیار کر لی۔ پہلے سینما آیا اور پھر ٹی وی ایجاد ہوا تو ایسا لگا کہ اس شعبے کی تکمیل ہو گئی ہے۔ لوگ گول ڈبا نما بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی دیکھ کر بھی بہت خوش ہوتے تھے۔ مگر یہ ہمیشہ کی طرح انسان کی خام خیالی تھی۔ ٹی وی آنے کے کچھ عرصے بعد ہی رنگین ٹی وی کے لیے کوشش شروع ہوئی اور بالآخر رنگین ٹی وی بھی تیار ہو کر مارکیٹ میں آ گیا۔

آنے والے تیس سال تک روایتی ٹی وی میں جدت سازی جاری رہی۔ تصویر کا معیار بہت بہتر ہوا۔ رنگوں اور آوازوں سے گھر پُررونق ہو گئے۔ تصویر بالکل اصل کا منظر پیش کرنے لگی۔ ٹی وی نے اتنی ترقی کی کہ سینما کو پیچھے چھوڑ دیا۔ وی سی آر کی آمد نے سینما کو گھر پہنچا دیا۔ جس مووی کے لیے لوگ پہلے سینما میں لگنے کا انتظار کرتے تھے اور پھر ٹکٹ خرید کر دیکھنے جاتے تھے اب وہ گھر میں کیسٹ لا کر آرام سے دیکھتے اور جس طرح سے چاہتے دیکھتے۔ اس میں سینما والی پابندی بھی نہیں تھی۔ وی سی آر کے بعد سی ڈی پلیئر اور پھر ڈی وی ڈی آیا جس نے معیار کو زمین سے آسمان پر پہنچا

دیا۔فرق اتنا زیادہ تھا کہ لوگ روایتی کیسٹ بلکہ سی ڈی کو بھی بھول گئے۔اب معیار ڈی وی ڈی ہے۔اگرچہ یہ بھی حرفِ آخر نہیں ہے اس سے بھی آگے بلورے اور دوسرے ورژن آچکے ہیں۔

انسان دو آنکھوں سے دیکھتا ہے۔اگر کسی کی ایک آنکھ ہو یا آدمی دو کے بجائے صرف ایک آنکھ سے دیکھے تو اسے دو بعدی منظر کہتے ہیں۔یعنی دیکھنے والے کو صرف لمبائی چوڑائی کا احساس ہوگا۔آپ چاہیں تو خود بھی یہ تجربہ کرکے دیکھ سکتے ہیں۔جب انسان دو آنکھوں سے دیکھتا ہے تو منظر اسے سہ بعدی نظر آتا ہے۔اس میں لمبائی اور چوڑائی کے ساتھ گہرائی کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔انگریزی میں اسے تھری ڈائمینشل یا تھری ڈی ایفکٹ کہتے ہیں۔جب سادہ فوٹوگراف ایجاد ہوئے تو تصویر میں انسان سہ بعدیت پیدا کرنے سے قاصر تھا اس لیے اس نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں۔لیکن جب مووی بنی اور انسان نے اسے دیکھا تو اس میں اسے گنجائش نظر آئی۔

مووی کو تھری ڈی کرنے کی کوششوں کا آغاز فلم سازی کے ابتدائی دور میں ہوگیا تھا اور بعض تھری ڈی مووزیز 1915 میں تیار ہوئی تھیں مگر یہ اپنا تاثر چھوڑنے میں ناکام رہیں۔اس وقت ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ ایسے کیمرے ایجاد کیے جاتے جو سہ بعدی مووی بنا سکتے۔وقت کے ساتھ ساتھ ٹیکنالوجی میں ترقی ہوتی رہی۔دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا دور آیا تو مووی کیمروں پر بھی اس کا اثر نظر آیا تھا۔اس وقت تھری ڈی مووی کے لیے دوبارہ کوشش کی گئی۔1950 میں اس سلسلے میں سنجیدہ کوششیں شروع ہوئیں۔مگر اس وقت بھی آلات اتنے ترقی یافتہ نہیں ہوئے تھے۔دوسرے تھری ڈی کے آلات نہایت مہنگے تھے اور اس میں فلم بنانے کا عمل نہ صرف مہنگا بلکہ پیچیدہ بھی تھا اس لیے تھری ڈی موویز بنیں لیکن اپنا اثر نہ چھوڑ سکیں۔

اس میدان میں صحیح ترقی اس وقت ہوئی جب ڈیجیٹل آلات بنے۔اسی اور نوے کی دھائی میں ڈیجیٹل سینما معروف نام بن گیا جہاں لوگ مخصوص عینکیں پہن کر تھری ڈی فلم سے لطف اندوز ہونے لگے۔اس میں لمبائی چوڑائی کے ساتھ گہرائی کا احساس بھی ہوتا تھا۔وقت کے ساتھ ساتھ اس شعبے میں مزید ترقی ہوئی۔پروجیکٹر کا دور ختم ہوا اور ڈیجیٹل سینما آگئے۔ان میں ٹی وی جیسی بڑی سی اسکرین ہوتی ہے جس پر مووی چلتی ہے اور معیار وہی ہے جو اعلیٰ درجے کے ایل ای ڈی ڈسپلے کا ہوتا ہے۔جب کہ پروجیکٹر کی مدد سے دکھائی جانے والی فلم کا معیار کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس میں حقیقی رنگ اور تاثر نہیں آتا تھا۔ڈیجیٹل سینما کی آمد سے تھری ڈی کا معیار بھی بڑھ گیا ہے اور اب یہ تقریباً حقیقت کے قریب جا پہنچا ہے۔تھری ڈی مووی دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ منظر کا ایک حصہ ہے اور یہ سب اس کے آس پاس چل رہا ہے۔

ہزاروں سال پہلے انسان نے عکس دیکھا اور پھر آنے والے انسان نے اسے محفوظ کرنے کے بارے میں سوچا۔آج انسان تھری ڈی کی حد تک آپہنچا ہے لیکن یہ تھری ڈی بھی آخری حد نہیں ہے۔اگلی منزل ہولوگراف ہے جو ہماری زندگی میں بہت سارے شعبوں میں داخل ہوچکا ہے لیکن ابھی اسے مکمل طور پر آنے میں وقت ہے۔ہولوگراف عکس یا مووی کی ایک ایسی صورت ہے جو تین سو ساٹھ درجے کے زاویے سے ہوتی ہے۔اسے یوں سمجھیں کہ ایک تصویر صرف سامنے کا منظر دکھاتی ہے جتنا کیمرے نے شوٹ کیا ہوتا ہے جب کہ تھری ڈی اس طرح سے دکھاتی ہے جیسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن ہولوگراف اس طرح دکھاتی ہے کہ اس میں چیز آگے پیچھے ہر طرف سے نظر آتی ہے۔جیسے آپ ایک ہولوگراف کی صورت میں نظر آنے والے شخص کے چاروں طرف سے گھوم کر اسے دیکھنا چاہیں تو یہ ممکن ہے اس کا صرف سامنے کا رخ ہی نہیں بلکہ دائیں بائیں اور پیچھے کے رخ بھی اسی طرح دکھائی دیں گے جیسے ایک جیتے جاگتے اور آپ کے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ سکتے ہیں۔فرق صرف اتنا ہوگا کہ وہ اصل انسان یا منظر نہیں ہوگا بلکہ صرف اس کا عکس ہوگا۔

ہولوگراف کے لیے دستیاب واحد چیز لیزر ہے لیکن یہ بہت مہنگی اور مشکل چیز ہے۔اس کے باوجود اس شعبے میں رفتہ رفتہ ترقی ہو رہی ہے۔جلد مارکیٹ میں ایسے کمپیوٹر دستیاب ہوں گے جو مکمل طور پر ہولوگراف کی مدد سے کام کریں گے۔ہولوگراف ٹی وی اور سینما وجود میں آئیں گے اور نہ جانے ترقی کی یہ دوڑ ہمیں کہاں تک لے جائے گی۔ہولوگراف موبائل فون تو وجود میں آچکا ہے۔بس دیکھیے اور اش اش کرتے رہیے۔



# شہر گزشت

امین بھایانی

وقت نے کس تیزی سے کراچی کی شکل بدلی ہے کہ یوں محسوس ہورہا ہے جیسے سب کچھ بدل گیا ہے۔ انسانی نفسیات، عادت واطوار، غوروفکر کا انداز، کیا نہیں بدلا ہے۔ ماضی میں جھانکیں تو آپ کو یکسر مختلف کراچی نظر آئے گا، جب محلے کا ہر بزرگ نانا دادا، خالو چچا ہوتا تھا اور ہر بچہ ادب کرنا خود پر فرض سمجھتا تھا۔ یہ روشنیوں کا شہر تھا، دکانیں ساری ساری رات کھلی رہتی تھیں اور کوئی دھڑکا بھی نہیں تھا۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ برابر سے بائیک گزرجائے تو اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جائے۔ ہرطرف امن چین تھا، سکون تھا، اخوت وبھائی چارے کی فضا تھی۔

## چند سال قبل کے کراچی کی ایک لفظی تصویر

آج بھی جب میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو میری نظروں میں گزرا وقت جامد نظر آتا ہے خود کو ایک چھوٹا سا بچہ دیکھتا ہوں۔ جو اپنی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہہ رہا ہے ''جی وہ....، ابو....، وہ....، اگلی گاڑی دوپہر بارہ بجے آئے گی''۔

''اوہ اچھا، بس پھر تو کوئی فکر کی بات نہیں ابھی تو صرف دس ہی بجے ہیں۔'' ابو نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اور ہاں بھئی اپنی امی سے کہہ دو کہ وہ اگلے ڈیڑھ

ایک گھنٹے میں ساری تیاریاں مکمل کرلیں، تاکہ دیر نہ ہو۔"

میں جلدی سے امی کی طرف بھاگا جو کہ کمرے کے ساتھ ہی لگے باورچی خانے میں کھڑی قیمہ، پیاز، ثابت خشک دھنیہ اور ہری مرچیں ملے باجرے کے آٹے کے کباب تل رہی تھیں۔ ہاں ہاں بھئی....!، سن لیا ہے میں نے، جاؤ اپنے ابّو سے کہو کہ میں نے اپنی ساری تیاریاں کم وبیش مکمل کرلی ہیں۔ آلوؤں کا خشک سالن اور میٹھی پوریاں کب کی تیار بھی ہوچکیں۔ اب میں تمہارے پسندیدہ کباب تل رہی ہوں اور پھر یہ سارا کچھ ٹفن کیریئر میں بھرنے کے بعد چائے بنا کر تھرماس بھی بھرلوں گی۔"

امی کی بات سن کر میرے منہ میں ڈھیر سارا پانی بھر آیا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ بس کسی طرح سے ہم سب جلد از جلد گاڑی میں سوار ہوجائیں اور پھر گاڑی چلنے کے ساتھ ہی میں ٹفن کیریئر کے خانے میں لبالب بھرے کبابوں پر اپنا ہاتھ صاف کرنا شروع کردوں۔

کوئی دو گھنٹوں کے بعد امی، ابّو اور چھوٹے بھائی کے ہمراہ میں کراچی پورٹ ٹرسٹ ریلوے اسٹیشن کے چھوٹے سے پلیٹ فارم کے شیڈ کے نیچے سیمنٹ کے بینچ پر براجمان سامنے گزرتی ریل کی پٹریوں کے دونوں اطراف نظریں دوڑا رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر کچھ خاص بھیڑ نہ تھی۔ کچھ پانچ سات نفوس ہماری طرح سے ادھر ادھر بیٹھے ٹرین کا انتظار کررہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دور کہیں ٹرین کی سیٹی سنائی دی اور پھر ہلکی ہلکی چھک چھک کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ سیٹی اور چھک چھک کی ملی جلی آوازوں نے وہاں موجود لوگوں کو متحرک کردیا اور سب اس سمت غور سے دیکھنے لگے جہاں سے یہ آوازیں آرہی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں دور سے ٹرین کا انجن سیاہ دھواں اڑاتا نظر آیا اور پھر اپنے پیچھے لگی بوگیوں کو لئے پلیٹ فارم پر آکھڑا ہوا۔

ابّو نے ایک خالی سے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم سب کو اس میں سوار ہوجانے کا اشارہ کیا۔ ابھی ہم ریل گاڑی کی اس لمبی چوڑی سی بوگی میں اپنی اپنی نشستوں پر ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ ٹرین کی الوداعی سیٹی سنائی دی اور پھر کچھ وقفے کے بعد ایک بار پھر سیٹی بجی اور ٹرین نے دھیرے دھیرے آگے کی جانب سرکنا شروع کردیا۔ ٹرین اس ریلوے اسٹیشن سے باہر آگئی اور پھر ویسٹ وہارف روڈ کے ریلوے پھاٹک سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اب اسے جی اے الانہ روڈ کے پل سے گزرتے ہوئے اپنی منزل "وزیر مینشن" اور پھر اس سے بھی مزید آگے جانا تھا۔

یہ 70ء کی دھائی کے اواخر کے سالوں کی بات ہے۔ ہم کراچی میں نواب مہابت خانجی روڈ پر واقع کے پی ٹی گراؤنڈ (موجودہ کے پی ٹی اسپورٹس کامپلیکس) کے عین سامنے کھارادر کے علاقے پنجابی کلب میں رہا کرتے تھے۔ ہمارے گھر کی بالکنی سے جہاں سامنے کے پی ٹی گراؤنڈ نظر آتا وہیں بائیں ہاتھ پر ذرا ہی دور پورٹ ٹرسٹ ہالٹ نامی ایک بہت ہی چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن بھی دکھائی دیتا، جہاں سے کراچی سرکلر ریلوے کی لوکل ٹرینیں گزرا کرتی تھیں۔

کراچی سرکلر ریلوے، جو نام سے ہی ظاہر ہے کراچی کے گرد ایک دائرہ بناتی ہوئی گزرتی تھی۔ اگر آپ کسی بھی اسٹیشن سے کسی بھی طرف کو جانے والی لوکل ٹرین پر سوار ہو جائیں تو وہ ٹرین آپ کو پورے کراچی کی سیر کرواتی ہوئی بالآخر اسی ریلوے اسٹیشن پر واپس لے آئے گی جہاں سے آپ اس پر سوار ہوئے تھے۔

ابو مرحوم کو ٹرین اور ٹرین کا سفر بہت پسند تھا۔ اس بات کا اندازہ یوں لگائیں کہ وہ اکثر رات کے کھانے کے بعد مجھے اپنی لال رنگ کی ہنڈا ففٹی موٹر سائیکل پر سوار کروا کر گھر سے کچھ ہی دور واقع آئی آئی چندریگر روڈ پر حبیب بنک پلازہ کی عمارت کے عین سامنے قائم انگریزوں کے دور کے چٹانوں کے بڑے بڑے پتھر کاٹ کر بنائے گئے ریلوے پل پر لے جاتے اور پھر ہم دونوں باپ بیٹا اس پل سے کچھ ہی دور سٹی اسٹیشن کی تیز روشنیوں میں وہاں پر کھڑی ریل گاڑیوں اور اردگرد کی پٹریوں پر ڈیزل اور موبل آئل کی تیز بو والا سیاہ دھواں اڑا کر شنٹنگ کرتے ریلوے انجنوں کو دیر تک دیکھا کرتے۔ پتا نہیں کیوں وہ منظر مجھے اس وقت بہت اچھا لگتا تھا۔ اتنے ڈھیر سال گزرنے کے بعد بھی وہ منظر تازہ بہ تازہ سا لگتا ہے۔

ابّو مجھے ریل گاڑیوں، ان کے انجنوں اور انگریز دور میں قائم کردہ ریلوے اسٹیشنوں اور نصب کردہ ریل کی پٹریوں کے بارے میں بتاتے جاتے۔ میں نے یہ ہمیشہ محسوس کیا کہ وہ اپنے اس پسندیدہ موضوع پر متواتر بے تکان بولتے چلے جاتے اور اگر میں کبھی کوئی سوال کرلوں "ابّو یہ انجن شنٹنگ کیوں کرتے ہیں؟" تو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک بھرپور چمک دکھائی دیتی اور ان کا چہرہ ان کے اندرونی جذبات کی بھرپور عکاسی کرتا محسوس ہوتا۔ بطور خاص وہ یہ بات تو مجھے ہر بار اور بار بار



بتایا کرتے کہ ان کے بچپن میں جب وہ ٹرین میں سفر کیا کرتے تو سب بچے مل کر ٹرین کی چھک چھک چھک کی تان پر کچھ یوں گایا کرتے:

چپل پور کے چھ چھ پیسے
چپل پور کے چھ چھ پیسے
چپل پور کے چھ چھ پیسے

اکثر چھٹی والے دن جو اگر کہیں اور جانے کا موڈ نہ ہو رہا ہو تو پھر وہ مجھے صبح ہی صبح گھر کے سامنے والے پورٹ ٹرسٹ ہالٹ کے اسٹیشن دوڑا دیا کرتے کہ جاؤ اور ٹکٹ گھر سے معلوم کر کے آؤ کہ اگلی گاڑی کتنے بجے آئے گی اور آخری اسٹیشن کے ٹکٹ بھی خرید لینا۔ چونکہ خود مجھے بھی ان کی طرح سے ٹرین اور ٹرین کے سفر سے بھرپور لگاؤ تھا، لہٰذا میں دوڑتا ہوا جاتا، دوڑتا ہوا آتا اور اپنے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں انہیں اگلی گاڑی کے آنے کے وقت سے آگاہ کرتا۔

امی، ابو کا پروگرام سنتے ہی کھانے پینے کے لیے اتنا کچھ بنا لیتیں کہ ہمیں اس سارے سفر کے دوران باہر سے کچھ بھی لے کر کھانے کی ضرورت تک محسوس نہ ہوتی۔ ہم پورٹ ٹرسٹ ہالٹ کے اسٹیشن سے ریل گاڑی میں سوار ہوتے جو کراچی کے گرد دائرے میں سفر کرتی ہوئی پانچ چھ یا اس سے بھی کچھ زائد گھنٹوں میں ہمیں واپس وہیں لے آتی کہ جہاں سے ہم سب اس پر سوار ہوئے تھے۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ اس سارے سفر کے دوران ابّو کتاب پڑھتے رہتے اور گاہے بہ گاہے اپنی نظریں کتاب سے اٹھا کر ریل گاڑی کی کھڑکی کے باہر تیزی سے دوڑتے ہوئے مناظر پر ڈالتے جاتے۔ گو کہ میں بھی گھر سے اپنے ہمراہ دو تین من پسند کتابیں لے کر چلتا اور ابّو کی تقلید میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے کے ساتھ ساتھ ٹرین کی کھلی کھڑکی سے دوڑتے بھاگتے نظاروں کو وقفے وقفے سے دیکھتا جاتا لیکن پھر جلد ہی اکتا کر کتاب بند کردیتا اور پوری یکسوئی کے ساتھ لوہے کی دو عمودی سلاخیں لگی بڑی سی کھلی کھڑکی پر اپنی ٹھوڑی ٹکا کر باہر نظر آنے والے مناظر کو بڑی ہی محویت کے ساتھ تکنے لگتا۔

ہوتا کچھ یوں تھا کہ ہم جیسے ہی اپنے مقامی اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوتے تو آمنے سامنے نصب دو سیٹوں پر سب لوگ براجمان ہوجاتے۔ شاید بہت سے پڑھنے والوں کو یاد ہو کہ اس دور میں کراچی کی لوکل ریل گاڑیوں میں لکڑی کی پٹیوں سے بنے بینچ نصب ہوا کرتے تھے جس میں ایک لکڑی کی پٹی کے بعد اتنی ہی جگہ خالی ہوا کرتی اور پھر خالی جگہ کے بعد لکڑی کی دوسری پٹی نصب ہوتی۔ جبکہ چند بوگیوں میں آمنے سامنے کشن والے سیاہ ریگزین سے آراستہ آرام دہ صوفے نما سیٹیں بھی ہوا کرتیں۔ ہم کوشش کر کے کوئی ایسی ہی بوگی تلاش کرتے اور پھر جیسے ہی ریل گاڑی چلتی تو امی گھر سے لایا ہوا اپنا عمرو عیار کی زنبیل جیسا اسٹین لیس اسٹیل کا بڑا سا ٹفن کیریئر کھولتیں اور پھر اس میں سے برآمد ہونے والی سوغاتیں ہم دوران سفر مسلسل تھرماس میں بھری چائے کے ہمراہ نوش جان کرتے جاتے اور امی کے ہاتھ کے ذائقے، ریل کے دلفریب و مسحور کن سفر اور شہر کراچی کے مضافاتی علاقوں کے حسین مناظر کی شان میں قصیدے پڑھتے جاتے۔

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ہماری طرح کا کوئی خاندان جو کہ چھٹی والے دن کا لطف اٹھانے کی غرض سے ریل گاڑی کے اس "ٹور ڈی کراچی" میں ہمارا بوگی نشین ہوتا اور دیکھتے ہی دیکھتے جو معاملہ بچوں کے باہمی کھیل کود سے شروع ہوتا وہ خواتین کی باہمی گفتگو اور پھر مرد حضرات کی باہمی دلچسپی کے امور پر اظہار خیال سے ہوتا ہوا تبادلہ اشیاء خورو نوش تک جا پہنچتا اور پھر سب آپس میں یوں شیر و شکر ہو رہے ہوتے جیسے ان خاندانوں کے مابین ہونے والی آج یہ کوئی اتفاقیہ ملاقات نہ ہو بلکہ برسوں کا دوستانہ رہا ہو۔

کیا بتاؤں صاحب...! کیا دلکش منظر ہوتا تھا...!

ریل گاڑی چھک چھک چھک کرتی بقول ابّو "چپل پور کے چھ چھ پیسے" کے مدھر گیت کی تانیں اڑاتی ہوئی اپنی نپی تلی رفتار سے چلی جاری ہوتی۔ کھڑکیوں سے آتے بھیگی نم آلود ٹھنڈی ہواؤں کے دبیز جھونکے بوگی میں سوار افراد کے بالوں کو رقصاں رکھتے۔ ہم بچے بالے یا تو سیٹوں پر بیٹھے "اکڑ بکڑ بمبے بو" لوڈو، تاش یا "کوا اڑا۔ بھینس اڑی" جیسے کھیلوں میں مگن ہیں۔ خواتین باہم گھریلو و امور خانہ داری نوعیت کی گفتگو میں مشغول ہیں۔ مرد حضرات میں موسمی تغیرات، ملکی سیاست، زیر نمائش نئی فلموں اور ان میں کام کرتے فنکاروں کے ماضی کی یادگار فلموں اور ان کے شاہکار گیتوں پر بھرپور بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ بوگی کے کسی کونے پر لگی نشست پر بیٹھے چند منچلے ٹرانزسٹر ریڈیو پر ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہونے والے فلمی گیتوں سے دل پشوری کر رہے ہیں اور بوگی کی فضا میں مہدی حسن مرحوم کی مدھر آواز گونج رہی ہے:۔

کیوں ہم سے خفا ہوگئے اے جانِ تمنا

بھگے ہوئے موسم کا مزا کیوں نہیں لیتے

ملکی وسیاسی صورتحال پر ہونے والی ان بحثوں میں ابو اکثر اپنے مخالفین جو کہ ذرا سا بھی پاکستان یا پھر قیام پاکستان کی مخالفت میں کوئی ہلکی پھلکی سی بھی اختلافی بات کرتا یہ کہہ کر ہمیشہ ہی لاجواب کر دیا کرتے۔ ''ارے صاحب، بس آپ دیکھتے جائیں، ماشاء اللہ اس وقت بھی پاکستان اپنے تمام ہمسایہ ممالک کے مقابلے میں خوشحال اور ترقی یافتہ ہے۔ آنے والے وقتوں میں پاکستان مزید آگے جائے گا، حالات موجودہ صورتحال سے کہیں اور زیادہ بہتر ہوں گے اور انشاء اللہ ہم بہت ترقی کریں گے۔''

گو کہ ابو کی پیدائش 1942ء میں بھارتی ریاست گجرات کے شہر بھاؤ نگر میں ہوئی تھی اور پھر وہ چھوٹی عمر میں اپنے والدین اور دیگر بہن بھائیوں کے ہمراہ ہجرت کر کے اولین شکار پور، سندھ چلے آئے اور بعدازاں وہاں سے کراچی کا رخ کیا۔ اپنی جنم بھومی ہونے کے اعتبار سے وہ اپنی جائے پیدائش کو اکثر یاد کیا کرتے لیکن انہیں بطور خاص کراچی سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ اس کے گوشے گوشے سے واقف تھے۔

بہرکیف، گاڑی جب کسی اسٹیشن پر رکتی تو وہاں موجود کنسیشن اسٹینڈس پر زور زور سے بجتے فلمی نغمات کی گونج ٹرین کی کھڑکیوں سے کبھی تیز اور کبھی مدھم ہوتی اندر داخل ہوتی۔ گلوکار اے نیئر کا ایک گیت مجھے آج بھی یاد ہے جو میں نے پہلی بار ٹرین کی کھڑکی میں بیٹھ کر سنا، جو کسی ریلوے اسٹیشن پر قائم چائے کے کھوکھے پر رکھے ٹرانزسٹر ریڈیو پر بج رہا تھا:

ملے دو ساتھی، کھلیں دو کلیاں

دیوانہ دل ہے، دیوانہ موسم

گاڑی کے رکتے ہی ان گیتوں کے ساتھ در آنے والی دیگر آوازیں کچھ یوں ہوا کرتی تھیں۔

''چائے والا، چائے والا، چائے والا، تجگ کراری ہو رہی ہے۔ گرما گرم سموسے، آلو کے گرما گرم سموسے لے لو بھائی امرود لے لو، ملیر کا، لاڑکانہ کا، امرود لے لو حکیمی منجن، ملتے، دکھتے، پیلے اور پایوریا والے دانتوں کا اکسیر علاج، کمپنی کی مشہوری کے لیے صرف اس ٹرین میں رعایتی قیمت پر دستیاب ہے، ایک روپیہ، ایک روپیہ، ایک روپیہ، آواز دیکر طلب کریں۔''

چلیں دوستوں، تو پھر ہم سب اپنا ریل گاڑی کا سفر وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا۔

ہماری ریل گاڑی چھک چھک کرتی، سیٹی بجا بجا کر گاڑھا سیاہ دھواں اڑاتی پورٹ ٹرسٹ ہالٹ کے چھوٹے سے اسٹیشن کو دور پیچھے چھوڑتی ہوئی سائٹ اور ماری پور روڈ کو جانے والے جی اے الانہ روڈ کے پل کے نیچے سے گزرتی ہوئی ماری پور روڈ کے متوازی چلتے ہوئے وزیر مینشن ریلوے اسٹیشن کی طرف رواں دواں ہے۔ کچھ دیر وہاں ستانے اور چند ایک مسافروں کو اتارنے اور سوار کرنے کے بعد ریل گاڑی دوبارہ حرکت میں آتی ہے اور دائیں ہاتھ پر متوازی چلتے ماری پور روڈ کی دوسری طرف قائم لیاری اسپورٹس گراؤنڈ (موجودہ پیپلز اسپورٹس کامپلیکس)، ماری پور ٹرک اسٹینڈ اور کراؤن سنیما کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ بچپن ہی سے چونکہ مجھے فلموں سے کچھ خاص لگاؤ رہا، لہٰذا میری پوری کوشش ہوتی کہ میں دیکھ سکوں کہ وہاں اس وقت کس فلم کے پبلسٹی بورڈ آویزاں ہیں۔ کچھ دیر چلنے کے بعد غلامان عباس اسکول کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ریل گاڑی لیاری ندی پر بنے ہوئے ریلوے کے پل پر آ پہنچتی ہے۔ اس پل کے نیچے سے لیاری ندی کا بدبودار پانی گزرتا ہوا بائیں جانب کچھ ہی آگے بحیرۂ عرب کے سمندر میں جا گرتا ہے۔

مذکورہ مقام میرے لیے خصوصی دلچسپی کا باعث ہوتا اور میں بڑی مستعدی کے ساتھ سائٹ ایریا کی جانب بڑھتی ریل گاڑی کے بائیں جانب کی کسی نشست پر کھڑکی سے لگ کر بیٹھ جاتا اور بڑی ہی محویت کے ساتھ لیاری ندی کو دور بحیرۂ عرب کے نمکین پانیوں میں مدغم ہوتے دیکھتا۔ ریلوے پل کے عین نیچے لیاری ندی کے گندے بدبودار پانیوں میں قریبی باڑوں کی انگنت بھینسیں غسل صحت لے رہی ہوتیں۔ ان بھینسوں کو لیاری ندی کے بدبودار اور گندے پانیوں میں یوں نہاتے دیکھ کر ہمیشہ مجھے خیال آتا کہ امی ہر صبح تاکید کے ساتھ جو خالص صحت افزا اور قوت بخش دودھ ہم دونوں بھائیوں کو پلاتی ہیں اس کا منبع حفظان صحت کے تمام تر ملکی و غیر ملکی اصولوں پر پلتی یہی بھینسیں ہیں۔

ابو بتایا کرتے تھے کہ ایک دور میں یہی لیاری ندی اور اس کا پانی اس قدر صاف ستھرا ہوا کرتا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ یہاں نہانے آیا کرتے۔ پھر لوگوں نے اپنے سیوریج کے سارے نالوں کا رخ لیاری ندی کی طرف کر کے بحیرۂ عرب کے پانیوں اور اس میں بسی مخلوق کو بھی آلودہ کر دیا۔



ریل گاڑی لیاری کے علاقے کو پیچھے چھوڑتے ہوئے سائٹ ایریا میں قائم بلدیہ ریلوے اسٹیشن آ پہنچی ہے اور کچھ دیر وہاں رک کر آگے بڑھتی ہے۔ یہاں سے ریلوے لائن دو حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ سیدھی لائن ماری پور روڈ کے متوازی چلتی ہوئی وہاں قائم سمندری نمک کے کارخانوں اور پھر اس سے بھی آگے تک جاتی ہے لیکن وہ ٹریک صرف مال گاڑیوں ہی کے لیے مخصوص ہے۔ جبکہ کراچی سرکلر ریلوے کا ٹریک ماری پور والے ٹریک سے جدا ہو کر دائیں طرف کے موڑ سے جو کہ سائٹ روڈ کہلاتا تھا اور اب غالباً وہاں ناردرن بائی پاس قائم ہو چکا ہے، سائٹ ایریا میں داخل ہو جاتا ہے۔

سائٹ ایریا میں داخل ہونے کے ساتھ ہی مجھے ہمیشہ ایک فیکٹری کی چھت پر نصب ایک بہت بڑا ''ہونہار نپل، سو در اینڈ بے بی فیڈر'' کا اشتہاری بورڈ نظر آتا جس میں مخصوص انداز میں شیشے کی بنی ہوئی دودھ کی بوتل دکھائی گئی ہوتی۔ اس کے علاوہ اب جب میں طاق نسیاں میں جھانک کر دیکھتا ہوں تو مجھے ''ایکسائیڈ بیٹری'' اور سب سے بڑھ کر ایک مخصوص بو جو کہ گوار پھلی سے بنائے جانے والے گوند کے کارخانے سے پھوٹا کرتی تھی، خوب یاد آتی ہے۔

سائٹ ایریا کی ایک اور سوغات ریلوے ٹریک کے دونوں اطراف قائم فیکٹریوں کی دیواروں پر لکھے کوچنگ سینٹروں، حکیموں، نجومیوں، سنیاسی باواؤں، منجنوں، ہر بیماری کی واحد داوؤں، مقامی سنیماؤں میں نمائش پذیر فلموں کے اشتہارات، شہر بھر کی طلباء تنظیموں اور صنعتی علاقہ ہونے کے سبب مزدور یونینوں کے ہتھوڑے اور درانتی سے مزین پیغامات کی بھرمار ہوا کرتی اور مجھے وہ سب دیواری اشتہارات پڑھنا بہت ہی اچھا لگتا۔ جبکہ: ''اے ون کوچنگ سینٹر''، ''نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن''، ''جمیعت طلبہ اسلام'' اور چند اور مزدور تنظیموں وغیرہ کے وہ دیواری اشتہارات میں بڑے ہی غور سے پڑھا کرتا۔ ویسے یہ دیواری اشتہارات تو سارے کے سارے ریلوے ٹریک پر ہی میری تفریح طبع کا سامان بنے رہتے۔

سائٹ ایریا سے گزرتے ٹریک کے دونوں اطراف قائم کارخانوں میں بڑی بڑی مشینیں اور کرینیں وغیرہ یوں ساکت کھڑیں نظر آتیں کہ جیسے وہ کبھی چلیں ہی نہ ہوں اور ان تمام فیکٹریوں میں کچھ یوں ہو کا سا عالم ہوتا کہ جیسے کسی جادوگر نے اپنی جادو کی چھڑی گھما کر انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پتھر کا کر دیا ہو۔

گاڑی شیر شاہ پل کے نیچے سے گزرتی ہوئی شاہ عبداللطیف اسٹیشن کے بعد امریلی اسٹیل فیکٹری کے عقب سے ہوتی ہوئی سائٹ ریلوے اسٹیشن پر قیام کے بعد پیپسی فیکٹری، منگھوپیر روڈ، ہینو پاک موٹرز کی فیکٹری کے عقب سے گزرتی ہوئی منگھوپیر اور حبیب بینک کے اسٹیشنوں پر رک کر اورنگی نالے کے ریلوے پل سے گزرتی ہوئی اورنگی ریلوے اسٹیشن جو کہ دراصل ناظم آباد کے علاقے بڑا میدان میں ہے، پر آ کھڑی ہوتی۔

اب شروع ہوتا ہے ناظم آباد کا علاقہ۔ ٹرین ناظم آباد کے پل سے ہوتی ہوئی نارتھ ناظم آباد ریلوے اسٹیشن جا پہنچتی ہے جو کہ مجاہد کالونی میں واقع ہے۔ ٹرین آگے موسیٰ گوٹھ، گجر نالہ، اپسرا اپارٹمنٹ اور اس سے ملحقہ سراج الدولہ کالج کے پاس سے ہوتی ہوئی لیاقت آباد میں شاہراہ پاکستان کو کراس کرتی ہوئی گزرتی ہے۔ پھر ٹرین دائیں طرف الاعظم اسکوائر اور بائیں جانب کریم آباد کے علاقے میں موجود دہلی اسکول کے ساتھ ہی لیاقت آباد ریلوے اسٹیشن پر آ کر رکتی ہے۔ اب ٹرین غریب آباد ریلوے کراسنگ سے گزر کر غریب آباد کے علاقے میں داخل ہوتی ہے۔ دائیں طرف غریب آباد کا علاقہ ہے اور بائیں طرف گورنمنٹ دہلی کالج آتا ہے۔ ٹرین یاسین آباد ریلوے اسٹیشن، اسحاق آباد کو پیچھے چھوڑتی ہوئی سر شاہ سلیمان روڈ پر موجود ریلوے پل سے ہوتی ہوئی گلشن اقبال کے علاقے میں قائم گیلانی ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوتی ہے۔ پھر ٹرین کچھ اور آگے چل کر یونیورسٹی روڈ کو کراس کر کے عزیز بھٹی شہید پارک اسٹیشن جا پہنچتی ہے۔

اکثر ہم لوگ اس مقام پر پہنچ کر عزیز بھٹی شہید پارک پر اتر جایا کرتے اور پارک کی سیر کر کے دوبارہ اسی جگہ سے واپسی کی ٹرین پکڑ کر گھر روانہ ہو جاتے۔ پارک سے ملحق موجودہ سندباد پارک والی جگہ کے عین سامنے سے ٹرین راشد منہاس روڈ کراس کرتی ہوئی کراچی یونیورسٹی ریلوے اسٹیشن جا پہنچتی۔ یہ ریلوے اسٹیشن موجود الہ دین پارک کے عین سامنے واقع ہے۔ یہاں سے آگے ریل گاڑی گلستان جوہر کے علاقے میں داخل ہوتی اور موجودہ روفی ڈرائیو لیک، رابعہ سٹی بلاک 2 اور 3، بائیں طرف ایئر فورس ہیڈ کوارٹرز اور دائیں آرمی آرڈیننس ڈپو کے عین

درمیان سے گزرتی ہوئی ڈپو ہل جنکشن پر پہنچتی۔ اس جگہ سے ذرا سا ہی آگے غالباً ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری کے پاس ہل پوائنٹ نام کا ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا اور وہاں سے گزرتے ہوئے ٹرین کراچی ائیر پورٹ کے رن وے کے عین عقب سے گزرتی۔ وہاں چند چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے عقب سے پی آئی اے کے طیارے کھڑے دکھائی دیا کرتے تھے۔ یہاں سے ہماری ریل ناتھا خان پل کے نیچے سے گزرتی ہوئی بائیں طرف کو مڑ کر شاہراہ فیصل کے متوازی ملیر کی جانب آگے بڑھنا شروع ہوتی اور شاہ فیصل کالونی اور سعود آباد کے علاقوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ملیر ہالٹ اسٹیشن پہنچ کر اس سفر کی آخری منزل ملیر کینٹ پہنچتی۔

اگر جو میں بھول نہیں رہا تو یہاں سے انجن ٹرین سے کٹ کر دوبارہ اس کے پیچھے جا لگتا اور پھر یوں اس کی واپسی کا سفر شروع ہوتا۔ ابو وہاں سے واپسی کا ٹکٹ خریدتے۔ کچھ ہی دیر بعد ٹرین دوبارہ اس اسٹیشن سے روانہ ہو کر واپس شاہراہ فیصل کے متوازی بلوچ کالونی کی طرف جاتے ہوئے پہلے ڈرگ روڈ ریلوے اسٹیشن پہنچتی۔ یہ مقام مجھے بے حد پسند تھا کیونکہ یہاں سے ریل جب شاہراہ فیصل کے بالکل متوازی دوڑتی تو شاہراہ فیصل اپنی دوڑتی بھاگتی ٹریفک کے ساتھ بہت ہی بھلی معلوم ہوتی۔ ٹرین یونہی اپنا سفر کرتی شاہراہ فیصل کے ریلوے اسٹیشنوں کارساز اور شہید ملت روڈ ریلوے اسٹیشنوں پر رکتی آخرکار چنیسر ہالٹ کے اسٹیشن اور کالا پل سے ہوئی کراچی کینٹ پہنچتی۔ وہاں سے روانہ ہو کر شیخ سلطان ٹرسٹ بلڈنگ کے عقب، پی آئی ڈی سی پل اور پھر آگے ڈان اخبار کے دفتر، پاور ہاؤس ایلنڈر روڈ، اخبار جنگ کے دفتر، نیشنل بنک ہیڈ آفس، آئی آئی چندریگر روڈ کے عقب سے ہوتی ہوئی کراچی سٹی اسٹیشن پہنچتی اور پھر یہاں سے ہمارا گھر صرف ایک اسٹیشن دور رہ جاتا۔ کچھ ہی دیر میں ٹرین ٹاور کے عقب سے ہوتی ہوئی پہلے اولڈ اور پھر نیو کسٹم ہاؤس کے عقب سے گزرتی آخرکار ہماری منزل مقصود یعنی پورٹ ٹرسٹ اسٹیشن پر ہم سب کو اتار کر پھر سے آگے کو روانہ ہو جاتی۔

وکی پیڈیا کے مطابق کراچی سرکلر ریلوے 1964ء میں اپنے قیام کے پہلے ہی برس میں فوری کامیابی کے ساتھ بھرپور منافع بخش اسکیم ثابت ہوئی۔ جبکہ 70ء اور 80ء کی دہائی کے دوران یہ منصوبہ اپنے عروج پر تھا اور اس وقت روزانہ کی بنیاد پر کراچی بھر میں کل 104 ٹرینیں چلا کرتی تھیں۔ لیکن 1990ء کی دہائی کے دوران پرائیویٹ ٹرانسپورٹر مافیا، کراچی سرکلر ٹرین کے کرتا دھرتاؤں اور اسٹاف کو کرپشن میں ملوث کر کے ان کی ملی بھگت سے اسے ناکام بنانے میں کامیاب رہا اور 1994ء سے یہ نفع بخش ادارہ مالی بدحالی کا شکار رہا اور پھر آخرکار ان کی حسب منشاء 1999ء میں اسے بند کر دیا گیا۔ یوں عوام اپنی ٹرانسپورٹ کی ضروریات کے لیے فقط نجی ٹرانسپورٹروں کے رحم و کرم کے محتاج ہو کر رہ گئے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ابو مرحوم مجھے تو کراچی شہر کے حسین مناظر سے ٹرین کے اس دلفریب و یادگار سفر کی صورت روشناس کرا گئے لیکن ہم اپنے بچوں کو بھلا کیسے اس سفر کی لذت سے آشنا کر سکیں گے؟

ایک اور بات جو اکثر میرے دل میں آتی ہے اور سوچتا ہوں کہ اگر آج ابو زندہ ہوتے تو میں ان سے کہتا کہ آپ تو کہتے تھے کہ ہمارا ملک اور زیادہ ترقی کرے گا۔ اے کاش کہ آپ دیکھتے کہ آپ کا وہ زمانہ کتنا اچھا تھا اور کتنا اچھا ہوتا کہ آج بھی ہمارا شہر کراچی اور ہمارا وطن پاکستان آپ کے دور جیسا ہی ہوتا۔

لیکن میرا دل اب بھی یہ کہتا ہے کہ ابو بالکل سچ اور درست کہا کرتے تھے کہ:۔

”آنے والے وقتوں میں پاکستان اور مزید آگے جائے گا، حالات موجود صورتحال سے کہیں اور زیادہ بہتر ہوں گے اور انشاء اللہ ہم بہت ترقی کریں گے۔“ (آمین)۔

اور ایسے وقت میں ابو کی بتائی وہ ساری باتیں یاد آتی چلی جاتی ہیں کہ ہمارا یہ شہر کتنا پرانا ہے۔ کس طرح آباد ہوا۔ ریلوے پل پر بیٹھ کر ایک ایک چیز کی جانب اشارہ کرنا۔ وہ بلڈنگ کب بنی، کس نے بنائی، ایک ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے جاتے اور بتاتے جاتے۔ بچپن کا دور کئی معنوں میں اہم ہوتا ہے۔ ذہن کا کینوس کورا ہوتا ہے۔ اس وقت جو تصویر بن جائے وہ ذہن پر تا عمر قائم رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابو کی فراہم کردہ معلومات آج بھی ذہن و دل پر قائم ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ اس زمانے کے والدین کس طرح اپنے بچوں کو دوسروں سے ممتاز بنانے کے لیے اسے معلومات کا خزانہ بنا دیا کرتے تھے۔ پہلے خود وہ معلومات پڑھ کر اپنے ذہن میں منتقل کرتے اور آج...؟ ذرا سوچیے ہم جن مسائل میں گھرے ہیں اس کی وجہ نظر آ جائے گی۔



جرمنی کے ایک چھوٹے سے شہر میں طوفانِ گردباد کے بعد ایک پُراسرار لڑکا نظر آیا۔ وہ کسی پتھر کے مجسمے کی مانند ایستادہ تھا۔ وہ کون تھا، اس بارے میں بڑا تحقیق ہوئی مگر اس کا پتا لگایا نہ جاسکا۔ یہ خبر جرمن کی سرحد پار کرکے برطانیہ تک پہنچی اور انگریز ڈیوک دلچسپی لینے لگے۔ اس معما کو حل کرنے میں آدھا یورپ دلچسپی لے رہا تھا۔ اس پر کئی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ فلم بنی لیکن معما حل نہ ہوسکا کہ وہ لڑکا کون تھا۔

# وہ کون تھا؟

صائمہ اقبال

**ایک انتہائی پراسرار لڑکے کی روداد جو دوسروں سے مختلف تھا**

فصلیں ہوا کی دھن پر اس طرح رقصاں تھیں کھیتوں میں سمندری لہریں پیدا ہونے لگتیں۔ دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے کسان کھاٹ پر پڑے آرام کر رہے تھے۔

کھیتوں سے کچھ پرے نورمبرگ کا پکی سڑکوں والا شہر تھا۔ اس کے بالائی حصہ پر رتیلے پتھروں سے بنا شاہی قلعہ خاموش کھڑا تھا۔ وہاں کے باسی صلح جو تھے اور اپنے مکانوں کی تکون چھتیں سرخ اینٹوں سے بنایا کرتے۔

یہ مئی 1828 کی بات ہے اس وقت تک نورمبرگ کو

جرمنی کے پرسکون شہروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اُن برسوں میں وہ توجہ کا مرکز بھی نہیں تھا۔ خال خال ہی اس کا تذکرہ آتا مگر اب صورتحال بدلنے کو تھی... شہر میں ایک عجیب واقعہ رونما ہونے کو تھا۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ شہر کا مرکزی چوراہا خاموش تھا۔ درختوں سے بندھے مویشی جگالی میں محو تھے۔ بلیاں چبوتروں پر ستانے کو لیٹ گئی تھیں۔ چھتوں پر بیٹھے کبوتروں کی بھی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

اچانک ہواؤں نے رخ بدلا۔ وہ شمال سے چلنے لگیں۔ ان میں مٹی کی ہمک تھی۔ کچھ دیر بعد دھول کا طوفان شہر پر حملہ آور ہوگیا۔ بلیاں کونوں کھدروں میں گھس گئیں۔ کبوتروں نے درختوں میں پناہ لی۔ مکانوں کی کھڑکیاں بند ہوگئیں۔

طوفان گزر گیا تو لوگ اپنی کھڑکیوں میں آ کھڑے ہوئے۔ جس پہلی شے نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی، وہ ایک نوجوان تھا جو کسی بت کی مانند چوک کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔

اس کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں ٹوپی، دوسرے میں رقعہ۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مکانات کو دیکھ رہا تھا۔

نوجوان اجنبی معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی اور دنیا کی مخلوق ہو۔

لوگ اس امید پر کھڑے رہے کہ شاید وہ کچھ کہے، کسی کا پتا پوچھے، مگر وہ یونہی خاموش کھڑا رہا۔ وہ صحرا میں موجود اکلوتے درخت کی مانند دکھائی دیتا تھا۔

بالآخر وچ مین نامی ایک موچی آگے بڑھا۔ اُسے اپنی سمت آتا دیکھ کر بھی نوجوان کے تاثرات میں تبدیلی نہیں آئی۔ نظریں بدستور چھتوں پر ٹکی تھیں۔

اجنبی کے نزدیک آنے پر ایک ناگوار بو موچی کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یہ وحشت کا بے نام احساس تھا۔ اس نے لڑکے سے اس کا نام پوچھا۔

وہ بدستور نگون چھتوں کو گھور رہا تھا۔ اسی حالت میں اس کے لب وا ہوئے۔ ”گھوڑا......گھوڑا۔“

دوبارہ استفسار پر اس نے اپنا نام کاسپر بتایا۔

”کہاں سے آئے ہو لڑکے، ورزبرگ سے، میونخ سے یا ریگنز برگ سے؟“

ریگنز برگ کا نام سن کر لڑکے کے تاثرات کچھ تبدیل ہوئے۔ اس نے یہ لفظ دہرایا، جس کا موچی نے یہی مطلب لیا کہ لڑکے کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ لڑکا ماحول آہنگ ہونے میں مشکل کا شکار ہے۔ اس نے رقعے پر نظر ڈالی جسے لڑکے نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

وہ گھڑ سواروں کے چھٹے دستے کے کپتان ون ویسنگ کے نام تھا۔

”اُن کی حویلی کا راستہ جانتے ہو؟“ آدمی نے پوچھا۔ لڑکا یونہی گم صم کھڑا رہا۔

”چلو میرے ساتھ۔“ اس آدمی نے لڑکے کا ہاتھ تھام لیا۔ اب وہ اس سے لگا آگے بڑھ رہا تھا۔

جس وقت موچی حویلی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا، نوجوان دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ اس نے اپنا سر دیوار پر ٹکا دیا تھا اور غنودگی میں معلوم ہوتا تھا۔

حویلی کے منتظم نے بتایا کہ کپتان صاحب شہر سے باہر گئے ہیں، سہ پہر کے بعد لوٹیں گے۔ موچی نے اس کی توجہ لڑکے کی خستہ حالی کی جانب مبذول کروائی اور درخواست کی کہ اسے کپتان کے لوٹنے تک گھر میں انتظار کرنے کی اجازت دی جائے۔ منتظم اس پر تو راضی نہیں ہوا، البتہ اس نے اصطبل کا احاطہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔

لڑکا وہاں جاتے ہی سوکھی گھاس پر گرا اور خراٹے لینے لگا۔ لڑکے کے رویے سے پریشان ہو کر منتظم نے دو ملازمین کو اس پر نگاہ رکھنے کی ہدایت کی اور موچی کو تھانے دوڑا دیا۔

راستے میں موچی کو شہریوں کے اس غول نے دھر لیا جو اصطبل کی سمت جا رہا تھا۔ انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ہر شخص کی آنکھوں میں تجسس تھا۔ ہر کوئی اجنبی کی بابت جاننا چاہتا تھا۔

موچی نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ لڑکے کا نام کاسپر ہے اور یہ کہ وہ ریگنز برگ کا ہے۔

”کیا تمہیں یقین ہے؟“ نان بائی نے سوال کیا۔

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ابھی تو پڑا مزے سے خراٹے لے رہا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ تھانے کی سمت بڑھ گیا۔

ایسے میں ایک عورت کی آواز اس کے کان میں پڑی۔

”مجھے تو وہ ٹھگ لگتا ہے۔“

☆☆☆

کپتان کو شہر میں داخل ہوتے ہی اس عجیب نوجوان کی اطلاع مل گئی۔ یہ حجام تھا، جو بیچ سڑک پر کھڑا لوگوں کو یہ قصہ سنا رہا تھا۔

جب وہ اصطبل کے نزدیک پہنچا تو وہاں لگے جمگھٹے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لڑکا گھاس پر بے سدھ پڑا تھا۔ دائیں جانب داروغہ شہر کھڑا تھا۔ ڈاکٹر لڑکے پر جھکا ہوا تھا اور پستہ قد محرر قلم ہاتھ میں لیے ایک اسٹول پر بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ لڑکا گہری نیند میں ہے اور اس کی لاکھ کوشش کے باوجود اٹھنے کا نام نہیں لے رہا۔

”اس کے پاس میرے نام کا رقعہ تھا۔“ کپتان نے استفسار کیا۔

”ایک نہیں دو رقعے جناب۔“ افسر نے زرد اور بوسیدہ دو ورق اس کی سمت بڑھائے۔ دونوں تحریریں باریک قلم اور نیلی روشنائی سے لکھی گئی تھیں اور بے حد حیران کن تھیں۔

پہلا مراسلہ جو براہ راست کپتان کے نام تھا، اس پر کسی کا نام درج نہیں تھا۔ البتہ ایک کونے میں ”سن 1828“ اور ”باویریا کا سرحدی علاقہ“ لکھا تھا۔

نامعلوم مراسلہ نگار کے مطابق 7 اکتوبر 1812 کو اس بچے کی کفالت اسے سونپی گئی، اس وقت وہ فقط چند ماہ کا تھا۔ مراسلہ نگار ایک غریب آدمی ہے، اس کے دس بچے ہیں۔ اس کی بیوی لڑکے کو پالنا چاہتی تھی، تاہم عسرت کے باعث یہ ممکن نہیں تھا۔ لکھنے والے کے مطابق اس نے بچے کی ماں کی ہدایات کے مطابق اسے تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سکھایا اور مسیحی عقیدے کی تعلیم دی مگر اسے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھنے دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حکام کو خبر ہو۔ مراسلے کے آخری میں لکھا تھا ”لڑکا اپنے باپ کی مانند جرمن فوج کے رسالے کا سپاہی بننا چاہتا ہے۔ اب یہ کپتان ون ویسنگ پر ہے، چاہے تو اسے گھڑ سوار بنائے، چاہے پھانسی پر لٹکا دے۔“

جب کپتان مراسلہ پڑھ رہا تھا، اصطبل میں مکمل خاموشی تھی، بس محرر کا قلم چل رہا تھا۔ کپتان نے داروغہ کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہاں تذبذب تھا۔ اب وہ دوسرے رقعے کی جانب متوجہ ہوا جو زیادہ مخدوش حالات میں تھا۔ اس کا متن نسبتاً مختصر تھا۔

اس میں لکھا تھا، لڑکے کا نام کاسپر ہاؤزر ہے۔ وہ 30 اپریل 1812 کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ فوج کے چھٹے دستے میں گھڑ سوار تھا اور وہ اب مر چکا ہے۔

یہاں پہنچ کر رقعہ خاموش ہوگیا۔

”یہ غالباً لڑکے کی ماں کی جانب سے ہے۔“ داروغۂ شہر نے خاموشی توڑی۔ ”شاید اس وقت لکھا گیا ہو، جب اس نے لڑکے کو اس نامعلوم آدمی کے حوالے کیا جس نے جناب کے نام رقعہ لکھا ہے۔“

”ممکن ہے۔“ کپتان کے چہرے پر لکیریں تھیں ”مگر ایک امر پریشان کن ہے۔ دونوں مراسلوں کا خط انتہائی حد تک یکساں ہے۔“

”اچھا۔“ داروغہ نے دونوں رقعوں کا جائزہ لیا۔ ”جناب درست فرماتے ہیں۔ خاکسار کو اس معاملے سے گڑبڑ کی بو آ رہی ہے۔ آپ کا کیا حکم ہے؟“

”پہلے اسے ہوش میں تو لے آئیں۔“ کپتان یہ کہتے ہوئے لڑکے کی سمت بڑھا۔ اسے ہلایا جلایا مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ پھر اس نے بغلوں میں ہاتھ دے کر جھٹکے سے اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔

تب لڑکے نے آنکھیں کھولیں۔

”گھوڑا۔ گھوڑا۔“ اس نے اونچی آواز میں کہا۔

”اس کا بھی انتظام ہو جائے گا، پہلے اپنی کوئی خبر دو۔“ کپتان تاحال اسے سنبھالے ہوئے تھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”نام...“ لڑکے نے دھیرے سے کہا۔ ”کاسپر۔“

”تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟“ اگلا سوال۔

”میں...“ اس نے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کی۔ ”میں...اپنے باپ کی طرح گھڑ سوار بننا چاہتا ہوں۔“

”تمہارا باپ کون تھا؟“ کپتان نے پوچھا۔

لڑکا خاموش کھڑا اسے تکتا رہا۔

”کیا اس آدمی کو جانتے ہو، جو تمہیں یہاں چھوڑ گیا؟“ سوال کرنے کی ذمے داری اب داروغہ نے سنبھال لی۔

لڑکا چپ سادھے کھڑا رہا۔

”کچھ بولو بھی۔ تمہاری وجہ سے میں سیدھا یہاں چلا آیا، ابھی غسل بھی نہیں کیا۔“ کپتان نے اسے جھنجھوڑا۔

اصطبل میں موجود ہر شخص پر تجسس تھا۔ لوگ کچھ سننا چاہتے تھے۔ جاننا چاہتے تھے اور لڑکا بالکل خاموش کھڑا تھا۔ پھر ایک تبدیلی آئی...لڑکے کی آنکھ سے آنسو رواں ہوگئے۔

”شاید یہ بھوکا ہو۔“ گھر کی شفیق ملازمہ کی آواز اصطبل میں گونجی۔

کپتان سے اشارہ پا کر وہ آگے بڑھی اور لڑکے کے آگے شوربے میں تر روٹی کا ٹکڑا رکھا۔ لڑکے نے ایک بڑا سا لقمہ لیا اور اسے چبانے لگا مگر اگلے ہی لمحے اس پر کھانسی کا حملہ ہوگیا۔ اس نے روٹی تھوک دی۔

کپتان نے اسے زمین پر بٹھا دیا۔ ڈاکٹر جانچ کرنے لگا۔ اس نے لونگ بوٹ پہن رکھے تھے۔ انہیں کھینچ کر اتارا تو اس کے دونوں پیروں میں زخم دکھائی دیے۔

"یہ زخم بے تحاشہ دباؤ کا نتیجہ ہیں۔" ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ "شاید اس نے بہت بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ یا شاید اسے چلنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔"

"دوسری بات کا زیادہ اِمکان ہے" داروغہ بولا۔ "خط میں بھی تذکرہ ہے کہ اس کی اب تک کی زندگی ایک کمرے میں گزری ہے۔"

"ذرا ادھر دیکھیے جناب۔" ڈاکٹر نے کپتان کو متوجہ کیا۔ "اس کے بازو پر ویکسین کا نشان ہے۔ مطلب ہے کہ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی سرکاری دستاویز میں اس کا اندراج ضرور ہوا ہوگا۔"

"وہ مارا۔ پھر تو ہم بہ آسانی جان جائیں گے لڑکا کون ہے، کہاں سے آیا۔" یہ موچی کے الفاظ تھے۔

"گھوڑا۔ گھوڑا۔" لڑکا بڑبڑایا اور زمین پر لیٹ کر خراٹے لینے لگا۔

باہر کتوں کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ دو گھوڑے ہنہنائے اور دولتیاں جھاڑنے لگے۔ نان بائی ان کا نشانہ بن گیا۔ اگلے ہی پل وہ زمین پر آ رہا۔

ڈاکٹر اس کی طرف بڑھا۔ کتے پھر غرائے۔ حویلی میں ایک دھماکا سنائی دیا۔

"اوہ، میں تنور بجھانا بھول گئی تھی۔" ملازمہ دوڑی۔ منتظم اس کے ساتھ ہو لیا۔

صورتحال کی تبدیلی سے پریشان ہو کر کپتان نے داروغہ کو مخاطب کیا۔ "اسے جیل میں ڈال دو۔ کل دیکھتے ہیں کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ میں نے ابھی غسل بھی نہیں کیا۔"

☆☆☆

نورمنبرگ پر طلوع ہونے والا سورج حیران و پریشان تھا۔

وہ پیر کا دن تھا۔ کپتان کے حوالات پہنچنے سے پہلے ہی وہاں خاصے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ داروغہ نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ میز پر کچھ چیزیں بکھری تھیں۔

"جناب، یہ سامان لڑکے کی کوٹ اور پتلون کی جیبوں سے ملا۔" اس نے کہا۔ کپتان نے میز پر نظر دوڑائی۔ اس پر ایک پرانی وضع کا لاکٹ اور ایک پڑیا دھری تھی۔

"اس پڑیا میں کیا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"سونے کے ذرات۔" داروغہ نے کہا۔ "مگر یہ خام ہیں۔ صبح میں نے سنار سے ان کی جانچ کروالی۔"

"اور اس کتاب میں؟"

"یہ مسیح کی مناجات پر مشتمل ہے۔" افسر نے چھوٹی سی کتاب کپتان کی طرف کھسکائی۔ "غالب اِمکان ہے کہ لڑکا انہیں پڑھنا نہیں جانتا۔"

"تو پھر ان کی اس کی جیب میں موجودگی کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟" کپتان گہری سوچ میں تھا۔ "کیا یہ ہمارے لیے کوئی پیغام ہے۔ خیر، لڑکے کا کیا حال ہے؟"

"وہ بالکل شانت ہے جناب۔ آیئے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ کپتان اس کے پیچھے چلتا ہوا کوٹھری تک پہنچا۔ سلاخوں کی دوسری طرف لڑکا۔ گرد و نواح سے لاتعلق چبوترے پر بیٹھا ایک تنکے سے کھیل رہا تھا۔

"گھوڑا۔" اچانک اس نے کہا۔

"اسے کچھ کھانے کو دیا؟" کپتان نے پوچھا۔

"جی جناب۔ مگر اس نے فقط خشک روٹی قبول کی، جسے پانی کے ساتھ نگل لیا۔ اس کے سوا ہر شے اگل دی۔ شاید وہ اسی ذائقے سے آشنا ہے۔"

"عجیب بے حد عجیب۔" کپتان بڑبڑایا۔ "یہ تو پراسرار قصوں جیسا ہے۔ ایک بچہ جس کی جنگل میں جانوروں نے پرورش کی اور پھر ایک دن وہ شہر میں آ گیا۔ ایک اجنبی ماحول میں۔"

"شاید یہ جانوروں سے بھی مانوس نہیں جناب۔" داروغہ نے کہا۔ "کوٹھری پر مامور سپاہی نے بتایا کہ کل رات لڑکا بلی کو دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ طلوع آفتاب کے بعد جب پرندے چہچہانے لگے، وہ دریچے میں جا کھڑا ہوا اور کافی دیر حیران و پریشان وہیں کھڑا رہا۔"

کپتان خاموشی سے لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔

حوالات کے باہر ایک متجسس ہجوم تھا۔ لوگ دبی آواز میں ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے۔ کچھ پرے بازار میں وینج مین نامی موچی کے اڈے پر رش لگا تھا۔ جب سے لوگوں نے یہ سنا کہ موچی اُس پراسرار لڑکے سے گفتگو کرنے والا پہلا شخص ہے، وہ ٹولیوں میں اس کے پاس آ رہے تھے۔

موچی لڑکے سے اپنی ملاقات اور بعد کے حالات مزے لے لے کر سنا رہا تھا۔ "طوفان رکنے کے بعد میری نظر اس پر پڑی۔ مجھے تو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میں سیدھا اس کے پاس پہنچا۔" اس کا آہنگ بلند تھا۔ وہ داستان گو معلوم ہوتا ہے۔

"خدا رحم کرے۔ مجھے تو پورا معاملہ بے حد منحوس لگ رہا ہے۔" درزی نے کہا۔ "لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ لڑکا شیطانی طوفان سے برآمد ہوا ہے۔ حویلی میں بھی کچھ عجیب واقعات رونما ہوئے ہیں۔ سنا ہے کہ تنور کی ایک دیوار ڈھے گئی۔"

"کہہ تو تم ٹھیک ہی رہے ہو۔" قہوہ خانے کے مالک نے گردن ہلائی۔ "صبح دکان کی سمت آتے ہوئے مجھے نالے کے پاس ایک کتے کی لاش ملی، کسی جانور نے اسے اپنے تیز دھار دانتوں سے بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ میں نے پہلی بار ایسا منظر دیکھا۔"

"توہم پرستی سے دامن چھڑایئے صاحبان۔" موچی چہکا۔ "آج کے دور میں اس قسم کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ حضور ہم انیسویں صدی میں ہیں۔ ارے... آپ کون ہیں جناب، پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

موچی کا مخاطب سیاہ کوٹ پہنا ایک فربہ شخص تھا جو ہجوم میں پیچھے کی جانب کھڑا تھا۔ اس کے سر پر بڑا سا ہیٹ تھا۔

"کیا آپ مجھ سے مخاطب ہیں؟" آدمی تھوڑا جھجک رہا تھا۔

"بالکل جناب۔ آپ کا اسم گرامی؟ کہاں کے ہیں؟"

"میں میونخ سے آیا ہوں۔ نورمنبرگ سے گزر رہا تھا تو لڑکے کی خبر ملی، بس کن لینے چلا آیا۔"

"صحیح جگہ پہنچے آپ۔" موچی چہکا۔ "میں ہی وہ شخص ہوں، جو اسے حویلی لے کر گیا تھا۔"

اس نے ایک بار پھر وہ قصہ سنانا شروع کیا، جس کا آغاز دھول کے طوفان سے ہوتا تھا۔ سیاہ کوٹ میں ملبوس شخص سپاٹ چہرہ لیے سنتا رہا۔

☆☆☆

ناظم شہر بیلندر رمسی نے مویشی باڑے کے نزدیک ایک مینار میں اس کے قیام کا بندوبست کر دیا تھا اور دارالحکومت مراسلے روانہ کیے گئے۔ وہاں سے دو تجربہ کار معالج نورمنبرگ آئے جنہوں نے لڑکے کی جانچ کی۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی ٹانگوں کی ہڈیاں نسبتاً نرم ہیں جس کا سبب شاید یہ رہا ہو کہ اس نے اب تک کی زندگی ایک تنگ کوٹھری میں کاٹی ہے جہاں اسے چلنے پھرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ البتہ انہوں نے مجموعی طور پر کاسپر کو صحت مند قرار دیا۔

ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر شانیڈر نے بھی لڑکے کے ساتھ خاصا وقت گزارا۔ پھر یہ تحیر خیز انکشاف کیا کہ اس میں خطرے کو محسوس کرنے کی ذرہ بھر قابلیت نہیں۔ اس ضمن میں چند تجربات بھی کیے گئے۔

ایک سپاہی تلوار سونت کے سامنے آن کھڑا ہوا مگر لڑکے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سپاہی نے یوں تلوار لہرائی جیسے حملہ کرنے لگا ہو، مگر کاسپر خاموشی سے چھت کو تکتا رہا۔ ایک بار تو اس نے آگے بڑھ کر پیٹ میں تلوار گھونپ ہی دی تھی مگر مجال ہے جو اس کے تاثرات بدلے ہوں۔

پھر ایک تیر انداز کو بلایا گیا۔ وہ لڑکے کے سر کا نشانہ لے کر کھڑا ہو گیا۔ جب لڑکے نے کوئی توجہ نہیں دی، تو تیر انداز نے داروغۂ زنداں کے اشارہ پر تیر چھوڑا۔ وہ کاسپر کے سر کے پاس سے ہوتا ہے کہ لکڑی کی الماری میں گھس گیا۔ لڑکا یونہی بیٹھا رہا۔

"یہ خطرے کو محسوس کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔" ڈاکٹر شانیڈر نے ناظم شہر کو مخاطب کیا۔ "اس نے کبھی تلوار یا تیر کا تذکرہ نہیں سنا۔ وہ ان ہتھیاروں کی بابت بالکل نہیں جانتا۔"

"مگر وہ تو گھڑسوار بنانے کا آرزومند ہے۔" داروغہ نے کہا۔

"اس مدعا پر بھی میں نے خاصا غور کیا۔" ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ "میرے اندازے کے مطابق یہ الفاظ لڑکے کو اس پراسرار آدمی نے سکھائے ہیں جس نے اِسے قید کر رکھا تھا۔ قوی امکان ہے کہ اگر یہ کسی گھوڑے کو دیکھے تو اس کے پاس جانے سے انکار کر دے۔"

"آگ کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ممکن ہے اسے اس کا علم ہو۔" یہ کہتے ہوئے داروغہ نے چراغ اٹھا لیا اور اس کی لو کو لڑکے کے چہرے کے گرد گھمانے لگا۔

تلوار اور تیر کے برعکس شعلے نے لڑکے کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ اس کی آنکھیں چراغ کے ساتھ حرکت کرنے لگیں۔ پھر اس نے شعلے کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ اپنا ہاتھ جلا بیٹھا۔

اب وہ سکتے میں تھا۔ گو وہ درد سے کراہا نہیں تھا مگر اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"یہ ایک بے ضرر مخلوق ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "میری رائے ہے کہ اسے معاشرے سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کوٹھری سے نکال کر کسی بھلے خاندان کو سونپ دیا جائے جہاں یہ زندگی کو قریب سے سمجھ سکے۔"

"میرے خیال میں داروغہ صاحب کا گھر بہتر رہے گا۔" ناظم نے کہا۔ "انہیں سرکاری خزانے سے لڑکے کی دیکھ بھال کے لیے رقم عطا کر دی جائے گی۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" اینڈریسو نے جھکتے

ہوئے کہا۔

اب کاسپر ایک نئی دنیا میں تھا جہاں روشنی تھی، زندگی تھی۔ یہ اینڈریسو کا مکان تھا، جہاں وہ دن کا بڑا حصہ گزارتا۔ یہ گھرانا چار افراد پر مشتمل تھا۔ اینڈریسو، اس کی بیوی اور دو بیٹے۔ وہیں اسے اپنا پہلا دوست ملا، جس کا نام پودوسکی تھی۔ پودوسکی داروغہ کا بڑا بیٹا تھا۔ اس کی عمر آٹھ برس تھی۔

پہلے روز جب وہ کھانے کی میز پر بیٹھا تو لڑکھڑا گیا۔ اسے بغیر سہارے کے بیٹھنے کی عادت نہیں تھی۔ پودوسکی نے اس کے دونوں ہاتھ میز پر رکھوائے، تاکہ اُسے کچھ سہارا مل سکے۔ عورت نے گرم گرما سبزی کا شوربہ سامنے رکھا۔ اوروں کی دیکھا دیکھی اس نے چمچے میں شوربہ لیا مگر اگلے ہی لمحے اسے تھوک دیا۔ داروغہ کی بیوی ایک شفیق عورت تھی۔ اس نے برا نہیں منایا۔ کپڑے سے میز صاف کی اور اسے خشک روٹی پیش کی جسے وہ مزے سے چبانے لگا۔ پھر پانی سے بھرا گلاس غٹاغٹ پی گیا۔

ننھے پودوسکی نے دیکھا کہ گلاس خالی ہو چکا ہے مگر برتن تاحال کاسپر کے منہ سے لگا ہے۔

”برتن خالی ہو چکا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے گلاس لے لیا۔

”خالی؟“ لڑکے نے دہرایا۔

”ہاں۔ خالی۔“ پودوسکی نے خالی گلاس الٹ کر کے دکھایا۔ ”دیکھو اس میں کچھ نہیں ہے۔“ پھر اس نے بھرا ہوا گلاس اٹھایا۔ اسے الٹا۔ پانی زمین پر گر گیا۔ ”اور یہ بھرا ہوا ہے۔ سمجھے۔“

”بھرا ہوا۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”تمہاری اس سے گاڑھی چھنے گی۔“ عورت مسکرائی۔

اس دوران کسی بچے کے رونے کی آواز گونجی۔ عورت پالنے کی طرف گئی۔ اس کا چھوٹا بیٹا ٹانگیں چلا رہا تھا۔

کاسپر اس کی آواز غور سے سنتا تھا۔

”میرا بھائی۔“ پودوسکی نے کہا۔

”بھائی۔“ کاسپر نے اس کے الفاظ دہرائے۔

”اور میری ماں۔“ بچے نے عورت کی طرف اشارہ کیا۔

”ماں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

یہ ایک نئی شروعات تھی۔

☆☆☆

ایک حبس زدہ صبح شمالی علاقے میں ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے پورے شہر میں سنسنی پھیلا دی۔

ایک نوجوان جو پیشے کے لحاظ سے لوہار تھا، باغ میں زخمی حالت میں ملا۔ اسے طبی امداد دی گئی مگر وہ جاں برنہ ہوسکا۔

پولیس نے تفتیش شروع کی۔ پتا چلا کہ نوجوان آخری بار اپنے تین دوستوں کے ساتھ دیکھا گیا تھا جنہوں نے رات بھر شراب پی۔ خوب غل مچایا۔ پھر باغ میں سو رہے۔ نشہ ہرن ہوا تو اپنی اپنی راہ کو ہو لیے۔ لوہار بھی اپنے گھر کی سمت گیا تھا مگر وہ کبھی وہاں پہنچ نہیں سکا۔

اس پر چاقو سے وار کیے گئے تھے۔ ایک وار کاندھے پر۔ دوسرا کمر کے نچلے حصے میں۔ خون زیادہ بہنے کی وجہ سے موت ہوگئی۔

معاملہ اتنا عجیب وغریب تھا کہ کپتان وینگ نے اپنی نگرانی میں مقتول کے دوستوں سے پوچھ گچھ کی اور اس دوران ایک عجیب انکشاف ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ شراب خانے میں آنے سے پہلے وہ اس مینار کی سمت گئے تھے جہاں کاسپر ٹھہرا ہے۔

”تم وہاں کیا کرنے گئے تھے؟“ داروغہ نے سوال کیا۔

”بس تفریح کے لیے۔“ ایک ہکلایا۔

کپتان اسے گھورتا رہا۔

”وہ... ہم نے سنا تھا کہ... اس میں خوف کا احساس نہیں۔ تیر یا تلوار جیسے ہتھیاروں کی بابت کچھ نہیں جانتا۔ تو... ہم...“

اب دوسرے نے بات کا سرا پکڑا۔ ”ہم نے سوچا کہ کچھ شغل کیا جائے۔ ہم ایک بلی اور مرغا ساتھ لے گئے۔“

”اور پھر کیا ہوا؟“ کپتان نے پوچھا۔

”بلی کو دیکھ کر تو وہ نہیں گھبرایا۔ البتہ مرغے کو دیکھ...“ نوجوان نے توقف کیا۔ ”وہ بری طرح ڈر گیا۔ چیخنے چلانے لگا۔ اس نے کھڑکی سے بھاگنے کی کوشش کی۔ ہم کھڑے ہنستے رہے۔ جب وہ رونے لگا تو مرغا بغل میں داب وہاں سے نکل آئے۔ بس وہاں سے ہم سیدھے شراب خانے گئے۔“

چند ساعت کمرے میں خاموشی رہی۔ داروغہ اینڈریسو نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”میرے خیال میں اس قصے کا کاسپر سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ ہمیں اور جہتوں پر کام کرنا ہوگا۔“

”کیا اس کی کوٹھری کے باہر کوئی محافظ تعینات کیا گیا ہے؟“ کپتان نے پوچھا۔



”کیا... محافظ؟“ اینڈریسو تذبذب کا شکار دکھائی دیا۔ ”نہیں جناب۔ اور اس کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ ایک بے ضرر انسان ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔“

”ہم تاحال اندھیرے میں ہیں۔ وہاں محافظ ہونا چاہیے تھا۔“ کپتان کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ”اگر محافظ ہٹایا گیا تو مجھے اطلاع کیوں نہیں دی گئی۔“

”میں اس بابت کیا کہہ سکتا ہوں جناب۔“ داروغہ نے سر جھکا لیا۔ ”یہ ناظم شہر کے حکم پر ہوا۔ وہ دن کا وقت میرے گھر پر گزرتا ہے۔ لڑکے کو میں خود کل سہ پہر کوٹھری تک چھوڑنے گیا۔ وہ کسی کی مدد کے بغیر شہر میں نہیں گھوم سکتا۔ اسے راستوں کا قطعی علم نہیں۔“

کپتان اور داروغہ کے درمیان جاری بات چیت سے لڑکوں کو شہ ملی۔ انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو چند اشارے کیے۔

”جناب۔ ہمیں لگتا ہے کہ کل ہمارا تعاقب ہو رہا تھا۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”کیا تم نے اس شخص کا چہرہ دیکھا۔“ کپتان نے سوال کیا۔

”نہیں۔ وہ اندھیرے میں رہا۔ مگر اس کا قد کاٹھ اور چلنے کا انداز اس بدمعاش کاسپر جیسا ہی تھا۔ شاید وہ ہم سے انتقام لینا چاہتا تھا۔“

”جی ہاں۔“ دوسرا بھی بیچ میں کود پڑا۔ ”جب ہم کوٹھری سے باہر آ رہے تھے، اس نے کہا بھی تھا کہ وہ ہمیں جان سے مار دے گا۔“

”بکواس“ داروغہ چلایا۔ ”وہ اس قسم کے جملوں کی ادائیگی سے قاصر ہے۔ اسے تو انتقام کے معنی بھی نہیں پتا ہوں گے۔“

”خود پر قابو رکھو۔“ کپتان نے کہا۔ پھر وہ لڑکوں سے مخاطب ہوا۔ ”تم لوگ جا سکتے ہو۔“

لڑکے سیدھے شراب خانے گئے۔ انہوں نے مئے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور اونچی آواز میں گریہ کرنے لگے کہ کاسپر پاجی نے ان کے دوست کو قتل کر ڈالا۔

اس پراسرار لڑکے کی بابت ہر نئی خبر لوگوں کو دلچسپی سے بھر دیا کرتی تھی۔ لوگوں نے مزے لے لے کر ان کی باتیں سنیں اور شراب خانے سے نکلنے کے بعد اوروں کو اس قصے میں شریک کرنے لگے۔ رات تک یہ معاملہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکا تھا۔

## کاسپر بیسویں صدی میں

کاسپر کی موت کے لگ بھگ ڈیڑھ سو برس بعد، جب ٹیکنالوجی نے دنیا بدل دی تھی، اس معمے کو سلجھانے کی ایک بار پھر کوشش کی گئی۔

یونیورسٹی آف میونخ اور فرانسک سائنس سروس آف برمنگھم نے 1995 میں ایک مشترکہ منصوبہ بنایا۔ موت کے وقت کاسپر نے جو لباس زیب تن کر رکھا تھا، اس کے کچھ حصے جرمن سرکار کے پاس محفوظ تھے۔ ان نمونے سے لڑکے کا ڈی این اے سیمپل حاصل کیا گیا۔ ریاست بادن عرصہ ہوا جرمنی میں ضم ہوگئی تھی، مگر ایسے کئی لوگ تھے، جن کی رگوں میں شاہی خون دوڑتا تھا۔ ان کے نمونوں سے کاسپر کے نمونوں کی جانچ ہوئی۔

نتائج اگلے برس ایک جرمن میگزین میں شائع ہوئے، جس میں دعویٰ کیا گیا کہ کاسپر کا تعلق نسل بادن سے نہیں تھا۔

اس تحقیق نے اس معمے کو لگ بھگ حل کر دیا تھا، مگر کچھ برس بعد یہ رپورٹ خود ایک پہیلی بن گئی۔

2002 میں انسٹی ٹیوٹ آف فرانسک میڈیسن مینسٹر نے کاسپر کے لباس اور باقیات سے خلیوں کے نمونے لے کر ان کی جانچ کی۔ نتائج 1996 کے ٹیسٹ سے حاصل شدہ نتیجے سے کچھ مختلف تھے، جس نے ریسرچ کو تذبذب میں ڈال دیا۔ بادن گھرانے سے اس بار بھی نمونے حاصل تو کیے گئے، مگر وہ اس نوع کی پرپیچ تحقیق کے لیے ناکافی تھے۔ روایت کے مطابق بادن کی ملکہ اور ڈیوک چارلس کی بیوی کاسپر کی ماں تھی۔ اس کی قبر موجود تھی۔ محققین نے ننھے شہزادہ کی قبر کا بھی پتا چلا لیا، جسے ڈیوک کا بیٹا تصور کیا جاتا تھا۔ ڈی این اے کا حصول ممکن تھا مگر بادن خاندان نے ایسی کسی تحقیق کی اجازت نہیں دی، جس کی وجہ سے یہ کوشش نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ اگر وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ نہیں کرتے، تو بیسویں صدی کاسپر کا معاحل کر ڈالتی۔

گو لوگوں کی اکثریت نے اس پر یقین نہیں کیا، خصوصی موچی وخ مین نے تو اس کی خوب بھد اڑائی مگر کچھ ایسے بھی تھے، جنہوں نے اس پر من وعن یقین کرلیا اور لڑکے کو مغلظات بکنے لگے۔

ایک نے کہا۔ ”جب سے وہ شہر میں آیا ہے چوری کی وارداتیں بڑھ گئی ہیں۔“

دوسرے نے جملہ لگایا۔ ”مجھے تو وہ منحوس لگتا ہے۔ دیکھا نہیں، اس کی آمد کے بعد سے آٹا نایاب ہوگیا۔“

تیسرا کیوں پیچھے رہتا۔ پٹ سے بولا۔ ”نکاسی آب کا نظام بھی جواب دے گیا ہے حضور۔“

موچی کو تاؤ آ گیا۔ ”خوب، تو یہ بھی کہہ دو کہ اس کی آمد کے بعد سے شراب کا ذائقہ گھٹیا ہوگیا ہے۔ بولو۔ بولتے کیوں نہیں۔ یہ الزام بھی دھر دو کہ اس کی وجہ سے تمہاری لڑکی بھاگ گئی ہے۔“

سب چپ ہوگئے اور ایک ایک کرکے کھسکنے لگے۔

پورے ہفتے یہ واقعہ موضوع بحث بنا رہا۔ لوگوں نے گھنٹوں اس مکالمے پر صرف کیے مگر کسی ایک شہری نے بھی سیاہ کوٹ میں ملبوس اس شخص کا تذکرہ نہیں کیا جو قتل والی رات شراب خانے اور باغ کے قریب دیکھا گیا تھا۔ لوگوں نے اسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کردیا تھا۔

☆☆☆

موسم بدل گیا۔ برسات شروع ہوگئی۔ دریاؤں میں طغیانی آگئی۔

بارش کے باعث کوٹھری کی چھت ٹپکنے لگی تھی۔ چند ہفتے کاسپر داروغہ کے مکان میں رہا۔

بچے کی دوستی اور اُس کی ماں کی شفقت لڑکے کے لیے سودمند ثابت ہوئی۔

وہ تیزی سے سیکھ رہا تھا۔ انسانی اعضا کے نام اسے پودوسکی نے سکھا دیے تھے۔ سلام دعا کرنے کا طریقہ جان گیا تھا۔ میز پر بیٹھ کر کھانا نوش کرنا اب مسئلہ نہیں رہا تھا۔ خشک روٹی کے علاوہ دیگر اشیاء بھی مزے لے لے کر کھاتا۔ صبح بیدار ہونے کے بعد چہچہاتے پرندوں کو دیکھ کر دل بہلاتا۔ پہلے غسل کے وقت بہت شور مچاتا تھا۔ اس کا جسم برسوں سے پانی سے دور رہا تھا مگر اب پانی سے اس نے دوستی کرلی تھی۔ خوشی خوشی پودوسکی کے ساتھ ٹب میں بیٹھ جاتا۔ جب تک ٹھٹھرنے نہیں لگتا، ٹب سے باہر نہیں آتا۔

اس عرصے میں ناظم شہر اور کپتان وینسگ سے اس کی خاصی ملاقاتیں ہوئیں۔ کچھ فلسفی بھی اس سے ملنے آئے۔ بظاہر یہ ملاقاتیں غیر رسمی تھیں مگر یہ سب تفتیش ہی کا حصہ تھیں۔ ان ملاقاتوں کا مکمل تذکرہ دارالحکومت مراسلے کی صورت ارسال کردیا جاتا۔

تفتیش کے طفیل اس کی پراسرار کہانی کے کچھ اور گوشوں پر روشنی پڑی۔

ناظم شہر نے کاسپر سے ہونے والی طویل ملاقاتوں کے بعد سرکاری محرر اور دیگر معززین شہر کو سامنے بٹھا کر جو کہانی لکھوائی، وہ کچھ یوں تھی۔ ”کاسپر نے اپنی کل زندگی ایک تاریک کوٹھری میں گزاری۔ وہاں کا ماحول مرطوب اور سیلن زدہ تھا۔ وہاں وہ تنہا رہا کرتا تھا۔ گھاس پھونس کا ایک بستر تھا جس پر وہ سو جاتا۔ اس کی کمر کے گرد ایک چمڑے کا بیلٹ تھا جو ایک کھونٹی سے بندھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا کھلونا تھا جو غالب امکان ہے کہ ایک گھوڑا تھا۔ بس وہ سارا دن اسی سے کھیلتا رہتا۔

جب وہ صبح بیدار ہوتا تو پہلو میں پانی سے بھرا برتن اور روٹی پڑی ہوتی۔ کبھی کبھار اسے پانی تلخ معلوم ہوتا۔ اسے پی کر غنودگی طاری ہوجاتی۔ وہ گہری نیند میں چلا جاتا۔ جب بیدار ہوتا، اس کا لباس تبدیل ہوچکا ہوتا۔ ناخن اور بال تراشے ہوئے ہوتے۔

جس پہلے انسان سے اس کا سامنا ہوا وہ لمبا سیاہ کوٹ پہنے تھا۔ کالر کھڑے کیے ہوئے تھے اور بڑا سا ہیٹ سر پر تھا۔ کاسپر کی رہائی سے لگ بھگ ڈیڑھ برس پہلے اس کی آمد میں تسلسل آگیا۔ اس نے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر لکھنا سکھایا۔ سب سے پہلے اس نے اپنا نام لکھا۔ پھر کچھ اور لفظ بولنے سیکھے۔ بالآخر ایک روز وہ اسے کاندھے پر ڈال کر کوٹھری سے باہر لے آیا۔ اسے سیدھا کھڑا ہونا اور چلنا سکھایا۔ یہ کہنا سکھایا کہ میں اپنے باپ کے مانند ایک گھڑسوار بننا چاہتا ہوں۔

اور پھر ایک روز وہ بدمعاش اسے نورمنبرگ کے چوراہے پر چھوڑ کر چلتا بنا۔“

جب ناظم کاسپر کا قصہ کہہ چکا اور محرر نے اسے قلم بند کرلیا، تب کمرے میں موجود سرکاری عہدے داروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

کپتان نے ناظم کو مخاطب کیا۔ ”کیا آپ اس قصے پر یقین کرتے ہیں جناب؟“

”مجھے اس پر اعتراض کا کوئی سبب نظر نہیں آتا محترم۔“ ناظم نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اور آپ کی کیا رائے ہے؟“ اس نے داروغہ کو مخاطب کیا۔



”وہ مجھے بے ضرر اور معصوم نظر آیا۔“ اس نے جواب دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر کپتان نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”اگر وہ بے ضرر ہے تو اسے معاشرے کا حصہ بننے کا پورا پورا حق ہے، مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی کفالت کی ذمے داری قبول کرے۔ اپنے گزربسر کا امکان پیدا کرے۔ حکومت اس کا خرچا نہیں اٹھا سکتی۔“

”مگر اس کی حالت دیکھتے ہوئے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنا دھیان رکھ سکتا ہے، دوراندیشی نہیں۔“ ناظم نے اعتراض کیا۔

”آپ نے درست کہا مگر ہمیں کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کرنا ہوگا۔“ کپتان کھڑا ہوگیا۔ ”اس ضمن میں ہم اگلی نشست میں بات کریں گے۔“

تمام صاحبان ایک ایک کرکے اٹھے اور اپنے راستوں پر ہولیے۔ ہر ایک کے ذہن میں یہی خیال تھا کہ کاسپر نامی معما کافی حد تک حل ہوچکا ہے۔ بس سیاہ کوٹ والا وہ پراسرار آدمی ہاتھ آجائے، تو پوری کی پوری کہانی سامنے آجائے گی۔

ان میں کسی ایک کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ اب اس قصے میں بے حد پراسرار موڑ آنے کو ہے۔

☆☆☆

شام اتر چکی تھی۔ ہوائیں سبک اور خنک تھیں۔ خاموش دریا کے کنارے درختوں کی قطار تھی۔ شاخیں جھوم رہی تھیں۔

درختوں سے کچھ پرے، نسبتاً خشک اور اونچی زمین پر الاؤ روشن تھا۔ اس کے گرد پانچ افراد بیٹھے تھے۔ کپڑوں سے وہ محنت کش طبقے کے معلوم ہورہے تھے۔ وہ سستا تمباکو پی رہے تھے۔

”میں ابھی ابھی جنوب مغربی حصے سے لوٹا ہوں اور میرے پاس ایک بڑی خبر ہے۔“ یہ ایک تاجر تھا۔

”کیا اسی لڑکے سے متعلق؟“ سوال کرنے والا وہی موچی تھا۔

”درست پہنچے میرے عزیز۔“ اس نے گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔

”وہاں میرا جانا بادن نامی ریاست میں ہوا۔ ایک روز شراب خانے میں اس عجیب وغریب واقعے کا ذکر چھیڑا جو تمہارے شہر میں رونما ہوا ہے۔ میں نے انہیں کاسپر سے متعلق بتایا۔ یہ قصہ انہوں نے میری توقع سے زیادہ دلچسپی سے سنا اور پھر انہوں نے اس دلچسپی کی وجہ بیان کی۔“

باقی چاروں افراد ہمہ تن گوش تھے۔

تاجر نے ایک اور کش لیا۔ ”بھئی انہوں نے عجیب بات کی۔ اُن سب کا اصرار تھا کہ ہو نہ ہو، یہ لڑکا خاندان بادن کا وارث ہے۔“

”وارث؟“ موچی بری طرح چونکا۔

”بالکل۔“ تاجر نے بات جاری رکھی۔ ”انہیں یقین ہے کہ کاسپر ہاوزر نامی یہ لڑکا درحقیقت بادن کے سابق نواب چارلس کا بیٹا ہے، جو 29 ستمبر 1812 کو پیدا ہوا۔ دستیاب تاریخ یہ کہتی ہے کہ چند روز بعد وہ بچہ انتقال کرگیا تھا۔ چارلس کی اور کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ وہ 1818 میں اپنی موت تک تخت پر رہا۔ موت کے بعد اس کے چچا نواب لوئس نے اقتدار سنبھالا۔“ تاجر نے ایک اور کش لیا۔ ”اب جو انہوں نے کاسپر کے بارے میں سنا، تو سب کہنے لگے کہ ضرور یہ وہی بچہ ہے۔ دشمنوں نے چارلس کی آنکھوں میں دھول جھونکی۔ اس کا بیٹا غائب کردیا۔ یہ مشہور کردیا کہ وارث کا انتقال ہوگیا ہے۔ ایسے حالات پیدا کردیے کہ نواب اور اس کی بیوی بچے کو نہیں دیکھ سکے۔ کسی غریب کے مردہ بچے کو شاہی رسومات کے ساتھ دفنا دیا گیا اور حقیقی شہزادے کو اٹھا کر کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔“

تاجر اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر ریگنز برگ روانہ ہوگیا۔ باقی چار افراد پیدل شہر کی سمت چل پڑے۔ ان کے پاس سنانے کے لیے ایک انوکھی کہانی تھی۔

☆☆☆

نورمنبرگ میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر شخص کی زبان پر ایک ہی نام تھا۔ درس گاہوں، گرجا گھروں اور چائے خانوں میں ایک ہی موضوع زیر بحث تھا۔ لوگ ٹولیوں کی صورت داروغۂ زنداں کے گھر کا رخ کررہے تھے۔ وہ کاسپر کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے تھے۔ پورا شہر اس قصے پر یقین کرچکا تھا جو ریگنز برگ کے تاجر کے ذریعے موچی اور اس کے دوستوں تک پہنچا اور پھر پورے شہر میں پھیل گیا تھا۔

کاسپر فقط نورمنبرگ میں زیر بحث نہیں تھا، ریاست بادن میں بھی ہلچل تھی۔ ڈیوک لوئس کا تخت افواہوں سے لرز رہا تھا۔

کچھ ہی روز میں یہ قصہ پورے جرمنی میں پھیل گیا۔ ملک کے مختلف حصوں سے لوگ نورمنبرگ پہنچنے لگے۔ اُن میں اخباری نمائندے بھی تھے اور محققین بھی۔ کچھ ایسے تھے جو تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر سفر پر نکلے۔ بڑی تعداد برلن سے آنے والے سرکاری اہل کاروں کی تھی جن میں چند ایسے بھی تھے جو اس کیس پر پہلے بھی سر کھپا کر نا امید لوٹے تھے مگر حالیہ انکشاف نے ان کی نیند اڑا دی تھی۔

کیا وہ واقعی تخت بادن کا وارث تھا؟ اس سوال نے

سب میں ہیجان برپا کر رکھا تھا۔

تفتیش کا عمل طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ وہ گھنٹوں پر محیط تھا۔

کاسپر کو کمرے کے درمیانی حصے میں بٹھا کر سوالات کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ طرح طرح کے سوال ہوئے۔ کبھی تو یوں ہوتا کہ ایک افسر اپنی بات ختم نہیں کر پاتا کہ دوسرا بولنے لگتا۔

تفتیشی عمل کے دوران لڑکا شدید پریشانی کا شکار دکھائی دیا۔ اتنے لوگوں کو سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ ایک بار تو وہ اپنے بال نوچنے لگا تھا۔ ایک دو بار کپڑے اتارنے کی کوشش کی۔

ناظم شہر اور داروغہ کو اس سے ہمدردی تھی مگر وہ سرکاری کارروائی روکنے کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔ وہ چپ سادھے بیٹھے رہے۔

یہ کوششیں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئیں تو باویریا کے ممتاز قانون داں پال جوین کو اس معاملے میں دخل دینا پڑا۔ اس مرد دانا نے خود کو تفتیش تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس بارے میں سنجیدگی سے تحقیق بھی کی۔ خاندان بادن کی پوری تاریخ کھنگال ڈالی۔ اس وقت کے حالات کا جائزہ لیا جب نواب چارلس کے نوزائیدہ بچے کا انتقال ہوا تھا۔

اسے پتا چلا کہ چارلس کے بعد تخت سنبھالنے والے نواب لوئس کی ماں لوی کا کردار اس پورے واقعہ میں بے حد مشکوک رہا ہے۔ اس نے ایک روایت بھی کھوج نکالی جس کے مطابق جب نومولود شہزادے کا انتقال ہوا تھا محل کی راہ داریوں میں ایک عورت کا بھوت دیکھا گیا تھا۔ سفید لبادے میں ملبوس ہیولا... اس کے نظر آنے کے کچھ ہی دیر بعد شہزادہ غائب ہوا تھا۔ نواب چارلس کے انتقال کے بعد جب لوی کا بیٹا تخت پر بیٹھا، تب بادن کے کچھ حلقوں میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ یہ دراصل لوی تھی جس نے شہزادہ کو ایک مردہ بچے سے بدل دیا، تاکہ چارلس بے وارث رہ جائے۔ اس نے کم عمر شہزادے کو قید خانے میں ڈال دیا، کاسپر کوئی اور نہیں وہ ہی بدقسمت شہزادہ ہے۔

پال جوین ایک عقلیت پسند تھا۔ وہ شواہد اور دلائل کا رسیا تھا مگر اس کہانی کی پوری عمارت ایک افواہ پر کھڑی تھی اور اس کی تصدیق کی راہ میں کئی رکاوٹیں حائل تھیں۔ لوی کا انتقال ہو چکا تھا اور موجودہ شاہ بادن نے اپنے ایک بیان میں کاسپر کو شاہی وارث ٹھہرانے کی کوششوں کو گھٹیا مذاق قرار دے ڈالا تھا۔

اس معاملے کو لے کر جب پال آگے بڑھا تو اس پر مزید انکشافات ہوئے۔ اسے پتا چلا کہ اگرچہ ملکہ اپنے مردہ بیٹے کو نہیں دیکھ سکی تھی کہ اس وقت وہ بہت علیل تھی مگر شہزادے کی موت کے وقت شاہی خاندان کے دیگر افراد موجود تھے۔ چند روایات کی رو سے اس کے باپ یعنی شاہ بادن نے اسے دم توڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ یعنی اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ علیل شہزادے کو کسی مردے بچے سے بدل دیا ہوگا۔

پال نے کچھ ایسے ماہرین کا بھی تعاون حاصل کیا جو اہل بادن کے چہرے مہرے، رنگت اور جسمانی خدوخال سے واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے کاسپر کا جسمانی معائنہ کیا۔

طویل تحقیق کے بعد پال نے اعلان کر دیا کہ کاسپر کے تخت بادن کا وارث ہونے کا قصہ فقط افواہ ہے۔ اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ لڑکے کا قد کاٹھ، چہرہ مہرہ اہل بادن سے یکسر مختلف ہے۔ پھر یہ بھی بعید از قیاس لگتا ہے کہ اس کا باپ اور خاندان کے دیگر افراد اتنی آسانی سے دھوکا کھا گئے۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔ ”یہ خیال کہ ایک پراسرار سفید عورت نے شہزادے کو اغوا کر کے اس کی جگہ ایک مردہ بچے کو پنگوڑے میں ڈال دیا، بالکل خام ہے۔ شہزادے کی موت کے وقت اُس کے اہل خانہ کے علاوہ اس کا باپ بھی موجود تھا۔ اس نے شہزادے کو دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ یعنی یہ لڑکا، کاسپر ہاؤزر کسی طور تخت بادن کا شہزادہ نہیں ہو سکتا۔“

پال کا بیان نہ صرف جرمنی کے تمام بڑے اخبارات میں شائع ہوا بلکہ یورپ کے دیگر ممالک میں بھی زیر بحث آیا۔

اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد نورمبرگ کے معززین اور کپتان ویننگ نے پھر یہ مسئلہ اٹھایا کہ لڑکے کو اپنی کفالت کی خود ذمے داری لینی ہوگی۔ اس ضمن میں جو خیالات پیش کیے گئے، ان میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ اسے کسی سرکس کمپنی کے حوالے کر دیا جائے۔

”کاسپر دلچسپی اور توجہ کا محور ہے۔“ کپتان نے کہا۔ ”سرکس والے اس کے ذریعے بہت سا پیسا کما سکتے ہیں اور یوں وہ اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جائے گا۔“

پال نے اس خیال کو رد کر دیا۔ ”صاحبان، لڑکے کی ذہنی حالت ایسی نہیں۔ میں آپ کی اس تجویز کی مخالفت کروں گا۔“

”پھر آپ ہی فرمائیں، اس ضمن میں کیا جائے؟“ کپتان نے سوال کیا۔

”میں نے جناب جارج فریڈرچ ڈومر سے بات کی ہے۔“ پال نے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ وہ نہ صرف بلند مرتبہ شاعر اور دانشور ہیں بلکہ ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی گراں قدر خدمات انجام دے چکے ہیں۔ وہ ہی میری نظر میں ایک ایسے آدمی ہیں جو بدقسمت کاسپر کو پڑھانے کا حوصلہ اور ہنر رکھتے ہیں۔“

”لیکن جناب، مسئلہ تو اب بھی وہیں کا وہیں ہے۔“ کپتان نے بات کاٹ دی۔ ”انہیں بھی وظیفہ جاری کرنا پڑے گا۔“

”نہیں۔“ قانون دان نے گردن ہلائی۔ ”وہ رضاکارانہ طور پہ یہ کام کریں گے۔ آپ کے علم میں ہے کہ وہ ایک نیک طینت انسان ہیں۔ اس وقت بھی وہ ایک نابینا نوجوان کی کفالت کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ کاسپر کی ذمے داری اٹھا سکتے ہیں۔“

”مجھے اس میں کوئی عار نظر نہیں آتا۔“ ناظم شہر نے کہا۔

”میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔“

اجلاس میں موجود تمام افراد نے تجویز کو قبول کر لیا۔

کاسپر کو اب جارج فریڈرچ کو سونپا جانا تھا۔

اجلاس کے اختتام پر ہر شخص مطمئن تھا۔ معززین شہر کا خیال تھا کہ کاسپر کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو چکا ہے۔ تمام افواہوں کا قلع قمع ہو چکا ہے اور اب اسے ایک چھت بھی مل جائے گی۔

معززین شہر کو اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس روز بادن کے محل میں بھی ایک اجلاس جاری تھا۔ وہاں ایک فیصلہ ہوا تھا۔ کچھ افراد کو خصوصی ذمے داری سونپی گئی اور وہ لوگ تیز رفتار گھوڑوں پر سوار نورمبرگ کی سمت بڑھ رہے تھے۔

☆☆☆

شاید وہ خوابوں کی دنیا تھی۔ ہر سوں سکون۔ کتابوں کی جادوئی مہک۔ کھڑکی کے باہر ہرے بھرے درخت۔ درختوں پر چہچہاتے پرندے۔

یہ جارج فریڈرچ کا مکان تھا اور اب یہ کاسپر کا مسکن تھا۔ وہیں پیانو کے سروں سے اس کی دوستی ہوئی اور اس کے دل میں یہ ساز سیکھنے کی خواہش مچلنے لگی۔

فریڈرچ اس کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ بڑے صبر کے ساتھ پہلو میں کھڑا رہتا۔ غلطیوں کی نشان دہی کرتا۔ اگر کہیں لڑکے کو مشکل پیش آتی تو کاندھا تھپتھپاتا۔ امید بڑھاتا۔ اگر کبھی اس پر مایوسی طاری ہوتی تو اسے مزے مزے کی کہانیاں سناتا۔

اس کی ملازمہ وزلن بھی ایک شفیق عورت تھی۔ وہ کاسپر سے بہت محبت سے پیش آتی۔ فریڈرچ کے گھر مقیم نابینا لڑکے ہوزے سے بھی اس کی اچھی دوستی ہو گئی۔ پھر اس کا پرانا دوست پودوسکی اور اس کی ماں بھی وقفے وقفے سے ملنے چلے آتے۔ کبھی کبھار داروغہ اینڈریسو بھی آ جاتا۔

کاسپر تیزی سے سیکھ رہا تھا۔ اب وہ چھوٹے چھوٹے جملے بولنے لگا تھا۔ چال بھی ٹھیک ہو گئی تھی۔ تھوڑا بہت دوڑ بھی لیتا تھا۔ پروفیسر نے پہلے اسے پڑھنا سکھایا۔ لڑکے کی کارکردگی حیران کن رہی۔ چند ہی روز میں وہ الفاظ سے شناسا ہو گیا۔ جب تھوڑی پختگی آئی تو اسے پنسل تھما دی۔

گو لڑکے کا خط بہت برا تھا مگر وہ ان الفاظ کو کاغذ پر منتقل کرنے کے قابل ہو گیا تھا، جو اُس نے کتابوں میں پڑھے تھے۔

اب کاسپر کو خواب آنے لگے تھے مگر وہ خوابوں کو بھی حقیقت ہی خیال کرتا تھا۔ اگر خواب میں اُس کی کپتان ون ویننگ سے ملاقات ہوتی تو صبح ناشتے کی میز پر وہ اس کی تفصیل بیان کر رہا ہوتا۔ تب وزلن شفقت سے اس کا ہاتھ دباتی اور کہتی۔ ”پیارے وہ تو فقط ایک خواب تھا۔“

”مگر میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔“ لڑکا تذبذب کا شکار نظر آتا۔

جب تین چار بار یہ واقعہ ہوا تو پروفیسر نے ایک ماہر نفسیات سے اس موضوع پر گفتگو کی۔ وہ دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ خواب کاسپر کے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔ ممکن ہے کہ قید کے دنوں میں اُسے خواب نہیں آتے ہوں۔

”خواب میں انسان وہی چیزیں دیکھتا ہے جو اس نے عام زندگی میں دیکھ رکھی ہوں۔“ ماہر نفسیات نے کہا۔ ”خواب کا تجربہ اس تجربے سے انتہائی حد تک مماثلت رکھتا ہے، جس سے ہم عام زندگی میں گزرتے ہیں۔ کاسپر نے چوں کہ زندگی ایک کوٹھری میں گزاری۔ باہر کی دنیا سے کوئی ربط نہیں رہا، کسی انسان کو اس نے دیکھا نہیں، اس لیے وہ خواب دیکھنے کے انوکھے تجربے سے بھی محروم رہا۔“

اگلی بار جب ناشتے کی میز پر کاسپر نے کہا کہ کل وہ اور پودوسکی گرم پانی کے ٹب میں گھنٹوں بیٹھے رہے تو پروفیسر نے اسے خواب اور حقیقت کا فرق بتایا۔

کاسپر نے حیرت سے سنا۔ استاد کی باتوں پر غور کرنے کی اسے عادت تھی۔ دھیرے دھیرے وہ اس خیال سے ہم آہنگ ہو گیا اور خواب اور حقیقت میں فرق کرنے لگا۔

چند ماہ بعد جب ایک عوامی تقریب میں کاسپر لوگوں کے سامنے آیا تو وہ ایک بدلا ہوا انسان تھا۔ وہ بہت اخلاق سے لوگوں سے ملا۔ ان کی خیریت پوچھی۔ اپنی تعلیم سے متعلق بتایا۔ عشائیے میں چھری کانٹے کے ساتھ کھانا کھایا۔

اس عمل نے جہاں بہت سوں کو حیران کیا، وہیں چند ایک میں شک کے جرثومے نے بھی جنم لیا۔

یہ وہ حلقہ تھا، جو ابتدا سے کاسپر کا ناقد رہا تھا اور اسے ایک ڈھونگی تصور کرتا تھا۔ ان کی جانب سے دبے الفاظ میں یہ اعتراض اٹھایا گیا کہ علم و تہذیب سے دور رہنے والا، ایک کوٹھری میں زندگی گزارنے والا انسان اتنی تیزی سے وہ باتیں کیسے سیکھ سکتا ہے جنہیں سیکھنے میں عام حالات میں برسوں لگ جاتے ہیں، جس کے لیے ایک خاص ماحول، معاشرتی اداروں اور درس گاہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس تقریب کے بعد جہاں ناظم اور اس کے ہم خیال لڑکے کے گن گا رہے تھے، وہیں ایک کونے میں کھڑے کچھ افسر سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

تقریب میں چند پادری بھی شریک تھے۔ کاسپر کی کہانی میں وہ اب تک غیر متعلق رہے تھے مگر جب انہوں نے کاسپر کو یوں ہنستے مسکراتے دیکھا تو ایک نیا خیال انہیں سوجھا۔

نورمنبرگ کے مرکزی گرجے میں اگلی صبح خصوصی اجلاس بلایا گیا۔

بحث کا موضوع یہ تھا کہ ایک مسیحی معاشرے میں پیدا ہونے والے بچے کو مسیحی عقائد ورثے میں ملتے ہیں۔ ماں باپ اس کی تربیت کرتے ہیں۔ وہ اہل خانہ کے ساتھ گرجے جاتا ہے۔ درسی کتب مذہب سے متعلق معلومات فراہم کرتی ہیں۔ یوں اس کا عقیدہ پختہ ہوتا جاتا ہے۔ کاسپر کا معاملہ مختلف ہے۔ اسے نہ ماں باپ کی سرپرستی ملی، نہ گرجے جانا ہوا، نہ ہی کتابوں سے رشتہ رہا، تو اس کے مذہبی عقائد کس نوع کے ہوں گے؟

پادریوں کو یقین تھا کہ کوٹھری میں تنہا زندگی گزارتے ہوئے کسی نہ کسی لمحے ضرور اسے خیال آیا ہوگا کہ ایک برتر قوت ہے جو اس کی خالق ہے۔ ضرور اس نے خدا کی بابت غور کیا ہوگا۔

اجلاس میں اس موضوع پر کاسپر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ گو پروفیسر فریڈرچ نے اس کی بہت مخالفت کی۔ انہیں سمجھانے کی کوشش کہ جو حالات اور تصورات انسان کو مذہب کی جانب مائل کرتے ہیں، عقیدے کو تشکیل دیتے ہیں، کاسپر کو کبھی میسر ہی نہیں رہے، مگر پادری نہیں مانے۔

تین پادریوں پر مشتمل ٹیم پروفیسر کے گھر پہنچی۔ پورے ایک ماہ انہوں نے لڑکے سے پوچھ گچھ کی۔ طرح طرح کے سوال کیے۔

ماضی کے برعکس اب کاسپر باتوں کو سمجھ کر جواب دینے لگا تھا، مگر اس معاملے میں وہ کورا ثابت ہوا۔ وہ یہی کہتا رہا عقیدہ پر اظہار خیال کے لیے اسے مزید پڑھنے کی ضرورت ہے۔ دوسری جانب پادریوں کا اصرار تھا کہ خدا کو سمجھنے کے لیے کسی نوع کی پڑھائی لکھائی درکار نہیں۔

کئی روز تک جاری رہنے والی کوشش کے بعد پادری اوب گئے۔ انہوں نے لڑکے کو گمراہ قرار دیتے ہوئے ایک رپورٹ مرتب کی اور جرمن کلیسا کو ارسال کر دی، جس میں تجویز دی گئی کہ لڑکے کو مذہب کی تعلیم دینے کے لیے خصوصی انتظامات کیے جائیں۔

تاریخی شواہد کے مطابق کلیسا نے اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کیا۔ کچھ اقدامات بھی کیے، مگر پھر نورمنبرگ میں ایک عجب دن طلوع ہوا۔

☆☆☆

وہ ایک کہر آلودہ صبح تھی۔

17 اکتوبر 1829 کا دن قصبے کے لیے اداسی اور اکتاہٹ لے کر آیا۔ زندگی سست تھی۔ کہرے کی وجہ سے لوگ بستروں پر پڑے رہنا چاہتے تھے۔

پروفیسر کی حویلی میں بھی خاموشی تھی۔ وہ کتب خانے میں بیٹھا تھا۔ لڑکا باغ میں بوڑھی ملازمہ دزلن کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

عورت نے لڑکے کو کنویں سے پانی لانے کو کہا۔ وہ دو بالٹیاں بھر لایا اور اس کے پاس رکھ کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد پروفیسر کتب خانے سے نکلا۔ وہ موسم کا جائزہ لینے کے لیے کھڑکی کے پاس آیا۔ اچانک نظر چوکھٹ پر پڑی۔ وہاں ایک سرخ دھبا تھا۔

”خون؟“ وہ بڑبڑایا۔ پروفیسر سیدھا باغ میں گیا۔ ملازمہ گملوں پر جھکی ہوئی تھی۔

”کاسپر کہاں ہے؟“ وہ چلایا۔

”کاسپر... یہیں تو تھا۔“ عورت سیدھی ہو گئی۔ اس کی نظر پروفیسر پر پڑی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”وہ کھڑکی پر خون...“ پروفیسر نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

ملازمہ دوڑی۔ انہوں نے کاسپر کا کمرا دیکھا۔ وہاں کسی بے ترتیبی کا نشان نہیں تھا۔ پھر وہ باغ کے پچھلے حصے میں گئے۔ وہاں انہیں خون کے چند قطرے ملے۔ بغلی دروازے کی دہلیز پر بھی خون ملا۔ وہ نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے تہ خانے میں جا پہنچے۔

وہ پیاز کے ڈھیر پر بے سدھ پڑا تھا، اس حالت میں کہ ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ قمیض سرخ ہو گئی تھی۔



سانسیں چل رہی تھیں۔ لڑکا زیر لب بڑبڑ رہا تھا۔ وہ دونوں اُسے اٹھا کر کمرے تک لے آئے۔ عورت نے پانی سے زخم صاف کیے اور اس میں مرہم بھر دیا۔ پروفیسر دوڑا دوڑا پڑوسی کے گھر گیا۔

پڑوسی نے اپنے ایک لڑکے کو ڈاکٹر اور دوسرے کو حوالات کی سمت روانہ کیا۔ پہلے لڑکے نے ڈاکٹر کے دروازے پر دستک دینے سے قبل پانچ آدمیوں کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ دوسرے نے حوالات جانے سے قبل نان بائی اور درزی کی دکان پر یہ قصہ سنایا۔

داروغۂ شہر اور ڈاکٹر کے پہنچنے سے پہلے ہی پروفیسر کی حویلی کے باہر جمگھٹا لگ گیا۔

ڈاکٹر نے اسے درد کشا انجکشن دیا۔ لڑکے کا سانس بحال ہونے لگا۔

داروغہ کے پوچھنے پر پروفیسر اور اس کی ملازمہ نے واقعے سے آگاہ کیا۔

”صرف کاسپر ہی بتا سکتا ہے کہ کیا ہوا تھا۔“ پروفیسر نے آخر میں کہا۔ ”ہم اس سے لاعلم ہیں۔“

”تو ہمیں لڑکے سے بات کرنی ہوگی۔“ افسر بستر کی سمت بڑھا۔

”یہ فی الحال ممکن نہیں۔“ ڈاکٹر نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”یہ گہری نیند میں ہے۔“

پل بھر میں خبر پورے شہر میں پھیل گئی کہ لڑکے پر حملہ ہوا ہے۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ تبصرے تجزیے کیے جانے لگے۔ ہر شخص امکان کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ حقیقت جاننے کے لیے شہریوں کو شام تک انتظار کرنا پڑا۔ جب کاسپر کی حالت کچھ سنبھلی اور اس نے پولیس کو اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔

کاسپر کے مطابق وہ باغ میں بنی بینچ پر بیٹھا تھا کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ سر اٹھایا تو ایک لمبا تڑنگا آدمی جس نے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا، سامنے کھڑا تھا۔ اس کے لباس سے گوبر کی بو آ رہی تھی۔

اس نے آتے ہی حملہ کر دیا۔ پہلے جبڑے پر گھونسہ رسید کیا۔ پھر اسے لاتوں پر رکھ گیا۔ آخر میں ایک تیز دھار آلے سے وار کیا۔

”کیا تم نے اس کا چہرہ دیکھا؟“ داروغہ نے پوچھا۔

”نہیں۔“ لڑکے نے نحیف آواز میں کہا۔ ”البتہ اس نے مجھ سے کچھ کہا تھا...“

”کیا؟“ افسر آگے کو جھک گیا۔ چہرے پر تجسس تھا۔

”اس نے کہا کہ...“ لڑکے نے گہرا سانس لیا۔ ”نورمنبرگ چھوڑنے سے قبل تمہیں مرنا پڑے گا۔“

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

وہ ایک کہر آلود شام تھی۔ تین گھڑسوار شہر کی مشرقی سڑک پر سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ انہوں نے چہرے ڈھانپ رکھے تھے۔

## فوریئر، چارلس

(1772ء۔1837ء)

فرانس کا اشتراکی فلسفی۔ جس نے کئی اشتراکی تجربے آزمائے۔ اعلیٰ تعلیم کے بعد کچھ عرصہ فوج میں ملازم رہا۔ پھر اپنی ایک چھوٹی سی دکان اور ایک چھوٹا سا کارخانہ کھولا۔ بیشتر وقت مطالعہ کتب میں صرف کرتا۔ ہوتے ہوتے معاشرے کے متعلق اسے اشتراکی نظریے پر یقین ہو گیا۔ اس نظریے کی تشریح میں اس نے کئی کتابیں لکھیں، لیکن کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ آخر مشہور کتاب ”صنعت کا زمانہ“ کی اشاعت پر اس کی شہرت ہوئی۔ اس کتاب میں اس نے افلاطون کی بتائی ہوئی طرز پر ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس معاشرے کی آبادی زیادہ سے زیادہ 1620 افراد پر مشتمل ہونی چاہیے۔ عورت اور مرد بالکل آزاد ہوں، ایک خاص عمارت میں رہیں اور ہر شخص کو اس کے طبعی رجحانات اور فطری صلاحیتوں کے مطابق کام دیا جائے۔ اس نظام میں وہ تمام مصنوعی پابندیاں ختم کر دی جائیں جو تہذیب نے انسان کے دل و دماغ پر عائد کر رکھی ہیں۔ یہ معاشرہ بنیادی طور پر زرعی ہو، جس میں صنعتوں کے فروغ کی مناسب گنجائش ہو۔ چند مقلدوں نے امریکا میں اس قسم کا معاشرہ قائم کرنے کی کوشش ضرور کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔

مرسلہ: زرینہ وہاب، لاس اینجلس (یو ایس)

☆☆☆

”میں نہیں کہتا تھا کہ وہ بادن کا شہزادہ ہے۔ پاجی ڈیوک نے ضرور اپنے ہرکارے بھیجے ہوں گے۔“ شراب خانے کے ایک کونے سے آواز آئی۔

قریبی میز پر بیٹھے آدمی نے کہا۔ ”چھوڑیے حضور یہ پادریوں کی حرکت ہے۔ اپنے مراسلے میں وہ اسے ملحد قرار دے چکے ہیں۔“

”پادریوں کو الزام مت دو۔“ تیسرے نے کہا۔ ”یہ شاہ بادن کے بھیجے ہوئے حملہ آور ہی تھے۔ کیا تم نے نہیں سنا؟ سرائے میں کل رات تین اجنبی آکر ٹھہرے تھے۔“

”ہاں ہاں، میں نے بھی انھیں دیکھا تھا۔“ ایک اور شخص نے کہا۔ ”موچی بھی ان کا ذکر کر رہا ہے۔“

”موچی کا تو دماغ چل گیا ہے۔ میں بتا رہا ہوں کہ یہ پادریوں کی چال ہے۔“

شراب خانے میں کاسپر پر ہونے والا حملہ موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ ہر کوئی اپنے اپنے اندازے لگا رہا تھا۔

شہر کے بازاروں میں بھی اسی معاملے پر بات ہو رہی تھی۔ ناظم شہر نے خصوصی اجلاس بلوایا۔ کپتان نے شہر کے داخلی حصوں پر مامور سپاہیوں کی خوب خبر لی تھی۔

اکثریت تو کاسپر کی ہمدرد تھی۔ البتہ قانون دان پال جوین ہمدردی سے زیادہ تذبذب کا شکار تھا۔

پادریوں کی جانب سے حملے کے خیال پر تو اس نے غور کرنے کی زحمت نہیں کی۔ یہ اسے بے حد احمقانہ لگا، البتہ بادنی سپاہیوں کے معاملے نے اسے پریشان رکھا۔ اسے یقین تھا کہ کاسپر کا تعلق تخت بادن سے نہیں ہے تو حملے کا کیا جواز رہ جاتا ہے... ایک بے ضرر انسان سے کسی کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟

اسی سوچ میں غلطاں وہ ڈاکٹر کلینس مین سے ملنے گیا، جو بچوں کے علاج معالجے میں سند تصور کیا جاتا تھا۔ وہ اس کا دوست تھا۔ اس کے روبرو اپنی پریشانی دہرائی۔

ڈاکٹر نے گہرا سانس لیا۔ ”دوست۔ تم قانون دان ہو۔ تم نے کاسپر کے معاملے پر جم کر تحقیق کی۔ تمہاری رپورٹ میں نے بھی پڑھی۔ مجھے اس پر ایک اعتراض تھا، مگر اس معاملے میں تمہارا خلوص اور سنجیدگی دیکھتے ہوئے میں نے چپ رہنا بہتر جانا۔“

پال چونکا۔ ”اعتراض... کس نوعیت کا؟“

”تم نے رپورٹ میں لکھا کہ 1812 کے ماہ ستمبر میں اصلی شہزادے کا انتقال ہوا تھا اور اس پورے معاملے میں شاہی خاندان کو یوں دھوکا نہیں ہو سکتا کہ موت کے وقت اس کا باپ یعنی شاہ بادن اور دیگر افراد وہاں موجود تھے۔“

”ہاں، میں نے یہی لکھا تھا۔“ پال نے گردن ہلائی۔

”بے شک اس کی ماں وہاں نہیں تھی۔ مگر دیگر تو شہزادے کو پہچانتے تھے۔ وہ دھوکا کس طرح کھا سکتے تھے؟“

”یہ عین ممکن ہے۔“ ڈاکٹر کلینس مین نے تاسف سے گردن ہلائی۔ ”کیا تم نے کبھی غور نہیں کیا۔ ایک نوزائیدہ بچے کے چہرے مہرے میں بہت تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ دو تین ماہ میں وہ اتنا بدل جاتا ہے کہ اگر کسی نے پیدائش کے روز اسے دیکھا ہو تو پہچان نہ پائے۔ ایک معنوں میں وہ ماحول سے ہم آہنگ ہو رہا ہوتا ہے۔ تبدیلیاں قبول کر رہا ہوتا ہے۔“

پال اسے سنتا رہا۔ ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔

”ماں بیمار تھی۔ باپ پر تخت کی ذمے داری تھی۔ بادن کے محل میں سازشیں جاری تھیں۔ ممکن ہے چند خادماؤں کو خرید لیا گیا ہو — یہ درست ہے کہ شاہی خاندان کے روبرو شہزادے نے دم توڑا، وہ اسے پہچاننے کے دعوے دار ہوں گے۔ لیکن ذرا سوچو تو... شاہی لباس، شاہی پنگوڑے میں تو ہر بچہ شہزادہ ہی لگتا ہے۔ پھر یہ مت بھولو کہ بیماری انسان کی رنگت بدل دیتی ہے۔ اسے چوس لیتی ہے۔ اگر اس وقت کسی نے کوئی تبدیلی محسوس کی بھی ہوگی، تو یہی کہا ہوگا کہ یہ بیماری کی علامات ہیں۔“

پال سناٹے میں آ گیا۔ یہ نقطہ تو اسے سوجھا ہی نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے جو کچھ بیان کیا، وہ عین امکانی تھا۔ اس کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ بدقسمت کاسپر تخت بادن کا وارث ہو۔

جس وقت نورمبرگ میں یہ پریشان کن مکالمہ جاری تھا، ہزاروں کلومیٹر دور... تین گھڑسوار بادن کی فصیل کے نزدیک پہنچے۔ انہوں نے اپنی شناخت بتائی۔ پانچ سپاہیوں نے آگے بڑھ کر گھوڑوں کی باگیں تھام لیں۔ وہ نیچے اتر آئے اور چھاؤنی کی سمت بڑھنے لگے۔ اچانک تلواریں نیام سے باہر آگئیں۔ اگلے ہی لمحے تینوں کے سر تن سے جدا ہو گئے۔ سرد رات میں ریت پر خون چمک رہا تھا۔

کچھ دیر بعد بادنی سپاہیوں نے اپنی تلواریں صاف کیں اور چھاؤنی کی سمت بڑھنے لگے۔

☆☆☆

”وہ بادن کا شہزادہ نہیں جناب، فقط ایک دروغ گو ہے۔“

”ذرا دیکھیں تو، کیسے پٹر پٹر بولتا ہے۔ چھری کانٹے سے کس مہارت سے کھاتا، بھلا ممکن ہے کہ وہ کسی کوٹھری میں قید رہا ہو۔“

”حضور وہ شہریوں کو بیوقوف بنا رہا ہے۔ پہلے داروغہ کے خاندان کو چکما دیا اور اب پروفیسر صاحب کو ٹھگ رہا ہے۔“

شہر دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک جانب اس کے ہمدرد، دوسری جانب ناقد۔ اور ناقدین کے رائے میں شدت آتی جا رہی تھی۔ انھوں نے حملے کے واقعے میں بھی سقم ڈھونڈ لیے تھے۔ ان کا الزام تھا کہ لڑکے پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ یہ زخم اس کی اپنی کارستانی ہے، باغ میں اس نے خود کو زخمی کیا۔ کمرے میں گیا۔ آلہ چھپایا۔ پھر نیچے تہ خانے میں چلا گیا۔

خطرے کے پیش نظر اسے شہری مالیاتی امور کے نگران جوین ہیرنج کے گھر منتقل کر دیا گیا تھا۔

ہیرنج ایک سخت گیر آدمی تھا۔ اس کی حویلی میں اصولوں کی پاسداری لازم تھی۔ داروغۂ زنداں اور پروفیسر فریڈرچ کی رہائش گاہ کے برعکس یہ حویلی لڑکے کو راس نہیں آئی۔ وہ یہاں بے چین رہتا۔ شفیق فریڈرچ اسے باقاعدگی سے پڑھانے آتا مگر اس کا دل اب پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ ننھے پودو کی سے بھی ملاقاتیں گھٹ گئیں۔

ان ہی دنوں ایک مقامی اخبار نے خبر لگا کر ہلچل مچا دی کہ اکتوبر 1829 میں کاسپر پر حملہ کرنے والا شخص وہی پُراسرار آدمی تھا، جو کئی برس کی قید کے بعد اسے کوٹھری سے نکال کر شہر کے چوراہا پر چھوڑ گیا تھا۔

اخبار کا دعویٰ تھا کہ یہ خبر انہیں خود کاسپر نے پہنچائی ہے، جس کا اصرار ہے کہ اُس نے آدمی کی آواز پہچان لی تھی۔

اس خبر نے شہری انتظامیہ کو تذبذب میں ڈال دیا۔ ہیرنج بہت پیچ پا ہوا۔ اس کا موقف تھا کہ کاسپر کو یہ بات اسے بتانی چاہیے تھی، براہ راست اخباری نمائندے سے رابطہ کرنے کا عمل انتہائی غیر ذمے دارانہ ہے۔ اس نے لڑکے کو بے نقط سنائی۔

لڑکے نے اپنی صفائی میں کہا کہ اس کا اس خبر سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ کبھی کسی اخبار کے دفتر نہیں گیا مگر اس معاملے میں اخبار کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ ایسے کئی گواہ تھے، جنہوں نے لڑکے کو اس سہ پہر اخبار کے دفتر کی سمت جاتے دیکھا۔

اس واقعے نے کاسپر کے ناقدین کو ایک اور موقع دے دیا۔ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ جس لڑکے کو بے ضرر اور معصوم تصور کیا جا رہا ہے، وہ جھوٹ بولنے کی بھرپور قابلیت رکھتا ہے۔ کیا خبر وہ ماضی میں بھی دروغ گوئی سے کام لیتا رہا ہو۔

پھر یہ افواہ اڑی کہ نیک طینت پروفیسر جارج فریڈرچ ایک نجی محفل میں یہ تسلیم کر چکا ہے کہ لڑکا جھوٹ بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ افواہ کے مطابق پروفیسر نے اپنے دوست کو چند واقعات بھی سنائے۔

جب اس ضمن میں پروفیسر سے رابطہ کیا گیا، تو وہ بالکل خاموش رہا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس کا اور کاسپر کا رابطہ دھیرے دھیرے منقطع ہونے لگا۔

ان ہی دنوں ایک برطانوی صحافی شہر میں وارد ہوا۔ اس کا تعلق لندن کے ایک موقر روزنامے سے تھا۔ اس نے ناظم کے توسط سے کاسپر سے ملاقات کی۔ واپس لوٹنے کے بعد اس نے جو خبر لگائی، اس میں نہ تو اسے بادن کا شہزادہ ٹھہرایا گیا، نہ ہی دروغ گو۔ اس نے کاسپر کو ایک ایسے بچے کے طور پر پیش کیا، جس کی جنگل میں جانوروں نے پرورش کی تھی۔

اپنی رپورٹ میں انگریز صحافی نے ایسے ایسے محیر العقول واقعات بیان کیے کہ قارئین دیوانے ہوگئے۔

اس رپورٹ نے ایک برطانوی رئیس فلپ اسٹین ہوپ کو اس کی جانب متوجہ کیا۔ رپورٹر کو ناقابل اعتبار خیال کرتے ہوئے اس نے اپنے ذرائع سے معلومات اکٹھی کی۔ جب اسے بادن کے شہزادہ کا قصہ پتا چلا، اس کا تجسس بڑھ گیا۔ اس نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا۔ جرمنی جانے والے نمائندوں کے ذریعہ نورمبرگ کے ناظم کو پیغام پہنچایا کہ وہ لڑکے کی کفالت اپنے ذمے لینا چاہتا ہے۔ ناظم نے جوابی خط روانہ کیا کہ اس میں یوں تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ کچھ قانونی پیچیدگیاں ہیں، جن کے سلجھنے تک انتظار کرنا بہتر ہے۔

فلپ ہوپ اور نورمبرگ کی انتظامیہ کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا کہ 3 اپریل 1830 کا دن طلوع ہوا، جو ایک اور پریشان کن خبر لایا۔

☆☆☆☆☆

زوردار دھما کا سنائی دیا۔

درختوں سے پرندے اڑ گئے۔ کھڑکی کے شیشے ٹوٹ گئے جوین ہیربخ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی۔ گولی چلنے کی یہ آواز بالائی منزل سے آئی تھی۔ وہ زینے کی طرف دوڑا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا، کاسپر خون میں لت پت زمین پر پڑا تھا۔ کمرے میں بارود کی بو تھی۔ وہاں دھواں بھرا ہوا تھا۔

لڑکے کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ ہیربخ اس پر جھکا اور پھر اچانک... اسے جھٹکا لگا۔

لڑکے کے ماتھے سے خون ضرور بہہ رہا تھا، مگر وہ گولی کا زخم نہیں تھا۔ قطعی نہیں۔ گو خون سے اس کی قمیص تر تھی مگر وہ ہوش میں تھا۔ قریب سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ زخم کسی نوکیلی شے کا ہے۔

جتنی دیر میں لڑکے کو طبی امداد دی جاتی، لوگ حویلی پر اکٹھے ہو چکے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اس واقعے کو گزشتہ برس کاسپر پر ہونے والے حملے سے جوڑا جا رہا تھا۔

جوں ہی پولیس کو خبر ملی، وہ دوڑی چلی آئی۔ داروغہ شہر بھی ساتھ تھا۔

لڑکے کی مرہم پٹی کے دوران ہیربخ مسلسل ٹہلتا رہا۔ وہ شدید اضطراب میں تھا۔ وہ کمرے کا باریک بینی سے جائزہ لے چکا تھا۔ کھڑکی کی بھی جانچ کرلی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جس لمحے بندوق سے گولی چلی، لڑکا کمرے میں تنہا تھا۔ وہاں کسی اور کی موجودگی غیر یقینی تھی۔ جن سپاہیوں نے کمرے اور کھڑکی کے نیچے کی زمین کا جائزہ لیا تھا، وہ بھی اسی خیال کے حامل تھے۔ بندوق سے نکلی گولی ایک دیوار میں پیوست پائی گئی۔

مرہم پٹی کے بعد لڑکے سے تفتیش شروع ہوئی۔ وہ بوکھلایا ہوا معلوم ہوتا اور بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔

"وہ آدمی... اس کا چہرہ... ہاں اس نے کہا تھا کہ میں... اس کے ہاتھ میں چاقو..."

محرر کا قلم چلتے چلتے رک جاتا۔ لڑکا کبھی اس شاخ، کبھی اس شاخ۔ ایک جگہ ٹک ہی نہیں رہا تھا۔

"خدارا چپ ہوجاؤ۔" ہیربخ چلایا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ کاسپر کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"وہاں کوئی نہیں تھا۔" آدمی نے کہا۔ اس کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔ "کھڑکی اندر سے بند ہے۔ کمرے کا دروازہ میں نے خود کھولا۔ اب سچ سچ بتاؤ گولی کیسے چلی؟"

کچھ دیر کاسپر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ "آپ نے درست کہا جناب۔ دراصل میں کچھ کتابیں لینے کے لیے کرسی پر چڑھ رہا تھا تو دیوار پر ٹنگی بندوق سے ٹکرا گیا۔۔۔ اور وہ۔۔۔ اس کے زمین پر گرتے ہی گولی چل گئی۔ صدمے سے میں زمین پر آرہا۔ میز کے کونے سے میرا ماتھا..." وہ چپ ہوگیا۔

"تو پھر تم نے جھوٹ کیوں بولا؟" آدمی نے سوال کیا۔

"میں ڈر گیا تھا۔" لڑکا ہچکیاں لے رہا تھا۔ "پچھلے حملے کو بھی لوگوں نے ڈھونگ ٹھہرایا۔ مجھے لگا، میری اس بات پر



کوئی یقین نہیں کرے گا کہ گولی خود بہ خود چل گئی۔ لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔"

آدمی کمرے سے باہر آگیا۔ وہ خاصا مضمحل معلوم ہوتا تھا۔ شام میں اُس کے گھر میں خصوصی اجلاس ہوا۔ لڑکے کو سرکاری اہل کار کے بجائے کسی عام شہری کے گھر منتقل کرنے کا خیال زیر بحث آیا۔ ہیربخ اس ضمن میں متذبذب تھا، مگر اس کی بیگم نے یہ کہہ کر بحث ختم کردی کہ اب وہ ایک لمحے بھی اس لڑکے کو برداشت نہیں کرسکتی۔ مجھے اپنے اور اپنے بچوں کی جان کا خطرہ لاحق رہے گا۔

فیصلہ ہوگیا۔ اسی شام اُسے باراون نامی تاجر کے گھر منتقل کردیا گیا۔ اُس شخص کا انتخاب قانون دان پال جوین نے کیا جو اجلاس میں شریک تھا۔ وہ لڑکے کا ہمدرد تصور کیا جاتا تھا۔

یہ کاسپر کے لیے بھاری صدمہ تھا۔ ہیربخ کے گھر دنیا جہان کی سہولیات تھیں مگر یہاں ایسا معاملہ نہیں تھا۔ تاجر کی حالت اُن دنوں پتلی تھی۔ پھر وہ کاسپر کے حوالے سے شبہات کا شکار تھا۔ اس کے ہر عمل پر شک کیا کرتا۔ ڈیڑھ ہفتے بعد جب اس نے شوریٰ کے سامنے رپورٹ پیش کی تو اس میں کاسپر کے لیے قبولیت نہیں تھی۔ ایک حصے میں اُس نے لڑکے کو دروغ گوئی کا مرتکب قرار دیا تھا۔

اس نے لکھا: "وہ بالکل میری طرح جھوٹ بول سکتا ہے جناب۔ اس معاملے میں ہم برابر ہیں۔"

☆☆☆

کاسپر پر یاسیت طاری رہنے لگی تھی۔ وہ تنہائی کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ ہیربخ کے گھر ہونے والے حادثے نے رائے عامہ کو اس کے خلاف کردیا۔ مخالفین کو تنقید کی کھلی چھوٹ مل گئی ان کے ہم خیال افراد کی تعداد بڑھنے لگی۔ ایسا نہیں تھا کہ کاسپر کے ہمدردوں نے چپ سادھ لی تھی، وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ پودو سکی اس سے ملاقات کے لیے برابر آتا۔ پروفیسر فریڈرچ نے دو تین چکر لگائے، اسے پھر سے پڑھائی کی جانب راغب کرنے کی کوشش کی، مگر کاسپر کا دل ٹوٹ گیا تھا۔

حالات اس وقت کچھ بہتر ہوئے، جب 1831 میں انگریز رئیس لارڈ اسٹیفن کی منظر میں آمد ہوئی۔ وہ نہ صرف کاسپر کی کفالت کا خواہش مند تھا بلکہ اس کا ماضی بھی بازیافت کرنا چاہتا تھا۔

اس مشکل کام کے لیے اس کے پاس پوری ٹیم تھی۔ جرمن حکومت اور نواب کے درمیان قانونی معاملات طے پاگئے۔ اس ضمن میں پال جوین نے کلیدی کردار ادا کیا۔ جس

## نبوت

نبوت انہی کو ملتی ہے جس میں اس کا حوصلہ و کردار ہوتا ہے۔ جب بنی نوع آدم گمراہی میں پڑ جاتی ہے، ایسے فعل اس میں گھر کر جاتے ہیں جو تباہی کی طرف لے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کسی بندے کو چن لیتا ہے اور اسے راہ حق بتاتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ میرے بندوں کی رہنمائی کرو۔ یہ توحید کے پیغام کی حامل ہوتی ہے اور دنیا کے تمام اسرار و رموز کو ظاہر کرتے ہوئے اسے فانی قرار دے دیا جاتا ہے کہ نبوت کی رو سے حقیقی و لابدی دنیا عرش بریں پر ہے اور یہاں صرف امتحان مقصود ہے۔ جب کسی کو نبوت ملتی ہے تو قومیں جو بگڑی ہوئی ہیں، ان کی راست روی کی وجہ سے دشمن ہوجاتی ہیں، مگر اللہ کارساز ہے وہ دشمنی کے منجدھار میں اپنے نبیوں اور رسولوں کی حفاظت کرتا ہے۔ جو کسی کی نبوت پر ایمان نہیں لاتا اس کے لیے کڑی سزا کی بشارت ہے۔ نبوت و رسالت حضور اکرمؐ پر ختم ہوچکی ہے۔

## نجار

مامون الرشید کے زمانے میں اسلام کی نامور شخصیت، نام نجار الحسن بن محمد ابو عبداللہ۔ ابتداء میں بمقام بام رہائش رکھتے تھے، پیشہ زندگی پارچہ بافی تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خدا کی دید صرف مقدس کاموں کی بجا آوری سے ہی ہوسکتی ہے۔ ان کے خیال میں زندگی حوادث ہی سے تکمیل پاتی ہے۔ ایٹم کیا ہے۔ حوادث، یہ سب بڑھتے بڑھتے خدا تک جا پہنچتے ہیں اور وہیں آخر ہے اس سے آگے کچھ نہیں ہے۔ یہی تصور ابن سینا کا تھا اور یہی نظریے بڑے بڑے دوسرے مفکرین نے پیش کیے کہ ہر چیز لاحق ہے اور خدائے واحد کی طرف بڑھتی چلی جارہی ہے۔ کیونکہ وہ حسن ازل ہے اور ہر چیز ناحق ہے، نجار کے مطابق وہ خیر کے تمام فعل کو اپنی مدد سے نوازتا ہے اور تمام فعل اس کی لعنت کا سامنا کرتے ہیں۔ ایمان خدا، رسول اور آسمانی کتب و صحیفہ کو دل سے ماننے اور ایسی دوسری باتوں پر مشتمل ہے۔ یہ بڑی پراسرار شے ہے۔ یہ بہت سی خصوصیتوں کا مالک ہے، یہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ مگر پھلتا ہے، اس کا ہر عمل تابع داری و انکساری کو سموئے ہوتا ہے۔ مگر انکاری، منکر، اسے مکمل طور پر تباہ کردیتی ہے۔ نجار کے اس علم نے پورے علوم کے گرد احاطہ کیا اور ان پر اثر ڈالا۔ یہ بشیر المصری کے شاگرد تھے۔

مرسلہ، فہیم الدین، وہاڑی

روز نواب صاحب لڑکے سے ملنے نورمنبرگ آئے، کاسپر کے مخالفین کو سانپ سونگھ گیا۔ اس کے حامی بغلیں بجانے لگے۔ کہنے لگے، ہم نہ کہتے تھے کہ لڑکا بے قصور ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو بھلا کوئی انگریز اس کے لیے یہاں کیوں آتا۔

نواب صاحب جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے کاسپر کو یقین دلایا کہ وہ جلد اس کے بچپن پر پڑا پردہ اٹھا دیں گے۔

"میں کسی کام کی ٹھان لوں تو تکمیل سے پہلے پیچھے نہیں ہٹتا۔" انہوں نے لڑکے کا کاندھا تھپکا۔

رئیس کاسپر کے کیس پر پہلے ہی خاصا کام کر چکا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ لڑکے کا تعلق ہنگری سے ہے۔ چاہے وہ کسی تخت کا وارث نہ ہو، مگر اس کی رگوں میں ہے شرفا کا خون۔ ضرور اسے خاندانی دشمنی کے بنیاد پر اغوا کیا گیا ہے۔

اس مفروضے کو ثابت کرنے کے لیے اس نے خاصے دلائل دیے، جن میں سے بیشتر لوگوں کے سر پر سے گزر گئے، مگر نورمنبرگ کی انتظامیہ خوش تھی کہ کسی نے تو لڑکے کی ذمے داری اٹھانے کی ہامی بھری۔

نواب صاحب کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ لڑکے کو اپنے ساتھ ہنگری لے جا رہے ہیں، جہاں وہ اس کے خاندان کو تلاش کریں گے۔

اس خبر نے پورے یورپ کی توجہ حاصل کی۔ نورمنبرگ سے اُن کی روانگی ایسے تھی، جیسے فوج محاذ کی سمت جا رہی ہو۔ وہ پورے تیس دن بعد جرمنی لوٹے۔

نواب صاحب خاصے مایوس تھے۔ کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوئیں، مگر وہ اس بات پر خوش نظر آئے کہ لڑکے نے وہاں کے ماحول کو شناخت کر لیا اور ہنگری کی زبان میں چند لفظ بھی ادا کیے۔

"ہم ایک چکر اور لگائیں گے۔" انہوں نے اعلان کیا۔ "اور اس بار ہم مزید تیاری کے ساتھ جائیں گے۔"

بھرپور تیاری کی گئی۔ انہوں نے اپنے ہرکاروں کی تعداد بڑھائی۔ ماہرین کے ساتھ بیٹھ کر منصوبہ بندی کی۔ نئی جہتیں، نئے امکانات تلاش کیے۔ اس بار وہ ہنگری گئے تو پورے ڈیڑھ ماہ بعد لوٹے۔

نواب صاحب کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ لڑکا گم صم نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے سفر کی کوئی تفصیل فراہم نہیں کی۔ بس یہ کہا کہ وہ خاصا تھک گئے ہیں، ابھی تو برطانیہ لوٹ رہے ہیں، اس معاملے کو پھر دیکھیں گے۔

اُن کے ہم سفروں نے بعد میں جرمن اخبارات کو بتایا کہ نواب صاحب کے ہاتھ فقط ناکامی آئی۔ ہنگری میں کوئی سراغ نہیں ملا۔ کاسپر سے متعلق بھی انہوں نے طرح طرح کی باتیں کیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہنگری میں کچھ ایسے واقعات ہوئے، جن کے باعث نواب صاحب کاسپر سے متعلق شکوک کا شکار ہو گئے ہیں۔ مثلاً انہوں نے اسے ندی میں بڑی مہارت سے نہاتے دیکھا۔ سوچیے ذرا، اس کا بچپن ایک کوٹھری میں گزرا، چند برس پہلے ہی باہر آیا۔ اب اتنے کم عرصے میں بھلا ایسی تیراکی کوئی سیکھ سکتا ہے؟ یہی نہیں جناب، اس نے ہنگری کا مقامی رقص بھی اتنی گرفت سے کیا کہ بہت سوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

نواب صاحب نے ان خبروں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ دسمبر 1831 میں اپنی روانگی سے قبل انہوں نے کاسپر کو نورمنبرگ سے پچیس کلومیٹر دور واقع شہر انسباخ کو ایک اسکول ماسٹر جارج میئر کے حوالے کر دیا۔

"لڑکے کا خرچا ماسٹر صاحب کو ملتا رہے گا۔" روانگی سے قبل انہوں نے جرمن سرکار سے کہا۔ "میں چند ماہ میں لڑکے کو لے جاؤں گا۔"

وہ چند ماہ کھنچ کر طویل ہو گئے۔ نواب صاحب لوٹ کر نہیں آئے۔ گو وہ خرچا متواتر بھجواتے رہے، مگر ان کے خطوط میں کاسپر کو برطانیہ لے جانے کے وعدے کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔

لڑکے کے لیے صورتحال بے حد گمبھیر تھی۔ وہ اب نورمنبرگ میں نہیں تھا۔ انسباخ یہ ایک نیا شہر تھا، جہاں لوگوں کی اکثریت شکی مزاج تھی۔ وہاں کے چند اخبارات نے تو یہ تک لکھ دیا تھا کہ لڑکا ایک بہروپیا ہے، اسے جیل میں ڈال دینا چاہیے۔

دور کیوں جائیں، خود اس کی دیکھ ریکھ کرنے والا ماسٹر جارج میئر متذبذب تھا۔ وہ کاسپر کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس سے سختی سے پیش آتا۔ ایک بار تو اسے چانٹا بھی رسید کر دیا۔ وہ نجی محافل میں یہ کہتا ہوا پایا گیا کہ نورمنبرگ والوں نے لڑکے کو قطعی تمیز نہیں سکھائی۔ ایک روز اس نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ وہ بہت سے معاملات میں مجھ سے جھوٹ بولتا ہے۔"

ناراضگی کے باوجود اس نے کاسپر کو اپنے گھر میں رکھا۔ اس کا ایک سبب تو اخلاقی بوجھ تھا، اگر وہ اسے نکال دیتا تو لوگ کیا کہتے۔ پھر نواب صاحب کی جانب سے ہر ماہ موٹی رقم بھجوائی جا رہی تھی۔ اس نے قانون دان پال جوین کو بھی ایک خط لکھا، جس میں درخواست کی کہ نواب صاحب کو کہہ کر لڑکے کو جلد از جلد برطانیہ روانہ کر دیا جائے۔ پال نے تسلی دلائی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے، جوں ہی سنبھلی، وہ اس کام میں جت جائیں گے۔

یہ کبھی ہو نہ سکا۔ مئی 1833 میں پال کا انتقال ہو گیا۔

کاسپر اپنا ایک بڑا ہمدرد کھو چکا تھا۔ وہ افسردہ تھا۔ دوسری جانب جارج میئر کی پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ پال جوین کے ہوتے اسے امید تھی کہ وہ معاملات سنبھالے گا، مگر اب وہ جہان فانی سے کوچ کر چکا تھا۔

ان دنوں کاسپر ایک کچہری میں نائب محرر کی نوکری کر رہا تھا۔ جب لوگوں کو پتا چلتا کہ یہ وہی لڑکا ہے، جو چند برس قبل نورمنبرگ کے ایک چوراہے میں کسی عجیب الخلقت مخلوق کی طرح کھڑا ملا تھا تو حیران ہوتے کہ وہ کتنا کچھ سیکھ گیا ہے۔ کچھ اُس کا کاندھا تھپکتے، کچھ اس پر شک کرتے۔

جارج کو خبر ملی کہ نواب صاحب کرسمس پر انسباخ آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ پھول کر کپا ہو گیا۔ سوچا، جلد اس مصیبت سے جان چھوٹ جائے گی۔ اس خوشی میں رات کو کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ مدہوش ہو کر کاسپر کو گالیاں دینے لگا۔ لڑکے کو بھی غصہ آ گیا۔ جارج نے آگے بڑھ کر دو چانٹے رسید کر دیے۔ لڑکے نے جوابی حملہ کیا تو نشے میں اس نے ڈنڈا اٹھا لیا۔ لڑکے کی خوب درگت بنائی۔ اسے گھر سے باہر دھکیل دیا۔ ساری رات وہ باغ کی بینچ پر پڑا ٹھٹھرتا رہا۔

صبح جب نشہ ہرن ہوا تو جارج کو اپنی بیوقوفی کا اندازہ ہوا۔ وہ ڈر گیا کہ اگر خبر کسی اور تک پہنچی تو وہ لوگوں کی نظروں سے گر جائے گا۔ وہ فوراً اسے گھر میں لایا، اس پر گرم کمبل ڈالا۔ چائے پیش کی۔ اس کی منت سماجت کرنے لگا کہ وہ اس بابت کسی سے کچھ نہ بولے۔

کاسپر چپ رہا۔ کچھ نہیں بولا۔ وہ ڈرا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں عجیب و غریب سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ دماغ سن ہو چکا تھا۔

رات جھاڑیوں میں اس نے ایک سایہ دیکھا تھا... اور وہ یہ سایہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

☆☆☆

وہ 14 دسمبر کی کہر زدہ صبح تھی۔

جارج نے آج چھٹی کی۔ وہ بیٹھا تمبا کو پی رہا تھا کہ اسے تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ کاسپر دوڑا چلا آ رہا تھا۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ چلایا۔

"وہ میں... کورٹ جا رہا تھا... باغ سے گزرتے ہوئے ایک آدمی نے..." اس کا سانس پھول گیا۔

جارج نے ملازمہ کو ڈاکٹر کی طرف دوڑایا۔ محلے دار کو تھانے روانہ کیا۔

کاسپر کا خاصا خون بہہ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے مرہم پٹی تو کر دی، مگر وہ زیادہ پرامید نہیں تھا۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کاسپر داروغہ کو اتنا ہی بتا سکا کہ باغ میں ایک اجنبی نے اس کے سینے میں چاقو اتار دیا۔

باغ سے آنے والے سپاہی کے ہاتھ میں چھوٹا سا ململ کا بٹوا تھا، جس میں جرمن زبان میں تحریر کردہ ایک خط تھا۔

سپاہی نے پنسل سے لکھا خط پڑھا۔ الفاظ کچھ یوں تھے:

"لڑکا تمہیں بہ خوبی بتا سکتا ہے کہ میں کون ہوں، کیسا دکھائی دیتا ہوں، کہاں سے آیا ہوں، لیکن اُسے زحمت سے محفوظ رکھنے کے لیے خود ہی کہہ دیتا ہوں کہ میں باویریا کی سرحد کے پاس، دریا کے کنارے واقع بستی کا مکین ہوں۔ میں تمہیں اپنا نام بھی بتا سکتا ہوں، جو ہے: ایم ایل اے"

"ایم ایل اے" داروغہ بڑبڑایا۔ "یہ کیسا نام ہے... کون ہو سکتا ہے؟"

ایک سسکی سنائی دی۔ یہ کاسپر تھا۔ افسر بستر پر جھک گیا۔ "نوجوان، تم پر کس نے حملہ کیا؟ وہ کون تھا؟"

"ایک پہاڑ ہے..." کاسپر نے دھیرے سے کہا۔

"پہاڑ؟ کیسا پہاڑ؟" افسر ششدایا۔

یوں لگا جیسے کاسپر نے اسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ کہتا رہا۔ "ایک پہاڑ ہے... مرد، عورتیں، بچے سب چوٹی کی سمت جا رہے ہیں۔ ایک کارواں ہے۔ اور میں بھی اس میں شامل ہوں... چوٹی پر موت منتظر ہے۔"

اس کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ جا چکا تھا۔

26 مئی کو 1828 کو دھول کا طوفان تھمنے کے بعد نورمنبرگ کے چوراہے پر ظاہر ہونے والے پراسرار لڑکے نے 1833 کے ماہ دسمبر میں انسباخ کے ایک اسکول ماسٹر کے گھر میں دم توڑ دیا۔

وہ کون تھا... تاریخ اس بابت خاموش ہے۔

کاسپر کو انسباخ کے اسٹینڈفورڈ قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ اس کے کتبے پر لاطینی زبان میں لکھا تھا۔ "یہاں کاسپر ہاؤزر سو رہا ہے جو اپنے عہد کی پہیلی تھا۔ نہ جانے وہ کب پیدا ہوا۔ نہ جانے کیسے مارا گیا۔"

بعد میں تحریر کو تبدیل کر کے یوں کر دیا گیا۔ "یہاں وہ پراسرار نوجوان محو استراحت ہے، جو پراسرار طور پر مارا گیا۔"

☆☆☆

کاسپر ہاؤزر ایک معما تھا۔

اس سے جڑی پراسراریت نے اسے پورے یورپ کی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا۔ موت کو لگ بھگ دو سو برس ہونے کو ہیں مگر وہ آج بھی تحقیق کا موضوع ہے۔

کاسپر کی موت کے بعد اس واقعے پر قلم اٹھانے والے بیش تر افراد کی رائے تو یہی تھی کہ وہ واقعی بادن کے تخت کا وارث تھا۔ تخت پر بیٹھا شاہ لوئس اسے خطرہ محسوس کرتا تھا، اس لیے اسے راہ سے ہٹانے کی ٹھانی۔ پہلی کوشش ناکام گئی، مگر اگلی بار وہ اپنے منصوبے میں کامیاب رہا۔

اس نظریے کو تواتر سے دہرایا گیا۔ یہاں تک کہ شاہ بادن کو ایک مذمتی بیان جاری کرنا پڑا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ نواب اسٹیفن نے اپنی جان چھڑانے کے لیے اسے قتل کروایا۔

اس الزام پر انگریز نواب بہت سیخ پا ہوا۔ اس نے مرحوم کاسپر کے ہمدردوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگوں کی عقل پر پردے پڑے ہیں، میں جلد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردوں گا۔

اس نے ایک کتاب لکھی، جس میں کاسپر کے کیس پر کی جانے والی تحقیق اور ہنگری میں گزرے زمانے پر روشنی ڈالتے ہوئے کئی مشکل سوالات اٹھائے۔ آخری میں لکھا۔ ”میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں اس کے دھوکے میں آ گیا تھا۔“

کاسپر کے حامی اس کتاب کی اشاعت پر آگ بگولا ہوگئے۔ انہوں نے اسے بے نقط سنائیں۔

اس وقت چند سنجیدہ حلقوں نے کہا کہ نواب اسٹیفن کسی غلط فہمی کا تو شکار ہوسکتا ہے مگر وہ جھوٹا نہیں، بے حد ایمان دار اور نفیس انسان ہے، مگر ان بے چاروں کی بات کسی نے نہیں سنی۔ نواب کو صبح شام مغلظات بکی جاتی رہیں۔

ان ہی دنوں انسباخ پولیس نے اپنی رپورٹ عدالت میں جمع کروائی، جس میں بستر مرگ پر کاسپر کی سنائی ہوئی کہانی پر شک و شبہات کا اظہار کیا گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق پراسرار قاتل کی جانب سے جو خط چھوڑا گیا تھا، اس میں ہجے کی ایک غلطی ہے، ایک جگہ صرف و نحو کا سقم ہے۔ اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مرحوم کاسپر کی دستیاب تحریروں میں یہ دونوں اغلاط کثرت سے ملتی ہیں۔ پھر یہ بھی تھا کہ خط پنسل سے لکھا گیا ہے اور کاسپر پنسل ہی استعمال کیا کرتا تھا۔ وہ قلم کا عادی نہیں ہوسکا تھا۔ خط جس ڈھب پر تہ کیا گیا تھا، کاسپر کی دراز وں سے ملنے والے تمام کاغذات اسی طرز پر تہ کیے گئے ہیں۔ یہ تک ظاہر کیا تھا کہ اس نے خود اپنے آپ کو زخمی کیا تھا۔ بدقسمتی سے زخم اس کی توقع سے زیادہ مہلک ثابت ہوا۔ وہ اس سے جاں بر نہیں ہوسکا۔

رپورٹ سراسر کاسپر کے خلاف تھی۔ کئی نکات بے حد اہم تھے، مگر عدالت نے انہیں شواہد کے بجائے اندازے قرار دیتے ہوئے نئے سرے سے تفتیش کا حکم جاری کر دیا۔ پولیس نے خانہ پوری کی کچھ کوششیں کیں، پھر فائل بند کر دی۔ بدقسمت کاسپر کا کوئی اپنا تو تھا نہیں، جو اس کے لیے بھاگ دوڑ کرتا۔ اس کا کیس دب گیا۔

کچھ عرصے بعد ایک پراسرار تحریر منظر عام پر آئی۔ جس اخبار میں یہ شائع ہوئی اس کا دعویٰ تھا کہ یہ مرحوم پال جوین کے کاغذات سے ملی ہے۔ وہی قانون دان جو کاسپر کا سب سے بڑا ہمدرد تصور کیا جاتا تھا۔

تحریر کچھ یوں تھی ”کاسپر ہاؤزر ایک فتنہ ہے۔ وہ کسی کام کا نہیں۔ اِس قابل ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔“

اس نوٹ نے سنسنی پھیلا دی۔

کاسپر کے مخالفین نے اسے ایک اہم ثبوت کے طور پر پیش کیا، تاہم اس کے ہمدردوں نے اسے یکسر رد کر دیا۔ وہ اب بھی اسے بادن کا شہزادہ قرار دینے پر بضد تھے۔

موت کے بعد کاسپر کے جسم کی چیر پھاڑ کی گئی۔ معالجین کا خیال تھا کہ وہ اس کے جسم سے اس کا ماضی کھوج نکالیں گے۔ اپنے تئیں وہ ایسا کر بھی گئے۔ معالجین نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اس کا دماغ عام انسانی دماغ سے تھوڑا مختلف تھا۔ ایک حصہ نسبتاً چھوٹا، ایک بڑا۔ پھر اس کا جگر بھی عام انسانوں جیسا نہیں تھا۔ ان ہی اسباب کے باعث کاسپر اوروں سے الگ تھا۔

کیا واقعی ایسا تھا؟

کاسپر کی جسمانی ساخت عام انسانوں جیسی نہیں تھی۔ دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت مختلف تھی... یا پھر وہ حقیقتاً شاہی تخت کا وارث تھا، جسے ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا۔

تاریخ کی چند غیر مستند کتابوں میں ملتا ہے کہ کاسپر کی موت کے چند برس بعد نورمبرگ کی ایک سڑک پر ایک ادھیڑ عمر شخص کی لاش ملی۔

اس نے لمبا سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا۔ ہیٹ سے اس کا چہرہ ڈھکا۔ اُسے چاقو گھونپ کر قتل کیا گیا۔

پولیس کو مقتول کی جیب سے ایک کھلونا ملا... وہ ایک گھوڑا تھا!





# ترکی نمی دانم

علی سفیان آفاقی

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کناں تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کرہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم دلچسپ نہیں، وہی کچھ سنا رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست وبرخواست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔
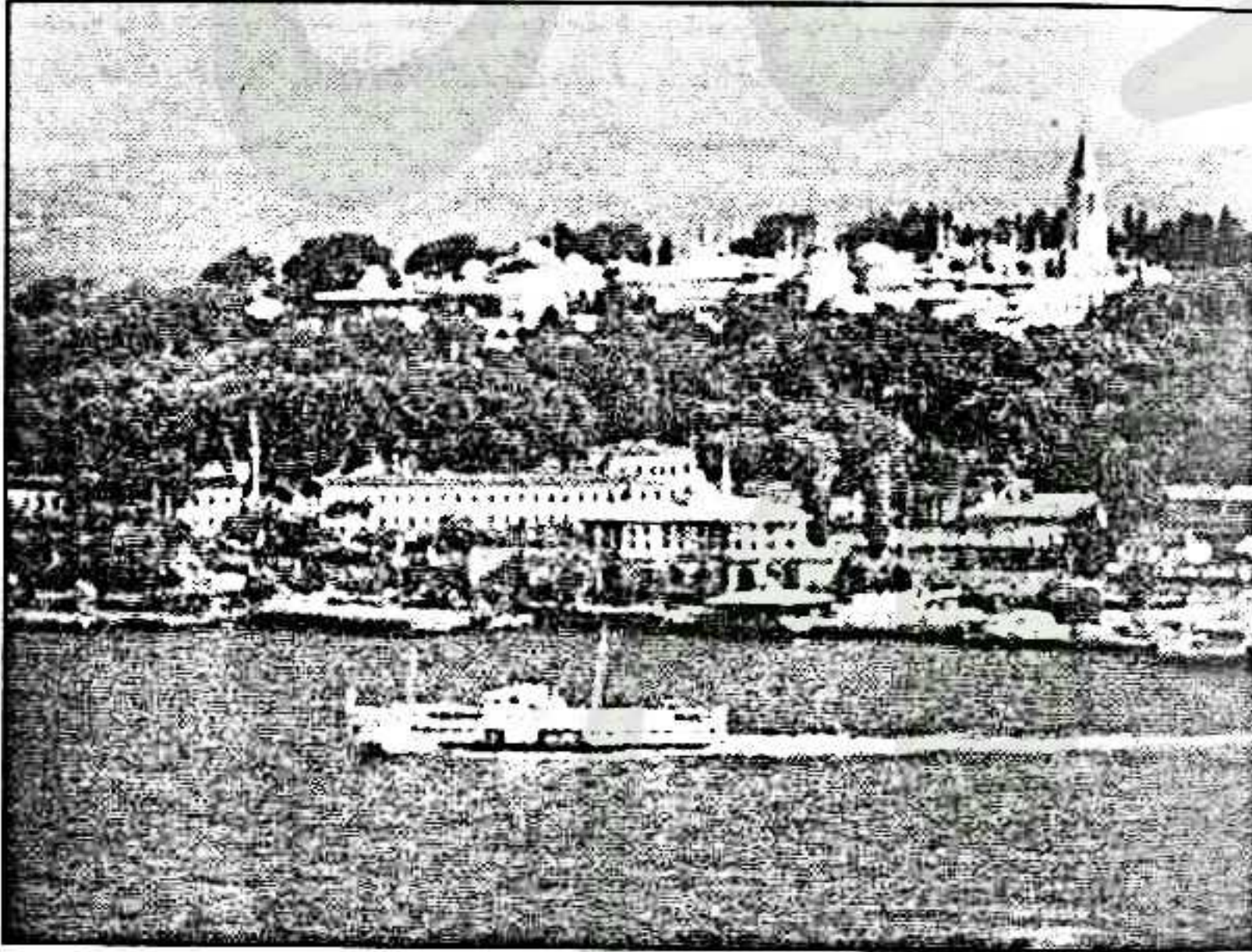
ترکی کے سفر کی دلچسپ روداد، سفر کہانی کی تیرھویں کڑی

عدنان صاحب مصطفیٰ کمال پاشا سے ناراض بھی تھے اور معترف بھی۔ ناراض اس لیے تھے کہ مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی کو ایک جدید سیکولر ملک بنا دیا اور ایسی بنیادی تبدیلیاں کردیں جس کی وجہ سے ترکی کا اسلامی تشخص قائم نہ رہا۔ لیکن ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ خلافت کے زوال کے ساتھ ساتھ استنبول میں سازشوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ یورپی اقوام خصوصاً برطانیہ، جرمنی، یونان وغیرہ نے ترکی کا نام ونشان مٹا کر اس ملک کے حصے بخرے کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ خلیفہ برائے نام

اور بے بس تھا۔ جس خلیفہ کے پاس نہ مال و دولت ہو نہ طاقت اور نہ ہی اس کو عالمِ اسلام قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہو اور جو یورپی سفیروں کی پذیرائی کرنے کے لیے حاضر ہو ایسی خلافت کا کیا فائدہ؟ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

مصطفیٰ کمال اور ان کے ہمراہی فوجی یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جب یورپی ممالک نے طاقت کے ذریعے ترکی کے مختلف علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کیا تو ترک فوج کے ناراض عناصر کی ناراضی ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ ترک فوجیوں نے مسلح جدوجہد کرنے کا عزم کیا تو دربارِ خلافت سے حکم آگیا کہ مدافعت نہ کی جائے لیکن فوج کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ مصطفیٰ کمال پارے کی طرح حرکت میں آگئے اور انہوں نے خلیفہ کے احکامات کو نظر انداز کر کے شدید مزاحمت کا آغاز کر دیا۔

عدنان صاحب کا کہنا تھا کہ اگر مصطفیٰ کمال نہ ہوتے تو آج ترکی کا وجود ہی نظر نہ آتا۔ عدنان کو اس بات کا اعتراف تھا لیکن ملک کو مغربی اور سیکولر بنانے کے لیے جو اقدامات کیے گئے ان سے وہ راضی نہ تھے۔ لیکن مصطفیٰ کمال کے حامیوں کا کہنا ہے کہ مصطفیٰ کمال واقعی اتاترک تھے یعنی ترکوں کے باپ۔ انہوں نے یورپی طاقتوں کے جبڑوں سے اپنا ملک چھین کر اس کو ایک آزاد، خود مختار ملک بنانے کا آغاز کر دیا تاکہ دوبارہ وہی بدترین صورتِ حال پیدا نہ ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اتاترک نے کچھ زیادہ بھی کیا لیکن ان کا اور ان کے ہم خیال ساتھیوں کا خیال تھا کہ اگر یہ تبدیلیاں نہ کی گئیں تو ترکی دوبارہ ایسے ہی مصائب میں گرفتار ہو سکتا ہے۔ کٹر مولوی اور علما باہمی لڑائی جھگڑوں میں پڑ کر ملک میں فرقہ بندی شروع کر دیں گے۔ اسلام کے نام کو ایکسپلائیٹ کر کے اس سمٹے ہوئے ملک میں کبھی استحکام پیدا نہ ہونے دیں گے۔

ترک خوبصورت اور بہادر قوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے میں ترک تین براعظموں پر قابض تھے۔ اس زمانے میں ترکی کا رقبہ چالیس لاکھ مربع میل تھا۔ اس کی سرحدیں یورپ میں پولینڈ، ہنگری اور ویانا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جنوب میں مشرقِ وسطیٰ مصر، شام ... بھی ترک علاقے تھے۔

سلطنتِ عثمانیہ کے زمانے میں ترکوں نے اپنی طاقت کے ذریعے اپنے تسلط کو منوایا تھا۔ مرکزی ایشیا کی دوسری قوموں کی طرح ترک بھی قبائل کی شکل میں رہتے اور ضرورت کے تحت نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔ قبیلے کا سردار نڈر، بہادر اور بلند حوصلہ ہونا ضروری تھا۔ سردار جس مذہب سے تعلق رکھتا تھا تمام قبیلے کا وہی مذہب ہوتا تھا۔ عموماً سردار کا بڑا بیٹا ہی اس کا جانشین ہوتا تھا۔ عثمانی سلطنت کے دور میں ارکانِ سلطنت تین طبقات میں منقسم تھے۔ ایک اہلِ علم و قلم، دانش ور، یہ سرکاری دفاتر میں کام کرتے تھے۔ اصحابِ سیف، یہ صوبوں کے گورنر ہوتے تھے جنہیں فوج کے لیے فوجی بھرتی کرانے کے عوض جاگیریں اور عہدے دیے جاتے۔ جو ملک فتح کیے جاتے تھے ان کے نو عمر لڑکوں کو قتل کرنے یا غلام بنانے کے بجائے شاہی فوج کے لیے تربیت دی جاتی تھی۔ عموماً وہ عیسائی ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے حسنِ سلوک کو دیکھ کر وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔ یہ بادشاہوں کی ذاتی حفاظت کے لیے سب سے موثر اور جانباز ہوتے تھے جو اپنے مالک پر جان قربان کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ انہیں بہت عیش و آرام سے رکھا جاتا تھا لیکن ان کو شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے ان کا نہ گھر ہوتا تھا نہ خاندان۔ ان کی زندگی سمیت ہر چیز سلطان پر نثار کرنے والی ہوتی تھی۔ یہی لوگ اصحابِ سیف کہلاتے تھے۔

اصحابِ مذہب، یہ مذہب کی تبلیغ کرتے تھے اور اسلام کے لیے خدمات سرانجام دیتے تھے۔ اسلامی دنیا میں صرف ترکی ایسا ملک تھا جہاں مذہب کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ شیخ الاسلام عیسائی پوپ کی طرح وسیع اختیارات کا مالک ہوتا تھا۔ اس کے اختیارات وزیرِاعظم کے برابر ہوتے تھے۔ وہ سب سے بڑا مذہبی پیشوا ہوتا تھا۔ دوسرے تمام مذہبی رہنما اور قاضی اس کے ماتحت ہوتے تھے۔ سلطنت کی تمام مسجدیں، عدالتیں، درگاہیں شیخ الاسلام کے ماتحت ہوتی تھیں۔ اس کو چیف جسٹس، وزیرِ مذہبی امور، وزیرِ قانون اور وزیرِ تعلیم بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت دنیا میں اگر عالمِ اسلام میں پاپائیت تھی تو وہ ترکی میں تھی۔ اس پاپائیت کی وجہ سے بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں چونکہ ان کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھے اور ان کی خوشنودی کے لیے عوام مذہب کو روزمرہ کی زندگی میں بھی استعمال کرنے لگے تھے۔ مذہب کو ایکسپلائیٹ کرنے کی وجہ سے معاشرے میں بھی برائیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے ملک میں سیکولر نظام ایسے ہی عناصر سے نجات حاصل کرنے کے لیے قائم کیا تھا۔ یہ اسلام کے نام پر اپنا کاروبار چلاتے تھے۔ شیخ



الاسلام کا عہدہ وزیرِاعظم کے برابر تھا اس لیے وہ ملکی سیاست اور درباری سازشوں میں بھی حصہ لیتا رہتا تھا اور اپنے مذہبی فرائض کی طرف سے بے پروائی برتتا تھا۔ یہ بھی جدید سوچ رکھنے والوں کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ سلطان کی افواج جو یورپ تک پہنچ گئی تھیں وہاں سے فوجی نئے خیالات لے کر آئے جن سے شیخ الاسلام اور قاضی وغیرہ لاعلم تھے۔ دنیا بدل رہی تھی۔ مغربی ممالک نے روایت پرستی چھوڑ کر نئے علوم اور سائنس پر زور دینا شروع کر دیا تھا لیکن ترکی میں علما کی سوچ علم و حکمت کے معاملے میں تیرھویں صدی سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ شیخ الاسلام اور ان کے ماتحتوں نے اجتہاد کا راستہ ہی بند کر دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے نصابِ تعلیم اور نظامِ حکومت میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ دنیائے اسلام جمود کا شکار ہو گئی تھی۔ آج بھی وہ سلسلہ جاری ہے کہ علما اور مُلائی سوچ اور نئے انداز کو اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے مغربی دنیا آگے جا رہی ہے اور مسلمان پیچھے رہ گئے ہیں۔

ہم نے ان سے دریافت کیا۔ ”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی زوال پسندی کو دیکھ کر اتاترک نے اپنے ملک کو سیکولر قرار دیا؟“

وہ بولے۔ ”یہ بات بہت حد تک درست ہے۔ اتاترک اور دوسرے فوجیوں کا خیال تھا کہ ترکی اگر پرانے بوسیدہ نظام سے باہر نہ نکلا تو ہمیشہ پسماندہ رہے گا چونکہ یہ طبقۂ اسلام کو نئے خیالات اور نئے نظام سے بچاتا رہے گا۔“

خان صاحب نے دریافت کیا۔ ”جب اتاترک نے خلافت کا خاتمہ کیا تو سارے عالمِ اسلام میں شور برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی خلافت قائم رکھنے کے لیے تحریکِ خلافت شروع کر دی۔ کیا آپ کے خیال میں خلیفہ کی موجودگی ضروری تھی۔“

عدنان صاحب نے کہا۔ ”دیکھیے، جہاں تک خلیفہ کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ کا مرتبہ عطا کیا ہے۔ آدم کے بعد ان کی اولاد بھی خلیفہ تھی۔ جتنے پیغمبر دنیا میں آئے وہ بھی زمین پر اللہ کے خلیفہ ہی تھے۔ سلطان سلیم اول کردار کے لحاظ سے حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسا نہ تھا لیکن اپنا مرتبہ اونچا کرنے اور زیادہ بااختیار بننے کے لیے اس نے اپنے لیے خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ ترکی کے عوام ”اے اللہ ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھنا“ کے نعرے لگاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سلطان کو سلطان یا بادشاہ ہی تسلیم کرتے تھے یعنی سلطان خلیفہ کا لقب اختیار کرنے کے بعد عالمِ اسلام کی بڑی سیاسی قوت کے ساتھ ہی مذہبی سربراہ بھی بن گیا۔ سچ پوچھیے تو میں بھی ”خلیفہ“ کے حق میں نہیں ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جب ہر طرح کی طاقت ایک ہی شخص کو حاصل ہو جائے تو آہستہ آہستہ آمریت اپنے پیر جمانے لگتی ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ اتاترک نے خلافت ختم کر کے غلط نہیں کیا تھا؟“

”اس سے تو میں متفق ہوں مگر اتاترک نے فرسودہ نظام سے نجات حاصل کرنے کے لیے انتہا پسندی کا جو مظاہرہ کیا وہ ضرورت سے زیادہ ردِعمل نہیں تھا؟“

”دیکھیے آغا، ہر شخص کا ذہنی اور سوچنے کا انداز علیحدہ ہوتا ہے۔ مصطفیٰ کمال نے ایک مسلمان گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ اگر آپ نے ترکوں کی قدیم تاریخ پڑھی ہے تو آپ جانتے ہوں گے کہ ترک بہت مذہب پرست تھے۔ انہوں نے جہاں بھی فتوحات کیں وہاں اسلام پھیلایا۔ ترک سلاطین کے زمانے میں عیسائی رعایا کی حیثیت سے ترک مملکت بننے کو عیسائی ملک پر ترجیح دیتے تھے، ترکوں نے کبھی عیسائیوں سے بدسلوکی نہیں کی۔ انہیں بھی دوسرے شہریوں کی طرح حقوق حاصل تھے۔ یہاں تک کہ عیسائی غلام کو اگر مالک سے کوئی شکایت ہوتی تھی تو وہ قاضی کے سامنے شکایت لے کر چلے جاتے تھے اور قاضی ان کے ساتھ پوری طرح انصاف کرتا تھا۔ ترکوں نے کبھی جبر نہیں کیا لوگ ان کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جاتے تھے۔

ترک جب یورپ میں گئے تو انہوں نے وہاں بھی اسلام پھیلایا جس کی نشانیاں آج تک موجود ہیں۔ عیسائیوں نے بذاتِ خود اپنی کتابوں اور سفرناموں میں لکھا ہے کہ عیسائیوں کو ترکوں کی سلطنت میں رہنا بہتر لگتا تھا۔ ترک انہیں مذہبی آزادی دیتے تھے۔ مسلمانوں کے برابر تمام حقوق دیتے تھے۔ انہیں مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کرتے تھے البتہ جب وہ مسلمان ہو جاتے تھے تو انہیں اعلیٰ عہدے دیا کرتے تھے۔ ہر طرح سے انہیں نوازتے تھے۔ تو پھر مصطفیٰ کمال پاشا کو اسلام سے اتنی نفرت کیوں تھی۔ کیونکہ ترک فوجیوں کے طرزِ عمل کی بھی عیسائی تعریف کرتے تھے۔ ترکوں کی دیانتداری، انصاف پسندی اور نماز کی پابندی کے بھی معترف تھے۔“

عدنان صاحب سنجیدہ ہوگئے۔ ”یہ وہ باتیں ہیں جو میری سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ میرا خیال ہے کہ مصطفیٰ کمال نے جب یورپ کے ملکوں کو دیکھا تو وہاں کی معاشرت اور کلچر نے متاثر کیا۔ دوسری طرف ترکی میں حکومت غیر ملکی طاقتوں کے سامنے سرنگوں تھی۔ شیخ الاسلام اور دوسرے مذہبی رہنماؤں نے خلیفہ کو راہِ راست پر لانے کے بجائے چاپلوسی میں اس کی ہاں میں ہاں ملانی شروع کردی۔ مصطفیٰ کمال اور اس کے ہم خیال دوسرے فوجی دیکھ رہے تھے کہ ترکی کو کس طرح پلیٹ میں رکھ کر یورپ کے ان ملکوں کے سامنے پیش کیا جارہا ہے جو ایک زمانے میں ترک سلطنت کے مفتوح اور باج گزار تھے۔ مصطفیٰ کمال دیکھ رہا تھا کہ اب پانی سر سے اونچا گزر گیا ہے۔ ترکی ڈوب رہا ہے اور اس کو ڈبونے والے خود اس کے کمزور، بے بس، خود غرض حکمراں ہیں، فوجیوں کے دلوں میں آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کو مزید اس وقت بھڑکایا گیا جب جرمنوں، فرانسیسیوں، انگریزوں اور یونانیوں نے باقاعدہ فوج کشی کرکے ترکی کے کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ مصطفیٰ کمال نے ان کا مقابلہ اور مدافعت کرنے کا ارادہ کیا تو دربار خلافت سے حکم آگیا کہ مدافعت نہ کی جائے۔ یہ وہ نقطہ تھا جب مصطفیٰ کمال اور اس کے ساتھیوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ خلیفہ استنبول میں بیٹھا ترکی کا سودا کررہا تھا اور مصطفیٰ کمال انگورہ (انقرہ) میں جنگی منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔ اس نے خلیفہ کے حکم کی پروا نہیں کی اور غیر ملکی فوجوں کے مقابلے میں مورچہ بندی شروع کردی۔ مصطفیٰ کمال نے ایک ایک کرکے ترکی کے تمام علاقے واپس لے لیے۔ مصطفیٰ کمال نے فیصلہ کرلیا تھا کہ عثمانیہ سلطنت کو فراموش کرکے صرف ترکی حدود تک محدود رہے گا۔

ترک جنگِ آزادی کے دوران اناطولیہ دفاعی نقطۂ نظر سے بہت اچھی جگہ تھی جہاں مصطفیٰ کمال نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا تھا۔ مغربی ممالک سے ملک کو آزاد کرانے کے بعد اتاترک نے انگورہ کو ملک کا دارالحکومت بنایا جو آج بھی ملک کا دارالحکومت ہے۔ اس شہر کے بارے میں بھی آپ کو بتائیں گے۔ مصطفیٰ کمال نے انگورہ کا نام بدل کر انقرہ رکھ دیا۔ وہ ان لوگوں کو غدار اور ترکوں کی بربادی کا ذمے دار سمجھتا تھا اس لیے اس نے استنبول کا رخ بھی نہیں کیا۔

رومی حکومت کے زمانے میں ارضِ روم مشرق میں ایک بارونق شہر تھا اب یہ ترکی میں شامل ہے۔ یہ شہر کافی بلندی پر ہونے کی وجہ سے ٹھنڈا مقام ہے، یوں سمجھیے کہ یہ ترکی کے بلند ترین علاقے میں واقع ہے۔ اس شہر میں اگست 1919 میں ایک کانگریس منعقد ہوئی تھی۔ اس کانگریس میں مصطفیٰ کمال کو ملک کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ اس کانگریس میں جو فیصلے کیے گئے ان میں یہ بنیادی اصول شامل تھے۔

1۔ ملک کی تقسیم کسی صورت میں بھی قبول نہیں کی جائے گی۔

2۔ بیرونی حملے کی صورت میں پوری قوم متحد اور ایک ہوجائے گی اور کسی حالت میں بھی شکست منظور نہیں کی جائے گی (ترکی میں ہر نوجوان کے لیے فوجی تربیت حاصل کرنا لازمی ہے جس کے بغیر اس کو سند نہیں ملتی۔ کسی زمانے میں ہمارے ملک میں بھی کالجوں میں فوجی تربیت دی جاتی تھی لیکن حکمرانوں نے اپنی مصلحتوں کی خاطر اس کو ختم کردیا حالانکہ بھارت جیسے دشمن ہمسائے ہونے اور اسٹریٹجک اہمیت کا حامل ہونے کی وجہ سے یہ بہت ضروری ہے۔ یقیناً جب پاکستان میں کوئی محبِ وطن اور دور اندیش حکمراں آئے گا تو وہ نوجوانوں کے لیے فوجی تربیت لازمی قرار دے گا۔ اسرائیل، امریکا اور دوسرے کئی ملکوں میں فوجی تربیت لازمی ہے۔ جنگِ عظیم دوم کے زمانے میں امریکا میں ہر ایک صحت مند مرد کو فوجی خدمات انجام دینی ضروری تھیں۔ بڑے بڑے دولت مند، فنکار، گلوکار اور ہر شعبے سے تعلق رکھنے والوں کو فوج میں بھرتی کرلیا گیا تھا۔ صرف محمد علی باکسر نے انکار کیا تھا یہ مقدمہ سالہا سال چلتا رہا تھا)

3۔ اگر مرکزی حکومت وطن کی آزادی کو قائم نہ رکھ سکی تو ایک عارضی حکومت قائم کی جائے گی۔

4۔ یورپ کے ملکوں کو خصوصی حقوق حاصل نہ ہوں گے اور نہ ہی انہیں ترکی کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کی اجازت دی جائے گی۔

5۔ اس کانگریس کے ارکان ہنگامی حالت میں ملک کے معاملات کو سنبھالیں گے۔

جب خلیفہ (سلطان) کو اس کانگریس کے انعقاد اور فیصلوں کی اطلاع ملی تو خلیفہ نے حکم دیا کہ مصطفیٰ کمال پاشا کو گرفتار کرکے استنبول بھیجا جائے مگر کسی نے خلیفہ کے حکم کی پابندی کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس طرح خلیفہ کو پہلی بار مصطفیٰ کمال کے مقابلے میں اپنی بے بسی کا احساس ہوا۔



یورپی طاقتوں کو بزور بازو ملک سے باہر نکالنے کے بعد مصطفیٰ کمال پاشا نے 29 اکتوبر 1923ء کو ترکی میں خلافت ختم کرکے ملک کو جمہوریہ بناکر --- خود ہی صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ ترکی کے دستور میں بھی بنیادی تبدیلیاں کی گئیں جن میں سب سے اہم یہ تھی کہ آئین میں سے یہ شق نکال دی گئی کہ ریاست کا مذہب اسلام ہوگا۔ اس طرح اسلام جو ایک ہزار سال تک ترکی کا قومی مذہب رہا تھا اور ترکوں نے دنیا میں اسلام پھیلانے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ وہ سلطنت بھی ختم ہوگئی جو تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی۔

1919ء میں جب مصطفیٰ کمال فاتح کی حیثیت سے انقرہ میں داخل ہوا تھا تو شہر کی ساری آبادی استقبال کے لیے سڑکوں پر امڈ آئی تھی جن میں مذہبی رہنما اور پیشوا بھی شامل تھے لیکن 1923 میں ملک کو جمہوریہ بنانے کے بعد اس ملک کا نقشہ ہی بدل گیا۔

صدارت کا عہدہ سنبھالنے اور ملک کو جمہوریہ قرار دینے کے بعد اتاترک نے انقلابی تبدیلیوں کا آغاز کردیا۔ مصطفیٰ کمال نے شیخ الاسلام کا عہدہ بیک جنبشِ قلم ختم کردیا۔ تمام دینی مدارس اور دینی اداروں کو بند کرکے ان پر پابندی لگادی گئی۔ آئین میں تبدیلیاں کرکے سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے اساطیر سے مدولی گئی۔ ترکی میں مسلم علما نے سیاہ جبّے اور سفید عمامہ کو رائج کیا تھا۔ یہ دراصل عیسائیوں کے پادریوں کے لباس سے متاثر ہوکر کیا گیا تھا تاکہ علما علیحدہ اور منفرد نظر آئیں۔ ترکوں کے قدیم ملبوسات کو ختم کرکے عوام کے لیے سوٹ اور ہیٹ پہننا لازمی قرار دے دیا گیا۔ ملک میں ہفتہ وار چھٹی جمعہ کے بجائے اتوار کو ہونے لگی۔ ہجری کیلنڈر ختم کردیا گیا۔ اسلام کے قانونِ وراثت میں تبدیلیاں کرکے مرد اور عورت کے مساوی حصے مقرر کردیے گئے۔ عورتوں کے لیے حجاب یا پردے کو ممنوع قرار دیا گیا۔ ترکی زبان میں بھی تبدیلیاں کی گئیں۔ ترکی زبان میں عربی الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے تھے مگر اب ترکی زبان میں سے عربی الفاظ خارج کردیے گئے۔ تعلیمی نصاب میں سے عربی اور فارسی کو خارج کردیا گیا۔ عربی اور فارسی کی کتابوں کو لائبریریوں میں سے نکال کر ایران اور دوسرے عربی ملکوں کو برآمد کردیا گیا۔ دراصل عربوں نے انگریزوں کے بہکانے پر ترک سلطنت کی جڑیں جس طرح کھوکھلی کی تھیں اور عثمانیہ سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا تھا یہ غم و غصہ بھی مصطفیٰ کمال کے دل میں تھا۔ اتاترک نے سلطنتِ عثمانیہ کی تمام یادگاروں اور اصولوں کا خاتمہ کردیا۔ استنبول کی جگہ انقرہ کو ملک کا دارالحکومت بنادیا گیا۔ انقرہ کو فوجی ہیڈ کوارٹر بھی بنادیا گیا۔

(نوٹ: یہ معلومات کتابوں سے حاصل کی گئی ہیں) ترکوں کی ایک بڑی اکثریت نے مصطفیٰ کمال کی ان تبدیلیوں کو پسند نہیں کیا لیکن فوج اس کے ساتھ تھی۔ حالانکہ جب مصطفیٰ کمال اس سے پہلے انقرہ میں داخل ہوا تھا تو شہر کے بچے بوڑھے جوان، مرد، عورت سب نے اس کا پُرجوش استقبال کیا تھا اور اس کے حق میں نعرے لگائے تھے۔ یہاں تک کہ مذہبی رہنما بھی اس کو اسلام کا محافظ قرار دے کر اس کے قدردان تھے۔

مصطفیٰ کمال پاشا نے انقرہ میں داخل ہوکر سب سے پہلے شہر کی مشہور مسجد میں نماز ادا کی تھی اور بالکونی میں کھڑے ہوکر عوام سے خطاب کیا تھا۔ عوام نے اس کے حق میں نعرے بلند کیے تھے مگر پھر وہی عوام مصطفیٰ کمال سے متنفر ہوگئے کیونکہ اس نے اسلام کو چھوڑ کر سیکولرازم ان پر تھوپ دیا تھا۔

آغا کریم صاحب سے بات چیت بہت لمبی ہوگئی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی باتیں بہت معلوماتی اور کارآمد تھیں جن سے ترکی کے ماضی اور حال کے بارے میں بہت کچھ حاصل ہوا۔ اس گفتگو کا خلاصہ ہم نے یہ نکالا کہ جب تک آئین اور قانون کی پابندی نہ کی جائے اور حکمراں آرام طلب اور عیش و آرام میں نہ پڑجائیں کوئی قوم اور ملک تباہ و برباد نہیں ہوسکتا۔ عثمانی سلاطین نے جب میدانِ جنگ کو چھوڑ کر عیش و عشرت کی محفلیں سجانی شروع کیں۔ امورِ سلطنت میں لاڈلی عورتوں کی مداخلت شروع ہوگئی۔ شراب و شباب ان کی زندگی کا حصہ بن گیا۔ اہم فیصلے درباروں کی جگہ حرم سراؤں میں کیے جانے لگیں تو ملکوں اور قوموں کا زوال شروع ہوجاتا ہے۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بھی یہی اسباب تھے۔ جب نااہل، عیش پسند، تلوار اٹھانے کی طاقت سے محروم افراد بادشاہت کا اختیار سنبھال لیں تو پھر پستی اور زوال مقدر بن جاتا ہے۔

انہوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کی خوبیاں اور برائیاں بھی بیان کیں اور اتاترک کے کارناموں کے ساتھ ہی ان کی اسلام دشمنی کے تذکرے کیے۔ اس کے اسباب اور وجوہات بھی بیان کردیں۔ انہوں نے فیصلہ ہم پر چھوڑ دیا کہ خود ہی مصطفیٰ کمال پاشا کے بارے میں اپنی رائے قائم

کرلیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ترکی میں خلافت کے خاتمے کے بارے میں اور ملک کو سیکولر بنانے کے لیے اتاترک نے جو فیصلے کیے ان کے بارے میں ہماری رائے ”نیمے دروں نیمے بروں“ قسم کی ہے۔ ہمارے خیال میں دونوں جانب سے غلطیاں ہوئیں۔ انتہاپسندی کا مظاہرہ کیا گیا۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اگر مصطفیٰ کمال پاشا نہ ہوتے تو آج ترکی بھی نہ ہوتا۔ عیسائیوں نے مشترکہ طور پر منصوبہ بندی کے ساتھ ترکی کا وجود ہی ختم کرنے کے منصوبے بنا کر ان پر عمل بھی شروع کردیا تھا۔

حصے بخرے کرنے اور وہاں کے مسلمانوں کے دلوں سے اسلام نکال دینے کا جو پروگرام بنایا تھا وہ پورا نہ ہوسکا۔ ایک عیسائی مبلغ نے کہا تھا کہ اگر ہم نے مسلمانوں کو عیسائی بنالیا تو انہیں عزت مل جائے گی۔ بہترین طریقہ یہی ہے کہ ان سے ان کا مذہب چھین لیا جائے۔ استنبول جا کر یہ معلوم کرکے حیرت اور خوشی ہوئی کہ کسی زمانے میں ترکی اتنا ترقی پسند ملک تھا جس پر یورپ رشک کرتا تھا۔ جس زمانے میں استنبول کی سڑکوں پر لیمپ جلا کرتے تھے پیرس کی سڑکیں کچی تھیں جو بارش میں کیچڑ سے بھر جاتی تھیں۔ ترک اس زمانے میں تعلیم میں بہت آگے تھے۔ قطار میں کھڑا ہونا ان کی عادت تھی۔ غرضیکہ وہ تمام خوبیاں جو آج ترقی یافتہ یورپ میں پائی جاتی ہیں ترکوں کا طرۂ امتیاز تھیں۔

ترکی جا کر زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود معلوم ہوا کہ دنیا بھر میں اگر ترک کسی قوم سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہ پاکستان ہے۔ پاکستانی دنیا بھر میں خواہ کسی بھی نظر سے دیکھے جاتے ہوں، ترکی میں انہیں سب سے زیادہ عزت اور محبت حاصل ہے۔ اس میں آسلام پسند اور سیکولر دونوں قسم کے ترک شامل ہیں۔ ترکی میں اپنی پاکستانی قومیت ظاہر کرتے ہی ریڈ کارپٹ بچھ جاتے ہیں اور ”کھل جا سم سم“ کی طرح سارے دروازے کھل جاتے ہیں۔ ترکی میں پاکستانیوں کو لاڈلے مہمانوں کی حیثیت حاصل ہے۔ لفظ پاکستان (جسے ترک بے سے باکستان کہتے ہیں) میں ایک جادو ہے۔ ترکوں کا یہ بے لوث اور مخلصانہ رویّہ دیکھ کر ہمیں بھی ان سے محبت ہوجاتی ہے۔ ایک دوسرے کی زبانوں سے واقفیت ہو یا نہ ہو محبت کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے آپ اپنوں کے درمیان میں آگئے ہیں۔

ریستوران میں بیٹھے گپ شپ کرتے ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی۔ شام تک ہمیں ڈائمنڈ آئی لینڈ کا مکمل جائزہ لینا اور پھر رات سے پہلے استنبول پہنچنا بھی ضروری تھا۔ جزیرے کی یہ واحد مارکیٹ ہے جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ ترکی کی یادگار چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدنے کے لیے گئے۔ یہ چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ بعض تو تھڑوں پر سامان سجا کر بیٹھ گئے تھے۔

ریستوران سے اٹھے تو ایک اور مسئلہ پیدا ہوگیا۔ ہمارے پاکستان میں تو مہمانوں کے کھانے کا بِل ادا کرنے کا دستور ہے لیکن وہاں آغا کریم اور مرزا مشرف میں اس بات پر اختلاف پیدا ہوگیا کہ کھانے کا بِل کون دے گا؟

ہم لوگ تھرڈ پارٹی تھے اور بِل ادا کرنے کے خواہش مند۔

مرزا مشرف نے ہم لوگوں کو ٹوکا۔ ”آپ اس جھگڑے سے باہر رہیے۔ ہم دونوں آپس میں طے کرلیں گے۔“

مگر مسئلہ طے ہونے میں نہیں آتا تھا۔ آخرکار بٹ صاحب کی فراست اور عقلمندی کام آئی ورنہ شاید ”پہلے آپ پہلے آپ، نہیں پہلے میں پہلے میں“ کی یہ بحث نہ جانے کب تک جاری رہتی۔

بٹ صاحب نے تجویز پیش کی کہ انگریز اس طرح وقت ضائع نہیں کرتے۔ منٹوں میں بڑے سے بڑا فیصلہ کرلیتے ہیں۔

”وہ کیسے؟“

”ٹاس۔“ انہوں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

”ٹاس؟“

”جی ہاں، ٹاس کرلیجیے۔ جس کے حق میں فیصلہ ہو وہ بِل ادا کردے۔“

ہم سب بٹ صاحب کی دانشمندی سے بہت خوش ہوئے۔ مرزا مشرف نے تو ہلکا سا نعرہ بھی لگادیا ”بٹ صاحب زندہ باد۔“

اس نعرے میں خود بٹ صاحب بھی شامل تھے۔ انہوں نے بھی اپنے آپ کو زندہ باد کہا۔ ہم سب نے حیرت ظاہر کی تو فرمایا ”بھائی آج کل اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا زمانہ ہے۔“

ترکی کے مہذب شہریوں کو دیکھ کر احساس ہوا کہ ہم کتنے بدتہذیب ہوتے جارہے ہیں۔ اخلاق و آداب، تہذیب اور ثقافت سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ جن



چیزوں کو آج کل فیشن اور ترقی کہا جاتا ہے ہماری تہذیب کے مطابق اس کو بدتمیزی اور بداخلاقی کہا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دوسری ترقی یافتہ قوموں نے اپنی تہذیب اور ثقافت کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ آپ جاپانیوں کو دیکھیے جو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں سے ایک ہے مگر جاپانیوں نے اپنی اخلاقی اقدار اور پرانی تہذیب کو نہیں چھوڑا۔ دوسرے ملکوں کا بھی یہی حال ہے سوائے امریکیوں کے، جن کی نہ تو پرانی ثقافت ہے اور نہ کوئی قدیم تہذیبی روایات۔

ترکی میں ہم نے ایک نمایاں چیز جو محسوس کی وہ ترقی یافتہ ہونے کے باوجود ان میں قدیم تہذیب اور پرانی قدروں کا احترام ہے۔ وہ اپنی پرانی ثقافت اور تہذیب پر فخر کرتے ہیں۔ جس زمانے میں مصطفیٰ کمال نے سیکولرازم رائج کرنے کے بعد ترکی میں مغربی طور طریقوں کو جنم دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا تھا اور حکومت طاقت کے استعمال سے ترکوں کو یورپین بنانے کی کوشش کررہی تھی اس وقت بھی ترک چپکے چپکے اسلام اور اپنی پرانی تہذیب سے چمٹے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسلام پسند اقتدار میں آئے تو انہیں بہت بڑی مسلمان اکثریت کی امداد حاصل تھی۔

ترکی کے اسلام پسندوں نے ہمارے مولویوں اور علما کی طرح فرقہ پرستی اور مسلک کے اختلاف پر لڑائی جھگڑے نہیں کیے بلکہ معاشرے کو اچانک اتھل پتھل سے بچانے کے لیے ہر ایک کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ کوئی انہیں برا نہیں سمجھتا۔ نہ ہی ان کو مسلمان بنانے کے لیے زور اور زبردستی سے کام لیا۔ اب ترکی کی سڑکوں پر آپ کو مغربی مشرقی اور ترکی لباس پہنے عورتیں اور مرد چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ جینز، بلاؤز، قمیص، ترشے ہوئے بالوں والی لڑکیاں بھی بے خوف و خطر گھومتی ہیں اور برقع، چادر اور عبایہ پہننے والی عورتوں کی بھی بہت بڑی اکثریت نظر آتی ہے۔ ان میں آپس میں کوئی اختلاف یا جھگڑا بھی نہیں ہوتا۔ جدید و قدیم سب یکجا نظر آتے ہیں۔ سب نے مل جل کر ایک مخلوط اور پُرامن معاشرہ تشکیل کیا ہے۔ یہ دانش مندانہ حکمتِ عملی ایک مضبوط ملک اور متحد قوم بنانے میں بہت کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ ترکی آج پہلے سے زیادہ مستحکم، خوشحال اور ترقی یافتہ ملک ہے۔ جو اپنا ڈھول خود نہیں پیٹتا وہ پھسڈی رہ جاتا ہے اور

فورمین جارج 1948ء عالمی شہرت یافتہ امریکی ہیوی ویٹ باکسر۔ اس نے جب مائیکل موورر کو ناک آؤٹ کیا تو وہ اس وقت 26 برس کا تھا اس سے پہلے اتنی عمر میں کسی باکسر نے ہیوی ویٹ کا ٹائٹل نہیں جیتا تھا۔ اس نے جو فریزیئر کو دوسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کیا، لیکن 1974ء میں وہ زائرے میں محمد علی سے ہار گیا۔ باکسنگ چھوڑنے کے بعد مذہب کی طرف راغب ہوگیا اور نادار بچوں کے لیے فنڈز اکٹھے کرنے کی مہم چلائی۔ تاہم 5 نومبر 1994ء کو لاس ویگاس (امریکا) میں ورلڈ باکسنگ ایسوسی ایشن ٹائٹل جیت کر 20 سال کے بعد پھر ورلڈ چیمپئن ہونے کا اعزاز حاصل کرلیا۔ تاہم اپریل 1995ء میں وہ اپنا یہ اعزاز برقرار نہ رکھ سکا۔

لوگ اسے کوا سمجھنے لگتے ہیں۔ چلتے چلتے آپ کو ”پہلے آپ“ کا لطیفہ سنادیں۔ یہ قدیم لکھنؤ کے زمانے کا واقعہ ہے جب تہذیب و اخلاق کا دور دورہ تھا، بچہ بچہ اخلاق کا نمونہ تھا۔ ایک نیک نام خاتون کو دائی نے بتایا کہ بیگم، مبارک ہو، آپ ماں بننے والی ہیں۔ سارے خاندان میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی۔ سارے خاندان نے دنیا میں آنے والے بچے کا انتظار کرنا شروع کردیا۔ دائی نے یہ خوش خبر بھی سنائی کہ جڑواں بچے ہوں گے۔

نو ماہ گزر گئے مگر پیدائش نہ ہوئی۔ مختصر یہ کہ ستر سال گزر گئے لیکن جب پیدائش نہ ہوئی تو ڈاکٹروں نے آپریشن کرکے بچوں کو ماں کے پیٹ سے باہر نکالنے کا فیصلہ کیا۔ آپریشن کے لیے پیٹ کاٹا گیا تو سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ 70 سال گزر جانے کے بعد بھی دونوں بچے زندہ تھے مگر دونوں کی ڈاڑھیاں سفید ہوچکی تھیں اور سر کے بال بھی سفید ہوگئے تھے۔

ایک بھائی دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ ”بھائی جان، پہلے آپ۔“

دوسرا کہہ رہا تھا ”نہیں پہلے آپ۔“

اس ”پہلے آپ پہلے آپ“ میں ستر سال گزر گئے۔

یہ تو خیر لطیفہ ہے لیکن ہم نے اپنے بچپن میں اور لڑکپن میں یہ ادب آداب خود آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ عجب بات

ہے کہ جوں جوں ہم ترقی یافتہ ہوتے جارہے ہیں اپنی روایت سے دور ہوتے جارہے ہیں۔

اِدھر اُدھر پھرتے پھراتے ایک ایسی دکان پر پہنچ گئے جہاں گول چکتی جیسا طغرا ایک رہا تھا۔ ہر چکتی پر ایک آنکھ بنی ہوئی تھی۔ یہ چکتی لوگ اپنے اپنے گھروں میں لگاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس آنکھ کی وجہ سے نظر بد سے گھر محفوظ رہتا ہے۔ خان صاحب نے بٹ صاحب پر زور دیا کہ ایک آنکھ آپ بھی خرید لو۔

”میں کیوں خریدوں۔“

”تمہیں خریدنا ہوگا۔“ خان صاحب نے زور دیا۔

”خان صاحب، آپ یہ زیادتی کررہے ہیں۔“

”ارے بھئی میں تو تمہاری بچت کررہا ہوں۔ دیکھو یہاں ہر سائز کی آنکھیں رکھی ہوئی ہیں میرا تو خیال ہے کہ تم بہت سی آنکھیں خرید لو۔ پاکستان جاکر ڈاکٹروں کو بیچ دینا۔ ان کا بھی فائدہ ہوجائے گا اور تمہیں بھی۔“

ہم نے بحث یہ ختم کرنے کے لیے مشورہ دیا کہ ترکی کی یادگار کے طور پر ہم سب کو یہ آنکھیں خرید لینی چاہئیں۔

مختلف قسم کی آنکھیں ہم سب نے خریدیں۔ سوچا کہ تحفے کے طور پر بھی تقسیم کردیں گے۔ لوگ خوش ہوجائیں گے۔

تانگے میں ہم نے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں سارے جزیرے کا چکر لگایا۔ جس سڑک پر بھی ہم گئے اس کی دوسری جانب نیلا سمندر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ سڑکوں کے دوسری جانب پہاڑیاں اور ڈھلوانیں تھیں جن پر بہت خوبصورت گھر بنے ہوئے تھے۔ کچھ گھر تو آباد تھے۔ ان میں لوگ رہتے تھے۔ کچھ گھر مالدار لوگوں نے اس لیے بنوا لیے تھے کہ دنیا کے شوروغل سے بچ کر سکون حاصل کرنے کی غرض سے وہ یہاں آکر کچھ دن یا ہفتوں پناہ لے سکیں۔ یہ جزائر استنبول سے بھی زیادہ دور نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کے فاصلے پر تھے۔ فیری اور بحری سروس بہت اچھی تھی اور ہر نصف گھنٹے بعد چلتی رہتی تھی۔ اس لیے بہت سے لوگ جو استنبول میں کام اور کاروبار کرتے تھے انہوں نے بھی اپنی رہائش قریبی جزیروں میں رکھی ہے۔ کام کے لیے وہ صبح استنبول آتے ہیں اور کام ختم کرکے شام کو یا رات کو واپس اپنی پُرسکون رہائش گاہ میں جاکر دنیا کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کرلیتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے سیاح استنبول کے بجائے ان جزیروں میں قیام کرتے تھے کیونکہ وہاں ہوٹل سستے مل جاتے ہیں۔ سہولتیں اور صفائی ان ہوٹلوں میں بھی استنبول کے ہوٹلوں جیسی ہی ہے۔

خریداری سے فارغ ہوکر ہم بازار سے باہر جانے کے لیے چل پڑے۔ اچانک آغا کریم نے کسی کو پکارا۔ ”یا حاج، یا حاج!“

دیکھا تو ایک سردار جی ڈاڑھی اور پگڑی سمیت ریستوران کی طرف جارہے تھے۔ ان کے دو بچے اور ایک بیگم بھی ان کے ہمراہ تھیں جنہوں نے جینز اور بلاؤز زیب تن کررکھے تھے۔ ہم حیران تھے کہ آغا نے سردار جی کو حاجی کا رتبہ کیسے عطا کردیا۔ حاج ترکی میں حاجی یا کسی بزرگ قابلِ احترام شخصیت کو کہا جاتا ہے۔

”حاج صاحب“ نے آغا کریم کی دھیمی پکار بھی سن لی تھی اور پلٹ کر ان کی طرف آرہے تھے۔ مزید حیرانی اس وقت ہوئی جب ہم نے سردار جی کو فرفر ترکی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے سنا۔

آغا کریم نے ہم سب سے ان کا تعارف کرایا اور بتایا کہ ان کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ پچیس سال سے استنبول میں رہتے ہیں اور ان کی بجلی کے آلات کی ایک دکان ہے۔

سردار جی کو جب معلوم ہوا کہ ہم لوگ لاہور سے آئے ہیں تو خوشی کے مارے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے فوراً ہم سب کو ”جپھیاں“ ڈالیں اور ٹھیٹ پنجابی زبان میں باتیں کرنے لگے۔

”ہور سناؤ جی، لہور دا کی حال اے۔“

ہم نے انہیں بتایا کہ لاہور بدستور اپنی جگہ ہے اور بہت اچھا رونق والا شہر ہے۔

انہوں نے شاہی قلعے اور شاہی باغ کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ بٹ صاحب نے کہا۔ ”سردار جی، یہ دونوں اپنی اپنی جگہ موجود ہیں کیونکہ ان کے پیر نہیں ہیں کہ یہ چل کر کہیں اور جاسکیں۔ مگر لاہور میں اور بھی کئی بڑے بڑے خوبصورت باغ بن گئے ہیں۔“

”بڑی چنگی گل اے۔“ پھر انہوں نے پوچھا۔ ”وہ جی چڑیا گھر والے باغ دا کی حال اے۔“

ان کا اشارہ باغ جناح کی طرف تھا۔ انہیں چڑیا گھر والے باغ کی صحت مندی کے بارے میں بھی مطلع کردیا گیا۔

کہنے لگے۔ ”باغ نوں چھڈو، چڑیا گھر دی خبر سناؤ۔“

خان صاحب نے انہیں بتایا کہ چڑیا گھر بھی وہیں ہے اور جانور بھی خیریت سے ہیں۔

سردار جی نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ اتنے پرانے جانور اور پرندے آج تک زندہ ہیں۔

خان صاحب انہیں سمجھانے لگے کہ انسانوں کی طرح جانور بھی مرتے رہتے ہیں مگر ان کی جگہ دوسرے آجاتے ہیں۔

سردار جی۔ ”اے نئے جانور ایں۔ اساں پرانیاں نو پچھیا سی۔ (لیکن یہ تو نئے جانور ہیں میں نے تو پرانے جانوروں کے بارے میں دریافت کیا تھا)

پھر خود ہی بولے ”چھڈو جی جانوراں نوں۔ کافی شافی ٹھنڈا گرم ہوجائے؟“ (جانوروں کو چھوڑو، کافی یا ٹھنڈا پی لیجیے) انہیں بتایا کہ ہم ابھی کافی شافی پی کر اور کباب شباب کھاکر نکلے ہیں۔ انہوں نے مایوسی سے آہ بھری اور بولے۔ ”تہاڈی قسمت، اسیں تے چلے۔ ٹبر انتظار کردا پیا اے۔“ (آپ کی قسمت۔ ہم تو چلتے ہیں وہاں میری فیملی میرا انتظار کررہی ہے۔“

ہمیں رب راکھا کہہ کر سردار جی رخصت ہوگئے۔

آغا کریم جو خاموش کھڑے پنجابی میں گفتگو سن رہے تھے، پوچھنے لگے ”آپ لوگ کس زبان میں باتیں کررہے تھے؟“

مرزا صاحب نے بتایا۔ ”پنجابی میں۔“

”مگر آپ کی زبان تو اردو ہے؟“

ہم نے انہیں بتایا کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں مختلف علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ صوبہ پنجاب کی زبان پنجابی ہے۔“

”مگر یہ بزرگ تو ترکی میں رہتے ہیں۔ انہیں ہندوستان سے یہاں آئے ہوئے پچیس سال ہوگئے ہیں۔ انہیں اپنی زبان ابھی تک یاد ہے؟ بہت اچھا حافظہ ہے ان کا۔“

خان صاحب نے انہیں سمجھایا کہ انسانوں کی جو مادری زبان ہوتی ہے وہ اس کو کبھی نہیں بھولتا۔ پنجابی لوگ دنیا میں جہاں کہیں بھی جائیں اپنے گھر میں آپس میں پنجابی میں ہی باتیں کرتے ہیں اور یہ سکھ تو اپنی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان بولتے ہی نہیں۔“

”سکھ؟ اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟“

”آغا صاحب، سکھ ہندوستان کی ایک قوم ہے۔ ان کا مذہب ہندو، مسلمانوں سے مختلف ہوتا ہے۔“

”اچھا!“ حیرت سے آغا کریم کا منہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ ”تو کیا یہ مسلمان نہیں ہیں؟“

”جی نہیں۔“

”اوہو! ہم تو انہیں بہت پرہیزگار اور عبادت گزار مسلمان سمجھتے ہیں۔“

”اسی لیے آپ انہیں حاج کہہ رہے تھے؟ مگر ان کے بزرگ ہونے کا خیال آپ کو کیوں آیا۔“

”ان کی ڈاڑھی اور عمامہ دیکھ کر۔“

”آغا صاحب، ڈاڑھی رکھنا ان کے مذہب میں لازمی ہے۔ اور جسے آپ عمامہ کہہ رہے ہیں ان کی پگڑی ہے۔ چونکہ یہ زندگی بھر بال نہیں کٹواتے ان کے بال بہت لمبے ہوجاتے ہیں۔ انہیں سمیٹنے کے لیے یہ پگڑی باندھتے ہیں۔“

آغا کریم یہ سن کر بہت حیران ہوئے۔ بولے ”ہم تو انہیں حاج کہتے ہیں۔“

سکھ اپنی ڈاڑھی اور پگڑیوں کی وجہ سے یہاں بہت برگزیدہ لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ ایک بات تو ماننی پڑے گی کہ سکھ ایسی قوم ہے جو دنیا میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ ایک ہو یا ہزاروں، آپ جہاں بھی جائیں گے وہاں سکھ ضرور نظر آجائیں گے۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ یہ بہت محنتی ہوتے ہیں اور کسی بھی کام کو عار نہیں سمجھتے۔ چاہے سڑکوں پر کھڑے ہوکر چھوٹی موٹی چیزیں فروخت کریں یا سائیکل پر اپنی چلتی پھرتی دکان لے کر گھر گھر، گلی گلی سامان فروخت کرتے رہیں۔ یہ کسی کام کو کمتر نہیں سمجھتے یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ ترقی کرکے لکھ پتی، کروڑ پتی بلکہ ارب پتی ہوجاتے ہیں۔ ہم نے کبھی کسی سکھ کو بھیک مانگتے اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے نہیں دیکھا۔ ترکی کے ڈائمنڈ آئی لینڈ میں بھی سکھ نظر آگئے۔

اب ہم پیدل بندرگاہ کی طرف چل پڑے۔ اونچی نیچی سڑکوں سے گزر کر ہم ساحل کی طرف جارہے تھے جہاں ڈیڑھ گھنٹے بعد ہماری فیری کو آنا تھا۔ اوپر سے سڑک پر سے ہم نے دیکھا کہ ساحل کے کنارے کچھ لوگ کپڑے دھورہے ہیں۔ دو تین سیاح پانی میں ڈور ڈالے آرام سے لیٹے کتاب پڑھ رہے تھے اور مچھلی پھنسنے کے انتظار میں تھے۔ مچھلی پکڑنا بھی ایک ایسا شوق ہے جس کے لیے پورا ایک دن

بھی ناکافی ہے اور بعض اوقات تو پورے دن کے بعد بھی ایک چھوٹی سی مچھلی کانٹے میں نہیں پھنستی۔

بٹ صاحب چلتے چلتے خودکلامی کے انداز میں بولے۔

"کاش میں مچھلی ہوتا اور سمندر کے نیلے پانی میں تیرتا پھرتا۔"

ہم نے کہا۔"مگر بٹ صاحب آپ تو کہتے ہیں کہ آپ کو پانی سے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر تو اس لیے لگتا ہے کہ میں انسان ہوں۔ اگر مچھلی ہوتا تو نہ ڈرتا۔"

خان صاحب نے کہا۔"بٹ صاحب، یہ زیادہ خطرناک بات ہوتی اس لیے کہ سمندر میں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں۔"

مرزا مشرف نے کہا۔"مگر آپ نے اتنی چھوٹی مچھلیوں کے بارے میں نہیں سوچا جو وہیل مچھلی کے پیٹ کو صاف کرتی رہتی ہے اور ہر وقت وہیل مچھلی کے پیٹ سے چمٹی رہتی ہے۔"

"آپ لوگ اب مجھے زیادہ نہ ڈرائیں۔ بھائی میری تو سمندر میں پیر رکھنے کے خیال سے ہی جان نکل جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے والد مجھے کیا بنانا چاہتے تھے؟"

"مچھلی؟"

"ارے نہیں بھئی، وہ مجھے نیوی میں بھرتی کرانا چاہتے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ میں ایڈمرل بنوں۔"

خان صاحب نے فوراً کہا"اگر آپ نیوی میں بھرتی بھی ہو جاتے تو زیادہ سے زیادہ خلاصی بن جاتے۔"

"جو بھی بنتا اس وقت بنتا جب نیوی میں بھرتی ہوتا۔ میں بھرتی کے دفتر گیا تھا۔ اس کا تحریری امتحان لاہور میں ہوا تھا۔ ابا نے مجھے رٹا لگوا کر کئی سوال یاد کرا دیے تھے۔ کیونکہ وہ خود بھی نیوی میں رہ چکے تھے۔ اس امتحان میں تو میں پاس ہو گیا لیکن فزیکل ٹیسٹ کے لیے شیخوپورہ جانا تھا۔"

"تو پھر آپ شیخوپورہ گئے۔"

"ہاں گیا تھا۔ بھرتی کے دفتر میں سوسوا سو نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک ایک افسر صاحب آئے اور بولے۔

"آپ سب کپڑے اتار دیجیے۔"

مجھے بہت حیرت ہوئی اور شرم بھی آئی مگر دوسرے نوجوانوں نے اپنی قمیص اور بنیان اتار دیے۔ جب افسر نے گھور کر دیکھا تو میں نے بھی قمیص اور بنیان اتار دی۔ یہ افسر خاصا بدمزاج تھا لیکن نیوی کی سفید وردی اور ٹوپی پہن کر بہت الگ رہا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے نیوی میں جانے کا شوق ہی اس یونیفارم کو دیکھ کر ہوا تھا۔"

"اچھا اچھا، آگے سنائیں۔"

"آگے یہ کہ جب اس نے کہا کہ آپ سب پتلونیں بھی اتار دیں تو مجھ سے رہا نہ گیا کہ یہ شخص تو مجھے ننگا کر دے گا۔ میں نے قمیص اور بنیان اٹھائی اور افسر کو سلیوٹ مار کر کہا۔

"جناب سوری۔"

"کس بات کی سوری؟"

"میں سب کے سامنے پتلون نہیں اتار سکتا۔ مجھے اجازت دیجیے۔"

یہ کہہ کر میں قمیص اور بنیان پہن کر وہاں سے چلا آیا۔ باقی سب لوگوں نے اپنی پتلونیں اتار دیں۔ میں جب بس میں واپس جا رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ کیا اس کے بعد سب امیدواروں کے انڈرویئر بھی اتروائے گئے ہوں۔ اس طرح میری نیوی کی یونیفارم پہننے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔"

ہم نے کہا"بٹ صاحب، اگر یونیفارم ہی پہننے کا شوق تھا تو آپ نے خود ہی نیوی کا یونیفارم سلوا لیا ہوتا۔ ٹوپیاں تو بازار میں بھی مل جاتی ہیں۔"

مگر ابا نے مجھے بہت ڈانٹا اور کہا۔"گدھے، معلوم ہو گیا کہ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ بس زمینوں پر جا کر زمینوں کا کام سنبھالو۔" اس طرح میں نیوی کا ایڈمرل ہونے کے بجائے زمیندار بن گیا۔"

مرزا صاحب نے پوچھا۔"تو آپ کو نیوی میں نہ جانے کا افسوس تو ہوا ہوگا؟"

"افسوس تو تھا مگر مجھے تیرنا نہیں آتا۔"

"تیرنا تو نیوی والے خود ہی سکھا دیتے ہیں؟"

"وہ کیسے؟"

"اس طرح کہ اٹھا کر سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔ تیرنے سے ناواقف بھی جان بچانے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہے اور اس طرح کچھ دن بعد اس کو تیرنا آجاتا ہے۔"

وہ ڈر کر بولے۔"اگر سمندر میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے کوئی ڈوب جائے تو کون ذمے دار ہوتا ہے۔"

"بھائی وہ ڈوبنے نہیں دیتے۔ جب ڈوبنے کا سوفیصدی خطرہ ہوتا ہے تو غوطہ خور ان کی جان بچا لیتے ہیں۔"



"اللہ تیرا شکر ہے!" بٹ صاحب آسمان کی طرف سر اٹھا کر اللہ میاں سے براہِ راست مخاطب ہوئے۔

"کس بات کا شکر کر رہے ہو؟"

"اس بات کا کہ اس دن اللہ نے توفیق دی اور میں نے اپنی پتلون نہیں اتاری۔ اس طرح جان بچ گئی۔"

اتنی دیر میں ہم لوگ ساحل پر پہنچ گئے تھے۔ ابھی بحری جہاز کے آنے میں دیر تھی اس لیے ہم مکانوں اور ہوٹلوں کے سامنے بنی ہوئی ایک پتھروں کی دیوار پر بیٹھ گئے۔ ایک ٹھیلے نما چیز پر ایک صاحب کھڑے تربوز فروخت کر رہے تھے۔ صورت شکل سے وہ بڑے بارعب ترک تھے۔ لمبے تڑنگے۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود سرخ و سفید رنگت۔ بھورے بال اور بھوری گھنی مونچھیں۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے۔ دیکھنے میں کوئی بڑے افسر لگتے تھے۔

ریڑھی پر انہوں نے سرخ رنگ کے تربوز کی کٹی ہوئی قاشیں رکھی تھیں۔ جن پر ایک تھالی ڈھکی ہوئی تھی تاکہ مکھیوں سے محفوظ رہیں۔ ریڑھی کے نچلے حصے میں ایک پلاسٹک بیگ جیسی چیز لٹک رہی تھی۔ یہ اس لیے تھی کہ اگر وہیں کھڑے ہو کر تربوز کھایا جائے تو چھلکے اس بیگ میں ڈال دیے جائیں تاکہ کوڑا نہ پھیلے۔ ہمارے ملک میں بھی تربوز کی قاشیں اسی طرح ٹھیلوں پر فروخت ہوتی ہیں مگر انہیں مکھیوں سے بچانے کے لیے ڈھانپا نہیں جاتا اور نہ ہی چھلکے ڈالنے کے لیے کوئی بیگ یا تھیلا ہوتا ہے حالانکہ ترکی میں ہم نے کبھی ایک مکھی بھی نہیں دیکھی اور ہمارے ملک میں مکھیوں کی آبادی اتنی زیادہ ہے کہ دوسرے ملکوں کو برآمد کرکے کافی ڈالر کمائے جا سکتے ہیں۔

ہم لوگوں نے بزرگ کے پاس جا کر السلام علیکم کہا۔

"وعلیکم السلام۔"

ہم نے اشارے سے بتایا کہ چار قاشیں دے دیں۔ یہ ہم بتانا بھول ہی گئے کہ آغا کریم سے ہمارا ساتھ چھوٹ گیا تھا کیونکہ آئی لینڈ میں کسی دفتری کام سے آئے تھے اور ازراہِ میزبانی ہمارے ساتھ ہو لیے تھے۔

بزرگ نے چار قاشیں ہم لوگوں کے حوالے کیں اور خاموشی سے پیسے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔ دراصل وہ ترکی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے اس لیے فضول گفتگو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم ترک نہیں ہیں۔

تربوز نہ صرف دیکھنے میں سرخ تھا بلکہ بہت میٹھا بھی تھا۔ شہد کی طرح۔ ہم لوگوں کا مزید تربوز کھانے کا ارادہ تھا لیکن اس وقت بحری جہاز کا ہارن سنائی دیا۔ وہ بندرگاہ پر پہنچنے والا تھا۔ ہم نے جلدی سے ترک بزرگ کو خدا حافظ کہا اور بندرگاہ کی طرف بھاگے۔ شکر ہے کہ جس وقت جہاز ساحل سے لگا اسی وقت ہم پہنچے اور اندر جانے والے راستے سے بحری جہاز میں داخل ہو گئے۔

جہاز یا تو وہی تھا جس سے ہم آئے تھے یا پھر ویسا ہی تھا۔ دیکھنے میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ ہم لوگوں نے عرشے پر بیٹھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہاں سے سمندر کا نظارہ بھی اچھا ہوتا ہے۔ سمندر کی بھیگی ہوئی ہوا بھی بہت بھلی لگتی ہے۔ عرشے پر کرسیوں کا بندوبست نہیں ہوتا۔ لکڑی کی بنچیں لگی ہوتی ہیں۔ ایک لمبی سی بنچ پر ہم سب کو بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔

جہاز نے ہارن بجایا اور حرکت میں آگیا اور رفتہ رفتہ ڈائمنڈ آئی لینڈ سے دور ہوتا چلا گیا۔ جیسے جیسے ہم جزیرے سے دور ہو رہے تھے اس کی یادیں ہم کو ستانے لگی تھیں۔ یہ اتنی خوبصورت جگہ ہے کہ وہاں سے آنے کو جی نہیں چاہتا۔ انتہائی خوبصورت اونچی نیچی سرسبز پہاڑیوں میں یہ چھوٹا سا جزیرہ ایک پُرسکون اور انتہائی دلکش جگہ تھی۔ جزیرہ کیا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ ضرورت کی ہر چیز یہاں کے بازار میں مل جاتی ہے۔ لوگ بھی خوش اخلاق اور مہذب ہیں۔ دنیا کے ہنگاموں اور شوروغل سے دور یہ ایک پناہ گاہ تھی۔ دنیا میں ہمیں خوبصورت اور پُرسکون جگہ اچھی لگتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ یہیں کیوں نہ رہ جائیں۔ مگر ایسا کہاں ممکن ہے۔ انسان کی ہر خواہش تو پوری نہیں ہوتی۔ غالب نے بھی کہا ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہماری بنچ کے ساتھ والی بنچ پر ایک چودہ پندرہ سالہ ترک لڑکا بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس ملک میں سگریٹ نوشی خصوصاً نوعمر بچوں کی سگریٹ نوشی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس لڑکے کے ہونٹوں میں سگریٹ تھی اور ہاتھ میں ایک پلاسٹک کی تھیلی میں کوئی دانہ تھا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے یہ دانہ سمندر میں پھینک دیتا تھا۔ سی گل (سمندری پرندے) یہ دانہ پانی میں گرتے ہی اپنی چونچ میں اٹھا کر کھا لیتے تھے۔ لڑکے کی اس دانہ گیری کی وجہ سے سفید براق پرندوں کا غول ہمارے ساتھ ساتھ پرواز کرتا چل رہا تھا۔ اس کی وجہ سے کافی رونق ہو گئی تھی۔ اس لڑکے میں ہمیں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس سے

بات چیت کرنے کے لیے ہم نے مرزا مشرف سے درخواست کی۔

مرزا صاحب: السلام علیکم۔

لڑکا: (حیرت سے دیکھ کر اور سگریٹ باہر سمندر میں پھینک کر) وعلیکم السلام۔

مرزا: مجھے حیرت ہے کہ اتنی کم عمری میں تم سگریٹ پیتے ہو۔ کیا کوئی تمہیں منع نہیں کرتا؟

لڑکا: (شرمندگی سے) کرتے ہیں۔ اسی لیے میں گھر والوں اور بزرگوں کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا۔

مرزا مشرف: کیا اسی لیے تم نے میرے مخاطب ہونے پر سگریٹ پھینک دی۔

لڑکا: جی ہاں۔ مگر مجھے اس طرح ہر بزرگ ٹوکتا بھی نہیں ہے۔ بزرگوں کو چاہیے کہ چھوٹوں کو برے کام کرنے سے روکیں چاہے وہ ان کے لیے انجان ہی کیوں نہ ہوں۔

مرزا مشرف: (پیار سے اس کا سر تھپک کر) تم ایک اچھے لڑکے ہو۔

لڑکا: ہوں تو نہیں مگر اچھا بننے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔

مرزا مشرف: دیکھو بچے، سگریٹ صحت کی دشمن ہوتی ہے اور تمہاری عمر کے بچوں کو بہکا کر لوگ ہیروئین پینے کی عادت بھی ڈال دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی اور ان کے گھر والوں کی زندگی عذاب ہو جاتی ہے۔

لڑکا: (شرمندگی سے سر جھکا کر) اللہ گواہ ہے۔ میں اب سگریٹ نہیں پیوں گا۔

مرزا مشرف: اللہ تمہیں اس کی توفیق دے۔

لڑکا: آپ کہاں سے آئے ہیں۔ ترک تو نہیں لگتے۔ ایسی اچھی ترکی زبان بولتے ہیں۔

مرزا مشرف: میں ہندوستان سے آیا ہوں۔ مسلمان ہوں۔ کافی عرصے سے ترکی میں رہتا ہوں اس لیے زبان سیکھ لی ہے۔

لڑکا: اور آپ کے یہ ساتھی؟

مرزا مشرف: یہ پاکستانی ہیں۔ ترکی دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔

لڑکا یہ سن کر "مرحبا" کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مرزا مشرف نے ہم سب کا باری باری تعارف کرایا۔ اس نے ہر ایک کا ہاتھ تھام کر چوما۔ "پاکستان، پاکستان"

یہ دیکھ کر ہمارا دل خوشی سے لبریز ہو گیا کہ ترک قوم کا بچہ بچہ پاکستان سے اتنی محبت کرتا ہے۔ لڑکا اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ لڑکے سے ساری گفتگو ترکی زبان میں ہوئی تھی۔ اچانک ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ایک مردانہ آواز نے سب کو چونکا دیا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین، اٹینشن پلیز اٹینشن۔"

ظاہر ہے کہ سب لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ ایک درمیانہ عمر کے ترک تھے۔ کوٹ پتلون میں ملبوس لیکن گلے میں ٹائی نہیں تھی۔ ترکی میں ہم نے دیکھا کہ عموماً لوگ ٹائی نہیں لگاتے۔ صحت مند اور وجیہہ آدمی تھے۔ کلین شیو لیکن سیاہ رنگ کی مونچھیں ان کے چہرے پر بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

ان کے ہاتھ میں ایک آلہ قسم کی چیز تھی۔ انہوں نے اس کو اونچا اٹھایا پھر اس کی وضاحت کرنے لگے۔ آلہ کیا تھا امرت دھارا تھا۔ یہ باورچی خانے میں استعمال کرنے والی چیز تھی۔ اس سے پھل اور ترکاری کاٹی جا سکتی ہے۔ یہ جوس بنانے کے کام بھی آتا ہے۔ اس سے انڈا پھینٹ کر آملیٹ بھی بنا سکتے ہیں۔ یہ ایک منٹ میں آلو وغیرہ چھیل دیتا ہے۔ اس کو قینچی کی طرح بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس سے آئس کریم بھی بنائی جا سکتی ہے۔

وہ آلے کا مختلف انداز میں استعمال عملی طور پر بتاتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ الارم کلاک کے طور پر بھی کام آ سکتا ہے۔ اس کو سوتے وقت سرہانے رکھ لیں اس میں لگے ہوئے کلاک میں الارم لگا کر اطمینان سے سو جائیں۔ مقررہ وقت پر یہ آپ کو جگا دے گا۔

بٹ صاحب بولے "یہ تو کمال کی چیز ہے۔ کیا یہ مشین خود بخود کھانا بھی پکا سکتی ہے؟"

"جی ہاں۔" خان صاحب چپ نہ رہ سکے "یہ مشین کپڑے بھی دھو سکتی ہے۔ استری بھی کر سکتی ہے۔ جوتوں پر پالش بھی کر سکتی ہے۔"

اُدھر انہوں نے اپنے آلے کی قیمت بھی بتا دی۔ بہت سے لوگوں نے خریداری شروع کر دی۔ وہ اپنے ساتھ دو بڑے بیگ بھی لے کر آئے تھے۔ اس بیگ میں سے ہاتھ ڈال کر وہ آلہ برآمد کر لیتے تھے۔

مرزا صاحب بول پڑے "یہ بیگ ہے یا عمرو عیار کی زنبیل جس میں سے آلے برآمد ہوئے چلے جا رہے ہیں۔"

سارا سامان فروخت کرنے کے بعد انہوں نے بیگ بند کر کے ایک طرف رکھے اور بیٹھنے کے لیے خالی جگہ تلاش کرنے لگے۔ بٹ صاحب نے کھڑے ہو کر انہیں اشارہ کیا



کہ ادھر ہمارے پاس جگہ خالی ہے۔

خان صاحب نے بٹ صاحب کو گھورا۔ "یہاں کون سی جگہ خالی ہے۔ ایک بینچ پر ہم چار بیٹھے ہیں۔"

بٹ صاحب نے انہیں تسلی دی "خان صاحب، دل میں جگہ ہونی چاہیے۔ ہم ذرا سکڑ کر بیٹھ جائیں گے۔ ہم میں سے کوئی بھی موٹا نہیں ہے۔"

اتنی دیر میں وہ صاحب ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ہم سب نے ان کے لیے جگہ خالی کر دی وہ "تشکرم" کہہ کر بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے سے تعارف ہوا۔ ہم پاکستانیوں سے مل کر وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات چیت شروع ہوئی۔

بٹ صاحب نے پوچھا۔ "کیا یہ آلہ خود آپ نے ہی ایجاد کیا ہے؟"

"جی، بے شک۔"

"کیا آپ سائنسدان ہیں۔"

"جی نہیں، میں استاد ہوں۔ پولیٹکل سائنس پڑھاتا ہوں۔"

ہم سب یہ سن کر حیران رہ گئے۔

"تو پھر آپ نے یہ آلہ کیسے بنا لیا؟"

"بچپن ہی سے مجھے مختلف چیزیں بنانے کا شوق تھا۔ اب اس کو میں نے سائیڈ بزنس بنا لیا ہے۔"

"آپ تو کمال کے آدمی ہیں۔"

"میرا پورا نام مصطفیٰ کمال ہے۔"

"کیا مصطفیٰ کمال آپ کو بہت پسند ہیں جو آپ نے یہ نام منتخب کیا ہے؟"

وہ ہنس پڑے "میرا نام تو میرے والد نے رکھا تھا۔ پیدا ہوا بچہ خود اپنا نام کیسے رکھ سکتا ہے۔ لیکن یہ درست ہے کہ مجھے بھی اتاترک سے بڑی عقیدت ہے۔"

بٹ صاحب کافی دیر سے چپ تھے۔ بول پڑے۔ "پھر آپ نے اپنا نام اتاترک کیوں نہیں رکھا؟"

"کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اتاترک ترکوں کے باپ کو کہتے ہیں۔ میں کہاں اور اتاترک کہاں؟ دنیا میں دوسرا اتاترک کبھی پیدا نہیں ہو گا۔"

ہم سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کیا بات ہے۔ آپ لوگ خاموش کیوں ہو گئے؟" انہوں نے دریافت کیا۔

خان صاحب نے کہا "مسٹر کمال! دراصل بات یہ ہے کہ ہم نے ترکی میں اتاترک کے بارے میں مختلف قسم کے خیالات سنے ہیں۔"

مصطفیٰ کمال سمجھانے کے انداز میں بولے "لیکن آپ سے کسی نے یہ نہیں کہا ہو گا کہ اگر اتاترک نہ ہوتے تو آج ترکی بھی نہیں ہوتا۔"

"ہاں، یہ تو سب مانتے ہیں اور انہیں اتاترک بھی کہتے ہیں۔"

وہ بولے "دیکھیے۔ اگر کوئی ان پر تنقید کرتا ہے تو اس کی بھی وجوہات ہیں۔ کیونکہ انہوں نے خلافت ختم کر دی تھی۔ وہ مُلاؤں کے دشمن تھے۔ انہوں نے ترکی میں مغربی طور طریقے رائج کر دیئے تھے۔ وہ یہی کہتے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔"

وہ بولے "میں اس بارے میں ان سے متفق ہوں۔"

ہم سب نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ "مگر آپ اُن کے عقیدت مند بھی ہیں۔"

"اس میں حیرانی کی بات نہیں ہے۔ انسان کو کسی بڑے شخص کے بارے میں حقیقت حال جاننے کے بعد اس کے بارے میں رائے قائم کرنا چاہیے۔ پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ مصطفیٰ کمال پاشا نے کن حالات کی وجہ سے یہ سب کچھ کیا تھا، میں آپ کو بتاتا ہوں۔ پھر فیصلہ آپ خود کیجیے گا۔ جب ترک سلاطین کی فتوحات بند ہو گئیں اور وہ تلوار کو چھوڑ کر عیش و عشرت میں ڈوب گئے تو سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ ترک سلطان کی آمدنی کے ذرائع ختم ہو گئے تھے مگر ان کی شان و شوکت اور شاہانہ اخراجات میں کمی نہیں آئی تھی۔ مجبوراً انہوں نے یورپ کے ملکوں سے قرضے لینے شروع کر دیئے جو کہ ان کے محکوم رہ چکے تھے۔

اس طرح انہوں نے عثمانیہ سلطنت کی عزت خاک میں ملا دی۔ یورپ والے تو تاجر لوگ ہیں۔ انہوں نے قرضوں کے بدلے مراعات حاصل کرنی شروع کر دیں۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں کا معیشت پر قبضہ ہو گیا۔ علما نے بجائے صحیح مشورے دینے کے آپس میں بحث مباحثے شروع کر دیے۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر یورپ کے ملکوں نے ترکی کے حصے بخرے کر کے آپس میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا اور ترکی کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ سلطان یا خلیفہ تو خوشامدیوں اور یورپی سفیروں کے درمیان میں گھرا ہوا تھا اس وقت مصطفیٰ کمال اور ترک فوج یورپی حملہ آوروں کا ہر محاذ پر مقابلہ کر رہی تھی۔ پارلیمنٹ کو سلطان پہلے ہی برطرف کر چکا تھا۔ ترکی کے وزیراعظم نے ان سنگین حالات کا







www.paksociety.com

مقابلہ کرنے کے لیے نیشنل اسمبلی کے انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا جو سلطان کو بہت ناگوار گزرا۔ سلطان نے علما کے مشورے سے انتخابات کو غیر اسلامی اور شریعت کے خلاف قرار دے دیا۔ مصطفیٰ کمال جو اس معاملے میں سرگرم تھے۔ خلیفہ نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اسلام کا دشمن ٹھہرا کر ان کے خلاف عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا۔ یہاں تک کہ شیخ الاسلام نے یہ فتویٰ دے دیا کہ مصطفیٰ کمال اور ان کے ساتھی واجب القتل ہیں۔ ان کو قتل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ''باغیوں'' کو مروانے کے لیے خلیفہ نے اسلام اور خلافت کی حفاظت کے نام پر ساری دنیا سے چندہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ مصطفیٰ کمال تو یورپ کے حملہ آوروں کو ملک سے باہر نکالنے کے لیے مختلف محاذوں پر جنگ میں مصروف تھے۔ استنبول میں خلیفہ اور شیخ الاسلام نے مذہب کے نام پر اکسا کر جن لوگوں کا گروہ بنایا تھا وہ مصطفیٰ کمال کی جان کے دشمن بن گئے تھے اور ان پر اور ان کے ساتھیوں پر حملے کر رہے تھے۔ اس طرح مصطفیٰ کمال کو ایک ہی وقت میں دو محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا۔ اگر وہ آہنی اعصاب اور ارادے کے مالک نہ ہوتے تو شاید سب کچھ چھوڑ کر ملک سے باہر چلے جاتے۔ یورپی ملکوں کے سفیروں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا اور خلیفہ کو یقین دلا دیا تھا کہ مصطفیٰ کمال کے قتل کے بعد ترک فوج کو شکست ہو جائے گی اور خلیفہ من مانی کر سکے گا۔ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ مسلمانوں اور ترکوں کا خلیفہ خود اپنے ملک کا دشمن بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی بندھ چکی تھی۔ خلیفہ نے استنبول میں مصطفیٰ کمال کا کورٹ مارشل کروا کر ملٹری کورٹ سے انہیں اور ان کا ساتھ دینے والوں کو موت کی سزا دی تھی۔

مصطفیٰ کمال ایک بہادر اور خود دار انسان تھے۔ وہ ترکوں کی اور ملک کی حفاظت کے لیے دن رات مختلف محاذوں پر جنگ کر رہے تھے اور خلیفہ نے انہیں غدار قرار دے کر موت کی سزا دلا دی تھی۔ مصطفیٰ کمال ترکی میں یورپی قوموں کا وجود بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور یورپ والے ترکوں کا نام و نشان تک مٹا دینا چاہتے تھے جو نہ صرف دنیا کی بہت بڑی طاقت رہ چکے تھے بلکہ یورپ تک کو ترک فوجوں کے قدم روند چکے تھے۔ یورپ کے عیسائی حکمرانوں کے لیے یہ ترکوں کی عظمت اور غرور خاک میں ملانے کا یہ بہترین موقع تھا۔ اب آپ خود ہی بتائیے کہ مصطفیٰ کمال کے علاوہ کوئی اور بھی ہوتا تو کیا کرتا۔ وہ ایک سچے ترک تھے۔

ان کا کہنا تھا کہ ترک ایک آزاد قوم ہے۔ یہ ترکوں کا ملک ہے اور ان ہی کے لیے ہے۔ یہاں غیروں خصوصاً غیر مسلموں کا وجود... برداشت نہیں۔ دوسری طرف خلیفہ اور شیخ الاسلام تھے جو درحقیقت ترکی اور ترکوں کے خلاف ہر کارروائی کو جائز قرار دیتے تھے۔

اللہ کو مصطفیٰ کمال کی حب الوطنی پسند آئی۔ انہوں نے یورپ کے حملہ آوروں کو ترکی سے مار مار کر نکال دیا اور ملک کے چپّے چپّے پر ترکوں کی حکومت قائم کر دی۔ ان حالات کا مصطفیٰ کمال پر کیا ردِعمل ہو سکتا تھا؟ انہیں علما سے، خلیفہ سے، خلیفہ کے ساتھیوں اور خوشامدیوں سے نفرت ہو چکی تھی۔ انہوں نے طاقت کے ذریعے بیک وقت یورپ کے چار ملکوں کی فوجوں کو شکست دے کر ترکی کو ایک آزاد ملک بنایا تھا۔ انہیں غدار اور مذہب کا باغی کہہ کر مذہب کے نام پر ترکوں کو ان کا مخالف بنا دیا تھا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اگر مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافت ختم کی اور علما کے مخالف ہو گئے تو کیا یہ غلط تھا؟''

ہم سب خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ یہی تاریخی حقیقت ہے جو وہ بیان کر رہے تھے۔

مصطفیٰ کمال کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔ ''اتاترک میں کچھ خامیاں بھی تھیں مگر وہ ان کی ذاتی خامیاں تھیں۔ وہ رنگین مزاج تھے۔ شراب پیتے تھے۔ عورتیں بھی ان کی کمزوری تھیں مگر ان کی یہ خامیاں ان کی ذات تک محدود تھیں۔ ملک اور قوم کے لیے تو وہ مسیحا تھے۔ وہ ترکی کے وفادار اور جاں نثار تھے۔ یورپ ---- کی فوجوں کو ترکی سے باہر نکال دینے کے بعد انہوں نے ملک میں انتخابات کرائے اور قومی اسمبلی نے 1924ء میں خلافت کو ختم کر دیا۔ علما نے ملک کو جو نقصان پہنچایا تھا اور جس طرح فرقہ وارانہ جذبات پیدا کیے اس کے بعد وہ ملک میں ایسے عناصر کو پنپتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ملک میں سیکولر نظام قائم کر دیا کہ ترکی ان خطرات سے بچا رہے جن کی وجہ سے ترکی کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔''

جہاز کا ہوٹر گونجنے لگا تو ہمیں احساس ہوا کہ ہم استنبول واپس آ گئے ہیں۔ مصطفیٰ کمال سے مل کر اور خدا حافظ کہہ کر ہم استنبول کی سرزمین پر قدم رکھنے کے لیے تیار ہو گئے۔

(جاری ہے)



# دغا باز

ابن کبیر

اس دنیا میں کیسے کیسے دغا باز کس کس طرح لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں۔ کس طرح دھوکا دیتے ہیں اس کا ایک معمولی سا نمونہ۔ اس مشہور کیس کا تذکرہ جو آج بھی لاینحل ہے مگر یورپ بھر میں زبان زدِ عام ہے۔

## ایک انوکھے دغا باز کا تذکرہ

وہ 13 جون 1994ء کا دن تھا۔

سین اینٹونیو کے قصبے پر موسم گرما اتر چکا تھا۔ بادلوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے سرگشت پر نکلے تھے۔ سورج کرنیں بکھیر رہا تھا۔ ہواؤں میں گرم لپٹیں تھیں۔

قصبے کے جنوبی کنارے پر ایک باسکٹ بال کورٹ تھا۔ تیرہ سالہ نیکلس بار کلے اس صبح وہیں تھا۔ جسم پسینے سے شرابور۔ نیلے رنگ کی جرسی بدن سے چپکی ہوئی۔

وہ ایک کڑا مقابلہ تھا۔ اس کی ٹیم دو پوائنٹ کے

خسارے میں جارہی تھی۔ میچ ختم ہونے میں کچھ ہی سیکنڈ بچے تھے۔ اس کے ساتھی گیند کے حصول کے لیے بھرپور جدوجہد کررہے تھے۔ وہ جیت کے آرزومند تھے۔

اچانک اس کے ایک ساتھی نے گیند اُچک لی۔ کورٹ میں اس کے نام کی بازگشت سنائی دی۔ گیند ہوا میں تیرتی ہوئی اس کی جانب آرہی تھی۔ اس نے جست لگا کر اسے تھام لیا۔

یہ آخری سیکنڈز تھے۔ اختتامی سیٹی بجنے کو تھی اور نیکلس گیند ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ نظریں باسکٹ پر تکی تھیں۔

مخالف ٹیم کے کھلاڑی اس کی طرف دوڑے آرہے تھے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ غلطی کا کوئی امکان نہیں بچا تھا۔ نیکلس نے ایک مشاق کھلاڑی کی طرح گیند ہوا میں اچھال دی۔

ریفری نے سیٹی منہ میں داب رکھی تھی۔ وہ اختتام کا اعلان کرنے کو تھا۔

گیند ہوا میں تیر رہی تھی۔ سب کی نظریں اس پر تکی۔ وہ دم سادھے کھڑے تھے۔ اور پھر... گیند پانی کی طرح بہتی ہوئی جالے سے نکل گئی۔ نیکلس کی ٹیم کو تین پوائنٹ مل گئے۔ اختتامی سیٹی بج گئی۔

اس کی ٹیم میچ جیت چکی تھا۔ وہ ہیرو بن گیا۔ سب نے اسے کاندھے پر اٹھالیا۔

کچھ دیر جشن جاری رہا۔ ڈریسنگ روم جانے سے قبل اس نے ٹیلی فون بوتھ سے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔

ریسیور چھوٹے بھائی نے اٹھایا۔

''مما سے کہو مجھے پک کرلیں۔ میچ ختم ہوگیا۔'' اس نے کہا۔

''وہ ابھی ابھی سوئی ہیں۔'' بھائی نے جواب دیا۔

''تو اٹھادو۔'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

چھوٹے بھائی نے اس کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ بیڈ روم میں جانے سے قبل عورت نے بچے کو خاصی ڈانٹ پلائی تھی۔ وہ ڈرا ہوا تھا۔

دوسری جانب کورٹ روم دھیرے دھیرے خالی ہونے لگا۔ نیکلس کے دوست ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ آخری ساتھی نے روانگی سے قبل ساتھ چلنے کی پیشکش کی۔

''ہمارے ساتھ چلے چلو۔ میرے ڈیڈی تمہیں سٹی اسٹیشن چھوڑ دیں گے۔''

''اس کھٹارا میں۔'' اس نے منہ بنایا۔ ''شکریہ جیمس۔ میری مما ابھی آتی ہوں گی۔''

اس کے انکار کے دو اسباب تھے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ جیب اُس کی خالی تھی۔ سٹی اسٹیشن سے پیدل گھر جانا پڑتا اور یہ اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ اور پھر لڑکے کی ماں نے وعدہ کررکھا تھا کہ وہ آج اُسے نئے جوتے دلائے گی۔ بس اِسی وجہ سے اُس نے انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

دوسری طرف نیکلس کی ماں بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ عجیب وغریب مناظر ذہن کے پردے پر گھوم رہے تھے۔ وہ ڈراؤنے خواب دیکھ رہی تھی۔ ایسے انسانوں میں گھری تھی، جن کے چہروں پر نقاب پڑے تھے۔

جیمس نے رخصت ہوتے ہوئے ایک بار مڑ کر دیکھا۔ نیکلس تنہا کھڑا تھا۔ اپنے دوست کے لیے اُس کے دل میں اندیشے تھے۔ اس نے ہاتھ ہلا کر نیکلس کو الوداع کہا۔ جواب میں لڑکے نے ہاتھ ہلایا۔

گاڑی آگے بڑھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اسے نیکلس ایک دھبّے کے مانند دکھائی دینے لگا۔ پھر دھبّا مٹ گیا۔

اب لڑکا تنہا تھا اور دوپہر میں ویرانی تیرنے لگی تھی۔

یہ آخری موقع تھا، جب کسی شخص نے نیکلس کو دیکھا۔ اس دوپہر یا تو زمین اسے کھا گئی یا آسمان نگل گیا... وہ پھر کبھی دکھائی نہیں دیا۔

اُس کے ساتھ کیا واقعہ رونما ہوا، یہ کوئی نہیں جانتا۔

☆☆☆

عورت بے آرام نیند کے بعد جاگ گئی۔ ایک حبس زدہ سہ پہر اُس کے روبرو تھی۔

جب بچے نے اُسے نیکلس کے فون سے متعلق بتایا، وہ چونکی۔ ''کیا وہ اب تک نہیں لوٹا۔ میچ تو کب کا ختم ہوگیا ہوگا۔''

اُس نے گاڑی نکالی۔ اب وہ جنوبی سمت جانے والی سڑک پر تھی۔ بیس منٹ بعد وہ باسکٹ بال کورٹ پہنچ گئی۔ وہاں سناٹا منہ چڑا رہا تھا۔

اس نے یہ سوچ کر خود کو دلاسا دیا کہ لڑکا کسی دوست کے ساتھ شہر آگیا ہوگا۔

وہ گھر لوٹ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ یہاں تک کہ شام اتر آئی۔ اب پریشانی بڑھنے لگی۔ اس نے نیکلس کے دوستوں سے رابطہ کیا۔ سب نے اس سے متعلق لاعلمی کا



اظہار کیا۔

اس نے باسکٹ بال کلب فون کیا۔ اس کی ٹیم ارکان کے نمبر لیے۔ اب وہ ریسیور تھامے ایک ایک کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ سب نے ایک ہی بات کہی کہ جب وہ باسکٹ بال کلب سے لوٹے، نیکلس وہیں تھا۔

آخرکار رابطہ جیمس سے ہوا۔ یہ وہی لڑکا تھا، جس نے نیکلس کو آخری بار دیکھا۔

''ہاں۔ میں نے اسے ساتھ چلنے کی پیشکش بھی کی، مگر اس نے کہا کہ میں اپنی مما کا انتظار کروں گا۔'' لڑکے کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''تو کیا آپ نے اِسے پک نہیں کیا؟''

''نہیں۔'' عورت نے دھیرے سے کہا۔

''اوہ۔'' جیمس کے منہ سے نکلا۔ ''یہ تو پریشان کن معاملہ ہے۔''

''تم فکر مت کرو۔ میں دیکھتی ہوں۔'' یہ کہہ کر عورت نے فون رکھ دیا۔ اب وہ پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کررہی تھی۔

کھڑکی کے باہر ایک گرم اور طویل رات دہانہ کھولے کھڑی تھی۔

☆☆☆

آفیسر ہنری نے اُس کال کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا۔

''نوجوان ہے میڈم۔ کہیں دوستوں کے ساتھ گھوم رہا ہوگا۔ جلد لوٹ آئے گا۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

''مگر میں اس کے تمام دوستوں سے رابطہ کر چکی ہوں۔'' عورت کے لہجے میں اندیشے تھے۔

''آپ پریشان مت ہوں۔ میں دیکھتا ہوں۔''

آفیسر نے فون رکھنے کے بعد اپنے اسسٹنٹ کو کمرے میں بلوایا۔

''ایک لڑکا گھر نہیں لوٹا۔ نیکلس بارکلے نام ہے۔ ذرا اس کی ماں سے مل لو۔ تصویر حاصل کرلو۔''

تصویر حاصل کرلی گئی۔ عورت کی کمپلینٹ درج ہوگئی۔ اُس رات تو پولیس ''انتظار کرو اور دیکھو'' کی پالیسی پر عمل پیرا رہی مگر چوبیس گھنٹے بعد بھی جب وہ نہیں لوٹا تو تلاش شروع ہوگئی۔

دیگر پولیس اسٹیشنز سے رابطہ کیا گیا۔ ہائی وے پر قائم چوکیوں سے معلومات اکٹھی کی گئی۔ لاری اڈے اور ریلوے اسٹیشن دیکھے گئے۔ سرائے خانوں کے رجسٹر کھنگالے مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔

''احتیاطاً مردہ خانے بھی دیکھ لو۔'' افسر نے کہا۔

''دیکھ چکا ہوں سر۔'' اسسٹنٹ نے جواب دیا۔ ''گزشتہ چوبیس گھنٹے میں وہاں کسی بچے کی لاش نہیں آئی۔''

افسر گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ پھر وہ گویا ہوا۔ ''نیکلس کے معاملے کو مسنگ پرسن کی فہرست میں ڈال دو۔ ریڈیو اور ٹی وی سے پیغامات نشر کروادو کہ اگر کوئی اس کی بابت کچھ جانتا ہے تو ہم سے رابطہ کرے۔ شاید اُسے اغوا کیا گیا ہو۔''

''اغوا؟'' اسسٹنٹ کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''وہ تیرہ سالہ لڑکا ہے۔ کوئی بچہ نہیں۔ پھر اس کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ اُسے کس مقصد کے لیے اغوا کیا گیا ہوگا؟''

''ہمیں تمام امکانات پر غور کرنا ہوگا۔'' افسر نے کہا۔ ''میری محکمۂ اطلاعات کے ڈائریکٹر سے بات کراؤ۔''

نو بجے کی بلیٹن کے بعد انتظامیہ کی جانب سے اپیل نشر کی گئی کہ اگر کوئی شہری نیکلس بارکلے کی بابت کچھ جانتا ہے، تو پولیس سے رابطہ کرے۔ ریڈیو سے بھی یہ پیغام دُہرایا گیا۔

کوشش بے اثر گئی۔ کسی نے پولیس سے رابطہ نہیں کیا۔ سین انٹونیو کا کوئی باسی بچے کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔

اندیشے بڑھ رہے تھے....

☆☆☆

''اپنوں کی موت سیاہ دبیز غم کو جنم دیتی ہے، مگر اس کا موازنہ اس کرب سے نہیں کیا جاسکتا، جو کسی اپنے کے بے نشاں ہونے سے پیدا ہوتا ہے، قطعی نہیں۔ وہ تو ناقابل بیان ہے۔''

ممتاز پرتگالی ادیب ہوزے سارا ماگو کے اِن الفاظ کی تصدیق ہر وہ دُکھیاری عورت کرسکتی ہے، جس کا لختِ جگر ہجوم میں گم ہوچکا ہو۔

اگلے تین برسوں تک ڈراؤنے خواب نیکلس کی ماں کا تعاقب کرتے رہے۔ وہ راتوں کو اٹھ کر اپنے بیٹے کو پکارنے لگتی۔ چلچلاتی دھوپ میں اُس باسکٹ بال کورٹ کی جانب چل پڑتی جہاں نیکلس آخری بار دیکھا گیا۔ وہ گہرے صدمے میں تھی۔ اپنے حواس کھوتی جارہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے اور وہ اپنی عمر سے کئی برس بوڑھی معلوم ہونے لگی۔

پولیس کو بھی کوئی کامیابی نہیں ملی۔ کوئی سراغ ہاتھ نہیں آیا۔

ہاں، ٹھیک ڈیڑھ برس بعد جب محکمۂ پولیس کی جانب سے اپیل دوبارہ نشر کی گئی، تب آفیسر ہنری کو ایک عجیب کال موصول ہوئی تھی۔

"کیا نیکلس اب تک نہیں ملا؟" آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"نہیں۔" آفیسر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "کیا آپ اس کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟"

"شاید اُسے اغوا کیا گیا ہو۔"

"ممکن ہے۔ کیا اِس ضمن میں کوئی انفارمیشن دے سکتے ہیں۔ ویسے آپ کی تعریف؟" اُسے الجھن ہونے لگی۔

"مجھے لگتا ہے کہ وہ مر گیا۔" اِن الفاظ کے ساتھ فون کٹ گیا۔

ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ سے معلوم ہوا کہ یہ فون اُسی بوتھ سے کیا گیا تھا، جس سے دو برس قبل نیکلس نے اپنے گھر فون کیا تھا۔

اور یہ بات بے حد عجیب تھی۔

☆☆☆

1997ء کا ماہ اکتوبر بارکلے خاندان کے لیے ایک عجیب خبر لایا۔

خبر اسپین کے شہر لینا ریس کے ایک شیلٹر ہوم سے آئی۔ یہ ایک ٹیلی فون کال تھی، جو آفیسر ہنری نے وصول کی جواب قصے کا شیرف ہو گیا تھا۔

سیکڑوں میل دُور واقع شیلٹر ہوم کے عہدے دار نے اسے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ یہاں نیکلس بارکلے نامی ایک نوجوان مقیم ہے، جو اپنا تعلق سین اینٹونیو سے بتاتا ہے۔

"کیا میں اُس سے بات کر سکتا ہوں؟"

"جی ضرور۔" ہسپانوی لہجے میں کہا گیا۔

"ہیلو جناب۔" ایک پُر اعتماد آواز شیرف کے کانوں سے ٹکرائی۔

اُسے الجھن محسوس ہوئی۔ وہ ایک گھبرائی ہوئی آواز کا منتظر تھا۔

نوجوان نے جو قصہ سنایا، وہ کچھ یوں تھا:

13 جون 1994ء کی دوپہر وہ ایک گھنٹے تک اپنی ماں کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ نہیں آئی، تو پیدل ہی شہر کی جانب چل پڑا۔ جنگل سے گزرتے ہوئے نظر سرخ رنگ کی ایک جیپ پر پڑی۔ اشارہ کرنے پر جیپ رک گئی۔ اس میں دو آدمی بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ چہرے مہرے سے وہ یورپی لگتے تھے۔ انہوں نے لڑکے کو لفٹ دے دی۔ ابھی وہ شہر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ایک شخص نے کلوروفوم سے بھیگا رومال اُس کی ناک پر رکھ دیا۔ جب آنکھ کھلی، تو وہ کسی بحری جہاز کے تہ خانہ میں تھا جس کی کھڑکی سے میلوں تک پھیلا سمندر دکھائی دیتا۔

اغوا کار اُسے یورپ لے گئے۔ کچھ عرصے کسی دیہی علاقے میں قید رکھا۔ روز اُس پر تشدد کیا جاتا۔ پھر وہ اسے اسپین لے گئے جہاں اس معصوم سے جسم فروشی کروائی گئی۔

"میں نے کئی برس یہ اذیت بھوگی۔" نوجوان کی آواز میں کرب تھا۔ "میری زندگی جہنم کی مثل تھی۔ بس ایک آس تھی کہ ایک دن یہ سب ختم ہو جائے گا۔ میں اپنی ماں کے پاس لوٹ جاؤں گا، جو مجھے بانہوں میں بھر لے گی۔"

وہ سسکیاں لینے لگا۔

"تم اُن کی قید سے نکلے کیسے؟" شیرف نے سوال کیا۔

"یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔" لڑکے نے جواب دیا۔ "مگر ایک دن موقع ہاتھ لگ گیا۔ اس جہنم نما عمارت سے نکلنے کے بعد میں پوری رات دوڑتا رہا۔ پھر ملاقات ایک پولیس افسر سے ہوئی جو مجھے اِس شیلٹر ہوم لے آیا۔ اور اب..." لڑکا چپ ہو گیا۔

شیرف دم سادھے منتظر رہا۔

"میں گھر لوٹنا چاہتا ہوں۔ اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔" وہ رو رہا تھا۔

"تم بے فکر رہو۔" شیرف نے کہا۔

کچھ گھنٹوں بعد سین اینٹونیو کے میئر کی جانب سے اسپین میں تعینات سفیر کو فون کیا گیا۔ سفارت خانے کا ایک اہل کار نیکلس سے ملاقات کے لیے فوراً روانہ ہو گیا تاکہ تصدیق کر سکے کہ خود کو نیکلس قرار دینے والا شخص کہیں جھوٹ تو نہیں بول رہا۔

ملاقات کے بعد سفارتی اہل کار کو اِس بات کا کامل یقین ہو گیا کہ نیکلس بارکلے کی گمشدگی کا کیس حل ہو چکا ہے۔

"وہ سچ کہہ رہا ہے جناب۔" اُس نے سفیر سے کہا۔ "اُس نے اپنی تاریخ پیدائش بتائی۔ ماں باپ، بہن بھائیوں کا نام دُرست بتایا۔ اسکول کے دوستوں کا تذکرہ کیا۔ اسے یہ بھی یاد ہے کہ سین اینٹونیو میں اس کے گھر کے پہلو سے ایک دریا بہتا تھا۔"

"کیا اس عمارت سے متعلق معلومات حاصل کی جہاں اسے قید رکھا گیا تھا؟" سفیر نے سوال کیا۔



"پولیس نے وہاں چھاپا مارا تھا۔" اہل کار نے جواب دیا۔ "مگر کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ تمام ملزمان فرار ہو گئے۔ پولیس کے مطابق وہ جسم فروشی کا اڈا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" سفیر نے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔ "لڑکے کی وطن واپسی کا انتظام کرو۔ وہ ہمارا شہری ہے۔ اور ہاں... بارکلے خاندان سے بھی رابطہ کرو۔ ان کے کسی فرد کی یہاں موجودگی ضروری ہے۔"

جب عورت کو اطلاع ملی کہ اس کا بیٹا زندہ ہے، مسرت سے اُس کا سینہ بھر گیا۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ وہ سجدے میں گر گئی۔ لڑکے کی بڑی بہن اگلی ہی فلائٹ سے اسپین روانہ ہو گی۔

امریکی سفارت خانے میں جس شخص سے اس کی ملاقات ہوئی، وہ اسے پہچان تو نہیں سکی، مگر جب وہ یہ کہتے ہوئے کہ "بہن تم آ گئیں" اس سے بغل گیر ہوا، لڑکی کے اندر آنسو رواں ہو گئے۔

"اوہ نیکلس۔ آخر تم مل گئے۔" اُس نے روتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اور اب میں تمہیں کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

کاغذات کی تیاری میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ دو دن بعد نیکلس اور اس کی بہن جولیا ہوائی جہاز میں سوار ہو گئے۔

جہاز بادلوں پر تیرتا ہوا خوابوں کی سرزمین کی سمت بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

وہاں جشن کا سماں تھا۔ شہر رقصاں تھا۔ ہر طرف پھول ہی پھول۔

دوست احباب تو آئے ہی آئے، استقبال کے لیے پورا میڈیا بھی ایئرپورٹ پر امنڈ آیا۔ میئر نے اُسے خوش آمدید کہا۔ پھر وہ رپورٹرز میں گھر گیا۔ چینلز لائیو کوریج کر رہے تھے۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اپنے احساسات بیان کر رہا تھا۔ آواز احساسِ تشکر سے لرز رہی تھی۔ پورا شہر اُسے سن رہا تھا۔

گھر جانے سے قبل اُسے میئر آفس لے جایا گیا، جہاں اس کے لیے ظہرانہ کا انتظام کیا گیا تھا۔

لنچ کے بعد ہونے والی پریس کانفرنس میں اُس نے صحافیوں کو اپنی زندگی کے تین گمشدہ برسوں سے متعلق بتایا۔

"وہ کریہہ اور ہیبت ناک تھے۔ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مجھ پر وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ مجھ سے جسم فروشی..." آواز رندھ گئی۔ اُس کی بہن نے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"خیر۔ وہ زمانہ بیت گیا۔ مجھے خوشی ہے میں اپنے وطن لوٹ آیا۔" اس نے خود کو سنبھالا۔ "میں امریکا لوٹ آیا، جو مائیکل جورڈن کا وطن ہے، جس سے میں عشق کیا کرتا تھا۔ جو مائیکل جیکسن کا وطن ہے، جس کی دھنوں پر میں رقص کیا کرتا۔ میں پھر سے اس باسکٹ بال کورٹ جانا چاہوں گا جہاں سے مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ اُن ہی دوستوں کے ساتھ ایک اور مقابلہ کرنا چاہوں گا۔ میں دوبارہ جینا چاہوں گا۔"

کانفرنس روم میں خوشی چیخ رہی تھی۔ کئی افراد کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ خوش تھے کہ سین اینٹونیو کا بیٹا لوٹ آیا۔

کانفرنس کے بعد اس کی ملاقات شیرف ہنری سے ہوئی۔

پہلے اُس نے تہِ دل سے بارکلے خاندان کو مبارک باد دی۔ دُکھیاری عورت سے بغل گیر ہوا۔ پھر نوجوان کو مخاطب کیا۔ "واپسی مبارک ہو لڑکے۔ ان برسوں نے تمہارا چہرہ مہرہ، چال ڈھال سب بدل دیا۔ تم اپنی سات برس پرانی تصویر سے بالکل الگ معلوم ہوتے ہو۔"

"یہ تجربہ تلخ تھا۔" لڑکے نے دھیرے سے کہا۔ شاید وہ ماضی میں تھا۔ "اور اِس کی تلخی نے ہر شے بدل ڈالی۔"

"جب امریکی سفیر نے اسپین سے اس کی تصویر بھیجی، مجھے لگا کہ یہ ہمارا نیکلس نہیں، کوئی اور ہے۔" اس کی بہن بولی۔ "مگر جب میں اس سے ملی، تو اس کے لمس نے بتا دیا کہ وہ میرے ہی باپ کا خون ہے۔ میرا بھائی ہے۔"

لڑکی کی آواز رندھنے لگی۔

"ہاں یہ تمہارا بھائی سین اینٹونیو کا نیکلس۔" میئر کی پاٹ دار آواز سنائی دی۔ وہ پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"وہاں کے مصائب نے اسے تھوڑا بدل دیا ہے مگر اس کا دل آج بھی امریکی ہے۔ میں نے ڈاکٹر جانسن سے بات کر لی۔ وہ معروف ماہرِ نفسیات ہیں۔ امید ہے کہ اُن کے سیشن تمہارے لیے معاون ثابت ہوں گے۔"

میئر نے بہ آواز بلند کہا۔ "تو آج کا جام نیکلس بارکلے کے نام۔"

سب نے اپنے گلاس بلند کیے۔

☆☆☆

"اِس خوشبو کے لیے میں ترس گیا تھا۔"

گھر میں قدم رکھتے ہی لڑکے نے گہرا سانس لیا۔

وہ خود ہی اپنے کمرے تک گیا جہاں اس کا بستر تیار

تھا۔ بستر کے پہلو میں ایک الماری تھی جسے نئے کپڑوں سے بھر دیا گیا تھا۔ پاس ہی وہ تحائف رکھے تھے جو اُسے سین انٹونیو کے باسیوں نے بھجوائے تھے۔

”ممّا، کیا ان تحائف میں وہ جوتے بھی ہیں جن کا آپ نے سات برس قبل وعدہ کیا تھا؟“ اُس نے شریر انداز میں کہا۔

”ہاں۔ میرے لال۔“ عورت نے اسے سینہ سے لگا لیا۔ ”بالکل نہیں بدلا۔“

اس رات بارکلے خاندان کے گھر کی بتیاں روشن رہیں۔ ٹیلی فون کا تانتا باندھا ہوا تھا۔ مبارک باد کے پیغامات موصول ہو رہے تھے۔

پھر کوئی فردسونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ خاندان کے تمام ارکان دائرے میں بیٹھے تھے۔ درمیان میں البم دھرے تھے۔ پرانی تصویریں دیکھ کر حسین یادیں تازہ کی جا رہی تھیں۔

اگلی صبح جیمس ملنے آیا۔ یہ وہی لڑکا تھا، جس نے سات برس قبل نیکلس کو آخری بار دیکھا تھا۔ اب وہ بڑا ہو گیا تھا۔ چہرہ دانوں سے بھرا تھا۔

جب اُس کی کار کھٹ پٹ کرتی آئی نیکلس باغ میں کھڑا پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ اتفاق سے جیمس اپنے دوست کی آمد کے وقت شہر سے باہر تھا۔ ٹی وی سے نشر ہونے والے اس کے انٹرویوز نہیں دیکھ سکا۔ تو وہ اُسے پہچان نہیں سکا اور اُس کے پہلو سے گزر گیا۔

دستک کے جواب میں جولیا نے دروازہ کھولا۔

”ہیلو۔“ وہ اُسے دیکھ کر چہکا۔ ”کہاں ہے میرا دوست؟“

”تمہارے سامنے بیوقوف۔ وہ دیکھو۔“ جولیا نے باغ کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ۔ یہ... اچھا۔“ لہجے میں تذبذب تھا۔ ”خاصا بدل گیا۔“

”تم بھی تو بدل گئے جیمس۔“ لڑکی ہنسی۔ پھر اپنے بھائی کو آواز دی۔ ”دیکھو کون آیا ہے!“

نیکلس نے پائپ نیچے رکھ دیا اور اُن کے سمت چلا آیا۔

”کون ہے بھلا؟“ جولیا نے سوال کیا۔

”ایں... یہ...“ اس نے ذہن پر زور ڈالا۔

”ارے اپنا جیمس۔“ لڑکی نے کہا۔

”اوہ اچھا جیمس۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”کیسے ہو پیارے؟“

جیمس نے چند لمحہ توقف کیا۔ مصافحہ کرتے ہوئے [illegible]

”ٹھیک ہوں دوست۔ اگر تم اُس روز میری پیشکش [illegible] کر لیتے، تو ہم سب اِس کرب سے نہیں گزرتے مگر [illegible] میرے ڈیڈی کی کار کا مذاق اڑانے سے فرصت نہیں ملتی [illegible] یاد ہے، تم مجھے زرد کار والا لڑکا کہہ کر دِق کیا کرتے۔“

”ہاں ہاں یاد ہے۔ زرد کار۔ اُسے کیسے بھول [illegible] ہوں۔ کھٹ پٹ کرتی رہتی تھی۔“ نیکلس نے قہقہہ لگایا۔ ”[illegible] اب بھی تمہارے ڈیڈی کے پاس وہ ہی کار ہے یا بدل لی؟“

”بدل لی۔“ جیمس نے دھیرے سے کہا۔ ”[illegible] ہمارے پاس نیلی کار ہے۔“

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ موسم بدل گئے۔

نیکلس کی واپسی چند روز تو شہ سرخیوں کا موضوع بنی رہی، ٹی وی چینلز انٹرویو کے لیے قطار لگائے کھڑے رہے۔ امریکا نے بھی حکومتِ اسپین سے مطالبہ کر ڈالا کہ ان کے شہری کو اغوا کرنے والے مجرموں کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے، مگر جوں جوں وقت گزر رہا تھا، شہر معمول کی زندگی کی طرف لوٹنے لگا۔ اُس کی آمد کو قبول کر لیا گیا۔ خود نیکلس بھی ماضی سے نکل آیا۔ اِس ضمن میں شہری حکومت کا ری ہیبلیٹیشن پروگرام بہت معاون ثابت ہوا۔

میئر کی جانب سے نیکلس کے لیے ایک ریسٹورنٹ میں ملازمت کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ شام کے ایک اسکول میں رجسٹریشن کروا دی گئی۔ یوں تعلیمی سلسلہ بحال ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر جانسن کے زیرِ علاج تھا، جو جانے مانے ماہرِ نفسیات تھے۔ ان کی کوششوں سے لڑکے کے زخم بھرنے لگے۔

زندگی اپنی ڈگر پر چل رہی تھی۔ کوئی پیچیدگی اور ابہام نہیں تھا، مگر پھر ایک ٹی وی چینل کو نہ جانے کیا سوجھی۔

وہ چینل سنسنی خیز خبروں کے لیے مشہور تھا۔ انہوں نے نیکلس کا انٹرویو کیا۔ اُس مکالمے کو اُنہوں نے ایک ڈاکومنٹری کی صورت نشر کیا۔ سنسنی پھیلانے کی اپنی قبیح عادت کی وجہ سے ایک سوال بھی اٹھایا:

”کیا یہ وہی نیکلس ہے جو سات برس پہلے بے [illegible] ہو گیا تھا؟“

ڈاکومنٹری میں اس کے کانوں کی ہیئت کو موضوع بنایا گیا۔ پروگرام کے میزبان کا خیال تھا کہ یہ سات برس پرانے نیکلس کے کانوں سے یکسر مختلف ہیں۔



اس رپورٹ نے لڑکے کی ماں کو غصے سے بھر دیا۔

”ان کا دماغ چل گیا ہے۔ میں ان کے خلاف مقدمہ دائر کروں گی۔“

فوراً ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا، جس میں عورت نے الزام عاید کیا کہ ٹی وی چینل نے ایک ماں کے جذبات کو مجروح کیا ہے۔ ”انہیں میرے لڑکے کی اذیت اور کرب سے زیادہ اس کے کانوں میں دلچسپی تھی۔ یہ شرمناک ہے۔“

نیکلس نے اسے انتقامی کارروائی قرار دیا۔

”جناب، وہ دو گھنٹے کا وقت مانگ رہے تھے مگر میں فقط تیس منٹ ہی ان سے بات کر سکا۔ مجھے اپنے نانا کی قبر پر جانا تھا۔ شاید اِسی بات کا بدلہ لیا ہے۔“

بات آئی گئی ہوئی۔ لوگ ڈاکومنٹری کو بھول گئے۔ البتہ سین انٹونیو کا ایک باسی نیکلس سے متعلق ہنوز متذبذب تھا اور جلد ایک فون کال اُس کے تذبذب کو مہمیز لگانے کو تھی۔

☆☆☆

آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے۔ محکمۂ موسمیات نے طوفانی ہواؤں کے ساتھ تیز بارش کی پیش گوئی کی تھی۔

جب فون بجا، شیرف کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

”ہیلو کیا میں شیرف ہنری سے بات کر سکتا ہوں۔ یہ بے حد اہم معاملہ ہے۔“ فون کرنے والے کی آواز سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

”دھیرج رکھو نوجوان۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔“ اس نے جمائی لی۔ آنکھیں ملیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”بولو کیا معاملہ ہے؟“

”میں نیکلس بارکلے سے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

وہ چونکا۔ ”کون بات کر رہا ہے؟“

”فون پر بات کرنا مناسب نہیں۔ کیا میں آپ سے مل سکتا ہوں؟“

”میں دفتر ہی میں ہوں۔ سیدھے چلے آؤ۔“ شیرف نے کہا۔ فون رکھ کر اس نے میز پر پڑی فائل کی سمت دیکھا۔

فائل میں دو تصاویر نتھی تھیں۔ ایک تیرہ سالہ نیکلس کی اور دوسری بیس سالہ نیکلس کی... دونوں کی آنکھوں کا رنگ تھوڑا مختلف تھا۔

اس نے ڈاکٹر جانسن کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو ڈاکٹر مجھے آپ کی معاونت درکار ہے۔ آپ کے ایک مریض کے بارے میں بات کرنی ہے۔“

ڈاکٹر نے ایک لمحہ کا توقف کیا۔ ”آپ جانتے ہیں آفیسر کہ مریض اور ڈاکٹر کے درمیان اعتماد کا رشتہ ہوتا ہے۔ میں شاید آپ کی زیادہ مدد نہیں کر پاؤں۔“

ایسے راگ پاٹ سننے کا شیرف عادی تھا۔ اس نے بھاری آواز میں کہا۔ ”یہ بہت اہم معاملہ ہے ڈاکٹر۔ میں نیکلس بارکلے کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”نیکلس۔“ لہجے میں حیرت تھی۔ ”اُسے کیا ہوا؟“

”فی الحال کچھ نہیں ہوا۔ آپ یہ بتائیں کہ کیا بڑھتی عمر کے ساتھ انسان کی آنکھوں کا رنگ تبدیل ہو سکتا ہے۔“

”اوہ... میں اِس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہارمونز کی تبدیلی شاید کچھ اثر انداز ہوتی ہو۔ مگر بہتر ہے کہ آپ کسی ماہرِ چشم کی رائے لیں۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ فرمائیں کہ نیکلس کے ساتھ آپ کے جو سیشن ہوئے، ان میں آپ نے کچھ عجیب محسوس کیا۔ کوئی ایسی بات جو معمول سے ہٹ کر ہو۔“

کچھ ساعت خاموشی رہی۔ جب ڈاکٹر بولا تو اس کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ”یوں تو ہر سیشن معمول کے مطابق ہی رہا مگر میری اسسٹنٹ بتا رہی تھی کہ اُسے...“ وہ متذبذب تھا۔ ”اُسے ہپناٹائز کرنا خاصا دشوار ثابت ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا، جیسے وہ معمول بننے کے لیے تیار نہیں۔“

”اوہ۔“ اس کے منہ سے نکلا۔ ”آپ کے نزدیک اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟“

”ممکن ہے، وہ عملِ تنویم کی حالت میں اپنے ماضی

> آرمینیس ویمبرے، مشہور مورخ و مستشرق تھا۔ وہ ہنگری کا باشندہ تھا اور جامعہ پرتھ میں استاد تھا۔ مصنف دوسرے مستشرقین کی مانند متعصب ہے۔ اس نے اپنی کتاب ”تاریخ نجارا“ لکھنے کے لیے خاص طور پر ترکی زبان سیکھی اور سارے علاقے کا جائزہ لیا۔ اس کتاب میں جیحون اور سیحون کے درمیانی ممالک کے علاوہ خراسان، ایران، افغانستان اور کوہ قاف کی وادیوں کا ذکر ہے۔ اس میں نجارا کی تاریخ 1864ء تک بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب 1873ء میں منظرِ عام پر آئی۔
>
> مرسلہ: نثار قلندر، کراچی

میں نہیں جانا چاہتا ہو۔"

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کچھ چھپا رہا ہو۔" شیرف نے سرد لہجے میں کہا۔

☆☆☆

باہر بارش ہو رہی تھی۔

نیکلس لحاف میں دبکا خراٹے لے رہا تھا۔ اُس کی ماں الماری دُرست کر رہی تھی۔ ایسے میں عورت کی نظر نچلے حصے میں پڑی۔ وہاں جوتے کا وہ ڈبا پڑا تھا جو اُس نے اپنے بیٹے کو واپسی پر دیا تھا۔

انہیں ایک بار بھی نہیں پہنا گیا، وہ جوں کے توں رکھے تھے۔

ڈاکٹر جانسن اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ وہ گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

شیرف کی نظریں کھڑکی پر ٹکی تھیں۔ پانی کے قطرے شیشے پر دستک دیتے تھے۔

اچانک کھٹکا ہوا۔ دروازے پر اسسٹنٹ کھڑا تھا۔

"سر ایک لڑکا ہے۔ وہ آپ سے..."

"بھیج دو۔" اس نے فوراً کہا۔

کچھ دیر بعد ایک بھیگا ہوا نوجوان اس کے روبرو تھا۔

"ہیلو سر۔ میں جیمس ہوں۔ جیمس..."

"تم مسٹر ہیڈلے کے بیٹے ہو ناں جو سٹے کا کاروبار کرتے ہیں۔ پچھلے ہفتے تمہاری گاڑی کا چالان ہوا تھا۔ شاید نیلے رنگ کی مزدا تھی، 87 ماڈل کی۔"

لڑکا شیرف کی یادداشت پر حیران رہ گیا۔ "آپ نے درست فرمایا جناب۔ اور میں نے چالان بھر دیا ہے۔"

"گڈ۔ بیٹھو۔ تم نیکلس بارکلے کے بارے میں بتانا چاہتے تھے۔ وہ تمہارا دوست ہے ناں؟"

"دوست... ہاں۔" وہ متذبذب نظر آرہا تھا۔

"دراصل میں کنفیوژ ہوں۔"

شیرف اسے گھور رہا تھا۔ کچھ دیر لڑکا یونہی مضطرب بیٹھا رہا۔ یکدم وہ کھڑا ہو گیا۔ "شاید مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ معذرت چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔"

"بیٹھ جاؤ۔" شیرف کی تیز آواز نے پاؤں پکڑ لیے۔ "تمہیں شک ہے کہ وہ نیکلس بارکلے نہیں۔"

لڑکے کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اُس نے خود کو کرسی کے حوالے کر دیا۔

"ایسا ہی ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "بے شک وقت کے ساتھ چہرہ بدل جاتا ہے مگر وہ تبدیلیاں جو نیکلس میں ظاہر ہوئی ہیں، وہ حیران کن ہیں۔"

"لیکن یہ تو بڑی بات نہیں۔ کیا شک کرنے کی کوئی مضبوط وجہ ہے تمہارے پاس؟" شیرف نے اُسے کریدا۔

"ہاں، ان تبدیلیوں کو شاید میں نظر انداز کر دیتا مگر وہ... میرے ڈیڈ کی گاڑی کا رنگ دُرست بتا دیتا۔"

شیرف خاموشی سے سنتا رہا۔

"ہمارے پاس نیلے رنگ کی ایک پرانی کار ہے۔ مجھے یاد ہے نیکلس ہماری گاڑی کا خوب مذاق اڑایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ جس دن وہ بے پتا ہوا، اس روز بھی اس نے گاڑی کی خستہ حالی پر پھبتی کسی تھی۔ مگر حیرت انگیز طور پر وہ اب اس کار رنگ بھول چکا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات عجیب ہے۔ اور پھر ایک معاملہ اور ہے..." لڑکے نے پہلو بدلا۔ "وہ باسکٹ بال کا بڑھیا کھلاڑی تھا۔ ممکن ہے کہ ان برسوں میں اس نے مشق نہ کی ہو، مگر گزشتہ روز جب وہ کورٹ میں اترا، تو اُس پر کسی اناڑی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ تو اِس کھیل کے قوانین بھی بھول چکا ہے۔"

شیرف آگے جھکا۔ "کیا تم میرے لیے ایک کام کرو گے لڑکے؟"

"جی.." وہ چونکا۔ "جی ضرور۔"

"ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی، اُس کا کسی سے ذکر مت کرنا۔ کسی سے بھی نہیں۔"

شیرف کا چہرہ سپاٹ تھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔

☆☆☆

برسات کا موسم تھا۔ دو آفیسر چھٹی پر تھے اور سین اینٹونیو ایف بی آئی آفس معاملے کو سنجیدگی سے لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"آپ ای میل کر دیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کیا ہو سکتا ہے۔" اِس جملے نے شیرف کو آگ بگولا کر دیا۔

"نکمے کہیں کے۔" اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے نیکلس کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو مسز بارکلے۔ کیسے مزاج ہیں۔ بارش سے لطف اندوز ہو رہی ہیں۔" اس نے مہذب انداز میں عورت سے بات کی۔ "امید ہے کہ آپ کے صاحب زادے خیریت سے ہوں گے۔ کئی روز سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سوچ رہا ہوں کہ آپ کے ساتھ ایک کپ چائے پی جائے۔"

"ضرور کیوں نہیں۔" عورت ہنسی۔ "آپ کا گھر ہے، جب چاہیں تشریف لے آئیں۔"

ایک گھنٹے بعد شیرف کی کار بارش کو چیرتی ہوئی نیکلس کے مکان کی سمت بڑھ رہی تھی۔ جتنی دیر میں جولیا نے دروازہ کھولا، وہ پورا بھیگ چکا تھا۔

"جلدی اندر آجائیں، آپ کو سردی لگ جائے گی۔" وہ ایک جانب ہو گئی۔

چائے کی میز پر بارکلے خاندان منتظر تھا۔ نیکلس کچھ اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی نیند سے جاگا تھا۔

چائے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ عورت نے بتایا کہ نیکلس کسی زمانے میں بارش کا دلدادہ تھا، مگر آج اُس نے بھیگنے سے اجتناب برتا۔

"جوں جوں بچے بڑے ہوتے ہیں، وہ سمجھ دار ہوتے جاتے ہیں۔" وہ کھلکھلائی۔ شیرف دھیرے سے مسکرا دیا۔

"کیا آپ کچھ کیک لینا پسند کریں گے؟" جولیا کھڑی ہو گئی۔ "میں نے خود بنایا ہے۔"

"ضرور۔" افسر نے کہا۔ "اگر ایک اور کپ چائے مل جائے محترمہ تو..."

"ہاں ہاں۔ ابھی لاتی ہوں۔" عورت بھی اپنی بیٹی کے پیچھے چل دی۔

جولیا اور اس کی ماں کچن میں چلے گئے۔ اب شیرف اور نیکلس اکیلے تھے۔

وہ گہری نظروں سے نوجوان کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکالا۔ "لڑکے کیا ماچس ملے گی؟"

"ضرور۔" نیکلس کھڑا ہو گیا۔ جب وہ لوٹا، شیرف فضا میں دھویں کے مرغولے چھوڑ رہا تھا۔

"ماچس کوٹ کی اندرونی جیب میں تھی۔" وہ مسکرایا۔ "تمہارے جانے کے بعد خیال آیا۔"

دو کپ چائے اور کیک کا بڑا ٹکڑا حلق میں اتارنے کے بعد وہ مکان سے باہر آیا تو چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ جیب میں وہ کپ تھا جس میں نیکلس نے چائے پی تھی۔ وہ اُس کا ڈی این اے اور فنگر پرنٹس حاصل کر چکا تھا۔

☆☆☆

ایف بی آئی والوں کو شیرف کی پھرتیاں ایک آنکھ نہیں بھائیں۔ اُنہیں یہ بات بھی گراں گزری کہ وہ کپ کو فوری لیبارٹری بھیجنے پر اصرار کر رہا ہے۔

## فلورنس

وسطی اطالیہ کا شہر فلورنس دریائے آرنو کے دونوں طرف ساحل سمندر سے پچاس میل کے فاصلے پر کوہ ایپی نائنز کے دامن میں آباد ہے۔ صوبہ فلورنس کا یہ دارالحکومت بھی ہے۔ دنیا کے تاریخی شہروں میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا نواحی علاقہ بڑا خوبصورت ہے جسے چاروں طرف سے درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں نے گھیر رکھا ہے۔ ازمنہ وسطی میں یہاں بڑی عظیم الشان شخصیتیں گزری ہیں جن میں پٹیارچ، مائیکل اینجلو، لیونارڈو داونشی، بلیکو اور سائیکاول خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ 1864ء سے 1870ء تک یہ شہر اطالیہ کا دارالحکومت بھی رہا۔ 1966ء کے سیلاب نے اسے بری طرح تباہ کیا۔ یہاں یونیورسٹی (1321ء) ہوائی اڈہ اور ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔

## فلینڈرز

وہ ملک جہاں "فلیمنگز" لوگ آباد تھے اسے فلینڈرز کہتے تھے۔ مگر اب اسے بلجیئم اور فرانس میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ علاقہ 862ء میں معرض وجود میں آیا جبکہ شاہ فرانس نے اسے خودمختار مملکت قرار دے کر اس پر اپنے لڑکے کو مسلط کیا۔ فلینڈرز، ہسپانیہ اور آسٹریا کے زیر تسلط بھی رہ چکا ہے۔ اس نے سولہویں صدی میں ہسپانیہ سے آزادی حاصل کی۔ 1815ء۔1830ء میں اسے ولندیز (ہالینڈ) سے ملا دیا گیا۔ فلینڈرز کے لوگ رومن کیتھولک فرقے سے اور ڈچ لوگ پروٹسٹنٹ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ 1830ء میں فلیمنگو کو ولونیز جو فرانسیسی زبان بولتے ہیں، کے ساتھ ملا کر بلجیئم کی بادشاہت عمل میں لائی گئی مگر 1914ء تک "فلیمنگو" کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اس لیے انیسویں صدی کے نصف آخر میں انہوں نے ایک قومی تحریک چلائی جسے جرمنوں کی ہمدردی حاصل تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں جب جرمنوں نے بلجیئم پر قبضہ کیا تو اس تحریک کو تقویت پہنچی اور جنگ کے بعد فلیمنگو کو فرانسیسی زبان بولنے والے اہل بلجیئم کے ساتھ ہمسری حاصل ہوگئی۔ 1932ء میں بلجیئم کو تین لسانی خطوں میں تقسیم کر دیا گیا اور فلینڈرز کے علاقے کے لیے فلیمش سرکاری زبان قرار پائی۔

مرسلہ: ناہید پروین، کراچی

"بارشوں میں بھی فرض کی ادائیگی کا جذبہ آپ کو مستعد رکھتا ہے جناب۔" افسر نے طنزاً کہا۔

شیرف نے اُسے نظر انداز کر دیا۔ "آپ کے پاس نیکلس بار کلے کا سات برس پرانا ڈی این اے سیمپل اور فنگر پرنٹس ہیں۔ اُنھیں موجودہ نمونوں سے میچ کر کے مجھے فوری رپورٹ دیں۔"

"ہم آپ کو رپورٹ دینے کے مجاز نہیں۔ مجھے اوپر بات..."

جتنی دیر میں افسر پورا جملہ ادا کرتا، شیرف باہر جا چکا تھا۔

بارش اب رک گئی۔ سڑکوں پر پانی کھڑا تھا۔ گھر جانے کے بعد وہ بہت دیر تک بے چین رہا۔ رات کے آخری پہر آنکھ لگی۔ صبح جب دفتر پہنچا تو آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

یہ بیزاری شام تک قائم رہی، جب اُسے ایف بی آئی آفس سے فون کال موصول ہوئی۔

"ہیلو۔ ابتدائی رپورٹس آگئی ہیں۔ میں واضح کر دوں کہ یہ حتمی نہیں۔ کپ سے ملنے والا ڈین این اے..."

شیرف خاموشی سے سنتا رہا۔

☆☆☆

فرانسیسی ڈیپارٹمنٹ آف انویسٹی گیشن میں فون بجا۔

جب افسرِ اعلیٰ کو اطلاع ملی کہ سین اینٹونیو کے محکمۂ پولیس سے فون ہے، وہ چہکا۔ "بڑے میاں ہوں گے۔"

ریسیور اٹھاتے ہی کہا۔ "آج خاکسار کی یاد کیسے آگئی۔ ہم تو سمجھے تھے کہ جناب ہمیں بھلا بیٹھے۔"

دوسری طرف شیرف کا کھُردرا قہقہہ سُنائی دیا۔ "ایسا ہی سمجھ لو ڑولیاں۔ کام پڑا تو تمھیں یاد کرلیا۔"

ڑولیاں نے آہ بھری۔ "اندازہ تھا۔ بِنا مطلب آپ کیوں ہمیں یاد کرنے لگے۔ خیر حکم کیجیے، بندے کی جان حاضر ہے۔"

شیرف پھر ہنسا۔ "اچھا سنو۔ تمہارے پاس مطلوب افراد کی جو فہرست ہے، اُس میں چند بہروپیے بھی ہوں گے، مجھے اُن کی تصاویر اور کوائف درکار ہیں۔"

"حضور، یہاں تو بہروپیوں کا دسترخوان لگا ہے۔ طویل فہرست ہے۔ ویسے معاملہ کیا ہے؟"

شیرف نے سوال نظر انداز کر دیا۔ "ان ملزمان کو پیشِ نظر رکھنا، جن کی عمر بیس سے پچیس کے درمیان ہو۔ تعلق پیرس کے مضافات سے جڑا ہو۔ اور کچھ عرصے سے غائب ہوں۔"

"ہوں۔" ڑولیاں سوچ میں پڑ گیا۔ "عمر بیس سے پچیس۔ تعلق مضافاتی علاقے سے۔ اور کچھ عرصے سے غائب۔ ٹھیک ہے۔ مجھے تھوڑا وقت دو۔"

ٹھیک دس گھنٹے بعد شیرف کو آفیسر ڑولیاں کی ای میل موصول ہوئی۔ اس میں فرانسیسی پولیس کو مطلوب بہروپیوں کے کوائف درج تھے۔ فہرست طویل تھی۔ اُسے کھنگالنے میں شیرف کو پورا ڈیڑھ گھنٹا لگا۔ ایک تصویر پر آکر وہ بری طرح چونکا۔

ٹھیک اُس پل بادل زور سے گرجے۔

سائرن کی آوازوں نے محلے کو جگا دیا۔ لوگ اپنی کھڑکیوں میں آ کھڑے ہوئے۔ تیز بارش کے درمیان تین پولیس اہل کار ایک نوجوان کو گھسیٹتے ہوئے لائے اور کار میں ڈال دیا۔

وہ نیکلس بار کلے تھا۔ ڈیوڑھی میں کھڑے اُس کے اہلِ خانہ رات کے اندھیرے میں حواس باختہ معلوم ہوئے۔

پولیس اہل کاروں کو کوستے ہوئے بوڑھی عورت کی نظر شیرف پر پڑی۔ وہ دوڑتی ہوئی گئی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے۔ میرے بیٹے کو کہاں لے جا رہے ہو۔ اِس نے تمہارا کیا بگاڑا۔"

"یہ تمہارا بیٹا نہیں۔" شیرف نے سرد لہجے میں کہا۔

بادل زور سے گرجا۔

☆☆☆

وہ شخص جو نیکلس بن کر امریکا آیا، جس نے درجنوں انٹرویوز دیے، میئر کے ساتھ کھانا کھایا، بار کلے خاندان کے گھر رہتا رہا... آخر کون تھا؟

اِس راز سے پردہ اٹھا تو ایک ایسے مجرم کا مکروہ چہرہ سامنے آیا جو ایک دو نہیں، بلکہ پانچ سو افراد کو بہروپیا بن کر لوٹ چکا تھا۔ وہ ایک فراڈیا تھا۔ جعلی شناخت بنانے کا ماہر۔ اور اپنی اسی مہارت کے ذریعے لوگوں کو بیوقوف بنایا کرتا۔

اِس بار اُس بدمعاش نے بڑا ہاتھ مارنے کا فیصلہ کیا۔ امریکیوں کو بیوقوف بنانے کی ٹھان لی۔ سوچا نیکلس بار کلے بن کر خوابوں کی سرزمین پہنچ جائے اور باقی زندگی عیش کرے۔ مگر بدقسمتی سے اس کا ٹکراؤ سین اینٹونیو کے شیرف سے ہو گیا۔

اس پاجی کا نام فریڈرک بورڈین تھا۔ اُس نے پیرس کے مضافات میں آنکھ کھولی تھی۔ اپنے باپ کی اُس نے کبھی شکل نہیں دیکھی۔ ماں کی شفقت سے بھی محروم رہا۔ عورت ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتی۔ آوارہ اور اوباش



لڑکوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ نانا نے سنبھالنے کی مقدور بھر کوشش کی، مگر وہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ پورا قصبہ اس کی حرکتوں سے تنگ تھا۔ جب نانا نے سختی کرنے کی کوشش کی تو وہ گھر سے بھاگ نکلا۔

اب جرائم کی دنیا تھی اور وہ تھا۔ پہلے چھوٹی موٹی چوریاں کیں۔ لوگوں کو لوٹا۔ مگر اِس کام میں خطرہ بہت رہتا۔ اِس لیے اس نے بہروپیا بننے کا فیصلہ کیا۔

کبھی وہ غریب طالب علم کا روپ دھار کر سماجی تنظیموں کے فنڈز ہڑپ کر جاتا، کبھی سماجی کارکن بن کر مخیر افراد سے چندہ بٹورتا۔ جعلی شناخت کے سہارے بینکوں سے قرضہ لیتا اور غائب ہو جاتا۔

وہ اپنے شکار کا باقاعدہ انتخاب کرتا۔ کسی رئیس پر نظر پڑتی تو اس کے کوائف جمع کرنے لگتا۔ کتنے رشتہ دار ہیں؟ کون کہاں رہتا ہے؟ کس سے سیٹھ کی برسوں سے ملاقات نہیں ہوئی؟ سب معلوم کر لیتا۔

پھر ایک روز اس کے دروازے پر جا کھڑا ہوتا۔ خود کو دور پرے کا رشتہ دار کہہ کر متعارف کرواتا۔ حویلی میں ڈیرا ڈال لیتا اور موقع ملتے ہی صفایا کر دیتا۔

فرانسیسی پولیس نے اسے پکڑنے کی اپنی سی کوشش کی، مگر ہاتھ فقط ناکامی آئی۔

ایک بار تو اُس بدمعاش نے بڑی ہی گھٹیا حرکت کی۔ اس نے بے پتا بچے کی شناخت اختیار کرلی۔ اس کے ماں باپ کو قائل کر لیا کہ وہ ان کی اولاد ہے۔ اُن کے پیسوں پر خوب عیاشی کی۔ موج مستی کرتا رہا۔ جب دل بھر گیا کہ تو زیورات اٹھائے اور نو دو گیارہ ہو گیا۔

شاید پولیس کبھی اس تک نہ پہنچ پاتی، اگر اس کا نیک دل نانا مرتے وقت اس کا بھانڈا نہیں پھوڑ دیتا۔ راز افشاں ہونے کے بعد وہ فرانس سے فرار ہونے کے جتن کرنے لگا۔ نیکلس بار کلے کی گمشدگی کا معاملہ اس کے علم میں تھا۔ انٹرنیٹ کے ذریعے مزید ریسرچ کی۔ جو مواد پڑھا، اسے ذہن میں بٹھا لیا۔

ایک دن شیلٹر ہوم پہنچ گیا۔ ڈھونگ رچایا کہ وہ جسم فروشی کے اڈے سے بھاگ کر آیا ہے۔ وہاں پناہ لینے کے بعد سین اینٹونیو رابطے کی سبیل کی۔ آگے کی کہانی سے تو آپ واقف ہی ہیں۔

گو وہ نیکلس کی بابت خاصا کچھ جان چکا تھا، مگر اس کے فرانسیسی لہجے کے باعث شیرف شک میں پڑ گیا، جسے جیمس ہیڈلے کے بیان نے مزید بڑھایا۔ فرانس سے مطلوب افراد کی جو فہرست حاصل کی، اُس میں اس پاجی کا نام درج تھا۔

جب اس کے ڈی این اے اور فنگر پرنٹس کی جانچ کی گئی، تو ثابت ہو گیا کہ یہ 23 سالہ نوجوان نیکلس بار کلے نہیں۔ یوں اُس کی امریکا آمد کے ٹھیک پانچ ماہ بعد قانون اس تک پہنچا۔

فروری 1998ء میں ایف بی آئی نے کورٹ سے ملزم فریڈرک سے تفتیش کے احکامات حاصل کر لیے۔ تمام شواہد اس کے خلاف تھے۔ ماہِ ستمبر میں عدالت نے اسے مجرم قرار دیتے ہوئے جیل میں ڈال دیا، جہاں وہ چھ برس سڑتا رہا۔

رہائی کے بعد وہ فرانس چلا گیا۔ وہاں بھی اس نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو دِق کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ انہیں انگلیوں پر نچاتا رہا۔ کئی روپ بدلے۔ لیکن ایک روز اُس کا بھانڈا پھوٹ ہی گیا۔

اب ایک اور جیل یاترا اُس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

فریڈرک کا قصہ تمام ہوا۔ اُسے جیل ہو گئی، مگر اُسے ملنے والی کڑی سے کڑی سزا بھی اُس کرب کا ازالہ نہیں کر سکتی تھی جس سے بار کلے خاندان گزرا۔

اِس واقعے سے اُن کے زخم ہرے ہو گئے۔ بوڑھی عورت پھر اپنے بیٹے کو یاد کر کے گریہ کرنے لگی۔

سین اینٹونیو حکومت کی جانب سے نیکلس کو تلاش کرنے کا عزم دُہرایا گیا۔ ٹیمیں تشکیل دی گئیں۔ بیانات داغے گئے، مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ نیکلس بار کلے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

شاید اسے زمین کھا گئی تھی... شاید آسمان اُسے نگل گیا تھا۔

اس کا کیس آج بھی کھلا ہے۔ آج بھی اُس کی ماں کو بے رنگ خواب آتے ہیں۔

نیکلس کے اس دکھ بھرے قصے کو دو برس قبل ریلیز ہونے والی ہالی وڈ کی ایک فلم میں بھی ڈھالا گیا۔ ناقدین نے اسے ایک معیاری فلم قرار دیا، البتہ چند حلقوں کا خیال تھا کہ اس میں حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کیا گیا ہے اور فلم بینوں کے مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت زیادہ مسالا ڈالا گیا ہے۔ چند تجزیہ کاروں کے نزدیک اس فلم کی کہانی کا مرکز کلی طور پر فریڈرک تھا۔

# معذور مسیحا

صبا شفیق

وہ دماغی امراض کا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کے سو فیصد آپریشن کامیاب ثابت ہوتے مگر اسے ایک اندوہناک حادثے نے مفلوج بنادیا تھا ۔ اور وہ بستر سے نیچے اترنے کی خواہش کو بھی پورا کرنے سے معذور ہوگیا تھا۔ لیکن دوستوں کے مشورے پر جب اس نے عمل کیا تو اسے شہرت اور عروج حاصل ہوگیا۔

انسان کی زندگی ایک پانی کا بلبلہ ہے، ایسا آبگینہ جو ہلکی سی ٹھیس سے پھوٹ جائے پھر بھی انسان اپنے رب کا شکر گزار نہیں۔ جن آنکھوں سے وہ دنیا کو دیکھتا ہے۔ جن ہاتھوں سے وہ دنیا کو زیر کرنے کی سعی کرتا ہے، یہ سب کس پیچیدہ نظام سے اپنا کام سرانجام دیتے ہیں اس پر بہت کم لوگ غور کرتے ہیں۔ اگر اس نظام میں ہلکا سا بھی خلل واقع ہوجائے تو سب کچھ چوپٹ ہوجاتا ہے مگر انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔ ہر خرابی کا متبادل تلاش کرلیتا ہے۔ ڈاکٹر رچرڈ بھی اس بات سے آگاہ تھا۔

رچرڈ ماپو یو صرف دو سال کا تھا جب اس کے ماں باپ میں علیحدگی ہوگئی اور اس کی ماں مارتھا اپنے چاروں بچوں کو محنت مزدوری کرکے پالنے لگی۔ مگر شاید ابھی قدرت کو اس کا ایک اور امتحان مقصود تھا۔ رچرڈ صرف نو سال کا تھا جب ایک بس کے حادثے میں اس کی ماں بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ تب اس کی بیوہ بہن جینیو نے جس کے اپنے پانچ بچے تھے، ان چاروں بہن بھائیوں کی پرورش کی ذمّے داری اٹھالی۔ ایک محدود آمدنی میں گزارہ بے حد مشکل تھا مگر جینیو دن رات محنت مزدوری کرکے رچرڈ کی تعلیم کا خرچ بھی اٹھاتی رہی۔ رچرڈ ایک ہونہار طالب علم تھا۔ اسکول کے بعد وہ رات گئے تک اپنے دوستوں کے ساتھ نٹ بال کھیلتا۔ اور پھر ایک واقعے نے رچرڈ کی پوری زندگی کا رخ بدل دیا اور اس کی زندگی کا ایک مقصد بن گیا۔ رچرڈ سترہ سال کا تھا جب ایک شام وہ اپنے ایک بیمار دوست کی عیادت کے لیے اسپتال گیا، اس کے دوست کے ساتھ والے بستر پر ایک عورت بری طرح سے کراہ رہی تھی۔ وہ سخت تکلیف میں تھی۔ دو ڈاکٹر اس کے قریب کھڑے تھے۔ اچانک اس عورت نے ایک زور کی ہچکی لی اور اس جہان فانی سے کوچ کرگئی۔ ایک ڈاکٹر بولا "یہ مرگئی ہے" دوسرا کہنے لگا۔ "تو مرجائے اس کا علاج کرنے سے کون سے ہمیں کوئی پیسے ملنے تھے...... بہت غریب تھی بے چاری"۔

رچرڈ کے دل پر اس واقعے کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اس نے سوچ لیا وہ ڈاکٹر بنے گا۔ اس کی غریب بہن اس کی مہنگی تعلیم کا بوجھ نہیں اٹھاسکتی تھی اس لیے رچرڈ اسکول کے بعد مختلف قسم کے کام کرکے اپنی تعلیم کا بوجھ اٹھانے لگا۔ اس کی لگن سچی تھی۔ پانچ سال بعد جب وہ ڈاکٹر بن گیا تو اس نے نیورو سرجن بننے کا فیصلہ کیا اور جنوبی افریقا کے شہر جوہانسبرگ آگیا۔ سات سال کی مزید محنت اور جدوجہد کے بعد وہ جوہانسبرگ کے سب سے بڑے اسپتال میں بطور نیورو سرجن متعین ہوگیا۔ اس دوران جولیا نامی ایک لڑکی سے اس نے شادی بھی کرلی تھی۔ جوہانسبرگ اسپتال میں اس کا معاون ڈاکٹر مارینو تھا جو خود ایک ماہر نیورو سرجن تھا۔ ان دنوں جوہانسبرگ شہر کے حالات بہت خراب تھے۔ اغوا، ڈکیتی، قتل اور دوسرے جرائم کی بہتات تھی جس کی وجہ سے دونوں ڈاکٹر اکثر رات گئے تک آپریشنز میں مصروف رہتے۔ ڈاکٹر مارینو سے رچرڈ نے سیکھا کہ ایک نیورو سرجن کو بہت محتاط اور بہت نڈر بھی ہونا چاہیے کیونکہ دماغ ایک نہایت



نازک عضو ہے اور سرجن کی ذراسی غلطی بھی مریض کے لیے عمر بھر کا روگ بن سکتی ہے یا اس کی جان لے سکتی ہے۔

یہ اکتوبر کی ایک صبح تھی جب ڈاکٹر رچرڈ اپنے بیٹے کو اسکول چھوڑنے کے بعد اسپتال کی طرف روانہ ہوا۔ سڑک پر ہلکا رش تھا۔ فضا میں یاسمین کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھاہ! ٹھاہ! اچانک گولیوں کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ ڈاکٹر رچرڈ نے گاڑی کی رفتار بڑھادی اور خود کو بچانے کے لیے اپنا سر جھکالیا۔ لیکن گولی اپنا کام کرچکی تھی۔ اسے ایک دم اپنے داہنے کندھے پر شدید بوجھ محسوس ہوا۔ گاڑی تیز رفتاری سے سامنے لگے کھمبے کی طرف بڑھ رہی تھی، ڈاکٹر رچرڈ نے بریک لگانے کی کوشش کی مگر اس کی ٹانگوں نے حرکت سے انکار کردیا اور گاڑی سامنے لگے کھمبے سے جاٹکرائی۔ قریب کھڑے ایک آدمی نے دروازہ کھولا اور ڈاکٹر رچرڈ کو باہر کھینچنے لگا۔ وہ چلارہا تھا۔ "جلدی نکلو گاڑی کو آگ لگ رہی ہے" اور رچرڈ نیم بے ہوشی میں سوچ رہا تھا کہ کاش آگ لگ جائے اور وہ اسی طرح مرجائے کیونکہ وہ جانتا تھا وہ مفلوج ہوچکا ہے۔ اور پھر مکمل بے ہوش ہونے سے پہلے اسے محسوس ہوا کہ اسے گاڑی سے نکال کر ایمبولینس میں ڈال دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مارینو صبح کے وقت اپنے مریض دیکھ رہا تھا جب اسے خبر ملی کہ ڈاکٹر رچرڈ کو کسی نے گولی ماردی ہے۔ وہ فوراً قریبی اسپتال پہنچا جہاں حادثے کے فوراً بعد رچرڈ کو لے جایا گیا تھا۔ ڈاکٹر مارینو نے ڈاکٹر رچرڈ کے سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی کا جائزہ لیا اور سوئی پکڑ کر رچرڈ کے جسم کے مختلف حصوں میں چبھوکر اس کے مختلف اعضا پر فالج کے اثرات کا اندازہ کرنے لگا۔ رچرڈ کے صرف بازوؤں اور ہاتھوں میں حساسیت باقی تھی، اس کا نچلا دھڑ پوری طرح مفلوج ہوچکا تھا۔ گولی نے اس کے دماغ کے نازک حصوں کو نقصان پہنچایا تھا جس کی وجہ سے وہ معذور ہوچکا تھا اور یہ معذوری ہمیشہ کے لیے تھی۔ ناقابل علاج...... چند دن بعد رچرڈ کو جوہانسبرگ اسپتال منتقل کردیا گیا۔ مریض ڈاکٹرز نرسیں سب کے لبوں پر اس کے لیے دعائیں تھیں بہت سے لوگ تو اس کی حالت دیکھ کر رو پڑے مگر رچرڈ کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اب وہ صرف ایک بے کار وجود ہے جس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ اس نے ڈاکٹر مارینو سے کہا "مجھے بحیثیت ایک نیورو سرجن زندہ رہنا ہے اور اگر میں لوگوں کا علاج نہیں کرسکتا تو مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے۔" ڈاکٹر مارینو رچرڈ کی حالت سمجھ گیا وہ اس وقت شدید ذہنی اور جسمانی کرب میں مبتلا تھا۔ اس کی معذوری اسے مایوسی اور ڈپریشن کی طرف دھکیل رہی تھی۔ ڈاکٹر مارینو نے اس سلسلے میں ایک بہترین ماہر نفسیات ڈاکٹر ویدا کی مدد طلب کی اور اسے ڈاکٹر رچرڈ کو مایوسی سے نکالنے اور زندگی کی طرف لانے کا کام سونپا۔ ڈاکٹر رچرڈ کے ساتھ گفتگو میں ویدا کو اندازہ ہوا کہ رچرڈ اسی صورت زندگی کی طرف لوٹ سکتا ہے جب اسے یقین ہوجائے کہ وہ دوبارہ

سے آپریشن کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر ویدا نے اس سلسلے میں خوب تحقیق کی اور آخر کار اسے ایک معذور نیوروسرجن مل گئی جس نے اسے یقین دلایا کہ اگر وہ ڈاکٹر رچرڈ کے ہاتھوں اور انگلیوں کو توانا اور ان کے ارتباط کو بہتر سے بہتر بنا سکے تو ڈاکٹر رچرڈ ایک بار پھر سے لوگوں کے دماغ کا علاج کرسکتا ہے۔

ڈاکٹر ویدا نے یہی یقین ڈاکٹر رچرڈ کو دلایا۔ اور پھر ڈاکٹر ویدا، ڈاکٹر مارینو اور رچرڈ کی بیوی جولیا تینوں نے مل کر ڈاکٹر رچرڈ کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کی بحالی کے لیے کام شروع کردیا۔ ڈاکٹر رچرڈ کو کئی گھنٹے ورزش کروائی جاتی۔ اسے وہیل چیئر کنٹرول کرنا اور وہیل چیئر پر بیٹھ کر مختلف امور سرانجام دینے کی مشق بھی دن میں کئی بار کروائی جاتی۔ ڈاکٹر رچرڈ کئی گھنٹے سوئی دھاگا لے کر کپڑے پر نمونے بناتا رہتا تاکہ اس کی انگلیاں مضبوط، توانا اور لچکدار ہو جائیں۔ شروع میں اسے شدید کمزوری محسوس ہوئی مگر آہستہ آہستہ ڈاکٹر رچرڈ کی انگلیوں میں پہلے سے بھی زیادہ لچک اور قوت لوٹ آئی۔

اب ایک بڑا مسئلہ ایسی وہیل چیئر ڈھونڈنا تھا جو خود ہلے بغیر ڈاکٹر رچرڈ کو دائیں، بائیں، اوپر، نیچے حرکت کرنے میں مدد دے۔ ڈاکٹر ویدا نے بہت سی وہیل چیئر بنانے والی کمپنیوں سے رجوع کیا مگر سب نے ایسی وہیل چیئر کو بنانا ناممکن قرار دیا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ اس کے لیے وہیل چیئر کو زیادہ طاقت کی بیٹری درکار ہوگی اور اس کا وزن اتنا بڑھ جائے گا کہ اسے آسانی سے ہلانا ناممکن ہو جائے گا۔ آخر کار مائیک ٹالن نامی وہیل چیئر انجینئر نے ڈاکٹر ویدا کے ڈیزائن کے مطابق وہیل چیئر تیار کرنے کی ہامی بھرلی۔ چند دن بعد کرسی تیار ہو کر آگئی تو ڈاکٹر مارینو نے خود تجرباتی طور پر اس پر بیٹھ کر آپریشن کیا تاکہ وہ پرکھ سکے کہ آپریشن کے دوران وہیل چیئر ڈاکٹر رچرڈ کی پوری طرح معاون بنتی ہے کہ نہیں۔ اور وہ کامیاب رہا۔ وہیل چیئر بھی تیار تھی اور ڈاکٹر رچرڈ بھی ذہنی اور جسمانی طور پر خود کو مکمل توانا محسوس کر رہا تھا۔ آپریشن تھیٹر کا سنک بھی وہیل چیئر کی سطح کے برابر کردیا گیا اور ڈاکٹر رچرڈ کے لیے خاص طور پر ایک گاؤن سلوایا گیا جو اس کو وہیل چیئر سمیت ڈھانپ سکتا تھا۔ اور پھر وہ دن آگیا جب ڈاکٹر مارینو نے ڈاکٹر رچرڈ سے کہا کہ آج وہ دونوں مل کر آپریشن کرنے والے ہیں۔ ڈاکٹر رچرڈ بے حد پرجوش تھا۔ وہ وقت مقررہ پر آپریشن تھیٹر پہنچا اور آپریشن کی تیاری کرنے لگا۔ مگر اچانک اس کا بلڈ پریشر بے حد کم ہوگیا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔

ڈاکٹر رچرڈ ایک بار پھر خود سے مایوس ہونے لگا تھا مگر ڈاکٹر مارینو اور ڈاکٹر ویدا نے اس کی خوب ہمت بندھائی۔ چند روز بعد اسپتال میں موٹر سائیکل حادثے کا شکار ایک نوجوان لایا گیا۔ جس کے سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ڈاکٹر مارینو نے ڈاکٹر رچرڈ سے کہا ”رچرڈ آج تمہیں میری مدد کرنی ہے اور اس نوجوان کی جان بچانی ہے۔“

ڈاکٹر رچرڈ نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈاکٹر مارینو کے ساتھ آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھ گیا۔ مریض کو دیکھتے ہی رچرڈ کو خود میں ایک توانائی سی دوڑتی محسوس ہوئی اور اسے یاد آیا کہ اس کی زندگی کا مقصد ہی لوگوں کی زندگی بچانا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کرکے اپنے رب سے دعا کی اور جب اس نے اوزار اپنے ہاتھ میں لیے تو وہ بھول گیا کہ وہ وہیل چیئر پر بیٹھا ہے۔ وہ وہی مہربان اور قابل ڈاکٹر رچرڈ تھا جو اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر آپریشن کرتا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ نے نہایت مہارت سے نوجوان کی کھوپڑی کے حصے جو ٹوٹ کر اس کے دماغ کی جھلی میں کھب گئے تھے نکالے اور پھر اسی مہارت سے بیس سے زائد ٹانکے لگا کر نوجوان کی کھوپڑی کو اس کی اصل حالت میں واپس لے آیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد رچرڈ اپنے کام سے فارغ ہوگیا۔ ڈاکٹر مارینو کی خوشی قابل دید تھی وہ فاتحانہ انداز میں بولا۔ ”مجھے یقین تھا رچرڈ کہ تم ضرور کامیاب ہوگے۔“

ویدا بھی وہیں موجود تھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ڈاکٹر رچرڈ...... اس کی خوشی دیدنی تھی اور اس کی آنکھوں میں بھی تشکر کے آنسو تھے۔

ڈاکٹر رچرڈ آج بھی جنوبی افریقا میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے مزید تعلیم بھی حاصل کی ہے اور اعصابی اور دماغی بیماریوں کے علاج میں ایک اور ڈگری بھی حاصل کرچکے ہیں۔ ڈاکٹر ویدا، رچرڈ کی بیوی جولیا اور ڈاکٹر رچرڈ نے حادثوں میں معذور ہونے والے افراد کے لیے ایک فلاحی تنظیم بھی قائم کی ہے کیونکہ ڈاکٹر رچرڈ کا کہنا ہے ”زندگی میں تمام دروازے کبھی بند نہیں ہوتے...... ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو کئی دوسرے دروازے کھل جاتے ہیں...... اور ہر کسی کو یہ نئے دروازے کھولنے کے لیے کسی کی مدد درکار ہوتی ہے۔ جس طرح ڈاکٹر ویدا میری مسیحا بنیں اور مجھے مایوسی کے گڑھے سے نکال کر دوبارہ ایک کامیاب سرجن بنادیا۔ اسی طرح ہم سب کا فرض ہے کہ ہم معذوروں کے لیے مسیحا بن جائیں۔“



قسط نمبر: 227

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم وادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان سرگزشت

فلموں میں جو کہانیاں اور کردار دکھائے جاتے ہیں ان میں حقیقت ضرور ہوتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ فلموں اور ٹیلی ویژن ڈراموں نے بھی معاشرے کو متاثر کیا ہے۔ ہمارے ملک میں تو آج کی فلموں (جو کہ آج کل نہ ہونے کے برابر بنائی جارہی ہیں) اور ٹی وی ڈراموں نے عظیم انقلاب پیدا کردیا ہے۔ اس سے پہلے جو معاشرے میں ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ تصور تھا اب وہ زہر گھر گھر ٹی وی چینلو کے ذریعے پھیلایا جارہا ہے۔ جس زمانے میں ہم فلمیں بناتے تھے (جنرل

ضیاء الحق کے دورِ حکومت سے پہلے) اس زمانے میں فلم سنسر بہت سخت تھا۔ سنسر کوڈ اور سنسر کے قوانین آج بھی وہی ہیں مگر انہیں بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ اس زمانے میں کسی کردار کو سگریٹ نوشی یا شراب نوشی کرتے ہوئے نہیں دکھایا جاسکتا تھا۔ البتہ نشے کے عالم میں دکھا سکتے تھے۔ ہیرو ہیروئن کا گلے لگاتا اور قریب ہو کر لیٹنا تو کیا ہاتھ لگانا بھی منع تھا جس کی وجہ سے ایسے شاٹس میں پرندے یا آسمان دکھا کر فلم سنسر ہوسکتی تھی۔ لڑکے اور لڑکی کے ساتھ چپک کر گھومنا منع تھا۔ آج کل ٹی وی ڈراموں میں لڑکا لڑکی اس طرح آزادی سے گھومتے پھرتے اور اظہارِ محبت کرتے نظر آتے ہیں کہ اب ہمارے گھروں کے بچے بھی ان کی پیروی کررہے ہیں۔ لڑکیاں ماں باپ سے کھلے عام بات کرتی ہیں کہ میں تو فلاں سے محبت کرتی ہوں۔ اسی سے شادی کروں گی۔ اگر آپ مجبور کریں گے تو گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ قریبی رشتے دار ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ بیٹے کا رشتہ آتا ہے تو ڈیڈی اس سے شادی کرلیتے ہیں مگر بیٹا اس دوسری ماں کا احترام کرنے کے بجائے اس سے اظہارِ محبت اور ملاقات کی خواہش ظاہر کرتا رہتا ہے۔ ایک بہن کے منگیتر سے دوسری بہن ضد کر کے شادی کرلیتی ہے۔ سوتیلی ماں پر بیٹا مسلسل ڈورے ڈالتا اور ملاقات پر زور دیتا رہتا ہے۔ سگریٹ نوشی تو معمولی بات ہے۔ شراب نوشی کھلے عام ہوتی ہے۔ ڈرامے کا موضوع محبت ہوتا ہے جیسے اس کے سوا دنیا میں اور کوئی مسئلہ باقی ہی نہیں رہا۔ ملبوسات مغربی اور نیم عریاں، میک اپ اس قدر زیادہ اور اس کی وجہ سے ماں بیٹی سے کم عمر اور نوجوان نظر آتی ہے۔ گھر میں داخل ہونے پر سلام کرنے کا دستور ختم ہوچکا۔ زیادہ سے زیادہ ”ہیلو“ کہہ دیا جاتا ہے۔ باپ کو ابو، ابا وغیرہ کہنا ترک ہوچکا ہے اس کی جگہ ڈیڈی ممی نے لے لی ہے۔ بہن بھائی اور ماں باپ کی موجودگی میں لڑکیاں کھلے عام اپنی محبت کا اظہار کرتی ہیں۔ آئی لو یو اور موبائل فون پر ایک دوسرے کو پیار کرنا تو معمولی بات ہے۔ ہیروئن لڑکی فون پر بوائے فرینڈ سے ملاقات کی جگہ اور وقت مقرر کرتی ہے اور بذاتِ خود اس سے کہتی ہے ”آئی لو یو۔ مجھ سے شادی کرو۔“ گویا الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ لڑکیاں کالج میں جوڑوں میں بیٹھی محبت کی باتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ زنانہ لباس اب جینز اور بلاؤز تک محدود ہوچکا ہے۔ دوپٹا تو کب کا رخصت ہوچکا، اب آستین بھی غائب ہوگئیں۔ ماں بیٹی دونوں اسی لباس میں نظر آتی ہیں۔ غرضیکہ بے شمار واقعات ایسے ہیں جو اس ملک میں نہیں تھے مگر اب لائے جارہے ہیں۔ اشتہار تک عریانی اور بے ہودگی سے آلودہ ہیں۔ برتھ کنٹرول کے اشتہار بار بار بڑی وضاحت سے دکھائے جاتے ہیں۔ دوسرے اشتہارات میں بھی نیم عریاں لڑکیاں ناچتی نظر آتی ہیں۔ سینما دیکھنے کے لیے تو سینما گھر جانا پڑتا تھا۔ ٹکٹ خریدنا پڑتا تھا۔ ٹرانسپورٹ کا بندوبست کرنا پڑتا تھا مگر اب تو گھر بیٹھے مفت میں یہ شیطان ہمارے گھروں میں گھس چکا ہے۔ کہاں کا پاکستان، کہاں کی شریعت، کہاں کی شرم وحیا، کہاں کی تہذیب، کہاں کا اخلاق، کہاں کی مشرقی اقدار۔ ہماری حکومتوں کی مہربانی سے یہ سب چیزیں اب ڈھونڈے بھی نہیں ملتیں۔ پہلے مغرب اور ہالی وڈ ہمارے فیشن ایبل طبقے کی پسند تھا، اب بھارت اور بالی وڈ ہمارے لیے ایک نمونہ بن چکا ہے۔ عریانی اور بے حیائی میں جس تیزی سے بالی وڈ نے ترقی کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اب ہالی وڈ کی فلمیں بھارتی فلموں کے سامنے بچوں کا کھیل لگتی ہیں۔ اس قدر عریانی بے حیائی اور بے شرمی ہے کہ خدا کی پناہ! خواتین کا لباس نہ ہونے کے برابر اور حرکتیں ایسی کہ عورتیں بھی دیکھ کر شرمائیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ فیشن کے نام پر کیا ہورہا ہے۔ ہم نے طوائفیں بھی دیکھی ہیں لیکن ان کی آنکھوں میں بھی شرم اور طور طریقوں میں تہذیب تھی۔ البتہ نائٹ کلب میں عریاں رقص کرنے والی ڈانسرز سے ان کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ جنہیں ڈانس فلور پر بالکل عریاں ہونے میں بھی تامل نہیں ہوتا تھا۔ بدقسمتی سے اب ہماری اونچی کلاس کے نزدیک ہالی وڈ کی جگہ اب بالی وڈ نے لے لی ہے اور انہوں نے بھی وہی ملبوسات اور طور طریقے اپنا لیے ہیں۔ ہمارے ٹی وی چینلز جو گندگی اور ننگا پن پھیلا رہے ہیں، الامان والحفیظ۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی ہمارا معاشرہ اس قدر بے لگام اور بے شرم بھی ہوجائے گا۔

پاکستان قائم ہوا تو برقع لڑکیوں کے لیے لازمی تھا۔ خال خال لڑکیاں ایسی ہوتی تھیں جو فیشن ایبل اور چست برقع پہنا کرتی تھیں۔ اس وقت لڑکیوں کی تعلیم کا آغاز ہوچکا تھا مگر مخلوط تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ لڑکیوں اور لڑکوں کی درسگاہیں الگ الگ ہوا کرتی تھیں۔ پھر این جی اوز کا زمانہ آگیا جو مغرب کی امداد پر پلتا ہے اور ان ہی کے گن گاتا ہے۔ این جی اوز نے عورتوں کی اس کے سوا کوئی بھلائی نہیں کی کہ انہیں ہر طرح اکسایا کہ قدامت پسندانہ طور طریقے چھوڑ کر مغربی انداز اپناؤ۔ این جی اوز کے شاندار دفاتر اور ان کو چلانے والی فیشن ایبل خواتین کی لمبی لمبی کاروں کی قطاریں لگ گئیں۔ ان میں جو عملہ رکھا گیا وہ بھی تعلیم یافتہ اور فیشن ایبل تھا۔ این جی اوز کا معاملہ یہ ہے کہ جس کا کھاؤ اس



رندھیر کپور، ببیتا، کرینہ کپور اور کرشمہ کپور

کا گاؤ۔ یہ مغرب کے اشارے پر اس کے مقاصد پورے کرتی ہیں۔ مختاراں بی بی کے واقعے کو انہوں نے عالمی مسئلہ بنا دیا اور ساری دنیا میں پاکستان کو وحشی، جنگلی اور عورتوں کا دشمن ملک بنا کر پیش کیا۔ اب آبروریزی اور اجتماعی زیادتی کی درجنوں وارداتیں ہر روز سامنے آتی ہیں مگر کسی این جی او کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ان کا مقصد مغرب سے وصول کی ہوئی رقم کو حلال کرنا ہے۔ انہیں عورتوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مغربی سروے کے مطابق امریکا اور یورپ میں خواتین کی عصمت دری کے واقعات بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق مغرب کی ہر پانچ میں سے ایک عورت زیادتی کا نشانہ بن جاتی ہے مگر ہماری این جی اوز نے کبھی ان کا ذکر تک نہیں کیا۔

بھارت میں بے حیائی کے ساتھ ساتھ یورپ اور امریکا کی طرح خواتین کو مادر پدر آزادی مل چکی ہے۔ اب وہاں بھی عورتیں اور مرد شادی کے بغیر سالہا سال ساتھ رہتے ہیں۔ شادی کے بغیر بچے بھی پیدا کرتے ہیں اور جب چاہیں یہ رشتہ توڑ کر اپنا اپنا راستہ لے لیتے ہیں۔ بھارتی معاشرے میں شراب عام ہے۔ چھوٹے سے گاؤں میں بھی پان سگریٹ کی طرح شراب فروخت ہوتی ہے جس کے خلاف بھارتی خواتین مظاہرے کرتی ہیں اور جلوس نکالتی ہیں کیونکہ شوہر ہر چیز سے بے نیاز ہو کر شراب، کباب اور شباب کا متوالہ ہوچکا ہے مگر چونکہ شراب کی فروخت سے حکومت کو بہت آمدنی ہوتی ہے اس لیے شراب پر پابندی نہیں لگائی جاتی۔ بھارت میں متوسط طبقے کی لڑکیاں بھی اب مغربی انداز اپنا رہی ہیں۔ ہیجان انگیز نیم عریاں لباس پہن کر بوائے فرینڈز کے ساتھ گھومتی ہیں۔ اس سے شہ پا کر دوسرے نوجوان بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا چاہتے ہیں تو اس کو زیادتی اور اجتماعی زیادتی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ جب تک اسباب ختم نہیں کیے جائیں گے یہ خرابی بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

بھارتی معاشرے پر فلموں اور فلم اسٹارز کا بہت زیادہ اثر ہے۔ بھارتی دنیا بھر میں سب سے زیادہ فلمیں دیکھنے والے لوگ ہیں۔ یہ جس ملک میں بھی ہوں بھارتی فلمیں دیکھنے کو فرض سمجھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بھارت میں فلمیں کروڑوں اور اربوں کماتی ہیں۔ ان فلموں کی لاگت بھی کروڑوں میں ہے۔ بڑے اداکار بھی کروڑوں میں معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ ممبئی کے نامور اداکار پچیس کروڑ تک معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ تامل ناڈو میں تو اداکاروں کو دیوی دیوتاؤں کا درجہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تامل ناڈو کے علاوہ بھارتی لوک سبھا میں بھی اداکار اور اداکارائیں

انتخاب میں کامیاب ہوکر وزیراعلیٰ کے عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ تامل ناڈو کی وزیراعلیٰ آج کل وہاں کی دوسری بار وزیراعلیٰ منتخب ہوئی ہیں حالانکہ ان پر کرپشن کے مقدمات بھی چل چکے ہیں۔

بالی وڈ میں آزادی کا معیار اب مغرب کی طرح ہے۔ عورت اور مرد کے مابین عارضی رشتے قائم ہوتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ہندو مسلم کی تمیز اٹھ گئی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عامر خان، شاہ رخ خان جیسے مسلمانوں کی بیگمات ہندو ہیں۔ عامر خان نے پہلی بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کی تو وہ بھی ایک ہندو خاتون سے۔ ان مخلوط جوڑوں کی اولاد کا مذہب کیا ہوگا ' یہ کوئی نہیں جانتا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ ان کے اثر کے تحت اولاد بھی ہندو ہوگی جیسا کہ نرگس اور سنیل دت کی شادی کا نتیجہ نکلا۔ ان دونوں کے بچے ہندو مذہب اختیار کر چکے ہیں لیکن بھارت کے ہندو انہیں مسلمان ماں کی اولاد ہونے کا جرم بھی معاف کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ سنجے دت کے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے یہ دراصل اس کو ایک مسلمان ماں کے اولاد ہونے کی ''سزا'' ہے۔ لیکن اس قسم کی شادیوں کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔

آیئے ' اس معاملے میں کرینہ کپور اور سیف علی خان کی شادی کا جائزہ لیتے ہیں۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کرینہ کپور کا تعلق بالی وڈ کی ایک ممتاز فیملی سے ہے۔ فلموں میں ان کا جدِامجد پرتھوی راج کپور تھا۔ ان کے بیٹے راج کپور نے فلم ساز' ہدایت کار اور اداکار کے طور پر بہت شہرت حاصل کی۔ ان کے دونوں بھائی شمی کپور اور ششی کپور نے بھی بہت نام کمایا۔ راج کپور دس سال تک نرگس کو اس کی والدہ اور بھائی کی مرضی کے خلاف بے وقوف بناتے اور پیسا کماتے رہے۔ سیدھی اردو میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلسل دس سال تک نرگس راج کپور کی داشتہ رہیں۔ وہ لارے دیتے رہے کہ میں گھریلو بیوی اور خاندان کی وجہ سے مجبور ہوں مگر تم سے شادی ضرور کروں گا۔ دس سال تک جھک مارنے اور گناہ کے اس جہنم میں جلنے کے بعد نرگس کو ہوش آیا اور عشق کا بخار اترا۔ راج کپور سے علیحدہ ہونے کے بعد انہوں نے سنیل دت سے شادی کرلی۔ یہ شادی کیوں اور کن وجوہات کی بنا پر ہوئی یہ سب جانتے ہیں۔ نرگس عمر میں سنیل دت سے بڑی تھیں مگر سنیل دت بدرجہا بہتر انسان تھے۔ انہوں نے نرگس کی بہت عزت کی۔ ان کی طویل بیماری میں سارے کام چھوڑ کر ان کی تیمارداری کی مگر کینسر کا جان لیوا مرض نرگس کی جان لے کر ہی رہا۔ سنیل دت بطور انسان راج کپور کے مقابلے میں بہت اچھے تھے، اس لیے دونوں کی بہت اچھی طرح نبھ گئی۔ نرگس نے اس کے بعد راج کپور کے ساتھ کام نہیں کیا حالانکہ وہ ناکام محبت کا روپ دھار کر کئی سال تک نرگس کو یاد کرتے رہے۔

شمی کپور نے ایک سکھ اداکارہ گیتا بالی سے شادی کی تھی مگر وہ چیچک کے مرض میں مبتلا ہوکر وفات پاگئیں۔ ششی کپور نے ایک انگریز عورت جینیفر سے شادی کی جو اپنے دور میں اسٹیج ڈراموں کی نامور اداکارہ تھی۔ یہ شادی بہت کامیاب رہی۔ بیوی کی وفات کے بعد ششی کپور نے دوسری شادی نہیں کی لیکن کوئی روک ٹوک نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی بہت زیادہ موٹے ہوگئے حالانکہ بیوی کی وفات سے پہلے کئی سال تک وہ دبلے پتلے اور بہت اسمارٹ تھے۔ رندھیر کپور (ڈبو) نے فلموں میں زیادہ کام نہیں کیا۔ انہوں نے فلم اسٹار ببیتا سے شادی کی۔ کرینہ کپور اور کرینہ کپور انہی کی بیٹیاں ہیں۔ رشی کپور نے فلم اسٹار نیتو سنگھ سے شادی کی تھی جو مذہب کے اعتبار سے سکھ ہیں۔ رنبیر کپور فلم اسٹار نیتو سنگھ اور رشی کپور کے بیٹے ہیں۔ رنبیر کپور، کرینہ کپور اور کرشمہ کپور اس خاندان کی چوتھی پیڑھی ہے۔ اس اعتبار سے کپور خاندان آج کل بھی بالی وڈ پر چھایا ہوا ہے۔ اس خاندان میں موٹا ہونے کی بیماری ہے۔ پرتھوی راج بہت اسمارٹ اور ورزشی جسم کے مالک تھے۔ فلم سکندر میں انہوں نے سکندر کا کردار ادا کیا تو واقعی ایک یونانی دیوتا ہی نظر آتے تھے۔ کئی سال متناسب جسم رہا لیکن پھر وہ موٹے ہونے لگے اور زندگی کے آخری چند سالوں میں تو بہت موٹے ہوگئے تھے۔

ان کا بڑا بیٹا راج کپور بھی بہت اسمارٹ اور دبلا پتلا تھا لیکن اس کے بعد مٹاپا چڑھنے لگا۔ زندگی کے آخری سالوں میں وہ بہت موٹے ہوگئے تھے۔

کثرتِ شراب نوشی اور عیش وطرب میں پڑجانے اور خوش خوراکی اور کثرتِ سگریٹ نوشی کے باعث ان کے مٹاپے میں اضافہ ہوتا رہا۔ بے اعتدالیوں کی وجہ سے وہ سانس اور دوسرے امراض میں مبتلا ہوگئے۔ انہیں جب پدم شری کا عظیم ترین ایوارڈ دیا گیا تو وہ بمشکل گھر سے چل کر تقریب میں پہنچے تھے۔ جب ان کا نام پکارا گیا تو وہ بمشکل اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ صدر نے یہ دیکھ کر بذاتِ خود اسٹیج سے اتر کر ان کے پاس جانے کو ترجیح دی اور اسٹیج چھوڑ کر ان کے پاس



جاکر پدم شری کا اعزاز ان کی گردن میں ڈالا۔ یہ ایک انہونا واقعہ تھا اور راج کپور کے لیے بہت بڑا اعزاز۔ اعزاز پانے کے بعد وہ اپنے قدموں پر کھڑے نہ رہ سکے اور گر گئے۔ انہیں فوراً اسپتال لے جایا گیا اور فوری طور پر علاج شروع کردیا گیا لیکن اس کے بعد وہ اسپتالوں ہی میں رہے اور اسپتال ہی میں زندگی کی آخری سانسیں لیں۔

راج کپور بہت بڑے اداکار سمجھے جاتے تھے۔ بھارتی فلم انڈسٹری کے تین بڑے اداکاروں میں دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند شامل تھے اور عرصہ دراز تک ان تینوں سے یہ اعزاز کوئی اور نہ چھین سکا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اداکار کی حیثیت سے راج کپور کا دلیپ کمار سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ وہ زندگی بھر ایک ہی قسم کے کردار، ایک ہی انداز سے کرتے رہے۔ ان کے مقابلے میں دیو آنند بہتر اداکار تھے۔ انہوں نے مختلف قسم کے کردار ادا کیے۔ صورت شکل اور قد وقامت کی وجہ سے اور اداکاری کے انداز کی وجہ سے وہ بھی بہت مقبول تھے لیکن اداکار کی حیثیت سے دلیپ کمار سے ان دونوں کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دلیپ کمار جب تک فلموں میں کام کرتے رہے ہندوستان کے عظیم ترین اداکار ہی قرار دیے گئے۔ انہوں نے لگ بھگ ساٹھ سال کے عرصے میں ساٹھ کے قریب فلموں میں کام کیا اور ہر طرح کے کردار ادا کرکے داد پائی۔ فلموں کی کم تعداد کا سبب یہ تھا کہ وہ ایک وقت میں ایک ہی فلم میں کام کرتے تھے حالانکہ فلم ساز انہیں منہ مانگا معاوضہ ادا کرنے کو تیار تھے۔

دلیپ کمار اور راج کپور دونوں پشاور میں پیدا ہوئے اور وہیں بچپن اور لڑکپن گزارا۔

ان دونوں کے دادا ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے اور دونوں گھرانوں میں بہت زیادہ میل جول تھا۔ دلیپ (یوسف خان) اور راج کپور ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ دونوں میں بہت دوستی تھی۔ جب دلیپ کمار کی شادی ہوئی تو راج کپور خوشیاں منانے والوں میں پیش پیش تھے۔ ان دونوں کے مابین رقابت اور کشیدگی کی داستانوں میں صرف اتنی سچائی ہے کہ پیشہ ورانہ ضرورت کو دونوں مدِنظر رکھتے تھے۔ راج کپور میں حسد کا جذبہ بھی تھا۔ راج کپور نے جو کام بھی کیا اپنے مفاد کے لیے کیا۔
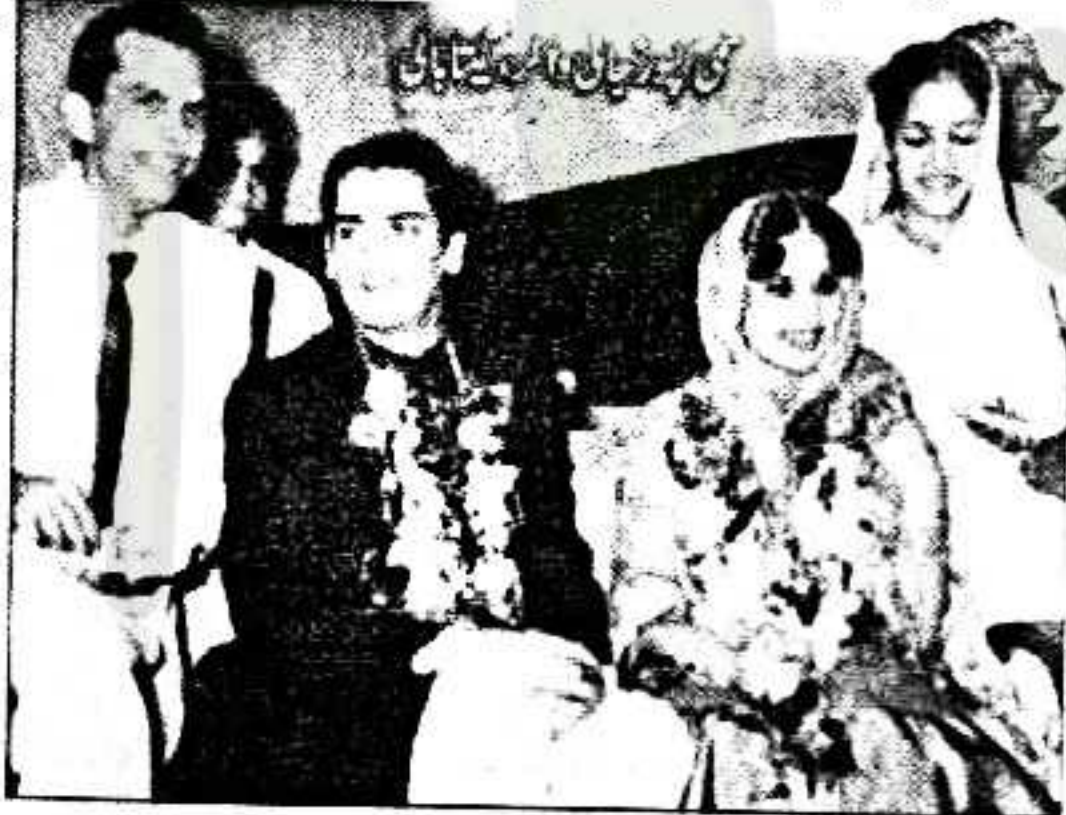
فلم ''انداز'' ایک لاجواب فلم ہے جس میں دلیپ کمار، راج کپور اور نرگس نے کام کیا تھا۔ یہ فلم لافانی اور یادگار بن گئی اور خود بھارتی مبصر بھی اس کو ایک نئی طرح ڈالنے والی فلم تسلیم کرتے ہیں۔ اس فلم کے بعد یہ تینوں کبھی یکجا نہیں ہوئے حالانکہ نرگس نے دلیپ کمار کے ساتھ جس فلم میں بھی کام کیا وہ سپر ہٹ ہوئی اور ان دونوں کی فلمی جوڑی ایک زمانے میں بے حد مقبول تھی۔

راج کپور اداکار اتنے اچھے نہیں تھے جتنے اچھے فلم ساز اور ہدایت کار تھے۔ ان کی فلموں میں رومان اور سیکس کا عنصر بہت زیادہ ہوتا تھا اور وہ اپنی ہر فلم کی ہیروئن کے ساتھ محبت کا ڈراما ضرور کرتا تھا۔ راج کپور کا کہنا تھا کہ وہ اپنی فلم کی ہیروئن سے محبت کیے بغیر فلم میں جان نہیں ڈال سکتا تھا۔ راج کپور کی فلموں کی دوسری نمایاں بات عریانی تھی۔ راج کپور کی فلموں میں ہیروئن کو اس زمانے میں بھی تقریباً عریاں دکھایا جاتا تھا۔ عریانی اور نیم عریانی جس کثرت سے راج کپور کی فلموں میں پیش کی جاتی تھی وہ کسی اور فلم ساز اور ہدایت کار

کی فلموں میں نظر نہیں آتی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس عریانی پر فلم سنسر بورڈ کو بھی اعتراض نہیں ہوتا تھا حالانکہ اس زمانے میں اتنی زیادہ جسم کی نمائش کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ دلیپ کمار نے جب فلم ''گنگا جمنا'' بنائی تو سنسر بورڈ کی طرف سے بہت اعتراضات کیے گئے اور رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ فلم کے آخری سین میں مرکزی کردار (دلیپ کمار) ''ہائے رام'' کیوں کہتا ہے جبکہ وہ مسلمان ہے۔ یہ انتہائی نامعقول اعتراض تھا لیکن دلیپ کمار کو اس فلم کو سنسر کرانے میں اتنی مشکلات پیش آئیں کہ اس نے آئندہ فلم بنانے کا خیال ہی ترک کردیا اور ''گنگا جمنا'' کی بے مثال مقبولیت اور کامیابی کے باوجود دلیپ کمار نے نہ تو فلم سازی کی اور نہ ہی ہدایت کاری۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلم ساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے راج کپور کو جو حیثیت حاصل تھی دلیپ کمار یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ بہتر فلم بنا سکتا ہے۔ راج کپور کی بہترین اور یادگار فلم ''آوارہ'' تھی جو ہر اعتبار سے بہت اچھی فلم تھی۔ اس کے بعد بھی راج کپور نے کئی فلمیں بنائیں جو بہت کامیاب ہوئیں مگر ''آوارہ'' جیسی فلم نہ بنا سکے۔ راج کپور کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ اپنی فلم کی ہیروئنوں کو عریاں یا نیم عریاں ضرور دکھاتے تھے۔

کپور خاندان کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ اس گھرانے کی خواتین فلموں میں کام نہیں کرتی تھیں بلکہ جن اداکاراؤں سے کپور خاندان نے شادیاں کیں انہیں اداکاری ترک کرنا پڑی۔ ببیتا نے اس شرط کو منظور تو کرلیا لیکن اسے یہ دکھ رہا کہ وہ اداکاری سے محروم کردی گئی۔ اداکاراؤں کے لیے فلمی زندگی چھوڑ دینا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے مچھلی کو پانی سے باہر نکال کر پھینک دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جب بھی اداکاراؤں نے شادی کی اکثر و بیشتر یہ شادیاں کامیاب نہیں رہیں۔ کئی شادیاں تو قائم ہی نہ رہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ جس چمک دمک اور آؤ بھگت کے ماحول میں وہ فلمی دنیا میں زندگی گزارتی ہیں اس کے بعد گھریلو زندگی انہیں بہت پھیکی اور بے معنی لگتی ہے۔ انہیں وہ دن یاد آتے ہیں جب وہ ہیروئن کی حیثیت سے گھر سے باہر نکلتی تھیں تو بے شمار پرستار انہیں دیکھ کر بے تاب ہوجاتے ہیں۔ ان کی ایک جھلک دیکھنے کو ترستے ہیں۔ کسی تقریب میں شرکت کریں تو ان سے آٹوگراف لینے والوں کی قطاریں لگ جاتی ہیں۔ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ان کی خوشنودی کے لیے ان

کے آگے آنکھیں بچھاتے ہیں۔ شہروں میں جگہ جگہ ان کی فلموں کے پوسٹر لگے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر ان کے پرستار آہیں بھرتے ہیں۔ بے شمار لوگ انہیں خطوط لکھ کر ان کی تعریف کرتے ہیں اور ان سے شادی کرنے کی پیشکش کرتے ہیں۔ جس محفل میں وہ جاتی ہیں فوٹو گرافرز (اور اب ٹی وی کے کیمرا مین) انہیں گھیر لیتے ہیں۔ ان کی تصویریں اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔ ٹی وی پر انہیں بڑے اہتمام سے دکھایا جاتا ہے اور ان کے ناز نخرے اٹھائے جاتے ہیں ...... فلم اسٹوڈیوز میں جب وہ فلموں کی شوٹنگ کرتی ہیں تو ہر ایک کی نگاہ کا مرکز بن جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ فلم ایکٹریسوں کو جس طرح پذیرائی ملتی ہے اور ان کی پبلسٹی کی جاتی ہے اس کی انہیں عادت پڑ جاتی ہے اور وہ تمام عمر ایسی ہی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں۔ جب ان کے عروج کا دور ختم ہوتا ہے اس وقت بھی وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہیں کہ آج بھی ان کی وہی حیثیت ہے جو عروج کے زمانے میں تھی۔ یہاں تک کہ وہ ادھیڑ عمر اور پھر بوڑھی ہوجاتی ہیں مگر اچھے دنوں کے خواب بھلا نہیں سکتیں۔

راج کپور کے بیٹوں نے ہیروئنوں سے شادی کی تھی۔ جوانی کے جوش میں جب عشق کا بھوت بھی سر پر سوار ہو انسان سوچ سمجھ کر کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔ ببیتا اور نیتو سنگھ نے جس وقت رندھیر کپور اور رشی کپور سے شادی کی تھی وہ ان کی مقبولیت کا زمانہ تھا۔ شاید ان کا خیال ہوگا کہ کچھ عرصہ بعد انہیں دوبارہ فلموں میں کام کرنے کا موقع مل جائے گا لیکن راج کپور کے خاندان میں ایسی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دیکھ دیکھ کر کڑھتی تھیں کہ ان کے شوہر تو کھلے عام رنگ رلیاں مناتے پھرتے ہیں، انہیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے مگر وہ خود اپنی خوبصورت اور چمکیلی دنیا سے باہر بھٹکتی پھر رہی ہیں۔

راج کپور کی بہوؤں نے راج کپور کی آنکھیں بند ہوتے ہی چولا بدل لیا۔ یہ حقیقت ہے کہ پرتھوی راج کپور کی زندگی میں ہی راج کپور نے خاندان کے سربراہ کی حیثیت سنبھال لی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ سارے بھائی اپنے بڑے بھائی کی بہت عزت کرتے تھے اور کوئی ایسا کام نہیں کرتے تھے جو راج کپور کی ناراضی کا سبب بنے۔ یوں سمجھیے کہ راج کپور نے سارے خاندان کو ایک لڑی میں پرو رکھا تھا۔ راج کپور کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی یہ لڑی ٹوٹ گئی اور سارے موتی بکھر گئے۔ اب راج کپور کے بیٹوں کو بھی آزادی مل گئی اور بہوئیں بھی کسی سے خوف کھائے بغیر اپنی من مانی



کرنے لگیں۔ شوہر پہلے ہی اپنی بیویوں سے دب کر رہتے تھے اور ان کی کوئی خواہش پوری کرنے سے انکار نہیں کرتے تھے سوائے ان باتوں کے جو راج کپور کو پسند نہ تھیں۔

سب سے پہلے ببیتا نے آغاز کیا اور اپنی بیٹی کرشمہ کپور کو فلموں میں کام کرنے کی اجازت دے دی۔ اجازت ہی نہیں دی اس کو فلموں میں متعارف کرانے کے لیے اپنے شوہر پر بھی دباؤ ڈالا۔ اس طرح کرشمہ کپور نے فلمی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ فلمی دنیا میں یہ ایک چونکا دینے والی بات تھی کہ راج کپور کی بیٹی فلموں میں اداکاری کرے۔ کپور خاندان کو فلمی دنیا میں ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ پرتھوی راج کپور نے فلموں اور تھیٹر میں بہت نام بنایا تھا۔ اپنے رکھ رکھاؤ، وضعداری اور رعب داب کی وجہ سے بھی فلمی صنعت میں پرتھوی راج کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ ابھی پرتھوی راج کا دور عروج ہی تھا کہ ان کا بیٹا راج کپور ایک دھماکے کے ساتھ فلمی دنیا میں داخل ہوا۔ پرتھوی راج نے اپنے بیٹے کی صلاحیتوں کا اندازہ لگالیا تھا اور اس کو کیدار شرما جیسے نامور ہدایت کار کا اسسٹنٹ بنوادیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کیدار شرما کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ ان کے بیٹے سے کوئی خصوصی برتاؤ نہ کیا جائے ایک عام تھرڈ اسسٹنٹ کی حیثیت سے اس کے ساتھ برتاؤ کیا جائے۔ پرتھوی راج کی خواہش تھی کہ راج کپور ایک عام اسسٹنٹ کے طور پر فلمی صنعت میں کام سیکھے اور پرتھوی راج کے بیٹے کی حیثیت سے اس کے ناز نخرے نہ اٹھائے جائیں۔ ہر مرحلے سے گزر کر وہ کندن بن جائے۔ کچھ تو باپ کی تربیت، اس پر کیدار شرما جیسے ہدایت کار کے ساتھ کام کرنے اور سیکھنے کا تجربہ اور سونے پہ سہاگا خود راج کپور کی ذہانت، شوق اور قابلیت۔ ان سب راستوں سے گزر کر راج کپور نے چند سال کے اندر ہی بھارت کی فلمی دنیا میں اپنا مقام بنالیا اور فلمی صنعت کے اہم ستونوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔

راج کپور کے بعد شمی کپور اور ششی کپور نے اداکاروں کی حیثیت سے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ جس خاندان کے اتنے افراد فلمی صنعت میں اونچا مقام حاصل کرلیں اس کی اہمیت میں تو اضافہ ہوتا ہی تھا۔ ایسا کامیاب اور مشہور خاندان بمبئی کی فلمی دنیا میں کوئی اور نہ تھا۔

جب یہ فن کار غروب ہو رہے تھے تو اس خاندان کو روشنی دینے کے لیے کرشمہ کپور فلم اسکرین کو جگمگانے کے لیے نمودار ہوئیں۔ کرشمہ کو خوبصورتی اور اداکاری کی صلاحیت

کمال امروہوی اور مینا کماری

وراثت میں ملی تھی۔ نیلی آنکھیں۔ بھورے بال۔ گورا رنگ۔ وہ خوبصورتی کی تصویر تھی۔ اداکارانہ صلاحیتیں بھی قدرت کی عطا کردہ تھیں۔ جب بڑے بڑے ہیروز کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو کرشمہ کا شمار بھی ممتاز ہیروئنوں میں ہونے لگا۔ کرشمہ اور ابھیشک بچن کے رومان کا بہت چرچا ہوا تھا لیکن پھر ابھیشک نے ایشوریا رائے سے شادی کرلی۔

فلموں میں کرشمہ کی کامیابی دیکھ کر اس کی بہن کرینہ کپور نے بھی اداکاری کا فیصلہ کرلیا۔ کرینہ کپور اپنی بہن سے زیادہ خوبصورت اور باصلاحیت تھی۔ آتے ہی فلمی دنیا پر چھا گئی۔ کرشمہ نے کچھ عرصہ بعد ایک دولت مند سنجے کپور سے شادی کرکے فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ یہ شادی بہت زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ کچھ عرصے بعد ہی

اختلافات اور جھگڑے شروع ہوگئے۔ یہاں تک کہ کرشمہ کپور نے ایک دن اعتراف کرلیا اور اس کے ساتھ ہی دوسری ہیروئنوں کو بھی مشورہ دیا کہ اپنے عروج کے زمانے میں شادی نہ کریں ورنہ کہیں کی بھی نہیں رہیں گی۔ فلموں میں واپسی کرشمہ کے لیے ناممکن تھی کیونکہ بالی وڈ میں اور بہت سی خوبصورت اور کامیاب ہیروئنیں آگئی تھیں۔ بمبئی میں نئے چہرے جس تیزی سے نمودار ہوتے ہیں اس کی وجہ سے جو ہیروئن مختصر عرصے کے لیے بھی فلموں سے دور ہوجانے کے بعد دوبارہ واپس آنا چاہتی ہے تو اس کی جگہ پُر ہوچکی ہوتی ہے۔ پریتی زینٹا، رانی مکھرجی، ایشوریارائے جیسی نامور اور کامیاب ہیروئنیں دیکھتے ہی دیکھتے اندھیروں میں گم ہوگئیں۔ کسی زمانے میں ان کی فلمیں کروڑوں روپے کماتی تھیں تو فلم انڈسٹری انہیں سرآنکھوں پر بٹھاتی تھی اور ان کے ناز نخرے اٹھاتی تھی مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اجنبی ہوکر رہ گئیں۔ اب ان کا نام بھی لوگوں کو یاد نہیں۔

کرشمہ کپور کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اب وہ ایک بھولی ہوئی کہانی بن چکی ہیں لیکن ان کی بہن کرینہ کپور نے فلمی دنیا کو اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ کرینہ کپور کو غالباً اپنے حسن و جمال کا مکمل احساس ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس کو حسین ترین اداکارہ تسلیم کرلیا گیا۔ اس وقت بالی وڈ میں حسین اور خوش جمال ہیروئنوں میں سے کرینہ کپور اور کترینہ کیف میں مقابلہ ہے لیکن سروے رپورٹوں کے مطابق کرینہ کپور کو خوبصورت ترین ہیروئن تسلیم کرلیا گیا۔ خوبصورتی کے علاوہ اس کی اداکاری بھی بہتر تھی۔ اس کو صف اول کے ہیروز کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کرینہ کپور نے شرم وحیا کو لپیٹ کر سوٹ کیس میں رکھ دیا ہے۔ اس کے ملبوسات اتنے مختصر اور ہیجان خیز ہوتے ہیں کہ عریانی بھی اس سے شرمائے۔ اس پر اس کی بے باکانہ اداکاری اور بے جھجک رقص اور ہیرو کے ساتھ بے باکی سے گلے ملنا یہاں تک کہ بوسہ بازی کا بھی مظاہرہ شروع کردیا۔ یوں تو کترینہ کیف اور پریانکا چوپڑا کے علاوہ دوسری ہیروئنیں بھی عریانی اور بے حیائی میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کررہی ہیں لیکن وہ کرینہ کپور کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ کرینہ کپور نے کئی سال پہلے فلم ''اشوکا'' میں کام کیا تھا۔ یہ فلم ہندوستان کے عظیم ہندو بادشاہ اشوک کے دور سے تعلق رکھتی تھی۔ زمانہ قدیم میں ہندوستان کے لوگوں (ہندوؤں) کے بارے میں کئی سیاحوں نے لکھا ہے کہ لباس کے نام پر یہ چند کپڑے جسم پر لپیٹ لیتے ہیں۔ عورتیں تقریباً عریاں رہتی ہیں۔ جب دوسرے فاتحین نے ہندوستان پر حملہ کیا اور حکمرانی کی تو ان کی تہذیب نے ہندوؤں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ خاص طور پر مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں نے فارسی زبان بولنی شروع کردی اور ان کے لباس بھی مسلمانوں کے مشابہ ہونے لگے۔

اس پس منظر میں۔ اشوک کے دور میں عورت کو نیم عریاں دکھانا کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ اس فلم میں کرینہ کپور کا لباس جسم کو چھپانے کے بجائے جسم کو نمایاں کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ اپنی اداکاری اور عریانی کے ساتھ ساتھ بے حیائی کی مدد سے کرینہ کپور نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے مختلف کرداروں کو بھی بہت خوبی سے نبھایا جس کے نتیجے میں وہ صفِ اول کی ہیروئن بن گئیں۔ اس وقت وہ بالی وڈ پر حکمرانی کررہی ہیں۔

مقبولیت کے ساتھ ساتھ کرینہ کپور کے اسکینڈلز میں اضافہ ہوگیا۔ ان کا نام مختلف اداکاروں کے ساتھ منسوب کیا گیا لیکن سب سے زیادہ شہرت شاہد کپور کے ساتھ ان کے رومانس کو ملی تھی۔ شاہد کپور بھی ایک نوجوان اداکار ہیں۔ اداکاری بھی اچھی کرتے ہیں اگرچہ بھارتی میڈیا نے انہیں تین خانوں، کے مقابلے میں پیش کرنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہوسکی۔

کرینہ کا تعلق بالی وڈ کی فرسٹ فیملی سے ہے۔ اس خاندان نے ایک طرح سے بالی وڈ پر راج کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں شاہد کپور کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ ان کے والد پنکج کپور تھے جو کہ ایک اوسط درجے کے اداکار تھے۔ شاہد کپور کی والدہ نیلما عظیم بھی فلموں میں کام کرتی رہی ہیں مگر وہ بہت کامیاب اور نامور اداکارہ نہیں تھیں۔ اس کے مقابلے میں کرینہ کپور نے پیدا ہوتے ہی شہرت اور دولت دیکھی۔ ان کے خاندان کو فلمی دنیا میں جو اہمیت حاصل ہے کسی اور ہیروئن کے نصیب میں نہیں ہے۔ وہ رندھیر کپور اور اداکارہ ببیتا کی بیٹی ہیں جن کا شمار مقبول اور کامیاب فن کاروں میں ہوتا تھا۔

اس سماجی اونچ نیچ کے باوجود شاہد کپور کی محبت میں گرفتار ہوکر کرینہ نے ثابت کردیا کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ ان دونوں کا اسکینڈل اتنا بڑھا کہ عشق کی صورت اختیار کرگیا۔ کرینہ کپور نے بے باکی سے میڈیا میں یہ اعتراف



کیا کہ وہ شاہد کپور سے محبت کرتی ہیں اور اس کے بغیر زندہ نہیں رہیں گی۔ کرینہ کپور شرم وحیا کی تمام حدود توڑ کر پبلک مقامات پر شاہد کپور کے ساتھ کھلم کھلا اظہارِ عشق کرتی رہیں۔ ریستورانوں میں، ہوٹلوں میں شاپنگ سینٹرز میں وہ دونوں میاں بیوی کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے نظر آتے تھے۔ میڈیا کے لیے یہ چٹ پٹا مسالا تھا۔ کرینہ کپور پبلک میں کھلے عام شاہد کپور سے لپٹتی نظر آتی تھیں یہاں تک کہ ہندوستانی روایات کے برعکس وہ ایک دوسرے کو پیار کرتے ہوئے بھی نہیں جھجکتے تھے۔

کرینہ کپور کے ماڈرن خیالات رکھنے والے ڈیڈی رندھیر کپور نے بھی ان باتوں کو برا نہیں کہا بلکہ انہوں نے صحافیوں کے سوال کے جواب میں کہا کہ کرینہ ایک سمجھدار لڑکی ہے۔ وہ اپنا بھلا برا سمجھتی ہے۔ اگر وہ کسی سے محبت کرتی ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اپنی زندگی کے بارے میں خود ہی فیصلے کرنے کے لیے وہ آزاد ہے۔ مگر شاہد کپور کے والدین کو شاہد کی کرینہ جیسی بے باک اور منہ زور لڑکی سے محبت پسند نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ کرینہ جیسی آزاد خیال لڑکی کو وہ اپنی بہو بنانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو بھی سمجھایا کہ کرینہ کا طرزِ زندگی ہم لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ تمہارا اس کے ساتھ گزارہ نہیں ہوسکتا۔ ایک دن تم اپنے اس فیصلے پر پچھتاؤ گے۔

مگر شاہد کپور کے سر پر تو عشق کا بھوت سوار تھا، وہ ہر قیمت پر کرینہ کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سحر میں گرفتار تھا۔ ماں باپ، دوستوں اور ہمدردوں کا کوئی مشورہ اس پر اثر نہیں کرتا تھا۔

جب انسانی کوششیں ناکام ہوگئیں تو قدرت نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور ایک دن خبر آئی کہ کرینہ کپور اور سیف علی خان محبت کی ڈور میں بندھ گئے ہیں۔ کرینہ کپور اور نواب سیف علی خان کی ملاقات فلم ''ٹشن'' کی شوٹنگ کے درمیان ہوئی تھی۔ اس فلم کی شوٹنگ لداخ کے سرد مقام پر ہورہی تھی۔ ان ہی دنوں کرینہ کپور اور شاہد کپور بھی اپنی فلم ''جب وی میٹ'' کی شوٹنگ کے لیے لداخ میں تھے۔ سیف علی خان اس سے پہلے بھی شادی کرچکے ہیں اور طلاق یافتہ ہیں۔ وہ عمر میں بھی کرینہ کپور سے کافی بڑے ہیں لیکن ان کا تعلق ایک شاہی خاندان سے ہے۔ ان کے والد نواب زادہ منصور علی خان نے اداکارہ شرمیلا ٹیگور سے شادی کی تھی۔ ان کے دو بچے ہیں ایک بیٹا سیف علی خان اور ایک بیٹی سوہا علی۔ یہ بھی ایک ماڈرن خاندان ہے۔ سیف علی خان نے کرینہ کپور کے بارے میں ان کے والدین رندھیر کپور (عرف ڈبو) اور اداکارہ ببیتا سے بھی ملاقات کی تھی اور انہیں کرینہ اور اپنی محبت کے بارے میں بتایا تھا۔ ان دونوں نے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خوشی سے ان دونوں کو شادی کی اجازت دے دی۔

اس کہانی کا ایک تلخ پہلو یہ ہے کہ جس وقت کرینہ کپور نے شاہد کپور سے تمام رشتے توڑے اس وقت شاہد کپور کینیڈا میں اپنی فلم ''لکی چارم'' کی شوٹنگ کررہے تھے۔ کرینہ کپور اور سیف علی خان کے مراسم کی خبریں کینیڈا میں شاہد کو مل رہی تھیں لیکن اس کا خیال تھا کہ یہ سب اخباری اسکینڈلز ہیں۔ کرینہ کپور کے ساتھ اس کی ٹیلی فون پر گفتگو تو ہوتی تھی لیکن بہت کم۔ شاہد کپور اس کو کرینہ کی مصروفیات سمجھتا تھا۔ وہ اس خیال میں تھا کہ ممبئی واپس پہنچتے ہی کرینہ کپور کے ساتھ شادی کی تاریخ طے کرکے دھوم دھام سے شادی کرے گا مگر جب وہ ممبئی واپس آیا تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ کرینہ کپور نے پٹڑی بدل لی تھی۔ وہ شاہد کپور کی محبت کو میلے کپڑوں کی طرح اتار کر ٹوکری میں ڈال چکی تھی۔ اب سیف علی خان کے ساتھ کرینہ کپور کی شادی یقینی تھی۔ دونوں کے والدین کی رضامندی بھی حاصل ہوچکی تھی۔ دونوں اپنا فارغ وقت ایک ساتھ ہی گزارتے تھے۔ اب ان کی شادی کے راستے میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں رہی لیکن فلمی صنعت میں رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ کچھ پتا نہیں کہ کس وقت کوئی ڈرامائی تبدیلی رونما ہوجائے۔ آخر وقت تک شاہد کپور اسی امید پر رہے۔

حالانکہ یہ خبر آرہی تھی کہ کرینہ کپور کی خواہش کے مطابق منصور علی خان کے عظیم الشان اور وسیع شاندار محل میں ایک حصہ کرینہ کپور اور سیف علی خان کے لیے وقف کیا جارہا

ہے تاکہ وہ آزادی سے اپنی زندگی اپنی خواہش کے مطابق گزار سکیں۔ سیف علی خان کو فلمی دنیا میں نواب سیف علی خان کہا جاتا ہے۔ ان کا رہن سہن آج بھی شاہانہ ہے، شاندار پُرشوکت محل، قیمتی کاروں کی قطاریں، ملازموں کی فوج اور ہر طرح کا عیش...... کرینہ کپور لاکھ دولت مند سہی مگر یہ نوابی اور شاہانہ ٹھاٹ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

اقبال یوسف ایک ہنس مکھ اور زندہ دل انسان تھے۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کا دل نہیں توڑا اور نہ ہی کسی سے سختی کے ساتھ بات کی۔

بہار بیگم

فلم کے ہدایت کار عموماً سیٹ پر شوٹنگ کرتے ہوئے اداکاروں اور اسٹاف کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں۔ وہ اپنے سیٹ پر خاموشی اور نظم و نسق کے خواہاں ہوتے ہیں۔ وہ سیٹ پر خاموشی اور سنجیدگی چاہتے ہیں لیکن اقبال یوسف ان سے بالکل مختلف تھے۔ ان کے سیٹ پر سنجیدگی کے بجائے ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہ خود بھی اداکاروں اور دوسرے لوگوں سے مذاق کرتے رہتے تھے۔ ہدایت کار کی حیثیت سے وہ اداکاروں کو جوابات اس طرح دیتے تھے جیسے کہ ان سے گپ شپ کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ پابندیوں اور سخت رویئے کی وجہ سے اداکار سہم جاتے ہیں اور کھل کر ادائیگی نہیں کر سکتے۔

اقبال یوسف نے زیادہ عمر نہیں پائی مگر مختصر عرصے میں بھی بہت زیادہ اور اچھا کام کیا۔ وہ مشہور و معروف ہدایت کار ایس ایم یوسف کے بڑے صاحب زادے تھے۔ ممبئی کے مشن اسکول میں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی جس کی وجہ سے بہت اچھی انگریزی بولتے تھے۔

جب ایس ایم یوسف 1960ء میں ممبئی سے لاہور آئے اور انہوں نے یہاں اپنی پہلی فلم سہیلی کا آغاز کیا تو فلمی صنعت کو ان سے زیادہ امیدیں نہیں تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ممبئی کے حالات اور ماحول میں کام کرنے والے ہدایت کار پاکستان میں مشکلات اور سرمائے کی کمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور معیاری فلمیں نہیں بنا سکتے جیسی کہ ممبئی میں بنایا کرتے تھے۔ سہیلی کی کہانی حسرت لکھنوی نے لکھی تھی۔ نغمہ نگار فیاض ہاشمی تھے اور موسیقار اے حمید۔ ایس ایم یوسف ممبئی کے ماحول میں کام کرنے کے عادی تھے۔ لاہور آ کر انہوں نے اپنی پہلی فلم کے یونٹ کو آخر تک برقرار رکھا۔ البتہ حسرت لکھنوی کے بعد فلموں کی کہانی اور اسکرپٹ لکھنے کا فرض بھی انہوں نے فیاض ہاشمی کو سونپ دیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ میرے مزاج اور مذاق کو سمجھتے ہیں۔ ہم ایک ہی طرح سوچتے ہیں اس لیے کام بہتر اور آسان ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ طریقہ کار ممبئی کے انداز کا تھا اور یہ بہت کامیاب نسخہ تھا۔ سہیلی کے بعد ایس ایم یوسف نے پاکستان میں بھی بہت اچھی فلمیں بنائیں۔ وہ ایک ہنر مند اور باشعور ہدایت کار تھے اور فلمی ضروریات سے پوری طرح واقف تھے۔ فلموں کے موضوع وہ خود منتخب کرتے تھے۔ ان کے پاس بہت اچھے ناولوں اور ہالی وڈ کی فلموں کے اسکرپٹ محفوظ تھے جن میں وہ اضافہ کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے وہ اپنی فلم کے موضوعات چن کر انہیں اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال لیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایس ایم یوسف اپنی ذات میں ایک درس گاہ تھے۔ کاش ہماری حکومت نے فلم اکیڈمی بھی قائم کی ہوتی جس میں ایس ایم یوسف، شوکت حسین رضوی، سبطین رضوی، ڈبلیو، زیڈ احمد جیسے دیو قامت اپنے علم کی روشنی نوجوانوں کو منتقل کرتے۔ انہیں اچھی فلمیں بنانے کے گُر سکھاتے تو آج ہماری فلمی صنعت اس بدحالی سے دوچار نہ ہوتی۔ افسوس کہ پاکستان کی حکومت اور فلمی صنعت نے ان کے تجربات سے فیض نہیں اٹھایا۔

اقبال یوسف تو ایم ایس یوسف کے بیٹے تھے۔ انہوں نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنے والد کے ساتھ کام کیا تھا اور بہت کچھ سیکھا تھا۔ یوسف صاحب ان ہنر مندوں میں تھے جو دوسروں کی مدد کر کے بہت خوشی محسوس کرتے تھے۔ ہم نے کئی بار ان سے ہدایت کاری کے سلسلے میں مشورے طلب کیے جو انہوں نے خوش دلی اور بلند اخلاقی کے ساتھ ہمیں بتائے۔ انہوں نے کبھی مشورے دینے سے گریز نہیں کیا۔ وہ نئے ہدایت کاروں کی حوصلہ افزائی کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ ایک بار ہم ایورنیو اسٹوڈیو میں اپنی فلم اجنبی کی شوٹنگ کر رہے تھے۔ یہ سین بہت جذباتی اور ڈرامائی تھا۔ دیبا فلم کی ہیروئن تھیں۔



منظر یہ تھا کہ وہ ایک بچے کی ماں بن گئی ہیں مگر انہیں یہ خیال ہے کہ بچے کا باپ ان کے منگیتر محمد علی کے بجائے کوئی اور ہے۔ اس لیے جب نرس بچہ ان کے پاس لاتی ہے تو وہ کہتی ہیں کہ اس کو میری نظروں کے سامنے سے ہٹا دو۔ یہاں تک کہ وہ ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ وہ خود کو اپنے منگیتر کا مجرم محسوس کرتی ہیں۔ یہ فلم کیونکہ جذباتی تھی جس میں نہایت اعلیٰ درجے کی اداکاری کی ضرورت تھی اس لیے کئی بار ریہرسل کروانے کے باوجود ہم مطمئن نہیں ہو رہے تھے۔ بالآخر یہ منظر فلمالیا گیا اور دیبا کی اداکاری پر سیٹ پر موجود لوگوں نے تالیاں بجا کر داد دی۔

ہمیں خبر نہیں تھی کہ کس وقت ایس ایم یوسف بھی ہمارے سیٹ پر آ گئے تھے اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ جب سین فلمالیا گیا تو اٹھ کر ہم لوگوں کے پاس آئے اور انہوں نے ہماری اور دیبا کی بہت تعریف کی۔ خصوصاً دیبا کی اداکاری کی انہوں بہت تعریف کی۔ جب ہم نے انہیں سچویشن کے بارے میں بتایا تو وہ اور زیادہ متاثر ہوئے۔ ان کی تعریف سے ہمیں اور دیبا کو بہت حوصلہ ملا۔ خصوصاً جب انہوں نے کہا کہ اگر میں خود بھی یہ منظر فلماتا تو اس سے بہتر نہیں فلمایا جاتا۔ حاضرین کے مجمع کے سامنے ایس ایم یوسف کی زبان سے تعریف سن کر ہمارا اور دیبا کا حوصلہ بڑھ کر آسمان تک پہنچ گیا۔

یوسف صاحب نے ہم سے کہا۔ ”آپ کی فلم کا موضوع مجھے کچھ مختلف لگا ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو کسی وقت مجھے اس کی کہانی ضرور سنائیں۔ یہ عام طور پر بنائی جانے والی فلموں سے بالکل الگ لگتی ہے۔“

دوسرے دن ہم نے انہیں اجنبی کی کہانی سنائی۔ کہانی سنانے کا ڈھنگ ہمیں نہیں آتا اور ہم روانی کے ساتھ فلم کی کہانی نہیں سنا سکتے مگر سننے والے سمجھ جاتے ہیں۔ یوسف صاحب بھی کہانی سن کر اور اس کے موڑ سن کر بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ یہ آپ نے بڑی ہمت کی ہے۔ ایسے انوکھے موضوعات پر کام کوئی سر پھرا ہی کر سکتا ہے۔

یوسف صاحب کا اندازہ بالکل درست تھا۔ اس فلم کو سنسر کروانے میں ہمیں بہت مشکلات پیش آئیں۔ فلم کی ریلیز کے بعد بھی عام فلم بینوں نے فلم کی تھیم پر اعتراض کیا لیکن اس کی تھیم کی جدت کا سب نے اعتراف کیا۔ زیبا بیگم خصوصی شو میں آئیں تو ساری فلم کے دوران ... میں دیبا کا ہاتھ پکڑے بیٹھی رہیں اور روتی رہیں۔

شو کے ختم ہونے پر زیبا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”آفاقی، تم نے تو آج سب کو رلا دیا۔“

ڈبلیو زیڈ احمد نے فلم دیکھنے کے بعد کہا۔ ”آفاقی صاحب آپ نے یہ کہانی پچاس سال پہلے بنا دی ہے۔“

اقبال یوسف کی تربیت ایس ایم یوسف نے خود کی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اقبال یوسف نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے ان کے ساتھ کام کیا۔ اس سے پہلے وہ چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے بھی کام کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اداکاری کا کیڑا ہمیشہ ان کے دماغ میں کلبلاتا رہا۔

فلم سہیلی دراصل یوسف صاحب ہی کی فلم مہندی کا دوسرا ایڈیشن تھا۔ مہندی انہوں نے ممبئی میں بنائی تھی۔ سہیلی میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کرنے کے لیے حسرت لکھنوی کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ سہیلی نے بہت زیادہ مقبولیت اور کامیابی حاصل کی۔ سہیلی پہلی فلم تھی جو یوسف صاحب نے پاکستان آ کر بنائی اور اس کی کامیابی نے ان کے حوصلے بلند کر دیے۔ ایس ایم یوسف انڈیا میں بھی گھریلو اور اصلاحی فلمیں بنانے کے لیے مشہور تھے۔ انہوں نے کسی دوسرے موضوع پر کبھی فلم نہیں بنائی۔ ممبئی میں انہوں نے 1956ء میں ایک فلم گورو گھنٹال بنائی تھی۔ یہ واحد فلم ہے جو اُن کے انداز سے مختلف تھی۔ اقبال یوسف جس نسل سے تعلق رکھتے تھے اس کا اندازِ فکر مختلف تھا۔ انہوں نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلنے کے بجائے نئے نئے معلوماتی موضوعات فلمائے اور کامیابی بھی حاصل کی۔

پاکستان آ کر انہوں نے یوسف صاحب کی فلم گورو گھنٹال کو نئے سانچے میں ڈھال کر رات کے راہی کے نام سے بنایا۔ یہ فلم کراچی کے ایسٹرن اسٹوڈیوز میں بنائی گئی تھی۔ اس کے مصنف معروف افسانہ نویس ابراہیم جلیس تھے۔ ایسٹرن اسٹوڈیوز کے ساؤنڈ انجینئر اقبال شہزاد کی فلم سازی کی

کمال امروہی اپنی بیٹی رخسار کے ساتھ

حیثیت سے یہ پہلی فلم تھی۔ اس فلم کی ہیروئن ہندوستان سے آئی ہوئی اداکارہ ریحانہ تھیں۔ اس فلم کی تکمیل کے دوران میں ہی اقبال شہزاد نے فلم اسٹار ریحانہ سے شادی کرلی تھی۔ یہ شادی زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ ان دونوں سے ہمارے گہرے مراسم تھے۔ شادی قائم نہ رہنے کی وجوہات ایک بااعتماد دوست کی حیثیت سے میں نے بھی معلوم کرنا چاہیں تو ان دونوں نے الگ الگ اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔ جب علیحدگی ہوچکی تھی تو پھر انہیں کوئی مشورہ دینا لا حاصل تھا۔

اقبال یوسف نے جب فلم دال میں کالا بنائی تو وہ بذاتِ خود فلم کی ہیروئن بہار بیگم کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔

جس وقت اقبال یوسف فلم تم ملے پیار ملا بنائی اس کے دوران میں محمد علی اور زیبا بیگم کی شادی ہوگئی۔

اقبال یوسف سے ہم نے کہا۔ ”بھائی تم جس طرح فلمی ہیروئنوں کی شادیاں کروا رہے ہو اس سے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی بھی ہیروئن غیر شادی شدہ نہیں رہے گی۔“

انہوں نے کہا۔ ”یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے اب یہ احساس ہورہا ہے کہ میں فلم ساز اور ہدایت کار بننے کے بجائے اگر شادی کا دفتر کھول لیتا تو بہت کامیاب ہوتا۔“

ہم نے کہا۔ ”ہمارا یہ خیال درست ہے کیونکہ تمہاری کروائی ہوئی شادی ختم بھی ہوجاتی ہے اس لیے لوگ بار بار آئیں گے اور کاروبار خوب چل پڑے گا۔“

فلم رات کے راہی نے اوسط درجے کی کامیابی حاصل کی تھی۔ رات کے راہی بنیادی طور پر ایک جاسوسی فلم تھی جسے ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔

اقبال یوسف کی دوسری فلم زمانہ کیا کہے گا بھی ایک جاسوسی فلم تھی۔ اس کے مصنف حسرت لکھنوی اور نغمہ نگار فیاض ہاشمی تھے۔ موسیقی مصلح الدین نے مرتب کی تھی۔ اس کے اداکاروں میں شمیم آرا اور کمال شامل تھے۔ اسی فلم کے دوران میں ان کی شادی بہار بیگم کے ساتھ ہوگئی۔ آغاز میں تو اس شادی کو خفیہ رکھا گیا لیکن بعد میں سب کو بتادیا گیا۔ ایس ایم یوسف اس شادی سے خوش نہیں تھے۔ اس شادی کی وجہ سے باپ اور بیٹے میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ یہاں تک کہ ایس ایم یوسف نے اخبارات میں یہ اعلان شائع کروادیا کہ ان کا اور ان کے خاندان کا اقبال یوسف سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن خون کا رشتہ اس طرح تو ختم نہیں ہوسکتا۔ کچھ عرصے بعد حالات معمول پر آگئے۔ بہار بیگم سے اقبال یوسف کے دو بیٹے ہوئے جن کی پرورش انہوں نے تنہا کی۔ دونوں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ آج کل وہ امریکا میں ہیں۔

اقبال یوسف زندہ دل آدمی تھے لیکن اس کے ساتھ ہی رومانٹک طبیعت کے مالک بھی تھے۔ انہوں نے کئی ہیروئنوں کے ساتھ رومانس کیا لیکن چپکے چپکے۔ کبھی کبھی ایسی باتیں منظرِ عام پر بھی آجاتی ہیں۔ سندھ سے ایک خوش شکل دوشیزہ ماہ پارہ فلموں میں اداکاری کرنے کے لیے لاہور آئیں تو اقبال یوسف کے دل کو بھا گئیں۔ وہ فلموں کی ہیروئن تو نہ بن سکیں البتہ اقبال یوسف کی ہیروئن ضرور بن گئیں۔

اقبال یوسف بہت تیزی سے کام کرتے تھے۔ مختصر عرصے میں انہوں نے کئی فلمیں بنائیں۔ ماہ پارہ سے اقبال یوسف کی شادی کو کچھ عرصہ پردۂ راز میں رکھا گیا لیکن 1984ء میں ان دونوں کی شادی کا اعلان ہوگیا۔ ماہ پارہ سے شادی بھی ایس ایم یوسف صاحب کو پسند نہیں آئی اور باپ بیٹے میں ایک بار پھر اختلافات کی خلیج حائل ہوگئی۔

بہار بیگم نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی زیرِ تکمیل فلمیں مکمل ہونے کے بعد اداکاری ترک کردیں گی۔ انہوں نے کچھ عرصہ فلمی دنیا سے قطع تعلق بھی کیا لیکن اقبال یوسف کی ماہ پارہ سے شادی کے بعد گھر چلانے اور بچوں کی پرورش کرنے کے لیے انہیں دوبارہ اداکاری کرنی پڑی۔ اس بار انہوں نے کریکٹر ایکٹریس کے طور پر کام کیا اور بہت کامیاب رہیں۔

1964ء میں اقبال یوسف کی ذاتی فلم نہلے پہ دہلا کی



معروف بالی ووڈ اداکار رجنی کانت

نمائش ہوئی۔ نیلو، کمال، ناصرہ ساقی اور رنگیلا شامل تھے۔ اس فلم کو درمیانے درجے کی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

سید کمال نے راج کپور کی فلم میرا نام جوکر سے متاثر ہوکر جوکر کے نام سے ایک فلم بنانے کا ارادہ کیا۔ کمال ہوش سنبھالتے ہی راج کپور کے دلدادہ ہوگئے تھے۔ ان کے چہرے کی وضع قطع بھی راج کپور سے مشابہ تھی۔ انہیں خود بھی گمان تھا کہ ان کی شکل راج کپور سے ملتی ہے۔ جب بھی موقع ملتا وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر راج کپور جیسے پوز بناتے۔ اسی طرح کا ہیٹ اور لباس پہن کر قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر ہر زاویے سے اپنا جائزہ لیتے۔ ان کے یار دوستوں نے بھی تصدیق کی اور اس بات کی تائید کی کہ واقعی وہ راج کپور کے ہم شکل ہیں۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنادیتے ہیں

لہٰذا کمال کو بھی یقین ہوگیا تھا کہ وہ راج کپور کے ہم شکل ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ ادکاری کے شوق میں بمبئی بھی گئے تھے۔ میرٹھ سے وہ ایک ڈسٹری بیوٹر کا تعارفی خط لے کر گئے تھے جس کی وجہ سے ان کی فلمی شخصیات تک رسائی ہوگئی تھی۔

انہیں سب سے زیادہ اشتیاق راج کپور اور نرگس سے ملنے کا تھا۔ انسان اگر کوشش کرے تو کیا نہیں ہوسکتا۔ ان کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اللہ نے بھی ان کی سن لی اور ان کی راج کپور سے ملاقات ہوگئی۔ اتفاق سے نرگس بھی اس وقت موجود تھیں۔ اس طرح ان کی دونوں تمنائیں پوری ہوگئیں۔ اس ملاقات کے بعد کمال نے مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ فلموں میں اداکاری ضرور کریں گے۔ راج کپور کے انداز میں اداکاری کرکے راج کپور کی طرح نام پیدا کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جب اداکاری کا آغاز کیا تو فیصلہ کیا کہ وہ فلمسازی بھی کریں گے اور کوشش کریں گے کہ راج کپور کے انداز کی فلمیں بنائیں۔ وہ ہم سے اکثر پوچھا کرتے کہ کیا میں راج کپور کی طرح اداکاری کرتا ہوں۔

ہم نے کہا۔ ”ہاں، تم راج کپور ہی کی طرح اوور ایکٹنگ کرتے ہو۔“ یہ ان کا کمزور پہلو تھا جس پر ہم دونوں کا اکثر اختلاف ہوتا رہتا تھا۔

ایک دن وہ ہمارے پاس آئے اور کہا۔ ”سوفی، بس اب تم مجھے ایک کہانی لکھ دو۔“

”کوئی کہانی ہے تمہارے پاس؟“ ہم نے پوچھا۔

”ہاں، فلم کا نام جوکر ہوگا۔ اس سے تمہیں اندازہ ہوگا کہ فلم کی کہانی کیا ہوگی۔“

”مگر تم سرکس اور سرکس میں کام کرنے والے اداکار کہاں سے لاؤ گے؟“

”سرکس تو پاکستان میں کئی ہیں۔ ان سے ٹریننگ لینے کا بندوبست بھی ہوجائے گا۔ بس تم ایک مہینے کے اندر مجھے اسکرین پلے بنادو۔ میں سرکس کے بارے میں ساری معلومات حاصل کرلوں گا۔ ایک سرکس تو اپنے لاہور میں بھی ہے لکی ایرانی سرکس۔ جتنی دیر میں اسکرپٹ تیار ہوگا میں سرکس کا تمام بندوبست کرلوں گا۔ مجھے تو کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ جوکر کا بہروپ بدل کر جوکروں جیسی حرکتیں کرنے میں کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔“

ہم نے کہا۔ ”تمہیں جوکری کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمہیں تو جوکر کا بہروپ بھرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ میاں نے تمہیں خود ہی جوکر بنادیا ہے۔“ کمال کسی بات کا برا نہیں مانتے تھے نہ ہی وہ یہ کہتے کوئی اور ان کی بات

کا برا مان سکتا ہے۔

کمال کے مزاج میں بچپنا بہت تھا۔ وہ جو کام سوچتے تھے چاہتے تھے کہ فوراً پورا ہو جائے۔ انہوں نے فوراً اٹھ کر کاغذ پنسل سنبھالی اور میز پر بیٹھ گئے۔

''آؤ، پہلے یہ سوچیں کہ فلم کی کاسٹ کیا ہوگی؟''

''بھئی تم ہیرو ہوگے اور رانی ہیروئن...... باقی کاسٹ کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔''

ان دنوں کمال اور رانی کا رومانس چل رہا تھا۔ کمال ہر ہفتے ہم سے پوچھتے تھے۔ ''سوفی، یہ بتاؤ کہ کیا میں رانی سے شادی کرلوں؟''

''یار تم ہر ہفتے مجھ سے یہ سوال کیوں کرتے ہو؟''

''اس لیے کہ میں اس بارے میں فیصلہ نہیں کر پارہا۔ اگر میں نے رانی سے شادی کرلی تو خاندان والے کیا کہیں گے۔ ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے ایکٹریس سے شادی نہیں کی۔''

''تمہارے خاندان میں کبھی کوئی اداکار بھی تو نہیں بنا تھا۔''

''اور ہمارے بچوں کا کیا ہوگا؟ دنیا انہیں کن نظروں سے دیکھے گی؟''

ہم نے تنگ آکر کہا۔ ''دیکھو، تم اب کوئی فیصلہ کرلو آخری فیصلہ، یہ ہر ہفتے کا سوال کب تک کرتے رہوگے۔ سنا نہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے اگر تمہیں رانی سے واقعی محبت ہے تو سب کچھ بھول جاؤ ورنہ پھر رانی کو بھول جاؤ۔''

رانی اور کمال کی یہ رومانی داستان کئی سال تک چلتی رہی۔ ہر سال جب کمال اپنی سالگرہ مناتے تھے تو دوستوں میں خبر گرم ہو جاتی تھی کہ اس سالگرہ پر کمال اپنی اور رانی کی شادی کا اعلان کریں گے۔ شاید رانی کے دل میں بھی یہی سوال پیدا ہوتا ہوگا مگر کمال نے یہ سسپنس کئی سال تک قائم رکھا۔

اس کی حقیقت کا اس وقت علم ہوا جب ایک دن کمال کی شادی کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی۔ ہمیں تو معلوم تھا کہ وہ ایک اچھے گھرانے میں شادی کررہے ہیں لیکن کسی اور کو یہ علم نہیں تھا۔ جس روز یہ خبر شائع ہوئی صبح سویرے ہی رانی ہمارے گھر آئیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر منہ سے وہ کچھ نہیں بولیں۔ دراصل ہم ان دونوں کے ہمراز تھے اور دونوں اپنے دل کی باتیں ہمیں سناتے رہتے تھے۔ رانی خاموش تھیں۔ ہم نے بھی کوئی سوال کیا نہ تسلی دی۔ کچھ دیر بعد وہ چائے پی کر رخصت ہوگئیں۔ وہ تو کچھ نہیں بولیں مگر ان کے والد حق صاحب نے ہم سے کہا۔ ''آفاقی صاحب! میں نے اس کو ہمیشہ سمجھایا مگر اس کے سر پر تو پیار کا بھوت سوار تھا۔''

اس روز شام کو ہم اسٹوڈیو گئے تو رانی ایک فلم کی شوٹنگ کررہی تھیں۔ شوٹنگ میں وقفہ ہوا تو وہ ہمارے پاس آئیں۔ ہم سنبھل کر بیٹھ گئے کہ اب یہ شکایتوں کا پلندا ہمیں سنائیں گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ انہوں نے صرف ایک فقرہ کہا۔

''آفاقی صاحب، دیکھا اپنے دوست کو۔'' اس کے بعد اس موضوع پر ہماری کبھی گفتگو نہیں ہوئی۔

فلم جوکر کا افتتاح بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ کمال کے سارے دوست وہاں موجود تھے۔ کمال نے جان بوجھ کر اپنی سالگرہ کے دن فلم کا افتتاح کیا تھا۔ یہ بھی ان کی کفایت شعاری کا ایک ثبوت تھا۔ جوکر کی شوٹنگ بھی گنڈے دار ہوتی تھی البتہ ان کی سالگرہ کے دن شوٹنگ ضرور ہوتی تھی۔ اس طرح پانچ سال کا عرصہ گزر گیا۔ جوکر پانچ سال تک بنتی رہی۔ ہر بار جب شوٹنگ کا پروگرام بنتا تھا تو اقبال یوسف ہم سے کہتے تھے۔ ''آفاقی صاحب، آپ تو کہانی بھول بھی گئے ہوں گے۔ میں تو خود بھول گیا ہوں۔ اب اسکرپٹ پڑھوں گا تو کہانی یاد آجائے گی۔''

کمال کی فلم جوکر میں ایک کہانی تھی جو دیکھنے والوں کو متاثر کرتی تھی۔ راج کپور نے اپنی فلم پر بہت روپیا صرف کیا تھا۔ کمال کی فلم کی لاگت اس سے بہت کم تھی۔ اگر زیادہ سرمایہ لگایا جاتا تو یہ فلم اور زیادہ کامیاب ہوتی۔

اقبال یوسف کی بات سے بات کہاں پہنچ گئی۔ دراصل اقبال یوسف اور کمال کی بہت گہری دوستی تھی۔ اقبال یوسف کی اکثر فلموں میں ہیرو کا کردار کمال ہی کرتے تھے۔

اقبال یوسف کی گھریلو زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی۔ بہار نے وعدے کے مطابق اداکاری ترک کردی تھی لیکن اچانک ماہ پارہ ایک بلا بن کر نازل ہوئیں اور اقبال یوسف اور بہار کی زندگیوں میں خزاں آگئی۔

بہار نے ایک بہت اچھی گھریلو بیوی کا کردار ادا کیا تھا۔ سچ پوچھیے تو ہم نے اپنے دوستوں کی ایکٹریسوں سے شادیوں کا انجام خراب ہی دیکھا لیکن اس میں اداکارہ بیوی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ انہوں نے ایک وفا شعار گھریلو بیوی بن کر دکھایا۔ ہمارے دوست حسن طارق نے عشق کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایمی مینوالہ سے شادی کی ایمی نے ایک مثالی گھریلو



بیوی بن کر دکھا دیا بعد میں طارق صاحب رانی کی طرف راغب ہوگئے اور رانی سے شادی کرلی۔ رانی نے بھی خلاف توقع ایک گھریلو بیوی کا کردار بہت خوبی سے ادا کیا مگر کچھ عرصے بعد دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔ اقبال شہزاد کی ریحانہ سے شادی کے بعد بھی ہم نے یہی دیکھا۔ اس سے پہلے اداکارہ یاسمین نے اداکارہ ہونے کے باوجود ایک گھریلو بیوی بن کر دکھایا۔ بہار اور اقبال یوسف کی شادی کے بعد بہار نے بھی یہ ثابت کردیا کہ ایک اداکارہ بہترین مثالی بیوی ہوسکتی ہے۔ نیر سلطانہ اور درپن صاحب کی شادی کو دیکھ کر بھی رشک آتا تھا۔ سنتوش کمار اور صبیحہ خانم کی شادی بھی بہت کامیاب رہی۔ ان شادیوں کی کامیابی میں اداکاراؤں کا کردار بہت اچھا رہا۔

ہم نے تو یہی دیکھا کہ خلاف توقع اداکارائیں بہت اچھی بیویاں ثابت ہوئیں۔ اگر علیحدگی ہوئی تو اس میں بھی قصور ان کا نہیں تھا۔ انہوں نے تو آخری دن تک ایک بیوی کی حیثیت سے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیے۔ قصوروار ان کے شوہر ہی نکلے۔

ایس ایم یوسف کو بیٹے کی دونوں شادیوں پر اعتراض تھا جس کا انہوں نے قطع تعلق کرکے عملی ثبوت بھی فراہم کیا۔

اقبال یوسف کی پیشہ ورانہ زندگی کامیاب تھی۔ انہوں نے ایس ایم یوسف کے برعکس مختلف مضوعات پر فلمیں بنائیں جو کامیاب بھی ہوئیں۔ تم ملے پیار ملا، کے مصنف ذاکر حسین اور موسیقار ناشاد تھے۔ یہ ایک کامیاب فلم تھی جس کی موسیقی بہت پسند کی گئی۔ آج بھی اس کے گانے بہت لطف دیتے ہیں۔ اس فلم کی کہانی ہالی ووڈ کی مشہور فلم ہالی ڈے اِن سے متاثر ہوکر لکھی گئی تھی۔ گلوکارہ مالا کے شوہر طالش بٹ کی فلم نائٹ کلب کے ہدایت کار بھی اقبال یوسف تھے۔ اس فلم کی موسیقار مالا کی بہن شمیم نازلی تھیں۔ اس کے مصنف رشید ساجد تھے۔ سید کمال اور شمیم آرا نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ یہ ایک جاسوسی فلم تھی۔ اس کے بعد اقبال یوسف کی ذاتی فلم ہل اسٹیشن ریلیز ہوئی۔ اس میں بھی مرکزی کردار شمیم آرا اور کمال نے ادا کیے تھے۔ مصنف اور نغمہ نگار تسلیم فاضلی تھے۔ موسیقار ناشاد تھے جنہوں نے اقبال یوسف کی اکثر فلموں کی موسیقی ترتیب دی تھی اور بہت اچھی دھنیں بنائی تھیں۔

صورت اور سیرت کے منصف خورشید اللہ تھے جو عین جوانی میں وفات پاگئے۔ اس فلم کے نغمہ نگار تسلیم فاضلی اور موسیقار ایم اشرف تھے۔ سدھیر، محمد علی، ممتاز، وحید مراد، تشو اس کے اہم کردار تھے۔

انگریزی فلم گاڈ فادر ایک حسین ناول ہے۔ اسے فلم کے سانچے میں ڈھالا گیا تو ہالی ووڈ کے معروف اداکار مارلن برانڈو نے گاڈ فادر کا یادگار کردار ادا کیا تھا جو کہ ان کی زندگی کی بہترین فلم تسلیم کی جاتی ہے۔ اس فلم کو اقبال یوسف نے ان داتا کے نام سے بنایا تھا۔ اس فلم میں مرکزی کردار سدھیر نے اور ان کے بیٹے کا کردار محمد علی نے کیا تھا۔ سلطان راہی، مصطفیٰ قریشی اور آغا طالش بھی اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ آسیہ، ممتاز اور نجمہ محبوب نے بھی اس فلم میں بہت اہم کردار ادا کیے تھے۔

1977ء میں اقبال یوسف کی فلم جینے کی راہ ریلیز ہوئی۔ اسی سال اقبال یوسف کی ایک اور فلم جاسوس نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ زرینہ چکوری، غلام محی الدین اس فلم کے مرکزی کردار تھے۔

1980ء میں ان کی فلم خدا اور محبت پیش کی گئی۔ اس کے فلم ساز ملک بلو تھے۔ اور مصنف بھی خورشید اللہ تھے۔ موسیقی ناشاد نے بنائی تھی۔ اداکاروں میں بابرہ شریف، رانی، محمد علی، وحید مراد، لہری نمایاں اداکار تھے۔

1981ء میں اقبال یوسف کی فلم ٹکراؤ ریلیز ہوئی۔ اس کے فلم ساز ایس ایم یوسف تھے۔ کہانی خورشید اللہ نے لکھی تھی۔ موسیقار طافو تھے۔ اداکاروں میں شبنم، نیر سلطانہ، وحید مراد تھے۔

اقبال یوسف نے اکثر فلمیں بڑی کاسٹ کے ساتھ بنائیں اور ان کی خوش مزاجی کی وجہ سے سب اداکار ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے اور فلم ساز بھی سرمایہ لگانے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔

1982ء میں ان کی فلم پاسبان کی نمائش ہوئی جس کے مصنف رشید ساجد اور موسیقار نذیر علی تھے۔ قتیل شفائی اس فلم کے نغمہ نگار تھے۔ اداکاروں میں بابرہ شریف، چکوری، سلطان راہی، غلام محی الدین، قوی خان، بدر منیر اور مصطفیٰ قریشی نمایاں تھے۔ 1984ء میں اقبال یوسف کی فلم آگ کا سمندر نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اس کے مصنف رشید ساجد اور موسیقار امجد بوبی تھے محمد علی، رانی، ممتاز، نمو، فردوس، صاعقہ، اسلم پرویز، شاہد، ساقی اور ادیب وغیرہ اس میں نمایاں اداکار تھے۔ اس فلم میں بھی اقبال یوسف نے اپنی عادت کے مطابق بڑے بڑے نامور

فن کاروں کو اکٹھا کرلیا تھا۔ پاکستان کے کسی اور فلم ساز یا ہدایت کار نے اپنی فلموں میں اتنے نامور فن کار اکٹھے نہیں کیے تھے۔ یہ اقبال یوسف کی نمایاں خوبی تھی کہ وہ بہت بڑی کاسٹ کے ساتھ فلم بناتے تھے۔

وحید مراد کی فلم ہیرو ابھی نامکمل تھی کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ اس فلم کی کہانی اور مکالمے وحید مراد نے خود لکھے تھے اور نغمات تسلیم فاضلی نے تحریر کیے تھے۔ ایم اشرف اس کے موسیقار تھے۔ اداکاروں میں بابرہ شریف، ندیم، ممتاز، وحید مراد، لہری، ساقی اور خود اقبال یوسف شامل تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وحید مراد کے بیٹے عادل مراد نے اس فلم میں چائلڈ اسٹار کے طور پر کام کیا تھا۔ اقبال یوسف نے اس نامکمل فلم کو مکمل کیا تھا لیکن یہ فلم کامیابی حاصل نہ کرسکی۔

اس کے بعد انہوں نے فلم ساز ریاض اختر کی فلم زلزلہ بنائی۔ اس کے ہدایت کار وحید مراد تھے۔ اداکاروں میں وحید مراد، رانی، سدھیر، سلطان راہی، آصف خان، ہمایوں قریشی، ادیب اور الیاس کاشمیری وغیرہ شامل تھے۔ مصنف رشید ساجد اور خورشید اللہ تھے۔

فلم ان داتا کی کامیابی سے متاثر ہوکر فلم ساز آفتاب زیدی نے سن آف ان داتا بنائی۔ اس کے اداکاروں میں سدھیر، بابرہ شریف، محمد علی، غلام محی الدین، قوی خاں، عارفہ صدیقی، شاہدہ منی اور آغا طالش شامل تھے۔ یہ بھی بہت بڑی کاسٹ تھی لیکن ناکام ہوگئی۔ اس کے بعد اقبال یوسف نے فلمساز غفار دانہ والا کے لیے فلم راز بنائی۔ اس فلم کی خصوصیت یہ تھی کہ کرکٹر محسن خان نے بھی اس میں اداکاری کی تھی۔ سلطان ارشد اس کے موسیقار تھے۔ محسن خان اس سے پہلے بمبئی میں بھی ایک فلم میں کام کرچکے تھے۔ اس فلم کے اداکاروں میں بابرہ شریف، معین اختر، مصطفیٰ قریشی نمایاں تھے۔ بدقسمتی سے یہ فلم بھی کامیاب نہیں ہوئی۔

مارچ 1995ء میں وہ معین اختر کی فلم خواہش کو انگریزی میں ڈب کروانے کے لیے لندن گئے تھے۔ وہاں ہارٹ اٹیک کی وجہ سے انتقال کرگئے۔ اقبال یوسف ایک ذہین، تخلیقی ذہن کے مالک تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر ان کے والد ایس ایم یوسف نے خصوصی توجہ دی تھی۔ انہوں نے پاکستانی فلمی صنعت میں نئے رجحانات پیدا کیے اور بہت اچھی رومانٹک اور جاسوسی فلمیں بنائیں۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ خلافِ عادت سنجیدہ ہوگئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ آنے والے دنوں نے انہیں لاشعوری طور پر متاثر کیا ہو۔ ان کی گھریلو ازدواجی زندگی نشیب و فراز اور حادثات سے متاثر ہوتی رہی جس کی وجہ سے وہ اپنے کام پر یکسوئی سے پوری توجہ نہ دے سکے۔

اقبال یوسف ایک کھلنڈرے، شوخ اور ہنستے مسکراتے ہوئے انسان تھے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ کسی چیز کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے وہ موقع ملتے ہی ہدایت کاری کے سلسلے میں والد ایس ایم یوسف سے علیحدہ ہوکر ہدایت کار بن گئے۔ ہم نے دونوں باپ بیٹوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ فرق یہ تھا کہ یوسف صاحب فلم بنانے کو ایک کاروبار، شوق اور عبادت سمجھتے تھے۔ ایک بلند مقام حاصل کرنے کے بعد بھی وہ فلموں کے بارے میں کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔ ہالی ووڈ کی فلموں کے اسکرپٹس کا ان کے پاس ایک ذخیرہ تھا۔ وہ ان پرانی کہانیوں میں سے اپنی فلموں کے لیے کردار اور واقعات تلاش کرتے رہتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ خالی وقت میں انگریزی اور اردو کے ناول پڑھ کر ان میں اپنی فلموں کے کردار اور سچویشنز کھوجتے رہتے تھے۔ ان کے دوستوں کا ایک مخصوص حلقہ تھا جو کہ ان کے یونٹ کے افراد پر مشتمل تھا۔ وہ فرصت کے اوقات میں فضول گپ شپ کرنے کے بجائے فلموں ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ فلم ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ ہر وقت فلموں کی دنیا میں گم رہتے تھے۔

اس کے برعکس ہم نے کبھی اقبال یوسف کو سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ انہیں دنیا بھر کی باتیں کرنے اور گپ شپ کرنے میں.... لطف آتا تھا مگر وہ کبھی اپنی فلموں کے کرداروں کے بارے میں سوچتے اور ان کے بارے میں دوستوں سے بات چیت کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔ فلموں سے ان کا صرف اتنا تعلق تھا کہ شوٹنگ کے وقت وہ سب کچھ بھول کر فلم کے سین فلمانے میں لگ جاتے تھے مگر سیٹ پر بھی ان کا رویہ ہنسی مذاق کا ہی ہوتا تھا۔ وہ اداکاروں کے ساتھ ان کے کرداروں کے بارے میں بھی سنجیدگی سے تبادلہ خیال نہیں کرتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ جب مصنف فلم کا اسکرپٹ لکھ کر انہیں دیتا تھا تو وہ اس کے ساتھ کبھی سنجیدگی سے ڈسکشن نہیں کرتے تھے جیسا کہ ہدایت کاروں کا طریقہ ہوتا ہے۔ ہم نے انہیں کبھی خود اپنی فلم کا اسکرپٹ بھی سنجیدگی سے پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔



شاید وہ دوسرے ڈائریکٹروں کی طرح ہوم ورک کرنے کے قائل نہیں تھے۔ جو سین فلمانے ہوتے تھے شوٹنگ کے دن ان ہی مناظر کو پڑھتے اور فلما لیتے تھے شاید پورا اسکرپٹ پڑھنے کی وہ ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے تھے اور نہ ہی مصنف کے ساتھ کہانی کے مناظر کے بارے میں بات چیت کرتے تھے۔ یہ ان کا لاابالی پن تھا یا خود اعتمادی۔ مصنف فلم کے منظر کے بارے میں جو تفصیل لکھتا تھا اقبال یوسف اس کو پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ منظر کو وہ اپنے انداز میں فلمایا کرتے تھے۔ ان کی فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ پر مری یا اور کہیں جانا ہوتو یوں لگتا تھا جیسے پکنک پر آئے ہوئے ہیں۔ ان کی آؤٹ ڈور شوٹنگ پر بہت لطف آتا تھا۔ لطیفہ بازی، فقرے بازی، ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری رہتا تھا مگر کیا مجال جو فلم کے مناظر یا اس کو پیش کرنے کے انداز کے بارے میں کوئی بات چیت ہوتی ہو۔ ان کی اس عادت کی وجہ سے بہت بڑے بڑے نامور اداکاروں کی موجودگی کے باوجود ان کی اداکاری متاثر نہیں کرتی تھی۔ افلاطون نے انسان کو حیوانِ مجلسی کہا ہے۔ اقبال یوسف اس کی عملی تصویر تھے۔ وہ ہر وقت دوستوں کے جمگھٹے میں رہنا اور ہنسنا بولنا پسند کرتے تھے۔ ہم نے انہیں کبھی تنہا اور کسی سوچ میں گم نہیں دیکھا۔ ان کی وفات وطن اور گھر بار سے دور لندن میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنے دوستوں کی محفلوں سے دور اور الگ تھلگ تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

☆☆☆

جب بالی وڈ کا تذکرہ ہوتا ہے تو بمبئی کے فلم اسٹاروں کی مقبولیت اور بے انتہا معاوضوں کا بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہندوستان کی بعض علاقائی فلمی صنعتوں خصوصاً تامل ناڈو کے فلم اسٹاروں کی تو باقاعدہ پرستش کی جاتی ہے۔ ان کے معاوضے شاہ رخ خان اور سلمان خان سے زیادہ ہیں۔ فلموں کی لاگت بھی زیادہ ہوتی ہے اور آمدنی بھی۔ ان کی یہ فلمیں ہندی، اردو اور دوسری زبانوں میں ڈب کرکے خوب دولت کمائی جاتی ہے۔ وہاں اب تک بھتہ اور تاوان کی بیماری پہنچی ہے یا نہیں لیکن ان کی مقبولیت اور دولت بالی وڈ کے فلم اسٹاروں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا نام رجنی کانت کا ہے۔ اس کی عمر 56 سال سے زائد ہے۔ سر گنجا ہے مگر شوٹنگ کے سوا عام زندگی میں وگ نہیں پہنتا لیکن رجنی کانت ایک بین الاقوامی شہرت کا حامل فلم اسٹار ہے۔ اس نے کچھ عرصہ قبل فلم شیوا بنائی تھی جس کی لاگت 80 کروڑ تھی۔ اس وقت تک بمبئی کی کسی فلم پر اتنا سرمایہ خرچ نہیں کیا گیا۔ اس دور میں بھارتی فلمسازوں کے لیے یہ ایک ریکارڈ رقم تھی۔ یہ تامل زبان میں رجنی کانت کی 100ویں فلم تھی اس لیے اس فلم میں رجنی کانت کے بجائے اپنے اصلی نام شیوا جی راؤ گائیکوار کے نام سے کام کیا تھا۔ یہ فلم یورپ، امریکا اور دوسرے ملکوں میں بھی کامیابی سے نمائش پذیر ہوئی تھی۔ رجنی کانت کی تازہ ترین فلم دی باس کی اٹلی کے علاوہ ناروے، ہالینڈ، آسٹریلیا میں بھی بیک وقت ریلیز کی گئی تھی۔ رجنی کانت کی فلمیں یورپ کے بڑے شہروں ہی میں نہیں دور دراز کے چھوٹے شہروں میں بھی چلتی ہیں اور پسند کی جاتی ہیں۔ رجنی کانت کی مقبولیت کے بارے میں پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ جوں جوں اس کی عمر بڑھ رہی ہے اس کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ تامل فلم بین اس کو مافوق الفطرت انسان سمجھ کر اس کی پرستش کرتے ہیں۔ سینما گھروں میں لگی ہوئی اس کی قدِ آدم تصاویر کو اس کے پرستار خوش قسمتی کی علامت کے طور پر دودھ سے نہلاتے ہیں۔ اپنی فلم روبوٹ کے لیے اس نے 150 کروڑ روپے معاوضہ وصول کیا ہے۔ اس کے علاوہ فلم کے منافع میں سے اس نے نصف منافع بھی وصول کیا۔ فلم روبوٹ اپنے عہد میں ہندوستان میں بننے والی سب سے مہنگی فلم تھی۔ ایشوریا رائے اس فلم کی ہیروئن تھیں۔ انہوں نے بذاتِ خود رجنی کانت کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس کو روبوٹ میں جو کردار سونپا گیا تھا وہ محض نمائشی تھا۔ اس فلم میں اس کو اداکاری کا برائے نام موقع ملا تھا۔ یہ فلم سپرہٹ ہوئی اور ساری دنیا میں مختلف زبانوں میں ڈب کرکے اسے ریلیز کیا گیا تھا اور اس فلم نے آمدنی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اس کی 100ویں فلم شیوا امریکا، کینیڈا، یورپ، سنگاپور، ملائیشیا، سری لنکا، جنوبی افریقا میں بھی بیک وقت نمائش کی گئی تھی۔ تامل ناڈو میں یہ فلم 270 پرنٹس کے ساتھ ریلیز کی گئی تھی۔ تامل ناڈو، کیرالہ اور کرناٹک میں بھی 140 پرنٹس بنا کر یہ فلم پیش کی گئی تھی۔ تین سو کے قریب تیلگو زبان میں بھی یہ فلم ڈب کی گئی تھی اور ان کو بھی ایک ہی ساتھ ریلیز کیا گیا تھا۔ ذرا سوچ کر بتایئے کہ کیا بالی وڈ کے سپر اسٹار کی فلموں کو بھی ایسی ہی پذیرائی ملتی ہے۔ رجنی کانت فلم میں کام کرنے کا منہ مانگا معاوضہ وصول

کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی منافع میں بھی حصے دار ہوتا ہے۔ شیوا کی ریلیز سے دو ہفتے پہلے ہی ایڈوانس بکنگ کی وجہ سے تمام سینما فل ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے 2005ء میں رجنی کانت کی فلم چندر مکھی نے 70 کروڑ کا بزنس کیا تھا۔ تقسیم کاروں کا کہنا ہے کہ رجنی کانت کی کوئی فلم ناکام نہیں ہوتی ہے اور یہ بھی ایک ریکارڈ ہے جس کی نظیر شاید ہی دنیا کا کوئی اور سپر اسٹار پیش کرسکتا ہو کیونکہ ہالی وڈ اور بالی وڈ کے بڑے بڑے نامور سپر اسٹارز کی فلمیں ناکامی کا منہ دیکھ چکی ہیں۔ اس کی ایک فلم باپا جس کی 2002ء میں نمائش ہوئی تھی حسب توقع کامیابی حاصل نہیں کرسکی تھی تو رجنی کانت نے فلم ساز اور تقسیم کار کو فلم کی لاگت اور منافع کے لیے ہرجانے کی رقم ادا کی تھی۔ اس کی فلمیں ہندوستانی (اردو ہندی) میں بھی ڈب کرکے ریلیز کی جا چکی ہیں۔ اس کی فلم کے ہدایت کار، کہانی نویس اور موسیقار سب سے زیادہ نامور اور معاوضہ لینے والے لوگ ہوتے ہیں تب ہی وہ اس فلم میں کام کرنے کی ہامی بھرتا ہے۔ اس کی فلم شیوا کے صرف ایک گانے پر ایک کروڑ سے زیادہ رقم خرچ ہوئی تھی۔ یہ فلم دنیا کی بہترین خام فلم پر بنائی گئی تھی۔ فلم شیوا کی کہانی اس کی دوسری فلموں سے زیادہ مختلف نہیں ہے مگر پیشکش کا انداز نیا اور انوکھا ہے۔ اس فلم کا ہیرو بھی اکیلا ہی دنیا کو بدل کر بہتر بنانا چاہتا ہے۔ جرمن (نازیوں) کے دور کی اس فلم میں کمل ہاسن نے ایک انڈین کا کردار ادا کیا تھا۔ ایک فلم میں اس نے ایک ایسے برہمن کا کردار کیا تھا جو درحقیقت قاتل ہے۔ وہ درجنوں افراد کو قتل کرچکا ہے لیکن اس کا نشانہ غلط کام کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اس مہم سے وہ اسکول، کالج، مندر وغیرہ تعمیر کرواتا ہے۔ صنعتیں لگاتا ہے تاکہ لوگوں کو روزگار مل سکے۔ اس فلم میں اس کی رومانی ہیروئن شریا ہے جس کی عمر چوبیس برس ہے جبکہ رجنی کانت 57 سال سے بھی آگے نکل گیا ہے لیکن اس کے باوجود فلم بینوں نے یہ فرق محسوس نہیں کیا بلکہ فلم کو بے انتہا پسند کیا۔ امیتابھ بچن اور شاہ رخ خان کے برعکس ہر شہر میں اس کے رجسٹرڈ فین کلب ہیں۔ جن کے اپنے باقاعدہ دفاتر اور عملہ بھی ہوتا ہے۔ رجنی کانت کی کئی فلموں نے دوسرے شہروں میں مقامی سپر اسٹارز کی فلموں سے زیادہ بزنس کیا۔ یوں کہیے کہ وہ جنوبی ہندوستان کی فلمی صنعت کا بے تاج بادشاہ ہے۔ اس کی بے پناہ مقبولیت کا یہ سبب بتایا جاتا ہے کہ امیتابھ تو فلمی تقاریب، فلمی میلوں میں جاتا ہے، انٹرویو دیتا ہے، ٹی وی پروگراموں اور اشتہاروں میں بھی نظر آتا ہے اس لیے اس کی شہرت بھی زیادہ ہے اور لوگ اس کو بڑا اداکار سمجھتے ہیں لیکن اس میں رجنی کانت جیسی کشش نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رجنی کانت نہ کسی تقریب میں شرکت کرتا ہے اور نہ ہی کسی اور جگہ نظر آتا ہے۔ دو تین سال کے بعد اس کی فلم ریلیز ہوتی ہے تو لوگ دیوانہ وار سینما گھروں میں اس کا درشن کرنے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ وہی طریقہ ہے جو دلیپ کمار نے اپنے عروج کے زمانے میں اپنایا تھا۔ وہ بھی تقاریب میں شریک ہوتا تھا نہ محفلوں یا پارٹیوں میں نظر آتا تھا۔ ایک سال میں وہ صرف ایک فلم میں کام کرتا تھا جس کا انتظار اس کے پرستار کیا کرتے تھے۔ رجنی کی مقبولیت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی اور ایسا زندہ یا مردہ اداکار نہیں ہے جسے دیکھ کر فلم بین خوشی اور تازگی محسوس کریں۔ اس کی فلم جس ملک میں بھی ریلیز ہوتی ہے فلم بین اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے چلنے پھرنے، بالوں کو جھٹکنے اور مفلر کو استعمال کرنے کا انداز سب کے دل کو بھاتا ہے۔ یوں کہیے کہ وہ ہر فلم بین کی خواہشوں اور تمناؤں کا مرکز ہے۔ اس کی اداکاری میں ایسی کشش ہے کہ فرانس کے مشہور ایکٹر اور ہدایت کار الین شبت نے جو بہت سی ..... کامیاب فلموں کا خالق ہے رجنی کانت کی ایک فلم سے پانچ منٹ کا ایک فائٹ سیکوئنس اس کی اجازت سے اپنی ایک فلم میں شامل کرلیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ شخص اداکار نہیں جادوگر ہے۔ یہ سین اس کی فلم متھو سے لیا گیا تھا۔ فرانس کی فلم کی ہیروئن اس کی فلم دیکھ کر وارفتہ ہوگئی تھی اور کئی بار اس نے فلم متھو دیکھی تھی۔

رجنی کانت کی زندگی بھی ایک افسانے کی طرح ہے۔ کرناٹک میں وہ ایک بس کنڈیکٹر کے طور پر ملازمت کرتا تھا۔ اس کی فلمی اداکاری کا آغاز 1974ء میں ہوا تھا۔ یہ ایک آرٹ فلم تھی جس میں معاوضہ بھی بہت کم ملا تھا لیکن اس فلم میں بھی رجنی کانت نے ناقابلِ فراموش نقوش چھوڑے تھے۔ اس نے ایک مختلف اور انوکھا انداز اپنایا تھا۔ اس کے قہقہہ مارنے کا انداز، ہوا میں جھومتے ہوئے بال، سگریٹ سلگانے کا انداز، چال ڈھال کا اپنا طریقہ سب نے پسند کیا تھا۔ ہندوستانی فلموں میں سگریٹ سلگانے کا انداز اشوک کمار نے ایسا پیش کیا کہ سب لوگ اسی انداز سے سگریٹ سلگانے لگے تھے۔ دلیپ کمار کی پیشانی پر بکھرے ہوئے بال اس کا مخصوص انداز تھا۔ رجنی کانت کو سپر اسٹار کی حیثیت



1980ء میں حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ دیوتا کی حیثیت اختیار کرگیا۔

وہ الگ تھلگ رہنے والا انسان ہے۔ تقاریب اور محفلوں میں کبھی نہیں جاتا۔ وہ صرف فلموں میں ہی نظر آتا ہے۔ شاید اسی لیے فلم بین اسے دیکھنے کے انتظار میں رہتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ جنوبی ہندوستان کا ایک کم گو اور گوشہ نشین اداکار سب کے دلوں کا تارا بن گیا ہے۔ چنائی میں اسے ون مین فلم انڈسٹری کہا جاتا ہے۔ اس نے بمبئی کی ایک فلم میں رحم دل لیکن اصول پرست جاگیردار کا کردار کیا تھا جس میں وہ انیل کپور کا بڑا بھائی بنا تھا۔ اپنی اداکاری کے انداز کے باعث وہ پوری فلم پر چھایا رہا حالانکہ فلم ختم ہونے سے کافی دیر پہلے اس کو ایک دشمن نے گولی مار کر ہلاک کردیا تھا۔

ہندوستان کی فلمی صنعت آج کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ ہندی، اردو فلموں کے علاوہ علاقائی زبانوں کا معیار بھی بلند ہے جنہیں بالی وڈ کے فلم ساز اجازت اور معاوضہ دے کر ری میک کرتے ہیں اور یہ فلمیں بے حد کامیاب بھی ہوتی ہیں۔ بھارت اور پاکستان کی فلمی صنعت میں زمین آسمان کا فرق ہے بلکہ پاکستان میں تو اِکّا دکّا ہی فلم بنتی ہے۔ ان حالات میں کون سے جی دار اور بلند حوصلہ پاکستانی فلم ساز، ہدایت کار اور اداکار اس کے مقابلے میں کھڑے ہونے میں کامیاب ہوں گے ورنہ ہماری فلمی صنعت تو اب پیدل چلنا بھی بھول چکی ہے۔ اسے کھڑا کرنے اور دوڑانے کا حوصلہ کون حوصلہ مند کرے گا؟

☆☆☆

ہندوستانی فلموں کو شعر و ادب کی لطافتوں سے مالا مال کرنے والے کمال امروہی نے اپنی بیٹی کے نام ایک خط لکھا تھا۔ "میری ایک ہی بیٹی ہے اور اس کا نام ہے رخسار۔ فردوسی ایک معمولی سی لڑکی کا نام ہے۔ اس نام کی لڑکیاں ہندوستان میں نہ جانے کتنی ہوں گی۔ کالی کالی، ٹھگنی ٹھگنی، گمنام گمنام لیکن میری بیٹی تو گلابی گلابی ہے، گوری گوری ہے، اونچی اونچی ہے اور ہندوستان کے ادبی مستقبل میں ایک مشہور و معروف ادیبہ۔"

اپنے بابا کی خواہش کا مان رکھتے ہوئے بیٹی نے اپنی ایک نظم میں اپنے ہونے کا اعلان کچھ اس طرح کیا ہے۔

"میں وہی ہوں، ہاں وہی رخسار ہوں اور امروہہ کے اس ادبی خانوادے کا ہر فرد بھی اب فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ جو رخسار ہے، وہ عجب سے خوب صورت نام کی مشہور ادیبہ، وہ ہماری ہی ہے اور اس کا پورا نام رخسار زہرا امروہی ہے۔"

بمبئی میں رہنے والی رخسار امروہی ان دنوں کراچی میں ہیں........ کراچی میں انہیں ددھیال کا پیار ملتا ہے۔ کہتی ہیں جب بہت اداس ہونے لگتی ہوں تو کراچی چلی آتی ہوں۔ اُس اپنی دیار سے، اِس اپنی دیار تک، محبت کے پھول..... لے کر آتی ہوں، محبت کا ٹانک لے کر جاتی ہوں۔ منور سعید انہیں پیار سے رخسار کے بجائے رونق سار کہتے ہیں۔ انہی کے گھر میں ہونے والی ایک ملاقات میں رخسار امروہی نے اپنی شاعری سنائی۔ بمبئی سے امروہہ اور لکھنؤ سے دہلی تک بکھرے ہوئے بچپن اور نوجوانی کے دنوں کو یاد کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے بابا کمال امروہی کے حوالے سے بھارتی میڈیا میں زیرِ گردش رہنے والی سنی سنائی باتوں، بنی بنائی غلط فہمیوں اور کچھ تلخ حقائق سے پردہ اٹھایا۔ اس انٹرویو کا خلاصہ قارئین سرگزشت بھی ملاحظہ کریں۔

سوال: آپ کا مجموعہ "دردِ دل لکھوں کب تک" میں شاعری کے ساتھ ساتھ کمال امروہی کے وہ خطوط بھی شامل ہیں جو آپ کے معصومانہ مکتوبات کے جواب میں وہ لکھتے رہے۔ قلم اور قرطاس کے ساتھ یہ رشتہ کب اور کیسے قائم ہوا؟ ہم نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

رخسار امروہی: میری پیدائش بمبئی کی ہے لیکن بچپن امروہہ میں گزرا۔ بابا بمبئی میں تھے تو بچپن میں ہی میں نے انہیں خطوط لکھنا شروع کردیے تھے۔ وہ بھی بڑی محبت سے میرے خطوط کے جواب دیتے تھے۔ میں نے یہ خطوط ایک عمر کی جمع پونجی کی طرح سنبھال کر رکھے ہیں۔ کبھی کوئی خط، کارڈ یا تصویر ضائع نہیں ہونے دی۔ تیرہ سال کی عمر میں بمبئی آگئی تھی۔ شاعری کا آغاز 1977ء میں کیا۔ ایک فلم کا گانا بھی لکھا لیکن شادی کے بعد کامیاب بیوی اور ذمے دار ماں بننے کی خاطر قلم کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔ 1993ء میں بابا کے انتقال کے بعد چچا جون ایلیا نے میرے ہاتھ میں دوبارہ قلم تھما دیا لیکن اس دوران جو کچھ لکھتی تھی کہیں چھپا دیتی تھی پھر ماموں کا اصرار بڑھ گیا جو کچھ لکھا ہے اسے شائع کیا جائے۔ سو شاعری اور بابا کے خطوط کی شکل میں ایک کتاب کی صورت نکل آئی۔

سوال: آپ نے تو شاعری میں دل لگا لیا ہے، بچے

کیا کرتے ہیں؟

رخسار امروہی: میری بیٹی تعبیر اور بیٹا وسیم دونوں جوان ہو چکے ہیں۔ میں نے انہیں اپنے اپنے شعبے کی کھلی فضاؤں میں اڑنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ تعبیر کا اپنا بیوٹی سیلون ہے، وہ اپنے کام سے بہت خوش ہے جبکہ وسیم نے اپنے نانا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے پروڈکشن ہاؤس کھول لیا ہے۔ فلم بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

سوال: آپ کی کتاب میں چھپنے والے خطوط سے لگتا ہے کہ کمال امروہی اپنی اہلیہ آل زہرا محمودی اور تینوں بچوں یعنی تاجدار، شاندار اور رخسار سے بہت محبت کرتے تھے۔ بیچ میں مینا کماری کیسے آگئیں؟

رخسار امروہی: یہ غالباً 1949-50ء کی بات ہے۔ بامبے ٹاکیز کی فلم محل ریلیز ہو چکی تھی۔ وہ ہندوستان کی پہلی سسپنس فلم تھی۔ بابا اس وقت اپنا مقام حاصل کر چکے تھے۔ شہرت اور دولت کی بھی کوئی کمی نہ تھی جبکہ مینا کماری جنہیں ہم چھوٹی امی کہتے ہیں۔ انہیں اس وقت تک کوئی نہیں جانتا تھا۔ اسی دوران بابا کو اپنی ایک اور فلم دائرہ کے لیے کسی نئے چہرے کی تلاش تھی جو مینا جی سے ملاقات کا سبب بنی۔ فلم کے دوران ہی دونوں میں پیار ہو گیا اور نوبت نکاح تک جا پہنچی۔ اس کے باوجود دونوں ایک ساتھ نہیں رہتے تھے لیکن مینا جی کو جب ان کے والد نے گھر سے نکال دیا تو وہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر کمال امروہی کے گھر آ گئیں اور اگلے دن اخباروں میں خبر شائع ہوئی کہ کمال امروہی نے مینا کماری سے شادی کر لی۔

سوال: مینا کماری کے ساتھ شادی پر آپ کی والدہ اور آپ تینوں بچوں کا کیا ردِ عمل تھا؟

رخسار امروہی: ہم تو بہت چھوٹے تھے لیکن والدہ کو اندازہ ہو گیا تھا بابا نے ایک اور شادی کر لی ہے لیکن وہ بہت صابر و شاکر اور اپنے شوہر سے پرستش کی حد تک محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے ہمیں بھی ہمیشہ یہی تلقین کی کہ دیکھو بیٹا تمہارے بابا تم سے بہت محبت کرتے ہیں اب اگر انہیں کوئی اور بھی اچھا لگے تو ہم سب کو اسے عزیز رکھنا چاہیے کیونکہ وہ تمہارے بابا کو عزیز ہے۔ ایک بار جب مینا جی بیمار تھیں تو میری والدہ مجھے اپنے ساتھ لے کر امروہہ سے ان کی عیادت کے لیے بمبئی چلی آئی تھیں۔ مجھے یاد ہے انہوں نے چھوٹی امی کو اپنی گھڑی اتار کر دی تھی اور کچھ پیسے بھی دیے تھے کہ نوکروں میں بانٹ دیں۔ جواب میں چھوٹی امی نے ہمیں ہمیشہ پیار دیا اور کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے لگے کہ وہ ہماری امی نہیں ہیں۔

سوال: ایک دوسرے سے محبت اور باہمی احترام کا جب یہ عالم تھا تو دوریاں اور فاصلے کیسے پیدا ہوئے؟

رخسار امروہی: میرے بابا، چھوٹی امی (مینا کماری) کے آئیڈیل تھے۔ بابا نے بھی ان سے محبت کی لیکن شادی سے پہلے یہ شرط رکھ دی تھی کہ اگر تمہیں میری بیوی بن کر زندگی گزارنی ہے تو فلموں کو چھوڑ کر آؤ۔ اس وقت محبت میں سرشار مینا جی نے یہ شرط مان لی تھی لیکن بہت سی فلموں کی کامیابی کے بعد وہ اپنے اندر کی اداکارہ کو نہ دبا سکیں اور بضد ہوئیں کہ وہ فلموں میں کام کیے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ بابا نے ان کی خواہش کا احترام کیا لیکن کچھ نام نہاد ہمدردوں نے دونوں کے بیچ آہستہ آہستہ بداعتمادی کی ایسی دیوار کھڑی کر دی جسے چاہتے ہوئے بھی دونوں کبھی گرا نہ سکے اور ایک دوسرے سے ملتے رہنے کے باوجود زندگی الگ الگ ہی بسر کی۔

سوال: علیحدگی یا طلاق؟ کہا جاتا ہے کہ کمال صاحب نے مینا کماری کو باقاعدہ طلاق دے دی تھی؟

رخسار امروہی: یہ سراسر جھوٹ ہے، بہتان ہے کہ میرے والد کمال امروہی نے چھوٹی امی کو طلاق دے دی تھی۔ مینا جی نے آخر دم تک کمال امروہی کو ہی اپنے سر کا تاج رکھا۔ میں کہتی ہوں جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ کوئی ثبوت تو لائیں۔ طلاق نامہ تو دکھائیں، چھوٹی امی آخر وقت تک مہ جبیں کمال کہلانے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔

سوال: کیا یہ سچ ہے کہ مینا کماری، کمال امروہی کے تلخ رویّے کی وجہ سے شراب نوشی کرنے لگی تھیں؟ ایک الزام یہ بھی ہے کہ کمال صاحب نے مینا جی کے ہاں بچہ نہیں ہونے دیا؟

رخسار امروہی: مینا جی نے فلموں کی طرح حقیقی زندگی میں بھی مظلومیت کی چادر اوڑھ لی تھی۔ ایک آدمی جو خود نشہ نہ کرتا ہو، اپنی بیوی کو نشے کی جانب کیوں راغب کرے گا۔ رہی بات بچہ نہ ہونے کی تو سچ یہ ہے کہ چھوٹی امی خود ہی بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے اپنے الفاظ تھے کہ میں بچے پیدا کرنے والی مشین بن کر گھر میں نہیں رہنا چاہتی۔ انہوں نے بابا کی منشا کے برخلاف دو بار اسقاطِ حمل کروایا۔ بابا نے تو اپنے ہونے والے بچے کا نام تک سوچ رکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ بچہ ہوا تو اس کا نام جہاں دار ہوگا۔

سوال: اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ فلم پاکیزہ مینا کماری کے انتقال کی وجہ سے کامیاب ہوئی؟ لوگوں نے مینا جی کی ہمدردی میں اس فلم کو دیکھنا شروع کیا؟

رخسار امروہی: یہ بھی حاسدین کی پھیلائی ہوئی خبریں ہیں۔ پاکیزہ کی بے پناہ کامیابی پر حسد کرنے والوں نے کہا کہ یہ فلم مینا جی کے انتقال کی وجہ سے چلی کیونکہ یہ ان کی آخری فلم تھی۔ فلم کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کیا تین دن میں ہو جاتا ہے؟ جبکہ اس وقت ذرائع ابلاغ آج کی طرح اتنے تیز ترین بھی نہیں تھے۔ اچھی فلم کسی کے جینے یا مرنے کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہاں میں یہ غلط فہمی بھی دور کر دوں کہ مینا جی کی آخری فلم پاکیزہ نہیں تھی بلکہ گومتی کے کنارے تھی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ پاکیزہ ان کے انتقال کی وجہ سے ہٹ ہوئی تو پھر گومتی کے کنارے تو سپر ہٹ ہونی چاہیے تھی۔

مینا کماری ہندوستان کی صفِ اول کی اداکارہ تھیں۔ انہوں نے کئی فلموں میں یادگار اداکاری کی اور بے شمار ایوارڈز سمیٹے۔ جو دنیا کو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ مینا کماری اپنے گھر والوں کے رویّے سے بے زار تھیں جو انہیں سونے کا انڈا دینے والی مرغی سمجھتے تھے۔ مینا کماری سب کچھ ہونے کے باوجود تنہا تھیں۔ کوئی ان کا ہمدرد، ہمراز نہیں تھا جس کے سامنے اپنا دکھ درد بیان کر کے وہ دل کا بوجھ ہلکا کر سکتیں۔ وہ ایک ایسی شخصیت کی حامل تھیں جو الجھی ہوئی تھی، نہ صرف شعر و شاعری پسند کرتی تھیں بلکہ خود بھی ایک شاعرہ تھیں۔ ایک ایسی حساس اداکارہ جو گھر والوں کی خود غرضی اور اپنی بے بسی اور تنہائی کی وجہ سے کچھ اور زیادہ دکھی اور حساس ہو گئیں۔ اپنے گھر والوں کی رکاوٹوں اور پابندیوں کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتی تھیں اس لیے انہوں نے فلمی اداکاروں کے ساتھ محبت کے رشتے جوڑنے شروع کر دیے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی شہرت اور حسن کے دیوانوں میں سے کوئی ایک شخص ان کے ساتھ شادی کر کے انہیں زندگی کی خوشیاں دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انہیں فلمی دنیا میں بے لوث اور سچی محبت کرنے والا کوئی نہیں ملا نتیجتاً غم غلط کرنے کے لیے وہ مے نوشی کرنے لگیں۔ ایک بار وہ بیمار ہوئیں تو کمال امروہی ان کی عیادت کے لیے آئے۔ کمال امروہی شادی شدہ تھے لیکن ان کی بیوی بچے امروہہ میں رہتے تھے۔ کمال امروہی اس وقت ایک بہت اعلیٰ درجے کے فلمی مصنف اور ہدایت کار تھے۔ فلمی دنیا میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے سب معترف تھے۔ وہ محل جیسی یادگار آرٹسٹک فلم کے مصنف اور ہدایت کار تھے۔ برصغیر میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ کمال امروہی مینا کماری کے حالات اور صلاحیتوں سے متاثر تھے۔ اس بیماری کے دوران میں کمال امروہی مسلسل ملاقاتوں اور شعر و ادب کی باتوں سے... بہت متاثر ہوئے یہاں تک کہ یہ دوستی محبت میں تبدیل ہو گئی۔ رفتہ رفتہ یہ ملاقاتیں رنگ لائیں اور کمال امروہی نے مینا کماری کے ساتھ شادی کی خواہش کا اظہار کیا جو مینا کماری نے خوشی خوشی قبول کر لیا۔ ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ یہ خبر چھپ نہ سکی، پہلے فلمی دنیا میں اور پھر اخبارات کے ذریعے پورے ملک میں پھیل گئی۔

کمال امروہی کی بیٹی کا یہ کہنا ہے کہ انہوں نے شادی کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ مینا کماری اداکاری ترک کر دیں گی جبکہ مینا کماری بدستور فلموں میں کام کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ کمال امروہی نے انہیں اپنی فلم پاکیزہ میں ہیروئن کے طور پر کاسٹ کر لیا جس کی وجہ سے فلم کی شہرت دوبالا ہو گئی۔ اس زمانے میں قریبی فلمی حلقوں اور اخبارات کو معلوم ہوا کہ کمال امروہی نے مینا کماری کو کہا کہ وہ کبھی ماں نہیں بنیں گی۔ مینا کماری اپنے گھر والوں کو چھوڑ چکی تھیں۔ انہوں نے دنیا میں کوئی سچا اور بے لوث رشتہ نہیں دیکھا تھا۔ ان حالات میں کمال امروہی کی بیٹی کا یہ کہنا کہ مینا خود ہی ماں نہیں بننا چاہتی تھیں اور دو بار انہوں نے اسقاط بھی کروایا تھا تسلیم کرنے کو دل نہیں مانتا۔ اگر بچہ ہوتا تو مینا کو دنیا بھر میں کوئی ایک اپنا سچا رشتہ تو مل جاتا لیکن کمال امروہی راستے میں دیوار بن گئے تھے۔ مینا کماری نے شادی کے بعد بھی کئی فلموں میں کام کیا تھا اور بہت پیسا کمایا تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ پیسا کہاں گیا؟ پھر جب مینا کماری نے پاکیزہ میں کام کیا تو کیا اس کا معاوضہ انہیں ملا تھا یا نہیں اور اگر نہیں ملا تو یہ کہاں کا انصاف تھا۔ شادی کے بعد بیویاں عموماً اپنا حساب کتاب الگ رکھتی ہیں اور ان کے شوہر اگر فلم بناتے ہوں تو وہ اپنی بیوی کو معاوضہ ضرور دیتے ہیں کم از کم پاکستان میں ہم نے یہی دیکھا۔

جب کمال امروہی کی بے رخی سے مینا کماری کا دل ٹوٹ گیا۔ کمال امروہی کے گھر والے بمبئی آ گئے تو ان کی توجہ مینا کماری کی طرف اور کم ہو گئی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر تلخی پیدا ہونے لگی۔ مینا کماری کے پاس پیسا بھی نہیں تھا۔ وہ چھوٹی

چھوٹی ضرورتوں کے لیے بھی کمال امروہی کی محتاج تھیں۔اس پر کمال امروہی کی پابندیوں کی وجہ سے بھی مینا کماری کی زندگی عذاب ہوچکی تھی۔ان حالات سے تنگ آکر مینا کماری نے بے راہ روی اختیار کرلی۔مے نوشی میں اضافہ ہوگیا، جو اداکار ہمدردی کے لیے اس سے ملتے تھے انہوں نے اس کی تنہائی اور دل شکستگی سے فائدہ اٹھایا۔مینا کماری بھی بھٹک گئیں کیونکہ جس منزل کی انہیں تلاش تھی اب وہ اس کو نہیں پاسکتی تھیں۔مینا کماری کی مے نوشی، بے ہوشی اور بے راہ روی میں اضافہ ہوتا رہا۔وہ غلط راستوں پر جس تیزی سے دوڑ رہی تھیں کمال امروہی ان سے اتنی ہی تیزی سے دور ہورہے تھے۔اس طرح دوریاں بڑھتی رہیں۔گورودت کی فلم صاحب بی بی غلام میں مینا کماری کا جو کردار اور جو روتیہ تھا مینا کماری کا اصل زندگی میں بھی وہی حال تھا۔یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ مینا کماری کافی عرصے بیمار اور پھر شدید بیمار رہیں۔ان کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں تھا۔کمال امروہی بھی نہیں۔مینا کماری نے بہت مفلسی اور بے کسی کے عالم میں وفات پائی تھی۔اگر رخسار کے مطابق وہ کمال امروہی کی بیوی تھیں تو انہیں اس بے کسی کے عالم میں کمال امروہی نے ان کے حال پر کیوں چھوڑ دیا۔اس سے پہلے فلم پاکیزہ کی تکمیل کے زمانے میں ہی خبریں شائع ہوئی تھیں کہ کمال امروہی نے مینا کماری کو طلاق دے دی ہے۔مینا کماری کی بڑھتی ہوئی بے خودی اور مے نوشی کا سبب بھی اسی کو قرار دیا جاتا ہے۔مینا کماری نے بہت شہرت، نام اور دولت کمائی لیکن وہ دولت کہاں چلی گئی اور مینا کماری نے اس کسمپرسی کے عالم میں کیوں جان دی؟ کمال امروہی جیسے دولت مند شوہر کے ہوتے ہوئے انہوں نے بے سہارا اور بے نوا عورت کی طرح آخری سانسیں کیوں لیں؟ کمال صاحب بھی اب دنیا میں نہیں ہیں اور مینا کماری بھی اللہ کو پیاری ہوچکی ہیں۔ان دونوں میں سے کوئی بھی صحیح صورتِ حال بیان کرنے کے لیے دنیا میں نہیں ہے۔تصدیق یا تردید کون کرے گا لیکن مینا کماری نے زندگی کے آخری دن جس طرح گزارے اور جس طرح وفات پائی ان کا کوئی اپنا یا ہمدرد ان کے سرہانے موجود نہ تھا۔دنیا نے آخری وقت میں اور مرنے کے بعد بھی شوہر کو آنسو بہاتے، سوگ مناتے اور محبت، عقیدت کے بول بولتے نہ دیکھا۔وہ واقعی قابلِ رحم تھیں۔پیدائش کے بعد دکھ ہی جھیلتی رہیں اور دکھ اٹھاتی ہوئی دنیا سے رخصت ہوئیں اللہ ان کے گناہ معاف کرے۔اس کے لیے ہم اور آپ کیا کرسکتے ہیں۔سچ کیا ہے یہ کمال امروہی اور مینا کماری کے ساتھ قبر میں دفن ہوچکا ہے یا پھر اللہ بہتر جانتا ہے۔آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ ہاں، رخسار امروہی کا یہ بیان بھی درست نہیں ہے کہ کمال امروہی کو اپنی فلم دائرہ کے لیے ایک نئی لڑکی کی تلاش تھی جس کے لیے انہوں نے مینا کماری کو منتخب کیا۔مینا کماری فلم دائرہ بننے سے پہلے ہی ایک بہترین اداکارہ کی حیثیت سے مشہور ہوچکی تھیں۔دائرہ ان کی پہلی فلم نہیں تھی۔

☆☆☆

مینا کماری کی کہانی بھی کسی فلم یا ناول کی کہانی سے مختلف نہیں ہے۔وہ یکم اگست 1932ء کو بمبئی میں پیدا ہوئی تھیں۔تیس سالہ فلمی زندگی میں انہوں نے تقریباً 90 فلموں میں کام کیا اور ان کی کچھ فلمیں یادگار قرار پائیں۔مینا کماری بہت اچھی اداکارہ تھیں۔المیہ کرداروں میں تو وہ سب ہیروئنوں پر فوقیت رکھتی تھیں۔1962ء میں بننے والی گورودت کی فلم صاحب بی بی غلام ان کی ناقابلِ فراموش فلم ہے جو اُن کی اپنی زندگی سے بھی مماثلت رکھتی ہے۔

مینا کماری کے والد علی بخش ایک تھیٹر میں ہارمونیم بجاتے تھے۔ان کی والدہ ہندو تھیں مگر علی بخش سے شادی کرنے کے بعد مسلمان ہوگئی تھیں اور ان کا اسلامی نام اقبال بیگم رکھا گیا تھا۔ان کے والد کے مالی حالات بہت خراب تھے یہاں تک کہ مینا کماری کی پیدائش کے وقت ان کے پاس ڈاکٹر کی فیس ادا کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔مینا کماری کی دو بہنیں خورشید اور مدھو تھیں۔علی بخش نے مینا کماری کو یتیم خانے میں داخل کردیا تھا مگر پھر بیوی کی فرمائش پر واپس لے آئے ورنہ مینا کماری نام کی کوئی اداکارہ نہ ہوتی۔مینا کماری کی ساری زندگی مصائب میں گزری تھی اس لیے المیہ کرداروں میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔مینا کے والد کو شاعری سے بھی لگاؤ تھا شاید یہی اثر مینا میں ان ہی کی طرف سے آیا تھا۔مینا کماری نے سات سال کی عمر میں فلم فرزندِ وطن میں چائلڈ اسٹار کے طور پر اداکاری کی تھی۔یہ فلم 1939ء میں ریلیز ہوئی تھی۔اس کے بعد انہوں نے فلموں میں کام کرکے گھر والوں کو زندہ رہنے کا موقع فراہم کیا۔گویا وہ بچپن ہی سے گھر والوں کے لیے کمائی کرتی تھیں۔جوان ہونے کے بعد ان کی پہلی فلم ایک ہندو دیومالائی کہانی پر بنائی گئی تھی۔اس کے بعد انہوں نے چند اور فلموں میں کام کیا مگر اصلی شہرت فلم بیجو باورا سے ملی جس نے راتوں رات انہیں سپر اسٹار بنادیا تھا۔اس فلم کے لیے انہیں فلم فیئر ایوارڈ بھی دیا گیا۔اس کے بعد 1953ء ہی میں



انہوں نے فلم آزاد میں دلیپ کمار اور دیو آنند کے ساتھ کام کیا۔دل اپنا اور پریت پرائی، شاردا، ایک ہی راستہ، مس میری اور کوہِ نور ان کی بے حد کامیاب فلمیں تھیں جنہوں نے انہیں آسمانِ فلم پر پہنچا دیا۔1962ء میں انہوں نے صاحب بی بی غلام میں لاجواب اداکاری کی مگر اس فلم نے انہیں شراب کا رسیا بنادیا۔دل ایک مندر، پھول اور پتھر نے انہیں مزید شہرت دی۔انہوں نے چار مرتبہ بہترین اداکارہ کا ایوارڈ حاصل کیا۔دولت اور شہرت ان کی باندی تھیں مگر انہیں مایوسیوں اور تنہائی نے شراب کا عادی بنایا۔کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے ان کے گردے خراب ہوگئے تھے اور 1958ء میں وہ شدید بیمار ہوگئیں۔ان کی کمال امروہی سے شادی ہوچکی تھی۔انہوں نے مینا کماری کا ملک سے باہر بھی علاج کروایا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔کمال امروہی سے ان کی 1952ء میں شادی ہوئی تھی جسے کافی عرصے راز میں رکھا گیا مگر یہ شادی انہیں خوشیاں نہیں دے سکی بلکہ انہوں نے ان کا دل توڑ دیا تھا۔شادی کے کچھ عرصے بعد ہی میاں بیوی کے تعلقات خراب ہوگئے تھے۔کمال امروہی کی فلم پاکیزہ 16 سال میں مکمل ہوئی تھی۔پہلے یہ بلیک اینڈ وائٹ میں تھی اور دوبارہ رنگین بنایا گیا۔مینا کماری کو اولاد کی بہت آرزو تھی مگر کمال امروہی نہیں چاہتے کیونکہ وہ سید نہیں تھیں۔مینا کو اس کا ہمیشہ دکھ رہا۔اخباری اطلاعات کے مطابق شدید اختلافات کی وجہ سے 1964ء میں ان دونوں میں علیحدگی ہوگئی تھی۔بیماری اور شوہر سے اختلافات کے باوجود مینا کماری نے قوتِ ارادی کے زور پر کام کرکے یہ فلم مکمل کروائی۔31 مارچ 1972ء میں مینا کماری وفات پاگئیں۔ان کے جگر اور گردے بیکار ہوچکے تھے۔اخباری اطلاعات کے مطابق آخری دنوں میں وہ تنگ دستی اور تنہائی کی انتہائی حد کو پہنچ گئی تھیں۔ان کی وفات کے بعد بھی کمال امروہی نے ان کا سوگ نہیں منایا۔یہ ہندوستان کی عظیم ہیروئن کی دردناک کہانی ہے۔جس کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں تھا۔انہوں نے ایک شعر میں اپنی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔

تم کیا کروگے سن کر مجھ سے میری کہانی
بے لطف زندگی کے قصے ہیں پھیکے پھیکے

دنیا کی ستم ظریفی دیکھنی ہو تو مینا کماری کی زندگی کو دیکھیے۔رہے نام اللہ کا۔

☆☆☆

پشاور سے بھارتی اداکار رحمان کا تعارف شوکت رحمان خٹک نے کروایا ہے۔رحمان، پشاور کے رہنے والے تھے۔اس تعارفی مضمون سے بہت سی نئی باتیں آپ کو معلوم ہوں گی۔اس وقت جس فن کار کا ذکر کررہا ہوں وہ بہت نامور فن کار تھا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے جب پہلی فلم میں بطور ایکسٹرا کام ملا تو اس نے چند الفاظ کی ادائیگی میں 90 ری ٹیک دیے۔اتنا نروس ہوا کہ شدید سردی کے موسم میں پسینے چھوٹ پڑے۔اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ کبھی فلموں میں کام نہیں کروں گا کیونکہ اس کے بس کی بات نہیں ہے لیکن قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔جب وہ اداکارہ نرگس کے مدِمقابل ہیرو منتخب ہوا تو اس نے اداکاری کے ایسے جوہر دکھائے کہ فلم بین حیران رہ گئے۔اس کے بعد اس نے مدھو بالا، مینا کماری، گیتا بالی، کامنی کوشل، ثریا جیسی بڑی فن کاراؤں کے مقابلے میں ہیرو کا کردار ادا کیا اور بہت مقبولیت حاصل کی۔اس نے دلیپ کمار، دیو آنند، گرودت، راج کپور جیسے عظیم فنکاروں کے ساتھ بھی کام کیا۔اس کی بے ساختہ اداکاری پر اس کا نام چار مرتبہ فلم فیئر ایوارڈ کے لیے نامزد ہوا۔اس فن کار کا نام رحمان تھا۔جب وہ ولن بنا تو صفِ اول کا ولن بنا۔اس نے ثابت کیا کہ لگن سچی ہو تو انسان سمندر کی تہ سے موتی نکال سکتا ہے۔اس بارے میں جن حضرات کی تحریروں سے رہنمائی حاصل کی...... ان کے اسمائے گرامی محترم زخمی کانپوری' محترم ابراہیم ضیا اور محترم صائمہ ایم اے سی شامل ہیں جس کے لیے میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

اگرچہ اس کا اصلی نام سعید الرحمان تھا مگر اس نے فلمی دنیا میں رحمٰن کے نام سے شہرت حاصل کی۔رحمان کے آباؤ اجداد کا سلسلہ بارک زئی قبیلے سے تھا۔1879ء دوسری برٹش افغان جنگ کے دوران اس کا خاندان کابل سے نقل مکانی کرکے پشاور آکر آباد ہوگیا تھا۔رحمان کے والد پشاور میں ہی پیدا ہوئے اور انہوں نے یہیں تعلیم پائی، رائل انڈین فورس میں ملازمت کی اور ترقی پاکر اسکواڈرن لیڈر کے عہدے پر پہنچے بعد میں نوشہرہ میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر کام کیا۔انہوں نے کوئٹہ میں مستقل رہائش اختیار کی۔کاروبار کے سلسلے میں بہت عرصہ لاہور میں بھی مقیم رہے۔

رحمان 23 جون 1923ء کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔میٹرک تک لاہور ہی میں تعلیم حاصل کی بعد میں جبل پور چلے گئے۔جہاں رحمان نے ایس ایس کالج سے گریجویشن کیا اور عملی زندگی کا آغاز ائرفورس سے کیا۔انہوں نے بطور پائلٹ تربیت حاصل کی' 1943ء میں جب رحمان

نے امتحان دیا تو فیل ہوگئے۔ دل برداشتہ ہوکر ائرفورس کو چھوڑ دیا اور کسی دوسری ملازمت کی تلاش شروع کی۔ انہیں اداکاری کا بالکل شوق نہ تھا پھر بھی پونا میں ہدایت کار و کرم بید کے معاون کی ملازمت اختیار کی۔ یہ فلم لاکھانی بنارہے تھے۔ پربھات ایک بہترین اسٹوڈیو تھا۔ وہاں گھر جیسا ماحول تھا۔ اسٹوڈیو میں سوئمنگ پول تھا۔ گھڑسواری کے لیے بہترین نسل کے گھوڑے تھے۔ جب فلم لاکھانی مکمل ہوئی تو ہدایت کار ڈی ڈی کیشپ نے انہیں اپنا معاون ہدایت کار بنالیا۔ وہ فلم چاند بنارہے تھے۔ جس کے مرکزی کرداروں میں پریم ادیب، بیگم پارہ تھیں۔

فلم کے ایک سین میں ایک رقاصہ تماشائیوں کے سامنے رقص کرتی ہے جوں ہی ڈانس ختم ہوتا ہے اچانک ایک پٹھان تماشائیوں میں سے اٹھ کر رقاصہ سے مخاطب ہوکر چند مکالمے کہتا ہے۔ یہ ایک اہم سین تھا۔ ڈائریکٹر کیشپ نے تماشائیوں سے مخاطب ہوکر کہا کہ اگر کسی نے بہترین پگڑی باندھی تو اس کو فلم کے اس سین میں شامل کیا جائے گا۔ اتفاق سے کوئی بھی پگڑی نہیں باندھ سکا۔ رحمان نے پٹھان ہونے کے ناتے بہترین پگڑی باندنے کا مظاہرہ کیا۔ ہدایت کار نے رحمان کو سمجھایا کہ ڈانس ختم ہونے پر تمہیں تماشائیوں میں سے اٹھ کر رقاصہ سے مخاطب ہوکر کہنا ہے۔

"واہ واہ کتنا اچھا ناچ تھا جیسے ساز کی لہروں پر چاند کا رقص۔" یہ مختصر سا مکالمہ بولنے میں رحمٰن نے 30 ری ٹیک کروائے پھر بھی صحیح مکالمہ نہ بول سکا۔ ہدایت کار رحمٰن پر برس پڑے۔

"دفع ہوجاؤ میری نظروں سے دور ہوجاؤ۔" اس وقت پربھات اسٹوڈیو کے پارٹنر سیٹھ فتح لال بھی وہاں موجود تھے۔ اس نے کیشپ کو سمجھایا کہ نیا لڑکا ہے اس کو موقع دینا چاہیے۔ ڈائریکٹر رضامند ہوگئے۔ اس بار جب رحمان کو کیمرے کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے 50 ... ری ٹیک دیے تو شاٹ اوکے ہوا اور رحمان کی جان میں جان آئی۔

اسی زمانے میں ہدایت کار سنتوش پربھات اسٹوڈیو میں فلم ہم ایک ہیں کے نام سے مشہور ہندی ناول دھرتی ماتا بنارہے تھے۔ سرزمینِ ہند میں بسنے والے مختلف مذاہب ہندو، مسلمان، عیسائی وغیرہ کے اتفاق پر یہ کہانی لکھی گئی تھی۔ یہ ایک ماں اور اس کے چار بچوں کی کہانی ہے۔ ایک بیٹی اور تین بیٹے۔ بیٹوں میں ایک ہندو، ایک مسلمان اور تیسرا کرسچین تھے۔ مسلمان لڑکے کا کردار رحمٰن کو دیا گیا۔

چند دنوں کی شوٹنگ کے بعد ہندو بیٹے کا کردار ادا کرنے والا لڑکا اچانک بنا بتائے شوٹنگ سے غائب ہوگیا۔ انتظار کے باوجود بھی جب وہ لڑکا نہ آیا تو ڈائریکٹر سنتوش نے ابھرتے ہوئے اداکار دیو آنند کو وہ کردار دے دیا۔

جب فلم ریلیز ہوئی تو رحمان کے کردار کو بے حد پسند کیا گیا۔ "ہم ایک ہیں" کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ ہدایت کار ڈی ڈی کیشپ نے نرگس کے نام سے فلم کا آغاز کیا۔ اداکارہ نرگس کو فلم کا مرکزی کردار دیا۔ دیو آنند ان کے مقابل ہیرو تھے۔ دیو آنند کی کنٹونٹی یہ تھی۔ گلے میں مفلر لمبے لمبے کانوں والا کتا ان کے ساتھ ہوتا۔ رحمان کو بھی فلم میں کام دیا گیا۔ ایک دن اچانک ہدایت کار ڈی ڈی کیشپ کے دل میں کیا بات آئی کہ انہوں نے رحمان کو بلا کر کہا کہ دیو آنند سے اسکرپٹ اور کتا واپس لے لو اور اس سے کہو کہ اس فلم سے تمہارا نام خارج کردیا گیا ہے۔ رحمان اور دیو آنند آپس میں بہت اچھے دوست تھے بعد میں گرودت بھی ان دوستوں کے ساتھ مل گیا اور تینوں دوست بن گئے۔ رحمان کے لیے دیو آنند سے یہ سب کہنا بہت مشکل تھا مگر ڈائریکٹر کے مجبور کرنے پر رحمان نے دیو آنند کو پیغام پہنچادیا اور فلم نرگس کے ہیرو کا کردار رحمان کو دیا گیا۔ اس فلم کی کامیاب نمائش اور کامیابی کے بعد رحمان کو بڑی ہیروئنوں کے ساتھ کاسٹ کیا جانے لگا۔

سیٹھ بابو رائے اپنے وقت کے بہت بڑے سرمایہ دار اور فلمساز تھے۔ اس نے رحمان سے مستقل معاہدہ کرلیا۔ شوکت حسین رضوی اور سیٹھ بابو رائے میں بھی بہت دوستی تھی۔ جب شوکت حسین رضوی نے فلم جگنو بنانے کا پروگرام بنایا تو انہیں مکمل یقین تھا کہ سیٹھ بابو رائے رحمان کو جگنو میں کام کرنے کی اجازت دے دیں گے۔ رضوی صاحب جب سیٹھ سے ملے تو جواب میں اس نے اپنی فلم کے لیے نور جہاں کا مطالبہ کردیا۔ سیٹھ صاحب نے صاف صاف لفظوں میں کہا کہ شوکت صاحب رحمان کے بدلے نور جہاں کو اپنی فلم میں کام کرنے کی اجازت دے دیں۔ شوکت حسین رضوی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ان کی آپس میں بات نہ بن سکی بعد میں وہی کردار دلیپ کمار کو دیا گیا۔ رحمان کو فلم جگنو میں کام نہ کرنے کا بے حد افسوس تھا۔ سیٹھ بابو رائے سے معاہدہ راستے کا پتھر بنا ہوا تھا۔ ان ہی دنوں رحمان کی فلم انتظار بہت کامیاب ہوئی۔ رحمان کو پلے بیک گانے سے بے حد نفرت تھی۔ وہ اس کو غیر فطری عمل سمجھتے تھے مگر اگلی فلم تحفہ میں انہیں ایک سنگر کا



کردار دیا گیا جس کی روزی کا ذریعہ ہی گانا ہے۔

جئیں گے مگر ہم مسکرا نہ سکیں گے
کہ اب زندگی میں محبت نہیں ہے

رحمان کی فلم تحفہ میں ویرا ہیروئن تھی۔ اس گانے پر رحمان کی اداکاری قابلِ دید تھی۔ یہ فلم بھی رحمان کی اداکاری اور مقبول گانوں کی وجہ سے کامیاب رہی۔

اداکارہ، گلوکارہ ثریا کے ساتھ رحمان کی پہلی فلم پیار کی جیت تھی۔ جسے او پی دتہ نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ یہ فلم 1948ء میں ریلیز ہوئی۔ رحمان اور ثریا کی جوڑی کو پسند کیا گیا۔ 1949ء میں ان دونوں کی فلم بڑی بہن بہت کامیاب رہی۔ اس فلم کے گانے بھی بہت مقبول ہوئے تھے۔

او دور جانے والے وعدہ بھول نہ جانا
راتیں ہوئی اندھیری تم چاند بن کے آنا

بڑی بہن نے بھی ریکارڈ توڑ بزنس کیا۔ فلم سانوریا میں رحمان نے ایک ان پڑھ دیہاتی کا کردار ادا کیا تھا جو ایک ماڈرن لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ یہ فلم بھی کامیاب رہی۔ اس فلم میں رحمان کے مزاحیہ کردار کو سراہا گیا۔ نگار سلطانہ کے ساتھ وہ فلم مفرور میں آئے۔ پارس میں کامنی کوشل، رحمان کی ہیروئن تھی۔ پردیس میں مدھوبالا ان کی ہیروئن تھیں۔ فلم کے ڈائریکٹر ایم صادق تھے بعد میں ایم صادق کی فلم چودھویں کا چاند، تاج محل میں رحمان نے کام کیا۔ شادی کی رات میں گیتا بالی ان کی ہیروئن تھیں۔ گیتا بالی ورسٹائل اداکارہ تھی۔ رحمان سے اس کی بہت بے تکلفی تھی۔ فلم کی شوٹنگ کے دوران گیتا بالی شدید زخمی ہوگئی۔ شوٹنگ کے بعد رحمان نے گیتا بالی سے کہا "زخمی ہونے کے بعد اگر تم مرجاتیں تو اس دنیا میں ایک سکھ کا بوجھ کم ہوجاتا۔"

گیتا بالی نے برجستہ کہا "مرنے سے پہلے میں مسلمانوں کا کلمہ پڑھتی اس طرح ایک مسلمان دنیا میں کم ہوجاتا۔"

اگلی فلم راج رانی میں رحمان نے لاجواب اداکاری کی۔ اس فلم میں ان کا جوانی سے بڑھاپے تک کردار تھا۔ یہ فلم کامیاب رہی۔ گوہر رحمان کی پہلی ناکام فلم تھی۔ اس سے پہلے ان کی ہر فلم ہٹ ہوئی تھی۔ فلم گوہر میں رحمان کا کام بہت اچھا تھا۔ اس فلم کے بعد سے رحمان چند سالوں تک بے کار رہا۔ 1957ء میں رحمان کے دوست اداکار، ڈائریکٹر گورودت نے پیاسا کے نام سے فلم شروع کی۔ دلیپ کمار کے انکار کرنے پر گورودت نے فلم کا مرکزی کردار خود ادا کیا۔ پیاسا رحمان کی بطور ولن پہلی فلم تھی۔ اس میں گورودت کے ساتھ ساتھ رحمان کی اداکاری کو بھی پسند کیا گیا۔ یہ فلم فیئر ایوارڈ کے لیے منتخب بھی ہوئی۔ دلیپ کمار کو فلمی زندگی میں دو کردار ادا نہ کرنے کا بہت افسوس رہا۔ ایک بیجو باورا اور دوسری پیاسا۔ اس فلم کے بعد رحمان کے لیے دوبارہ فلموں کی لائن لگ گئی مگر اب وہ ولن یا کریکٹر ایکٹر کے رول میں کاسٹ ہونے لگا۔ بطور ولن وہ آنگن، گھونگھٹ، چھوٹی بہن، بارہ بجے جیسی سپر ہٹ فلموں میں کاسٹ ہوا۔ فلم گھونگھٹ میں رحمان نے اندھے کا رول کیا تھا۔ اس دور کے فنکاروں میں رحمان کا بہت بڑا نام ہے۔ ایک مرتبہ اسٹوڈیو میں ایک جاننے والے نے رحمان پر طنز کیا کہ تم مسلمان ہوکر گورودت، دیو آنند جیسے ہندوؤں سے دوستی کرتے ہو۔ رحمان کو یہ سن کر بے حد غصہ آیا جواب میں کہا۔

"دوستی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر پٹھان کی یہ... شان ..... ہے کہ دوستی میں جان دینا اور دشمنی میں جان لینا پٹھانوں کی فطرت میں شامل ہے۔"

رحمان نے 27 جولائی 1946ء کو حیدرآباد دکن کی ایک معزز خاتون سے شادی کی تھی۔ یہ بہت کامیاب شادی ثابت ہوئی۔ بدقسمتی سے ان کی اولاد نہ ہوسکی۔ رحمان نے اپنی سالی کے دو بچوں کو پالا۔ پاکستان کے مشہور فلمی کیمرا مین مسعود الرحمان ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ مشہور فلم اور ٹی وی اداکار فیصل الرحمان، مسعود الرحمان کے بیٹے ہیں۔

دلیپ کمار کے ساتھ رحمان نے فلم میلہ میں کام کیا تھا۔ اس کے علاوہ راج کمار، دیو آنند، گورودت اور دیگر بڑے اداکاروں کے ساتھ رحمان نے کام کرکے اپنے فن کا ثبوت دیا۔ رحمان کی چار فلمیں فلم فیئر ایوارڈ کے لیے نامزد ہوئی تھیں۔ چودھویں کا چاند، صاحب بی بی اور غلام، دل نے پھر یاد کیا، پھر صبح ہوگی۔ رحمان نے تقریباً دو سو فلموں میں کام کیا۔ چالیس سالہ فلمی زندگی میں اس کی اداکاری سے مزین فلموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ رحمان کی اداکاری میں ایک ٹھہراؤ، دھیما پن تھا۔ ان خصوصیات نے رحمان کو اپنے ہم عصر اداکاروں کو بہت پیچھے چھوڑا۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ اپنے عزیزوں سے ملنے پاکستان آئے تھے۔ آخری عمر میں انہیں گلے کے کینسر کی بیماری لاحق ہوئی تھی۔ وہ چھ برس تک شدید بیمار رہے۔ طویل بیماری کے بعد آخرکار 6 نومبر 1979ء کو وفات پاگئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی یہ فلمیں ریلیز ہوئیں۔ آہستہ آہستہ، سلام میم صاحب، وکیل بابو، سانجھ کی بیلا، راج پوت، دل آخر دل ہے۔ پشاور کے فن کاروں میں رحمان کا بہت بڑا نام ہے۔

MAY

# مئی
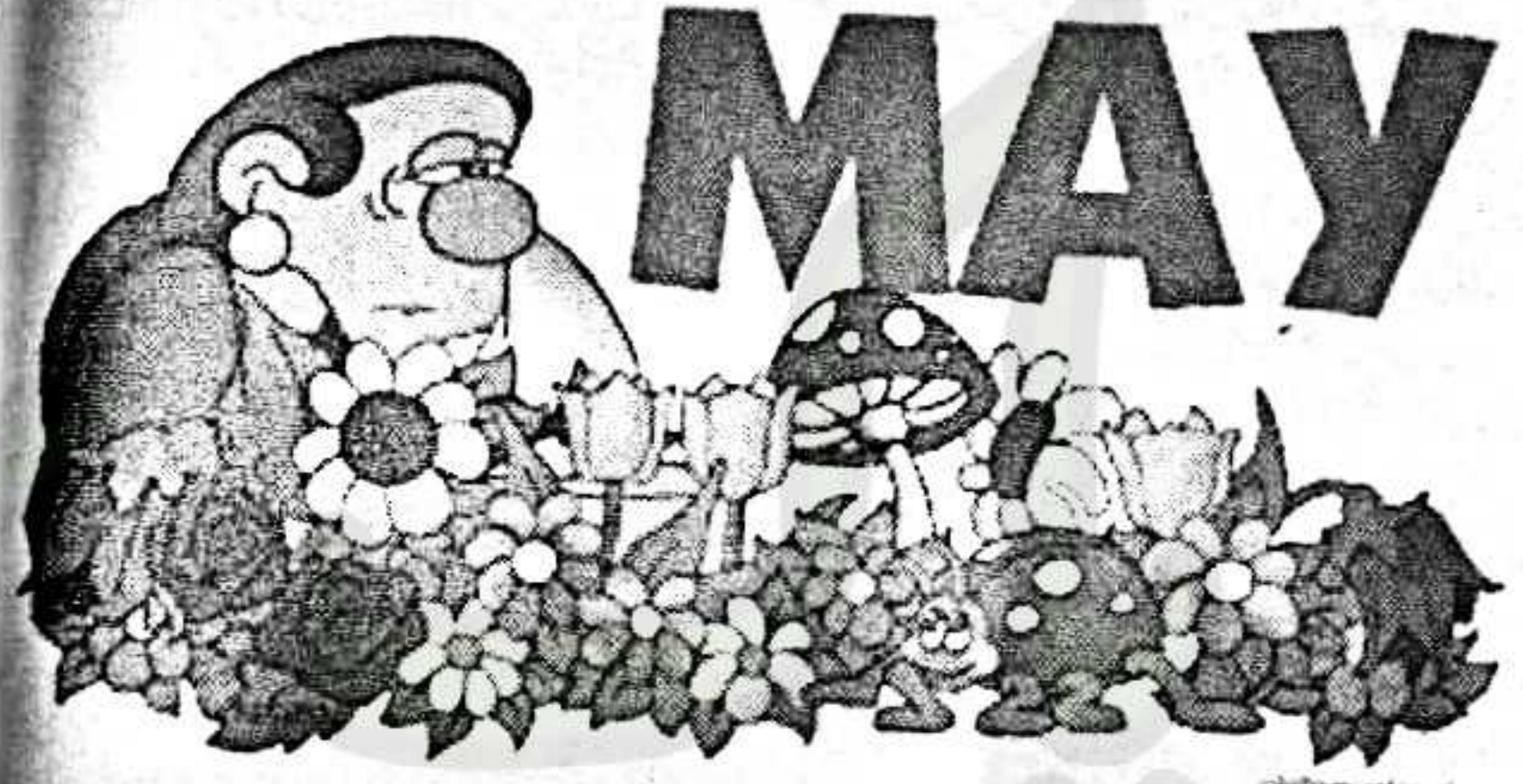
منظر امام

مئی کا مہینا عیسوی سن کے اہم مہینوں میں سے ایک ہے۔ اس مہینے میں ایسے بہت سے واقعات رونما ہوئے ہیں جن کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے یہاں صرف اہم واقعات دیے جارہے ہیں۔

**باشعور قارئین کے لیے ایک خصوصی تحریر**

مئی جولین اور جارجین کلینڈر کے مطابق سال کا پانچواں مہینا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جنوبی ہیمپ شائر میں یہ خزاں کا اور شمالی ہیمپ شائر میں بہار کا موسم ہوتا ہے۔ یہ گرمی کا مہینا ہے۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مئی اور اکتوبر کی شروع اور آخری تاریخیں ایک ہی دن پر ہوتی ہیں۔ اس کا نام یونانی دیوی Maia کے نام پر رکھا گیا تھا۔

جاپان میں اس مہینے گولڈن ویک منایا جاتا ہے۔



اپریل 29 سے لے کر 5 مئی تک۔ ان تاریخوں میں چھٹی ہوتی ہے۔ کچھ علاقوں میں رومن دیوی Maia کے نام پر خوب جشن منایا جاتا ہے۔ یہ دیوی زمین اور عورت کی زرخیزی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

ہوائی میں Lei Day منایا جاتا ہے۔ لوگ دن بھر لی پہنے رہتے ہیں۔ لی پھولوں اور کاغذ سے بنایا ہوا لباس ہوتا ہے۔

اس مہینے کے اہم واقعات میں سے چند کے بارے میں جان لیں۔ اس کے بعد مرحلہ وار مئی کی کہانی شروع ہوگی۔

دنیا بھر میں پہلی مئی کو مزدوروں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔

1328ء کو انگلستان نے اسکاٹ لینڈ کی آزادی کو تسلیم کیا۔

1707ء کو اسکاٹ لینڈ کا انگلینڈ سے الحاق ہوا۔

1848ء میں امریکا اور اسپین کی جنگ کے دوران امریکا نے اسپین کا بحری بیڑا تباہ کردیا۔

1941ء میں دوسری جنگِ عظیم کے دوران جرمنی نے تبروک پر حملہ کردیا۔

اس کے علاوہ اور بے شمار واقعات جن کا ذکر مرحلہ وار آئے گا۔ اب ہم مئی کی پہلی تاریخ سے شروع کرتے ہیں۔

## پہلی مئی

جرمنی میں اپریل کی آخری اور مئی کی پہلی رات بہت خوبصورت اور رومان پرور سمجھی جاتی ہے۔ پہلی مئی کو رات بارہ بجے کے بعد جرمن لڑکے تحفے لے کر اپنی اپنی دوست لڑکیوں کے گھروں کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ کسی لڑکی کے لیے یہ محبت کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا موقع ہوتا ہے۔

اس تاریخ کو Mother good day منایا جاتا ہے۔

اس تاریخ کو 1888ء میں نکولا ٹیسلا نے الیکٹرک ٹرانسمیشن آن پاور متعارف کروایا تھا۔ یومِ مئی کے دو حصے ہیں۔

ایک ہے یومِ مئی اور دوسرا ہے مزدوروں کا دن۔ Laborday یومِ مئی عیسائیت سے پہلے رومن عہد میں فلورا دیوی کے لیے منایا جاتا تھا۔ یہ پھولوں کی دیوی کہلاتی تھی۔ اس لیے آج بھی دنیا کے مختلف علاقوں میں بچے یومِ مئی پر ایک دوسرے کو پھولوں کے تحفے دیا کرتے ہیں یا نیک شگون کے طور پر پڑوسیوں کے دروازوں کو کنڈوں میں پھول لٹکا دیتے ہیں اور لڑکیاں ایسے لباس پہنتی ہیں جن پر پھولوں کے پرنٹس ہوتے ہیں۔

پہلی مئی کو مزدوروں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ مزدوروں کی تحریک گرچہ شکاگو کے مزدوروں کے قتل سے منسوب ہے۔ لیکن اس کی ابتدا نیوزی لینڈ سے ہوتی ہے۔

اس زمانے میں مزدوروں سے دس دس بارہ بارہ گھنٹے کام لیا جاتا تھا۔ پھر نیوزی لینڈ کے ایک بڑھئی سموئیل پانیل نے آٹھ گھنٹے کام کی مہم شروع کی۔ جس پر آج پوری دنیا میں عمل کیا جاتا ہے۔ اس مہم کا آغاز 28 اکتوبر 1890ء میں ہوا تھا۔

پہلی مئی 1707 میں برطانیہ اور اسکاٹ لینڈ کا الحاق ہوا تھا۔

پہلی مئی 1960ء کو روس نے ایک امریکی جاسوس طیارہ U2 مار گرایا تھا جس پر پوری دنیا میں ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔ پائلٹ فرانسس بچ گیا تھا۔ حکومتِ روس نے اسے دس سال کی سزا دی تھی۔

پہلی مئی 2004ء میں آٹھ ممالک یورپی یونین میں شامل ہوئے تھے۔

یہ تاریخ آئرلینڈ نژاد امریکی مزدوروں کی رہنما ہیری کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس نے بہت دشوار زندگی گزاری۔ اس کی پیدائش 1830 میں ہوئی تھی۔ ابتدا ہی میں اس کے شوہر اور چار بچے زرد بخار میں مبتلا ہوکر مر گئے۔ وہ شکاگو آئی۔ یہاں 1871 میں شکاگو میں لگی آگ میں اس کے بقیہ رشتے دار بھی مر گئے پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور مزدوروں کی رہنما بن گئی۔

دو مئی 2010ء میں پاکستان میں ایک بہت بڑا واقعہ رونما ہوا۔ جب امریکی فوجیوں نے ایبٹ آباد کے علاقے میں اسامہ بن لادن کے لیے کارروائی کی۔

2001ء میں پاکستان میں مولانا عبدالستار خان نیازی کا انتقال ہوا تھا۔

## تین مئی

تین مئی 1831ء میں Edwing Budding نے گھاس کاٹنے کے لیے ہاتھ سے چلانے والی مشین بنائی تھی۔

تین مئی مشہور و معروف متنازعہ رائٹر میکاولی کی پیدائش کی تاریخ ہے۔
نکولو میکاولی 1469 کو اٹلی کے شہر فلورنس میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی کتابوں اور اس کے نظریات نے ایک دنیا کو متاثر کیا ہے۔
خاص طور پر حکمران اور سیاست دان اس سے بہت استفادہ کرتے ہیں۔ اس کی مشہور ترین کتاب ”دی پرنس“ ہے۔ جس کو دنیا کا ہر ڈکٹیٹر بہت شوق سے پڑھتا ہے۔
3 مئی 1898 میں روس میں گولڈا میئر کی پیدائش ہوئی تھی۔ گولڈا میئر کو جدید اسرائیل کے بانیوں میں سے سمجھا جاتا ہے۔
4 مئی 1943 میں laorsikorski نے ہیلی کاپٹر پیٹنٹ کروایا تھا۔
پانچ مئی 1809 میں میری نامی کی ایک خاتون نے اپنی ایک ایجاد پیٹنٹ کروائی۔ وہ پہلی عورت ہے جس نے اپنی کوئی ایجاد پیٹنٹ کروائی ہو۔ اس کی یہ ایجاد مشین کے ذریعے کشیدہ کاری کی تھی۔
5 مئی 1865 کو پہلی بار ڈیکوریشن ڈے منایا گیا۔ یہ جنگ میں مارے جانے والے فوجیوں کی قبروں کی سجاوٹ کا دن ہے۔
5 مئی 1961 اس لحاظ سے ایک یادگار تاریخ ہے کہ اس تاریخ کو امریکی ہوا باز ایلن شیرڈ نے خلا میں کئی منٹوں تک چہل قدمی کی تھی۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد روس نے بھی اپنے خلا باز یوری گگارین کو خلا میں بھیجا تھا۔
5 مئی 1818 ایک بہت بڑے مفکر کی پیدائش کا دن ہے۔ اس کا نام تھا کارل مارکس۔ اس نے اپنے نظریات اور فلسفے سے آدھی دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔
اس جرمن فلاسفر نے پوری دنیا پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس نے کمیونسٹ مینی فیسٹو بھی دیا تھا۔ کارل مارکس ایک اچھا شاعر بھی تھا۔ اس کی شاعری کا اردو ترجمہ ممتاز رفیق نے کیا ہے۔
6 مئی 1889 کو پیرس میں عوام کے لیے ایفل ٹاور کھول دیا گیا تھا۔ اسی تاریخ کو 1851 میں جان گوری نے برف بنانے کی مشین پیٹنٹ کروائی تھی۔
اسی تاریخ کو 1527 میں کو جرمنوں نے روم پر حملہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت توڑ پھوڑ کی۔ انہوں نے درجنوں تاریخی یادگاریں تباہ کردیں۔ اثاثے ضائع کردیے۔
چھ مئی 1856 کو جرمنی میں گلمنڈ فرائڈ پیدا ہوا تھا۔ یہ شخص سائیکو انالیسس کا بانی تھا۔ ذہنی بیماریوں کے علاج کا ماہر۔
اس کا نام لوگوں میں متضاد ردِعمل کو جنم دیتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیتے ہیں اور بہت سے سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے جنسیت اور جنس پرستی کو فروغ ہوا۔ اس کے نظریات بہت انقلابی ہونے کے ساتھ ساتھ اتنے نئے تھے کہ اس نے پوری دنیا کو چونکا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ بیٹا ماں کی طرف اور بیٹی باپ کی طرف اس لیے راغب ہوتی ہے کہ اسے مخالف جنس میں سکون ملتا ہے۔ عورتیں اس کی بہت زیادہ خلاف ہوگئی تھیں۔ اس نے ایک بار کہا تھا کہ عورتیں نامکمل مرد ہوتی ہیں۔ اس نے نفسیات کے علم کو ایک نئی جہت دے دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک دن آئے گا جب ہمیں سائیکو انالیسس اور ذہن کی بائیولوجی کو یکجا کرنا پڑے گا۔
6 مئی 1856 میں رابرٹ پیری کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ ایک زبردست مہم جو تھا۔ اس کا کارنامہ اپریل 1909 میں نارتھ پول تک پہنچنے کا ہے۔
سات مئی کو ایک بہت بڑے ایوارڈ کا اجرا ہوا تھا۔ ادب، آرٹ اور میوزک کی دنیا میں اس ایوارڈ کو Puilter Prize کہا جاتا ہے۔ اس کا آغاز 1917 سے ہوا ہے۔ یہ انعام آن لائن جرنلزم، لٹریچر اور میوزک کے لیے کولمبیا یونیورسٹی کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ یہ ایوارڈ ایک بہت بڑے پبلشر جوزف پلسٹزر کے نام سے منسوب ہے۔ یہ ایوارڈ اکیس مختلف شعبوں میں دیا جاتا ہے۔ جیتنے والے کو سند کے علاوہ دس ہزار ڈالرز نقد بھی دیے جاتے ہیں۔ اس کو حاصل کرنے والوں میں رابرٹ فراسٹ جیسے شاعر بھی ہیں۔
سات مئی 1878 کو جان ونسٹر نے وہ سیڑھی متعارف کروائی جس سے آگ لگنے کے بعد کسی عمارت سے نکلا جاسکتا ہے۔
سات مئی 1915ء کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس کی وجہ سے امریکا پہلی جنگ عظیم میں کود پڑا تھا۔ برطانیہ کے ایک مسافر بردار جہاز Lusitania کو جرمنوں نے تارپیڈو



مار کر ڈبو دیا تھا۔ اس بحری جہاز میں بارہ سو مسافر تھے جو سب ہلاک ہوگئے۔ ان بارہ سو میں ڈیڑھ سو کے قریب امریکی تھے۔ اس کے بعد امریکا جرمنی کے خلاف اتحادیوں میں شامل ہوگیا۔ پھر سات مئی 1945 کو ایک اسکول کی سرخ اینٹوں والی عام سی عمارت میں جرمن اور اتحادیوں کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ ہوا تھا۔
آٹھ مئی 1942ء میں اروِنگ برلن نے White christmas رجسٹر کروایا۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں اب تک سب سے زیادہ سنا اور گایا جانے والا نغمہ یہی ہے۔
8 مئی 1942 کو دوسری جنگِ عظیم کے دوران سمندر میں ایک جنگ ہوئی۔ جس میں جاپان کو شکست ہوئی تھی۔
اس جنگ کی خاص بات یہ تھی کہ دشمنوں کے بحری جنگی جہاز ایک دوسرے کے آمنے سامنے تو تھے لیکن وہ اتنے فاصلے پر تھے کہ نظر نہیں آتے تھے۔ اسی لیے دیکھنے اور حملہ کرنے کا کام طیارے انجام دے رہے تھے۔
8 مئی 1828 میں جینوا سوئٹزر لینڈ میں ایک بہت ہی اہم آدمی کی پیدائش ہوئی۔ یہ ہنری ڈونانٹ تھا۔ اس نے خدمتِ خلق کے لیے ایک سروس شروع کی جو پوری دنیا میں ریڈ کراس کے نام سے مشہور ہوئی۔ ہنری نے نوبل پرائز بھی حاصل کیا تھا۔

نو مئی

9 مئی 1774 صحافت کی دنیا میں ایک انقلاب کی تاریخ ہے۔ اس تاریخ کو پہلی بار ایک امریکی اخبار میں کارٹون چھاپا گیا تھا۔
9 مئی 1959 کو Mettles کی باربی ڈول رجسٹر ہوئی۔ برتھ رینڈل نے باربی کو متعارف کروایا تھا۔
روس میں اس تاریخ کو ایک جشن منایا جاتا ہے۔ جسے جشنِ فتح کا نام دیا گیا ہے۔ یہ جشن دوسری جنگِ عظیم میں روس کی جرمنوں کے خلاف فتح کی یادگار ہے۔ یہ ایک بھیانک جنگ تھی۔ دونوں طرف کے لاکھوں فوجی انسان درندگی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ جرمنوں کو روس کی سخت ترین سردی اور برف نے تباہ کرکے رکھ دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں بیس لاکھ روسی ہلاک ہوگئے تھے۔

دس مئی

دس مئی 1752 میں بنجامن فرینکلن نے Lighting rod کا تجربہ کیا۔ اس شخص نے اور بھی کئی ایسے تجربات کیے جن سے آج پوری دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ جیسے آئرن فرنس اسٹو۔ بائی فوکل گلاسز (یہ وہ عینک ہوتی ہے جس میں دور اور نزدیک دیکھنے کے لیے دو شیشے لگے ہوتے ہیں۔ اندازہ لگالیں کہ اس ایک ایجاد سے دنیا کے کتنے افراد فائدے اٹھا رہے ہیں)
اسی شخص نے Obolneter بنایا تھا۔ یہ وہ آلہ ہے جو گاڑیوں کی رفتار کا اندازہ کرتا ہے۔ اس کی ترقی یافتہ شکل آج کل رفتار جانچنے کے لیے استعمال کی جارہی ہے۔
دس مئی 1944 کو بچوں کے لیے مشہور فلم ساز ادارے وارنر برادرز نے Tiny Toon Adventure شروع کیا۔ جس کو آج بھی ہر بچہ شوق سے دیکھا کرتا ہے۔
دس مئی 1818 کو نیو یارک میں ایک اوپیرا ہو رہا تھا۔ جس میں برطانوی اداکار ولیم چارلس پرفارم کررہا تھا کہ اچانک تماشائیوں کو اس بات پر اعتراض شروع ہوگیا کہ اس ڈرامے میں امریکیوں کی معاشرت کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ لہٰذا توڑ پھوڑ اور ہنگامے شروع ہوگئے۔
لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے فائرنگ شروع کردی۔ جس کے نتیجے میں 22 آدمی موقع پر ہی ہلاک ہوگئے تھے اور بے شمار زخمی بھی ہوئے۔
گیارہ مئی 1994 میں ساؤتھ افریقا میں نیلسن منڈیلا نے صدر کے عہدے کا حلف اٹھایا تھا۔ نیلسن منڈیلا ایک آدمی کا نام نہیں بلکہ پوری تاریخ اور عہد کی بچی آواز کا نام ہے۔ نیلسن منڈیلا 18 جولائی کو جنوبی افریقا کے علاقے ٹرانسکی میں پیدا ہوئے۔ وہ ساؤتھ افریقا کے پہلے منتخب جمہوری صدر تھے۔ نسلی امتیاز کے کٹر مخالف۔ افریقی نیشنل کانگریس کے کے سربراہ بھی رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے 27 برس قید میں گزار دیے۔ ان کی وفات 5 دسمبر 1913 کو ہوئی تھی۔ دنیا بھر سے بے شمار اعزازات اور محبتیں حاصل کیں۔ آج پوری دنیا میں نیلسن منڈیلا ظلم اور ناانصافی کے خلاف ایک تحریک کا نام بن گیا ہے۔
گیارہ مئی 1951 کو پاکستان میں ایک قابلِ قدر علمی درس گاہ کا قیام عمل میں آیا اور وہ ہے کراچی یونیورسٹی۔
بارہ مئی 1910 روس نے برلن سے محاصرہ ختم کردیا جو ایک سال جاری رہا تھا۔ اس دوران برلن میں لاکھوں شہری پھنس کر رہ گئے تھے۔ لوگ بھوک پیاس سے مرنے لگے

تھے۔اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے امریکی اور برطانوی طیاروں نے خوراک پہنچانی شروع کر دی۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ان طیاروں نے ڈھائی لاکھ پروازیں کیں۔

ہر تھوڑی دیر بعد ایک طیارہ اترتا تھا جو خوراک کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے مٹھائیاں اور کھلونے بھی لے کر آتا۔ برلن کے بچے انہیں کینڈی بمبار کہا کرتے تھے۔

12 مئی 1820 کو مشہور برطانوی نرس فلورنس نائٹ اینگل کی پیدائش کا دن ہے۔اس نے جنگ کے دوران ترکی جاکر لوگوں کی اتنی خدمت کی کہ اس کی وجہ سے نرسنگ کا شعبہ قابلِ احترام ہوگیا۔آج پوری دنیا میں لوگ اس کے نام کو جانتے ہیں۔اس پر گیت لکھے گئے ہیں۔دنیا بھر سے بے شمار اعزازات اس کے حصے میں آئے تھے۔

تیرہ مئی

تیرہ مئی کو Tulip day (گلِ لالہ) ڈے منایا جاتا ہے۔

اس خوبصورت پھول کی سجاوٹ اور اس کا حسن ہالینڈ میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی تاریخ کو 1857 میں برطانوی پیتھالوجسٹ رونالڈ روز کی پیدائش ہوئی تھی۔اس نے 1902 میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

تیرہ مئی 1846 میں امریکا اور میکسیکو کے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی تھی جو دو سال تک جاری رہی اور جس میں بہت سے لوگ مارے گئے۔

اگر انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ انسان کو سوائے جنگ وجدل کے اور کسی بات سے دلچسپی نہیں رہی ہے۔

تیرہ مئی 1981 کو پوپ جان پال پر روم میں اس وقت قاتلانہ حملہ ہوا جب وہ کھلی گاڑی میں جا رہے تھے۔

انہیں دو گولیاں ماری گئی تھیں لیکن وہ بچ گئے۔ صحتیاب ہونے کے بعد انہوں نے دہشت گرد کو معاف کردیا تھا۔

14 مئی 1853 کو گیل بورڈن نے کنڈینسڈ ملک (Condensed milk) بنانے کا طریقہ دریافت کیا۔

14 مئی 1686 میں ڈینیل گبرائیل فارن ہائٹ نے بخار کا اندازہ لگانے کے لیے تھرمامیٹر ایجاد کیا۔اسی کے نام پر فارن ہائٹ تھرمامیٹر ہوا کرتا ہے۔

1796 میں انگلینڈ کے ایک ڈاکٹر ایڈورڈ جینز نے چیچک کے ٹیکے کو بہت موثر بنادیا۔اس کے بعد سے چیچک سے موت کی شرح بہت کم ہوگئی۔

چودہ مئی 1727 میں برطانوی مصور تھامس گلین برو کی پیدائش ہوئی۔وہ ایک باکمال مصور تھا۔اس نے کئی شاہکار تخلیق کیے۔

چودہ مئی 1956 میں پاکستان میں چوہدری محمد علی نے پانچ سالہ منصوبہ پیش کیا۔

14 مئی 2006 کو لندن میں نواز شریف اور بے نظیر کے درمیان چارٹر آف ڈیموکریسی پر دستخط ہوئے۔

پندرہ مئی 1856 میں فرینک ایل باؤم کی پیدائش۔ یہ ایک ایسا رائٹر تھا جس کی لکھی ہوئی سیریز نے تہلکہ مچادیا۔اس کتاب کا نام تھا Wizard of oz اس کتاب پر مشہور فلم ساز ادارے پٹرو گولڈرائن بیکر نے ایک لاجواب فلم بنائی تھی۔ یہ فلم 1939 میں بنی تھی۔

15 مئی 1859 پیری کیوری کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ جس نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر 1903 میں نوبل پرائز حاصل کیا (اس کی بیوی کو آج مادام کیوری کہا جاتا ہے)

پندرہ مئی 1718 میں Jaunes puckle نے دنیا کی سب سے پہلی مشین گن بنائی۔موصوف پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے۔لیکن مشین گن جیسی چیز بنادی۔

سولہ مئی

سولہ مئی 1866 کو پہلا امریکی سکہ جاری ہوا جس کو نکل سے بنایا گیا تھا۔

1763 کو کیسٹ لوئس نکولس نے کرومیم اور بیری لیم دریافت کیا۔

1831 ڈیوڈ ایڈلر کی پیدائش کی تاریخ ہے۔اس نے کاربن مائکروفون اور ٹیلی پرنٹر ایجاد کیا تھا۔

سولہ مئی 1987 جرمن سائنس دان جو ہانسن نے نوبل پرائز حاصل کیا۔

پاکستان میں سولہ مئی 1991 کو شریعت بل پاس ہوا تھا۔

سترہ مئی 1875 میں پہلی بار کن ٹکی ڈربی منعقد ہوئی تھی۔گھوڑوں کی یہ ریس پوری دنیا میں مشہور ہے، اور ہر



سال لاکھوں ڈالرز کی شرطیں لگائی جاتی ہیں۔ 1939 میں گارے پالسن کی پیدائش ہوئی۔

1839 میں سترہ مئی کو واٹر وہیل رجسٹر کروایا گیا تھا۔

اسے Loran kins نے پیٹنٹ کروایا تھا۔

نیویارک میں سترہ مئی 1792 کو وال اسٹریٹ سڑک پر کچھ تاجر جمع ہوکر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ وہاں سے انہوں نے اسٹاک ایکسچینج کا کام شروع کیا۔سامنے ایک بڑا سا کمرا بنا ہوا تھا۔اگر موسم خراب ہوتا تو وہ اس کمرے میں جاکر بیٹھ جاتے۔ اگر موسم بہتر ہوتا تو درخت کے نیچے آجاتے۔ آج وال اسٹریٹ کا وہی نیویارک اسٹاک ایکسچینج پوری دنیا کے معاشی اور مالی معاملات کو کنٹرول کرتا ہے۔پوری دنیا کے تاجروں کی نگاہیں اسی اسٹاک ایکسچینج کے بھاؤ اور تیزی پر لگی رہتی ہیں۔

اٹھارہ مئی

اٹھارہ مئی 1980 میں ایک بڑا حادثہ اس صورت میں ہوا کہ ماؤنٹ سینٹ ہیلن پھٹ پڑا تھا۔یہ پہاڑ سیاٹل سے 96 میل کے فاصلے پر ہے۔یہ مدتوں سے خاموش تھا۔ لیکن اٹھارہ مئی 1980 کو اچانک پھٹ پڑا تھا۔جس میں بہت سے افراد ہلاک ہوئے تھے۔ہلاکتوں کے علاوہ تباہی بہت ہوئی تھی۔بے شمار مکانات، ریلوے لائن، پل وغیرہ تباہ ہوگئے۔

18 مئی 1827 میں مشہور مصور ریمبراں نے جارج واشنگٹن کو اس کا پورٹریٹ تحفے میں پیش کیا تھا۔

18 مئی 1872 اپنے عہد کے ایک بہت بڑے مفکر، دانشور اور فلاسفر برٹرینڈ رسل کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ رسل برطانیہ میں پیدا ہوا تھا۔ یہ عظیم دانشور فروری 1970 میں انتقال کرگیا۔رسل نے کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ اس کی علمیت کے کئی پہلو ہیں۔ اسے Ethics Meths Logic، Philosaphy وغیرہ میں دل چسپی تھی۔ فلاسفی آف سائنس اور فلاسفی آف ریلیجن کے شعبوں میں بھی اس نے بہت کام کیے۔ 1967-68 ,69 میں اس کی تین جلدوں میں لاجواب سوانح عمری شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد بھی بے شمار ہے۔1950 میں اسے نوبل پرائز ملا۔

اٹھارہ مئی 1804 کو نپولین بوناپارٹ فرانس کا حکمران بنا۔اس کی تاج پوشی پوپ پائیس نے کی تھی۔اس کا زمانہ 1769 سے 1821 تک کا ہے۔فرانس کا سپہ سالار اور بادشاہ۔اس کی زیرِ قیادت فرانسیسی فوجوں نے بے شمار ممالک فتح کیے۔

اٹھارہ مئی 1998 کو بیسویں صدی کا ایک بڑا مقدمہ مائکروسوفٹ کے خلاف قائم ہوا کہ یہ کمپنی غلط حربے استعمال کررہی ہے۔

پاکستان میں 18 مئی 1950 میں پشاور یونیورسٹی قائم ہوئی۔

انیس مئی کو سرکس ڈے ہوتا ہے۔ یہ سرکس ڈے Ringling brothers کے قائم کیے ہوئے سرکس کی یاد میں منایا جاتا ہے۔یہ سرکس 1884 میں شروع ہوا تھا۔ یہ سات ہم شکل بھائی تھے جو Lowa میں پیدا ہوئے۔

ان کے نام Charles ringling al- ringling- alf ringling وغیرہ ہیں۔ان بھائیوں نے مل کر ایک چھوٹی سی سرکس کمپنی قائم کی تھی جو ترقی کرتے کرتے دنیا کی چند بڑی سرکس کمپنیوں میں سے ایک ہوگئی۔ یہ کمپنی آج تک قائم ہے۔

انیس مئی 1890 میں ویت نام کے لیڈر ہوچی منہ کی پیدائش ہوئی جبکہ وفات 1969 میں ہوئی تھی۔

ہوچی منہ ایک چھوٹے سے گاؤں کم لین میں پیدا ہوا۔ انڈر چائنیز کیمونسٹ پارٹی بنائی۔ اس نے 1945 میں ویت نام کی آزادی کا اعلان کیا اور 1969 تک صدر کے عہدے پر رہا۔

ہوچی منہ کا مطلب ہوتا ہے وہ جس نے عرفان حاصل کیا۔

انیس مئی 1925 عظیم سیاہ فام لیڈر اور سماجی کارکن میلکم ایکس کی پیدائش کی تاریخ ہے۔اس نے ساری زندگی انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کی۔اسے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ جیل میں اس نے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا اور مسلمان ہوگیا۔1952 میں رہائی ہوئی۔ رہائی کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے لیے کام کرتا رہا۔اس نے حج بھی کیا تھا۔ فروری 1963 میں اس وقت اسے قتل کیا گیا جب وہ مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب کررہا تھا۔اس کا نام آج بھی احترام سے لیا جاتا ہے۔

19 مئی سیاہ فام افریقی نژاد امریکی رائٹر کی پیدائش

کی تاریخ۔لورین فس ہیری کی پیدائش 1930 میں ہوئی تھی۔اس نے کئی ڈرامے لکھے۔اس کے مشہور ڈراموں میں Araisin in the sun اور Tabe young gitted بہت مشہور ہیں۔اس خاتون کی اہمیت اس لیے ہے کہ یہ پہلی سیاہ فام ہے جس کا ڈراما براڈ وے میں کھیلا گیا۔

بیس مئی

Liwd bargh flight day منایا جاتا ہے۔اس کی ابتدا 1927 سے ہوتی ہے۔چارلس لینڈ برگ ایک پچیس سالہ باہمت نوجوان تھا۔1927 میں اس نے تنہا نیویارک سے فرانس تک پرواز کی تھی۔تقریباً 3600 میل تک۔اس کی یہ پرواز نان اسٹاپ تھی۔اس کارنامے پر اس نے کئی اعزازات بھی حاصل کیے۔

بیس مئی 1830 میں B.Hyde نے فاؤنٹین پین ایجاد کیا جو دنیا بھر میں ہر لکھنے والے شخص کی ضرورت بن گیا تھا۔

1851 میں جرمنی میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے موسیقی کو گھر گھر پہنچادیا۔اس کا نام ایملی برنا لکر تھا اور اس کی ایجاد تھا گراموفون۔

20 مئی 325 ad روم میں پہلی عیسائی سلطنت قائم ہوئی تھی۔حلف برداری کی تقریب Nicaea میں ہوئی تھی۔جس میں 300 بشپ شریک ہوئے تھے۔

1932 میں Raielia نام کی ایک خاتون نے تنہا پرواز کر کے اٹلانٹک پار کیا تھا۔

بیس مئی 1860 میں Theodor herzl کی پیدائش ہوئی تھی۔ہنگری میں پیدا ہونے والا یہ شخص جدید (صیہونیت) Zionism کا بانی تھا۔

اکیس مئی

اکیس مئی 1881 میں امریکن ریڈ کراس کی بنیاد رکھی گئی۔یہ کارنامہ کلاوا بارٹن نے انجام دیا تھا۔

اکیس مئی 1991 کو ہندوستان کے وزیر اعظم راجیو گاندھی کا قتل ہوا۔

بائیس مئی

بائیس مئی 1819 کو نیویارک میں پہلی سائیکل متعارف ہوئی۔

بائیس مئی 1828 میں البرٹ گراف کی پیدائش ہوئی۔اس شخص کو آنکھوں کے آپریشن کا بانی کہا جاتا ہے۔

البرٹ نے جدید Opthalmalogy متعارف کروایا۔

بائیس مئی 1911 میں روس کے ریاضی دان اناطولی کی پیدائش ہوئی تھی۔اس نے گیم تھیوری پیش کی تھی۔

22 مئی 2004 میں پاکستان دوبارہ کامن ویلتھ میں شامل ہوا۔اسی تاریخ کو 1972 میں صدر نکسن نے روس کا دورہ کیا تھا۔اس دورے کی اہمیت اس لیے ہے کہ وہ پہلا امریکی صدر تھا جس نے روس کا دورہ کیا۔

بائیس مئی 1859 کو اسکاٹ لینڈ میں مشہور کردار شرلاک ہومز کی خالق آرتھر کانن ڈائل کی پیدائش ہوئی تھی۔آرتھر کا تخلیق کردہ یہ کردار پڑھنے والوں کو زندہ محسوس ہوتا ہے۔

بائیس مئی 1907 میں انگلینڈ میں لارنس اولیور کی پیدائش ہوئی۔اولیور ایک عظیم اداکار تھا۔اسے بیسویں صدی کا اہم ترین اداکار سمجھا جاتا ہے۔نوبار آسکر ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا اور تین بار آسکر ایوارڈ حاصل کیا۔

تئیس مئی

23 مئی 1810 میں مشہور جرنلسٹ خاتون مارگریٹ کیمبرج پورٹ میں پیدا ہوئی۔وہ نیویارک ٹریبون کے لیے کام کرتی تھی۔اس کی اہمیت اس لیے ہے کہ وہ پہلی امریکی صحافی تھی جس نے ملک سے باہر جا کر رپورٹنگ کی۔اس کی مشہور کتاب انیسویں صدی کی عورت 1945 میں شائع ہوئی تھی۔

چوبیس مئی

چوبیس مئی 1830 میں بچوں کی مشہور نظم Mary had a little lamb شائع ہوئی تھی۔یہ بہت چھوٹے بچوں کے لیے ایک بہت خوبصورت گیت ہے۔اس گیت کو سارہ جوزف نے لکھا تھا۔

سارہ کی یاد میں اس کا مجسمہ ٹاؤن ہال میں نصب کر دیا گیا ہے۔یہ وہ گیت ہے جو آج بھی اسکولوں میں پڑھنے والے ہر بچے کو یاد کرائی جاتی ہے۔

گیت کا تھیم کچھ یوں ہے کہ میری ایک پیاری سی بچی تھی جس کے پاس ایک بھیڑ تھی جو میری سے اتنا پیار کرتی کہ وہ ہر جگہ اس کے ساتھ پہنچ جاتی۔اسکول میں بچے میری کا مذاق اُڑایا کرتے کہ وہ ایک بھیڑ کو اپنے ساتھ رکھتی ہے۔وغیرہ۔

24 مئی 1844 میں پہلا سورس کوڈ پیغام واشنگٹن



بالٹی مور بھیجا گیا تھا۔یہ پیغام سموئیل مورس نے بھیجا تھا۔پیغام یہ تھا "Whathath God wrought"

1982 میں کاپی رائٹ کو بہتر بنایا گیا تھا۔

24 مئی (ہجری تاریخ کچھ اور ہو سکتی ہے) کو جنگِ خیبر ہوئی تھی۔ہجری مہینا محرم کا تھا۔اس جنگ میں حضرت علیؓ کو پرچم دیا گیا تھا۔

25 مئی 1994 کو بیس برس کی جلاوطنی کے بعد مصنف الیکو نڈر کی وطن واپسی ہوئی تھی۔کہا جاتا ہے کہ اہلِ قلم سچ لکھنے اور سچ بولنے سے نہیں کتراتے۔الیکو نڈر بھی ایسا ہی مصنف تھا۔اس نے روس کے جیل خانوں اور تشدد پر ایک لاجواب کتاب The gulag Archipalogo لکھی تھی۔جس پر اسے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔

اسی تاریخ کو 1803 میں امریکی مصنف اور فلاسفر والف ایمرسن کی پیدائش ہوئی تھی وہ بوسٹن میں پیدا ہوا۔

چھبیس مئی

26 مئی 1857 میں رابرٹ موشاد نے لوہے سے اسٹیل بنانے کا طریقہ متعارف کروایا۔

26 مئی 1993 کو پاکستان میں سپریم کورٹ نے نواز شریف کی حکومت بچالی تھی۔

ستائیس مئی

ستائیس مئی 1796 میں جیمز سلیکین نے پیانو رجسٹرڈ کروایا تھا۔

ستائیس مئی 1930 میں ماسکنگ ٹیپ پیٹنٹ ہوا۔1937 میں گولڈن گیٹ برج کا افتتاح ہوا۔یہ خوبصورت اور شاندار پل سان فرانسسکو کیلی فورنیا میں واقع ہے۔اسے دنیا کا طویل ترین پل بھی کہا جاتا ہے۔اس کی لمبائی اتنی زیادہ ہے کہ گاڑیاں دیر تک اس پر سفر کرتی رہتی ہیں۔اس پل میں سرخ اور نارنجی رنگ استعمال کیے گئے ہیں تا کہ دھند اور کہر میں بھی دور سے نظر آجائے۔اس پل کو امریکی ماہرِ تعمیرات جوزف بی اسٹراس نے تخلیق کیا تھا۔

اٹھائیس مئی

28 مئی 1961 کو لندن کے ایک وکیل پیٹر برنسن نے ایک بین الاقوامی ادارہ ایمنسٹی انٹرنیشنل قائم کیا۔پرتگال میں کچھ طالب علموں کو قید کر دیا گیا تھا۔ان کی آزادی کے لیے اس شخص نے ایک سال تک آواز بلند کی۔جدوجہد کی۔یہ تحریک اس نے ایمنسٹی کے نام پر چلائی تھی۔جو ایمنسٹی انٹرنیشنل بن گئی۔یہ تحریک پوری دنیا میں انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے ایک موثر آواز بھی جاتی ہے۔

29 مئی 1826 کو Edenazer نے دنیا کا پہلا ٹشو پیپر بنایا تھا جو آج دنیا کے ہر گھر کی ضرورت بن گیا ہے

29 مئی 1453 کو ترکوں نے بازنطینی سلطنت سے Constantinapale پر قبضہ کیا اور اس کا نام استنبول رکھ دیا جو آج تک چلا آرہا ہے۔استنبول کو عثمانی دور میں دارالخلافہ بنادیا گیا تھا۔

29 مئی 1880 میں مشہور جرمنی مورخ اور فلاسفر اسپنگلر کی پیدائش ہوئی۔اس کی لاجواب کتابوں میں ایک The Declina of the west ہے۔اس کتاب کو دنیا کی چند اہم ترین کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

تیس مئی 1848 کو ولیم ہنگ نے آئس کریم فریزر پیٹنٹ کروایا تھا۔

30 مئی 1783 کو امریکا کے پہلے اخبار دی پنسلوانیا ایوننگ پوسٹ کا اجرا ہوا تھا۔

30 مئی 1672 کو روس میں ماسکو کے قریب پیٹر دی گریٹ کی پیدائش ہوئی۔یہ شخص روسی بادشاہت کا بانی تھا۔

اس بادشاہ نے ایسے کئی کام کیے جن کی وجہ سے اسے گریٹ کہا جاتا ہے۔

جیسے روس کیلنڈر کو جدید کیا۔اس زمانے میں روسی رسم الخط بہت پیچیدہ اور مشکل تھا۔ اس نے رسم الخط کو آسان کیا۔وہ پہلا شخص تھا جس نے عربی ہندسوں کے استعمال کا طریقہ رائج کیا۔اس کی موت کے بعد اس کی بیوی کیتھرین ملکہ بنی تھی۔

اکتیس مئی

1981 میں J.William کی پیدائش ہوئی تھی۔

31 مئی 1884 میں پنسلوانیا میں بے پناہ بارش کے نتیجے میں تین ہزار آدمی مر گئے تھے۔

اسی تاریخ اور سال کو امریکی شاعر Walt whit man کی پیدائش ہوئی تھی۔اس کی نظم Leaves of grass کا شمار کلاسک میں کیا جاتا ہے۔

# الوداع

حسن رزاقی

اپنی قومی ایئرلائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئرلائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب وروز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

**باذوق قارئین کے لیے توشۂ خاص**

سیر سپاٹے کے علاوہ پی آئی اے میں نوکری کے تین سال مکمل کرنے پر ایک اور بہت کارآمد سہولت ملتی تھی، پڑھائی کے لیے لمبے عرصے کی چھٹی۔ ایک پنتھ دو کاج، نوکری بھی سلامت اور ڈگری بھی ہاتھ میں۔ میں اس سہولت سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس لیے ایک سال کی چھٹی کی درخواست دے دی۔ جولائی کا مہینا تھا۔ امریکن یونیورسٹی میں میں پہلے ہی داخلہ حاصل کرچکا تھا۔ اب عملی اقدام کا وقت آچکا تھا۔ دھڑکتے دل اور لرزتے پیروں سے، تمام وسوسوں کو پس پشت ڈال کر پرسنل آفس کا رخ کیا کہ معلوم کروں کہ میری چھٹی کی درخواست کا کیا بنا۔

سوال کرتے ہی جواب ملا کہ ایک مہینا سے اوپر ہوگیا، درخواست ایڈمن کے پاس منظوری کے لیے پڑی ہے۔ انتظار فرمایئے۔

میں انتظار فرماتا رہا، یہاں تک کہ کلاسیں شروع ہونے میں چند دن رہ گئے۔ دوبارہ پرسنل آفس گیا تو ان کا وہی جواب تھا۔ ”درخواست ڈائریکٹر ایڈمن کے پاس پڑی ہوئی ہے۔“

امریکن یونیورسٹی میں کلاسیں شروع ہوچکی تھیں مگر میری چھٹی کی درخواست منظور نہیں ہوئی تھی۔ میں سیدھا ڈائریکٹر ایڈمن کے دفتر پہنچا کہ بذاتِ خود ان سے بات کرلوں۔ وہ ابھی دفتر نہیں آئے تھے۔ میں نیچے بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔

ان کا چپراسی ان کے پیچھے ان کا بریف کیس اٹھائے چل رہا تھا۔ افسر شاہی ہمارے دفتروں میں پوری طرح بیدار تھی۔ افسر اپنا بوجھ اٹھانا ہتک سمجھتا تھا۔ میں بھی ان دونوں کے پیچھے ہولیا۔

اوپر پہنچ کر عرضی بھجوائی کہ ملاقات مطلوب ہے۔ عرضی شرفِ قبولیت کو پہنچی۔ انہوں نے پوچھا۔ ”کیا چاہتے ہو؟“

میں نے عرض کیا۔ ”حضور میری چھٹی کی درخواست آپ کے پاس کئی ہفتوں سے پڑی ہوئی ہے اس کی منظوری چاہتا ہوں۔“

”آپ کو کیسے معلوم کہ درخواست میرے پاس پڑی ہے؟“

”پرسنل والوں نے بتایا۔“

وہ برہم ہوگئے کہنے لگے۔ ”پرسنل والوں نے آپ کو یہاں بھیجا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

انہوں نے مزید برہم ہوتے ہوئے کہا۔ ”پھر آپ کیوں آئے آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا۔“

ملاقات ختم ہوچکی تھی۔

دو گھنٹے بعد پرسنل والوں کا فون آیا۔ انہوں نے خوشخبری سنائی ”آپ کی درخواست ”نامنظور“ ہوکر آگئی ہے۔ آکر لے جایئے۔“

مجھے اس خوشخبری کا اندازہ پہلے ہی ہوچکا تھا۔ میں



پرسنل آفس تو نہیں گیا البتہ ٹریول ایجنسی جا کر امریکا کی سیٹ کنفرم کروالی۔

☆☆☆

آج میری امریکا روانگی تھی۔ سامان گاڑی میں رکھا جاچکا تھا۔

”سامان اچھی طرح سے دیکھ لیا ہے؟“ ماں نے سوال کیا۔

”ایک سوٹ کیس اور ایک بریف کیس ہی تو ہے۔ اچھی طرح سے کیا دیکھنا۔“ میں نے جواب دیا۔

”پھر بھی ایک دفعہ اور دیکھ لو۔“ ماں کی خلش کم نہیں ہوئی تھی۔

”جی ایک دفعہ اور دیکھ لیا۔ اب آپ گاڑی میں بیٹھ جائیں۔“ میں نے ماں سے استدعا کی۔ ہم سب گاڑی میں بیٹھ کر ائرپورٹ روانہ ہوگئے۔

گاڑی اسٹار گیٹ سے ہوتی ہوئی ائرپورٹ کی حدود میں داخل ہوئی۔ مڈوے ہاؤس ہوٹل کراس کرتے ہوئے ٹرمنل پر آکر رک گئی۔ میں نے ماں باپ سے رخصت لی اور پورٹر کو سوٹ کیس اٹھانے کا اشارہ کیا۔ ائرپورٹ پر قلی، اپنے آپ کو قلی کہلانے میں ہتک محسوس کرتے ہیں، پورٹر کہلاتے ہیں۔

میں بے خیالی میں پی آئی اے کے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا حالانکہ میری پرواز سیرین عرب ائرلائن سے تھی۔ اس غلطی کا احساس جلد ہوگیا اور میں ائرلائن کے کاؤنٹر پر جا پہنچا، وہاں اپنا بورڈنگ کارڈ لیا اور لاؤنج کی طرف روانہ ہوگیا۔ پچھلے پونے چار سال میں میرا تقریباً ہر روز اس لاؤنج میں آنا جانا ہوتا تھا اور میں اس ٹرمنل سے کئی دفعہ مختلف پروازوں پر روانہ ہوچکا تھا مگر آج اس لاؤنج سے روانہ ہوتے وقت مجھے ایک طرح سے بچھڑنے کا افسردہ سا احساس ہورہا تھا۔

جہاز میں داخل ہوا تو جہاز کا ماحول کچھ اجنبی سا محسوس ہوا۔ کئی سال بعد جب مجھے سعودی ائرلائنز کے لیے نئے جہاز خریدنے کا اتفاق ہوا تو یہ عقدہ کھلا کہ جہاز تو ہر ائرلائن کے ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں، ان میں تکنیکی اعتبار سے کوئی خاص انفرادیت نہیں ہوتی۔ ساری انفرادیت اندرونی آرائشی اور سیٹوں وغیرہ کے انتخاب سے پیدا کی جاتی ہے۔ ہر ائرلائن چاہتی ہے کہ اس کا اپنا انفرادی ٹھپا ہو جس سے وہ پسنجر لائلٹی پیدا کرسکے۔ جب ایک مسافر اسی ائرلائن کے ایک نوع کے جہاز سے دوسری نوع کے جہاز
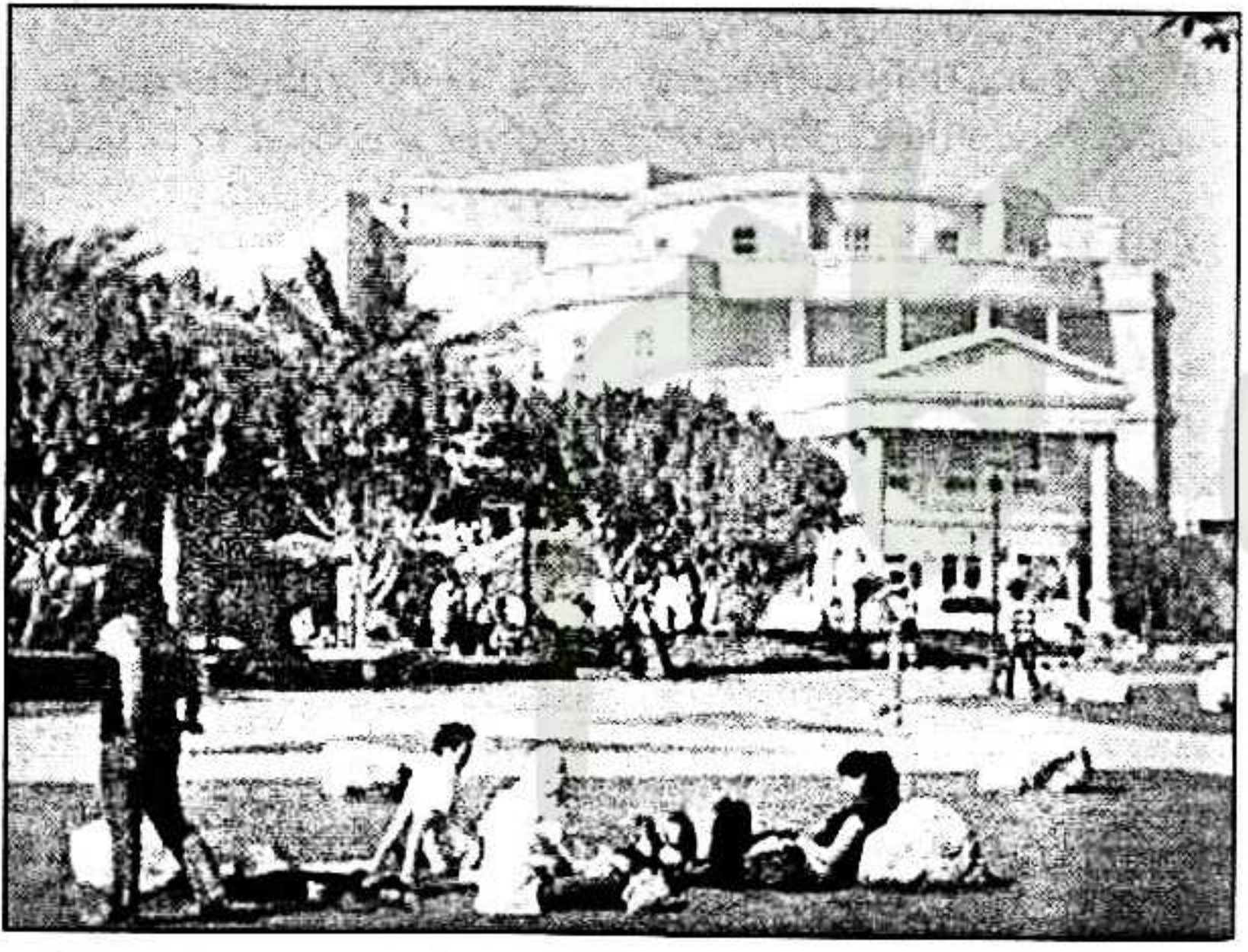
میں داخل ہوتو اس کو اجنبیت کا احساس نہ ہو۔ یوں معلوم ہو کہ وہ ایک ہی گھر کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں داخل ہوا ہے۔ ایسا ماحول پیدا کرنے میں کیبن کے عملے کے یونیفارم کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ مردانہ عملے کے لباس کا اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا ائر ہوسٹس کے لباس سے پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ائرلائن کا مردانہ عملہ پتلون قمیص میں ہی ملبوس ہوتا ہے۔ ان کے کپڑوں کے رنگ بھی تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ لیکن زنانہ لباس اکثر مختلف ملکوں کے لباسوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ مثلاً شلوار قمیص، ساڑی وغیرہ اسکرٹ کے مقابلے میں منفرد ہوتی ہیں۔ یہی انفرادیت ائرلائن کے کھانوں میں بھی ہوتی ہے۔ سیرین ائرلائن کا کھانا بھی اسی اصول کے تحت بنایا گیا تھا۔

مشروب تو وہی تھے جو ہر دوسری ائرلائن میں دیے جاتے ہیں لیکن کھانا عربی طرز اور ذائقے کا تھا۔ میں نے سب سے پہلے سلاد پر ہاتھ صاف کرنا چاہا۔ سلاد میں مختلف چیزیں تھیں لیکن ایک چیز ایسی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سلاد کے اوپر ایک ہرے رنگ کی کچی کھجور کی طرح کی کوئی چیز رکھی تھی۔ میں نے اس کو احتیاط کے ساتھ اٹھا کر منہ میں رکھا، چبالیا۔ ذائقے نے عجیب احساس کرایا، فوراً تھوک دیا۔ ائر ہوسٹس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ زیتون ہے۔

دنیا میں چند خوراکیں ایسی ہیں کہ جن کو کھانے کے لیے ذوق پیدا کرنا پڑتا ہے۔ زیتون اور کیویار بھی ان غذاؤں میں شامل ہیں۔ زیتون کھانے کا ذوق تو کسی نہ کسی طرح پیدا ہوگیا۔ مگر کیویار سے اللہ بچائے۔

زیتون کی بے شمار اقسام ہوتی ہیں۔ ہر قسم کا مزہ مختلف۔ زیتون کے بارے میں جاننے سے پہلے میرا خیال تھا کہ دنیا میں آم ہی ایک ایسا میوہ ہے، جس کی بے شمار قسمیں ہیں۔ لیکن پتا چلا کہ جس میوے کی دنیا میں سب سے زیادہ اقسام ہیں وہ کھجور ہے۔ کھجور بھی شاید ایک معجزہ ہے۔ اس لیے کہ یہ صحراؤں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے پکنے کے لیے گرمی بہت ضروری ہے۔ لیکن ریت میں ایسی جگہوں پر اگنے کے باوجود جہاں پانی کمیاب ہوتا ہے کھجور میں رطوبت اور بے پناہ غذائیت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحرا نشین لوگوں کو اگر صرف پانی اور کھجور ہی میسر ہو تو ان کی توانائی کے لیے کافی ہے۔ یہ ایک معجزہ ہی ہے کہ ریت میں سے اتنی وافر غذائیت دستیاب ہوجائے۔

کھانا کھانے کے بعد نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں خواب میں پنوعاقل میں زیتون کی کاشت کررہا تھا۔ درخت زیتون کے پھل سے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے جیسے ہی زیتون توڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا میری سیٹ کو دھکا لگا۔ سارے زیتون زمین پر بکھر گئے۔ زیتون بکھیرنے کی ذمے داری ائر ہوسٹس کے سر تھی، وہ میری سیٹ کی پشت کو سیدھا کررہی تھی جس کے دھکے سے میرے سارے زیتون بکھر گئے تھے۔ کیبن میں اناؤنسمنٹ ہورہا تھا۔ خواتین و حضرات انشاء اللہ اب سے تھوڑی دیر بعد ہم دمشق کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ......"

کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو نیچے کا منظر اتنا ہی بے رونق تھا جتنا بے رونق کراچی ائرپورٹ پر لینڈنگ کا منظر ہوا کرتا تھا۔ اب تو کراچی کے ہوائی اڈے پر اترتے وقت ہرے بھرے درخت دکھائی دیتے ہیں لیکن آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے کراچی ائرپورٹ کے نزدیک درخت ڈھونڈنے کے لیے دوربین درکار ہوتی تھی۔ چند منٹ بعد جہاز دمشق کے ائرپورٹ پر اتر چکا تھا۔ لینڈنگ اتنی آہستگی سے ہوئی کہ پتا ہی نہ چلا کہ جہاز نے کب زمین کو چھولیا۔ فیدر ٹچ لینڈنگ، بعض پائلٹ اتنی مہارت اور آہستگی سے جہاز اتارتے ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ جہاز زمین پر اتر چکا ہے۔ اناؤنسمنٹ کی آواز ایک دفعہ پھر گونجی۔ "خواتین و حضرات ہم دمشق کے ہوائی اڈے پر اتر چکے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ......"

اچھا ہوا اس نے اناؤنس کردیا ورنہ مسافروں کو پتا ہی نہ چلتا۔

مسافر جہاز سے اتر کر ہوائی اڈے کی عمارت میں داخل ہوچکے تھے۔ یہ پرواز دمشق تک تھی اور مجھے دمشق سے لندن جانا تھا پھر آگے لندن سے نیویارک۔ سیرین ائرلائن کے زمینی عملے نے لندن جانے والے مسافروں کو ایک جگہ اکٹھا کیا پھر ان سے ان کے پاسپورٹ لے کر ان پر عبوری ویزا لگوانے امیگریشن کے دفتر چلا گیا۔ لندن کی پرواز دو دن بعد تھی یہ دو دن ہم لوگوں کو دمشق میں ہی گزارنے تھے۔ ہوٹل وغیرہ کا انتظام ائرلائن کی ذمے داری تھی۔

کچھ دیر بعد ہمارے پاسپورٹ پر عبوری ویزے لگ کر آگئے۔ ائرلائن کی بس مسافروں کو شہر لے جانے کے لیے باہر تیار کھڑی تھی۔ جیسے ہی ائرپورٹ کی عمارت سے



باہر نکلے ہوا کے گرم جھونکے نے استقبال کیا۔ مزاج ٹھکانے آگئے۔ جلدی سے بھاگ کر بس میں سوار ہوئے۔ حالانکہ ستمبر کا مہینا تھا اور صبح کا وقت تھا لیکن گرمی اپنے عروج پر تھی۔ پنوعاقل کی گرمی یاد آگئی۔ بس ائرکنڈیشنڈ تھی ورنہ دم بخت ہوجاتے۔ بس میں بیٹھے تو جان میں جان آئی۔ بس نے شہر کے لیے کوچ کیا۔

دنیا بھر میں ہوائی اڈے شہروں کی مدد سے باہر تعمیر کیے جاتے ہیں تاکہ عام شہریوں کی زندگی ہر وقت کے جہازوں کے اترنے اور پرواز کرنے کے شور شرابے سے محفوظ رہ سکے۔ لیکن شہروں کی دن بدن تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی نے ہوائی اڈوں کی منصوبہ بندی کرنے والوں کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ زیادہ تر ہوائی اڈے جو کبھی شہر سے کئی میل دور ہوا کرتے تھے اب شہری آبادی کے بیچوں بیچ آچکے ہیں۔ کراچی کا ائرپورٹ اس شہری پھیلاؤ کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔ آج سے چالیس پچاس سال قبل ائرپورٹ جانے والا راستہ ویران ہوا کرتا تھا۔ دمشق ائرپورٹ کا بھی 1970 میں یہی حال تھا۔ یہ سڑک تقریباً ویران تھی۔ اِکّا دُکّا گاڑیاں چل رہی تھیں۔ سڑک کے آس پاس کی آبادی بھی شہری آبادی کے بجائے دیہی آبادی معلوم ہورہی تھی۔ صحرائی علاقہ ہونے کی بنا پر پیڑ پودوں کی کمی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف اونچے نیچے ٹیلوں پر کچھ کچے کچھ پکے، کچھ چھوٹے اور کچھ درمیانے سائز کے گھر بنے ہوئے تھے جن کے باہر بچے کھیل رہے تھے۔ دوڑ بھاگ کررہے تھے۔ اس کے برعکس شہر کا علاقہ اچھا تھا۔

بس ہوٹل پہنچ چکی تھی۔ ہوٹل ڈھنگ کا تھا۔ انتظام اچھا تھا۔ تمام آنے والے مسافروں کو چابیاں تھمادی گئیں۔ سامان ان کے کمروں میں پہنچادیا گیا۔ مسافروں میں پانچ یا چھ پاکستانی تھے باقی غیر ملکی تھے۔ پاکستانی مسافروں نے طے کیا کہ تازہ دم ہوتے ہی شہر کی سیر کو نکل لیا جائے۔ شہر بارونق تھا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ آج کل دمشق میں ایک صنعتی نمائش لگی ہوئی ہے۔ شام کے وقت نمائش جانے کا پروگرام بنا۔

شہر سے واپس آئے تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہوچلا تھا۔ ہم سب نے ایک ہی میز پر کھانا کھایا۔ ہمارے گروپ کے تمام لوگ پاکستان میں ہی رہائش پذیر تھے سوائے ایک صاحب کے جو کہ جرمنی میں رہتے تھے۔ اپنے رشتے داروں سے ملنے پاکستان آئے تھے اب جرمنی واپس جارہے تھے۔ یہ صاحب تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جرمنی گئے تھے مگر پہلے تو جرمنی کی محبت میں گرفتار ہوئے پھر ایک دخترِ جرمن کی محبت میں، اور جرمنی کے ہی ہوکر رہ گئے۔

ویٹر کھانے کا آرڈر لینے آیا تو آرڈر دینے کی ذمے داری ان کے حصے میں آئی۔ اس لیے کہ ویٹر انگریزی سے نابلد تھا اور ہم لوگ عربی سے۔ ویٹر انگریزی کے بجائے فرانسیسی میں بات کررہا تھا اور ہمارے جرمن پاکستانی دوست اس کی زبان سمجھ رہے تھے۔ کھانے کا مینیو بھی عربی اور فرانسیسی میں تھا جو ہم لوگوں کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس موقع پر بھی ہمارے جرمن دوست کی ترجمانی کام آئی۔ انہوں نے سب کی پسند معلوم کرنے کے بعد انتہائی ادب کے ساتھ ویٹر کو کھانے کا آرڈر دیا۔ ویٹر کے چلے جانے کے بعد وہ ہم لوگوں سے مخاطب ہوئے۔

"مجھے پاکستان میں یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ ہمارے ہاں ابھی تک امیر غریب کا فرق ہے۔ غریب سے ہر کوئی حقارت بھرے انداز میں بات کرتا ہے۔ جرمنی اور باقی ماندہ مغربی دنیا میں غریب کی یہ بے توقیری نہیں ہے۔ وہاں مزدور کی بھی عزت ہے۔ صرف قانون کی نگاہ میں ہی نہیں بلکہ آپس کے معاملات میں بھی برابر کا مقام دیا جاتا ہے۔ جمہوریت کی یہی خوبصورتی ہے۔ ان کی باتوں کی سچائی سے کون انکار کرسکتا تھا۔ پھر ان کا رخ پاکستان میں تعلیم کی کمی کی طرف ہوگیا۔ "مجھے اس بات سے بھی دکھ ہوتا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے اتنے سال بعد بھی پاکستان میں تعلیم عام نہیں ہے۔ جمہوریت کی بنیاد تعلیم پر ہے۔ ایک اَن پڑھ آدمی کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنا ووٹ دینے کا حق کس طرح سے استعمال کرسکتا ہے۔ ان کا اختتامی جملہ تھا۔ "تعلیم کے بغیر جمہوریت ڈھکوسلا ہے۔"

ان بیچارے کو شاید اس بات کا علم نہیں تھا کہ ہمارے یہاں کے سرداروں، وڈیروں اور جاگیرداروں نے تعلیم کے پھیلاؤ میں کس قدر گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اس بات سے کلیتہً بے بہرہ تھے کہ جاگیرداروں وغیرہ نے انتہائی سخت جانفشانی اور انتھک محنت کے بعد اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ ان کے زیرِ اثر جو لوگ ہیں ان کو تعلیم حاصل کرنے کا کوئی موقع نہ ملنے پائے۔ اگر خدانخواستہ ان لوگوں نے تعلیم حاصل کرلی اور ان میں وسعت نظری پیدا ہوگئی تو وہ اپنی مرضی سے ووٹ ڈالنے لگیں گے۔ یہ بہت بڑا خطرہ ہے

کہ پھر وہ ان سرداروں کو ان کے رشتے داروں کو ووٹ نہ ڈالیں گے جس کے نتیجہ میں حقیقی جمہوریت نہیں پنپنے پائے گی، کہ ان کے خاندانوں کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی جو پاکستان کے لیے نقصانِ عظیم ہوگا۔ میں نے کوشش کی کہ ان کو اس نظریہ کا قائل کرلوں مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔

نمائش کوئی غیر معمولی نہ تھی۔ ویسی ہی تھی جیسے پاکستانی شہروں میں ہوتی ہے۔ جاپان کا عالمی میلہ دیکھنے کے بعد تو اور بھی بے توقیر لگی۔ البتہ ایک فائدہ یہ ہوا کہ وہاں ایک مقامی صاحب سے ملاقات ہوگئی جو کافی پڑھے لکھے اور شائستہ تھے۔ انگریزی سے بھی واقفیت تھی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ اگر آپ دو دن دمشق میں ہیں تو یہ بہت اچھا موقع ہے کہ آپ بیروت بھی گھوم لیں۔ بیروت یہاں سے بہت نزدیک ہے۔ ہر گھنٹے دو گھنٹے پر ٹیکسیاں بیروت کے لیے چلتی ہیں۔ ویزے کی ضرورت نہیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں تو فوراً تیار ہو گیا لیکن باقی ساتھیوں کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

اگلے دن میں نے ٹیکسی پکڑی اور ڈیڑھ دو گھنٹے بعد بیروت میں تھا۔ سرحد پر معمولی چیکنگ ہوئی، کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ ابھی بیروت میں امن کا دور دورہ تھا۔ عالمی برادری میں بیروت کی مثال دی جاتی تھی کہ وہاں پر کس طرح دو متقابل مذہب، عیسائیت اور اسلام شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں۔ مگر چند ہی سال بعد بیروت کے امن کو دنیا کی کالی نظر کھا گئی اور عیسائی و مسلمان تو ایک رہے۔ مسلمان ہی مسلمان ٹکرانے لگے نتیجہ یہ نکلا کہ اسرائیل کو تحفظ مل گیا۔

بیروت کا پروگرام بلا کسی ارادے کے اچانک بن گیا تھا۔ مجھے نہ لبنان کے متعلق کچھ معلوم تھا نہ ہی بیروت کے بارے میں۔ میں صرف بیروت دیکھنے کے شوق میں یہاں آ گیا تھا اور بلا مقصد سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔

دمشق اور بیروت میں بہت واضح فرق تھا۔ عمارتوں میں، رہن سہن اور لباس میں۔ لبنانی اپنے کپڑوں کے ذوق کے لیے مشہور ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے چہرے کے نقوش بھی خوبصورت ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ایک خوش باش قوم تھی۔ میں انہی باتوں پر غور کر رہا تھا کہ آواز آئی "یا حبیبی السلام علیکم" میں نے سلام کا جواب دیا۔ یہ سلام میرے برابر چلنے والے راہ گیر نے بڑے خلوص سے ادا کیا تھا۔

سلام کے بعد انہوں نے انگریزی میں پوچھا کہ کیا میرا تعلق پاکستان سے ہے۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ساتھ ہی حیرت بھی ہوئی کہ ان کو کیسے معلوم کہ میں پاکستانی ہوں۔ نام ان کا ابوہشام تھا۔ فاتحانہ مسکراہٹ سے بولے پہلی چیز تو یہ کہ اجنبی آدمی شہر میں پہچانا جاتا ہے۔ دوسرے تمہارے جیسے نقوش ہیں ایسے صرف پاکستان اور تیونس کے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ یہ میرا تکا تھا۔ میں پاکستان گھوم چکا ہوں بالکل ویسے ہی جیسے آج تم بیروت گھوم رہے ہو۔ آؤ دوست چل کے بیئر پیتے ہیں۔

میں نے جواب دیا کہ ہر قسم کی شراب سے اجتناب کرتا ہوں۔ کہنے لگے "مجھے معلوم ہے پاکستان میں صرف بڑے لوگ شراب پیتے ہیں۔ لگتا ہے تم اس طبقے سے نہیں ہو۔"

میں نے اپنی کم مائیگی پر افسوس کا اظہار کیا۔ ان کی دعوت بدستور قائم تھی۔ بولے "تو چلو چائے پیتے ہیں۔"

میں تیار ہو گیا۔ ہم ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔

چائے چھوٹے گلاسوں میں آئی جن کی شکل بوتل نما تھی مگر منہ کھلے ہوئے تھے۔ دودھ ندارد، چائے میں پودینے کی پتیاں تیر رہی تھیں، ساتھ میں شکر کے کیوب تھے۔ ان تمام لوازمات کے ساتھ ایک طشتری میں وہی دشمنِ جاں زیتون رکھے ہوئے تھے۔

ابوہشام نے میری طرف کچھ شوخ انداز سے دیکھا اور کہنے لگے۔ "مجھے معلوم ہے کہ یہ دونوں چیزیں پاکستان میں عام نہیں۔ تمہارے یہاں چند لوگ سلیمانی چائے ضرور پیتے ہیں مگر پودینے والی کوئی نہیں پیتا۔ گو کہ یہ نہایت عمدہ اور ہاضم ہوتی ہے۔ اور زیتون کی تو کوئی مثال ہی نہیں۔ سفید کبوتر بھی امن کا نشان ہے کہ وہ زیتون ہی کی شاخ کو اپنی چونچ میں دبا کر اڑتا ہے۔"

آج یہ سطور لکھتے ہوئے مجھے بدلتے ہوئے حالات کی ستم ظریفی پر رونا آتا ہے۔ بیروت کا امن چند سال بعد تباہ ہو چکا تھا۔

ابوہشام نے اپنا کلام جاری رکھتے ہوئے زیتون کی طشتری میری طرف بڑھائی، بولے۔ "اس میوے کے کھانے کے لیے تم کو ذوق پیدا کرنا پڑے گا۔ کھاؤ اس کو کھاؤ۔ چاہے شروع میں اس کا مزہ تم کو کتنا ہی خراب لگے جب تم اس کا ذوق پیدا کر لو گے تو تم کو اس سے زیادہ مزہ کوئی میوہ نہ دے گا۔"

آنے والے برسوں نے ابوہشام کے کہے کو بالکل صحیح ثابت کر دکھایا۔ جب مجھے پاکستان میں زیتون نہیں ملتا



تو میں دبئی سے آنے والوں سے فرمائش کر کے منگواتا ہوں۔ لیکن مجھے ابوہشام سے ایک بات پر اختلاف ہے۔ زیتون ترکاری کی قسم تو ہو سکتی ہے لیکن یہ میوہ کسی صورت نہیں کہلا سکتا۔

دوپہر کے کھانے کا ذمہ ابوہشام نے اپنے سر لے لیا کہ آج کے دن میں ان کا مہمان بن چکا تھا۔ بن بلایا مہمان ہی سہی۔ کہنے لگے "جو کھانا تم لبنان میں کھاؤ گے ایسا عمدہ اور لذیذ کھانا دنیائے عرب میں کہیں اور نہیں ملے گا۔ لبنانی کھانا اس خطے کا بہترین کھانا ہے۔"

کھانا کھانے کے بعد مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ ابوہشام نے لبنانی کھانے کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ حرف بہ حرف سچ تھا۔ اِلّا یہ کہ کئی سال بعد جب مجھے عمان میں بھنا ہوا گوشت کھانے کا اتفاق ہوا تو اس کو بھی میں نے اسی طرح لذیذ پایا۔

کھانے کے بعد ابوہشام نے مجھے ساحلِ سمندر کی سیر کروائی۔ کراچی میں رہنے والوں کے لیے سمندر کوئی عجوبہ نہیں ہے۔ سارا فرق ماحول کا تھا۔ بیروت کے ساحل پر جو بے حجابی ملتی ہے اس کا پاکستان میں کوئی وجود نہیں۔ سہ پہر ہو چلی تھی۔ میں مغرب سے پہلے دمشق واپس پہنچنا چاہتا تھا۔ ہم نے دمشق جانے والی ٹیکسیوں کے اسٹینڈ کا رخ کیا۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچ کر ابوہشام مجھ سے رخصت ہوئے۔ میں نے ابوہشام کو گلے لگانا چاہا مگر جب تک وہ میرے گالوں پر تین چار بوسے جڑ چکے تھے کہ عرب کی دنیا میں دوستی، گرم جوشی اور محبت کے اظہار کا یہی طریقہ ہے۔

دمشق واپس پہنچا تو باقی ساتھیوں نے بیلے ڈانس دیکھنے کا پروگرام پکا کر رکھا تھا۔ میں کافی تھک چکا تھا مگر خیال خاطرِ احباب جانا پڑا۔

لوگ اسٹیج کے گرد اپنے اپنے جام ہاتھ میں لے کر جمع ہو چکے تھے۔ موسیقی پہلے دھیمے سُروں میں بجتی رہی پھر بتدریج تیز ہونا شروع ہوئی حتیٰ کہ اپنے عروج پر جا پہنچی۔ اِدھر موسیقی اپنے عروج پر پہنچی اُدھر رقاصہ نے اسٹیج پر اپنا جلوہ دکھایا۔ پورے ہال نے زوردار نعرہ لگایا، کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ رقاصہ نے ناچ شروع کیا تو آوازیں دھیمی پڑ گئیں۔

دمشق کے لوگ انتہائی زندہ دل اور دل پھینک واقع ہوئے ہیں۔ رقاصہ کے ہر ٹھمکے پر اپنے جام لہرا لہرا کر دل کھول کر داد دیتے اور ہاتھ بڑھا کر اپنے دل پر مارتے کہ ان کا یہ دل صرف رقاصہ کی خاطر دھڑک رہا تھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ بلورانی کہو تو ابھی جان دے دوں۔

رات کا ایک بج چکا تھا۔ مزید جاگنے کی ہمت نہیں تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں ہوٹل کے کمرے میں سو رہا تھا۔ اگلے روز لندن کے لیے روانہ ہونا تھا۔

رات کی تھکن اپنا اثر دکھلا رہی تھی۔ میری آنکھ صبح سات بجے ہی کھل گئی تھی مگر بستر چھوڑنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں دوبارہ نیند کی وادی میں پھسل گیا۔ گیارہ بجے کے قریب شور سن کر میری آنکھ دوبارہ کھل گئی۔ کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا تو میرے سامنے ہمارے جرمنی مقیم ہمسفر ارسلان صاحب کھڑے تھے۔

"ہم لوگ شہر گھومنے جا رہے ہیں آپ چلیں گے؟" ارسلان صاحب نے سوال کیا۔

"جانا تو چاہوں گا" میں نے جواباً کہا "لیکن فی الحال تیار ہونے کی ہمت کرنی پڑے گی۔ آپ لوگ چلے جائیں۔"

"ہم لوگ کھانا باہر ہی کھائیں گے۔ آپ ہمارا انتظار مت کیجیے گا۔" ارسلان صاحب جا چکے تھے۔

میں تیار ہو کر باہر آیا تو ناشتے کا وقت کئی گھنٹے پہلے گزر چکا تھا اب دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ کھانا کھا کر میں بھی شہر گھومنے نکل گیا۔ واپس آیا تو شام ہو چکی تھی۔ آٹھ بجے ہم سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور ہوٹل کی بس میں بیٹھ کر ائرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔

ائرپورٹ پر ایک دفعہ پھر ہم سب کو اپنے اپنے پاسپورٹ سیرین ائرلائن کے حوالے کرنا پڑے۔ ان کی مدد سے ہم لوگوں نے اپنے اپنے بورڈنگ کارڈ حاصل کیے اور امیگریشن و کسٹم کے پل صراط کو پار کیا۔

جہاز کی پرواز کا وقت رات بارہ بجے تھا۔ بارہ بج چکے تھے لیکن جہاز کے دروازے ابھی تک بند نہیں ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ کسی مسافر نے چیک اِن کرنے کے بعد اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ وہ سفر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا سامان اتارا جا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے بارہ پینتیس پر جہاز کے دروازے بند ہوئے اور ایک کے بعد ایک چاروں انجنوں کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پائلٹ نے جہاز کے بریک ریلیز کیے اور جہاز نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا، چند منٹ بعد جہاز رن وے پر نقطۂ اٹھان پر کھڑا تھا۔ پائلٹ نے انجنوں کے تھرسٹ لیور کو فل پاور کی طرف بڑھا دیا تھا۔ انجن

پورے زور و شور کے ساتھ گرج رہے تھے۔ کیبن کے اندر ارتعاش کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی جو انجنوں کے فل پاور پر چلنے کی مرہونِ منت تھی۔

ہوائی جہاز کے انجنوں کی فل پاور صرف پرواز کی اٹھان کے وقت استعمال میں لائی جاتی ہے اور فل پاور کے استعمال کا دورانیہ کم سے کم رکھا جاتا ہے اور عام طور سے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فل پاور کے استعمال سے انجن میں جو حدت پیدا ہوتی ہے اس کا جہاز کے کل پرزوں پر منفی اثر مرتب ہوتا ہے۔ ان کے استعمال کا دورانیہ کم ہو جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پرواز کے دوران انجن کو اس کی ریٹنگ سے کم ریٹنگ پر چلایا جاتا ہے۔ کم ریٹنگ پر استعمال کرنے کے باعث انجن کے کل پرزوں کا دورانیہ استعمال بڑھ جاتا ہے۔

فل پاور پر پہنچنے کے بعد پائلٹ نے بریک ریلیز کر دیے اور جہاز نے رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا۔ جہاز کی پرواز کی اٹھان اور لینڈنگ دونوں ہوا کی مخالف سمت پر کیے جاتے ہیں۔ یعنی جب جہاز پرواز کی اٹھان کے لیے دوڑتا ہے اور جب لینڈنگ کے لیے اترتا ہے تو ہوا کا رخ ہوائی جہاز کے رخ کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔

اگر آپ کبھی کسی پہاڑی پر چڑھیں تو آپ کششِ ثقل کے مخالف چڑھ رہے ہوتے ہیں۔ آپ کو اوپر چڑھنے کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔ قوت لگانا پڑتی ہے اور آپ جما جما کر قدم رکھ سکتے ہیں۔ آپ کے بدن پر آپ کا کنٹرول مضبوط ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جب آپ پہاڑی پر سے اترنے لگتے ہیں تو آپ کششِ ثقل کے ساتھ اتر رہے ہوتے ہیں۔ کششِ ثقل آپ کے موافق ہوتی ہے آپ کو اپنی طرف کھینچ رہی ہوتی ہے۔ اگر آپ اپنے آپ کو پوری طاقت سے کنٹرول نہ کریں تو آپ کی رفتار بڑھتی جائے گی۔ آپ چلنے کی بجائے دوڑنا شروع کر دیں گے۔ منہ کے بل گر جائیں گے۔ یہی صورتِ حال ہوائی جہاز کے ساتھ بھی ہوتی ہے۔ اگر جہاز موافق ہوا کے رخ اتارا جائے تو ہوا اس کو پیچھے سے دھکیلے گی اور وہ جہاز بھی منہ کے بل گر سکتا ہے اگر پوری جدوجہد کے ساتھ کنٹرول نہ کیا جائے۔

ہمارا جہاز فضا میں بلند ہو چکا تھا۔ تمبا کو نوشی اور سیٹ بیلٹ کی بتیاں بجھائی جا چکی تھیں۔ ارسلان صاحب نے فوراً اپنا سگریٹ کیس کھول کر ایک سگریٹ منتخب کیا اور اسے جلا کر دھویں کے مرغولے اُڑانے لگے۔ میری اور ارسلان صاحب کی سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں۔ ہمارا باتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

وہ مجھے جرمنی یورپ اور لندن کے بارے میں معلومات فراہم کرتے رہے۔ پھر باتیں ان کی ذاتی زندگی سے متعلق ہونے لگی۔ ان کا تعلق پاکستان کے ایک غریب گھرانے سے تھا۔ باپ کے زیادہ وسائل نہ تھے مگر ارسلان صاحب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ ان کے تعلیم حاصل کرنے کے شوق سے متاثر ہو کر ان کے ایک دور کے رشتے دار نے جو جرمنی میں مقیم تھے انہیں جرمنی بلا لیا اور ان کی تعلیم کا خرچ اٹھایا۔ لیکن تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی وہ اپنی ایک ہم جماعت کی زلف کے اسیر ہو بیٹھے۔ تعلیمی ڈگری تو بعد میں حاصل کی خاندانی ڈگری پہلے مل گئی۔ ہر سال اپنے ماں باپ سے ملنے پاکستان آتے تھے۔

ہماری باتیں چل رہی تھیں کہ ائیر ہوسٹس مشروبات کی ٹرالی لے کر آ گئی۔ ارسلان صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ اس ٹرالی میں دیگر مشروبات کے ساتھ ساتھ ان کے پسندیدہ برانڈ کی بیئر بھی موجود تھی۔ جرمنی میں بیئر بکثرت پی اور پلائی جاتی ہے۔ جرمنی کے باشندے اگر گھڑا بھر کر نہیں تو کم از کم جگ بھر بیئر غٹا غٹ پی جاتے ہیں۔ اکثر جرمن تو پانی کی جگہ بیئر کو ترجیح دیتے ہیں۔

کچھ دیر بعد کھانے کی ٹرالی آ گئی۔ ہم لوگوں نے کھانا ختم کیا۔ کیبن کی بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔ زیادہ تر مسافروں نے کمبل اوڑھے اور نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ جب میری آنکھ کھلی تو لندن ائیر پورٹ پر اترنے کا اعلان ہو رہا تھا۔

لندن ائیر پورٹ کی ٹرمنل تھی یا شیطان کی آنت۔ درجن بھر راہداریاں طے کرنا پڑیں، ہر راہداری پر لندن آنے والے مزید مسافر اس انسانوں کے ریلے میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔ ایک ہی وقت میں چھ سات پروازوں نے ہیتھرو ائیر پورٹ پر لینڈ کیا تھا۔ امیگریشن کا عملہ بڑی مستعدی سے کام کر رہا تھا۔ میں اور ارسلان صاحب میں پچیس منٹ میں فارغ ہو چکے تھے۔

اس زمانہ میں پاکستان دولت مشترکہ کا رکن تھا۔ پاکستانی باشندوں کو ویزا کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ میرے پاسپورٹ پر صرف ایک چند سطر کی مہر لگا دی گئی جس کی رُو سے میں انگلستان میں چھ مہینے تک قیام کر سکتا تھا۔ صرف ایک پابندی تھی۔ مجھے اس قیام کے دوران انگلستان میں نوکری کرنے کی اجازت نہیں تھی۔



مجھے برطانوی حکومت کے بھولپن پر ہنسی آ رہی تھی کہ برطانیہ میں اُس وقت اور آج بھی سیکڑوں پاکستانی غیر قانونی طور پر نوکری کر رہے تھے اور حکومت برطانیہ سیلاب کو چھوٹی سی مہر کا بند لگا کر روکنا چاہتی تھی۔

برطانیہ میں داخلے کا ٹھپا تو لگ گیا تھا۔ اب کئی راہداریوں کو عبور کرنا باقی تھا۔ سامان حاصل کرنے کے بعد ارسلان صاحب نے رخصت ہونا چاہا۔

آج لندن کے ہیتھرو ائیر پورٹ پر چار ٹرمنل ہیں۔ اس وقت تین ہوا کرتی تھیں۔ ٹرمنل نمبر ایک، اندرونِ ملک پروازوں کے لیے مختص تھی۔ ٹرمنل نمبر 2 یورپ سے آنے اور جانے والی پروازوں کے لیے اور ٹرمنل نمبر 3 بین الاقوامی پروازوں کے لیے۔ اس وقت میں اور ارسلان صاحب ٹرمنل نمبر 3 پر کھڑے تھے۔ ارسلان صاحب کو ائیر پورٹ کی بس کے ذریعے ٹرمنل نمبر 2 جانا تھا جہاں سے دو گھنٹے بعد ان کو میونخ کی پرواز پکڑنا تھی۔ میونخ میں ان کی جرمن زوجہ ان کی منتظر تھی۔

میرا معاملہ مختلف تھا۔ میرا انتظار کسی کو نہ تھا سوائے جاپان ائیر لائن کے کاؤنٹر کے۔ مجھے جاپان ائیر لائن کی پرواز سے لندن سے نیویارک کا سفر طے کرنا تھا۔ کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں پر بیٹھی ہوئی جاپانی لڑکی میرے استقبال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے دونوں ہاتھ آگے باندھ کر رکوع میں چلی گئی۔ مجھے بھی رکوع میں جانا پڑا۔ جب ہم دونوں حالتِ رکوع سے باہر آئے تو اس نے پوچھا۔ ”کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟“

”یقیناً۔“ میں نے عرض کیا پھر اپنا نیویارک کا ٹکٹ نکال کر اس کو دکھایا۔ اس نے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیا جس پر میرا نام لکھا ہوا تھا۔

”آپ کی پرواز تین بجے شام کو جائے گی۔“ اس نے تفصیل بتائی۔ پھر لفافہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس لفافہ کے اندر آپ کے لیے ہوٹل میں قیام کرنے کا اور کھانا کھانے کا واؤچر ہے۔“ پھر وہ کاؤنٹر سے باہر نکل کر آ گئی اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ ایک دروازے کے نزدیک آ کر اس نے رکنے کا اشارہ کیا ”آپ کے ہوٹل کی بس اس دروازے کے باہر چند منٹ بعد آ جائے گی۔ وہ بس آپ کو آپ کے ہوٹل لے جائے گی۔ ہوٹل ائیر پورٹ کی حدود میں ہی واقع ہے۔“ پھر وہ رخصتی کے لیے رکوع میں چلی گئی۔ مجھے بھی اس کے رکوع کی تقلید کرنا پڑی۔

دروازہ کھول کر باہر نکلا تو جیسے جان نکل گئی۔ باہر سخت سردی تھی۔ دو دن پہلے دمشق میں گرمی سے جان نکل رہی تھی، آج سردی سے۔ میں نے سوٹ کیس کھول کر اپنا جیکٹ نکالا اور اسے پہن لیا تو سکون ملا۔

چند منٹ بعد ہوٹل کی بس آ گئی جس نے اگلے چند منٹ میں مجھے ہوٹل پہنچا دیا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے تھوڑی دیر آرام کیا پھر ہوٹل کی لابی میں جا کر ناشتا کیا۔ صبح ہو چلی تھی۔ لندن شہر جانے کا موڈ ہو رہا تھا لیکن بعد میں یہ ارادہ ترک کر دیا کہ مجھے ایک بجے سے پہلے نیویارک کی پرواز پکڑنے کے لیے ٹرمنل واپس جانا تھا۔ اجنبی شہر گھومنے میں خدا معلوم کتنا وقت لگ جائے اور میری پرواز میرے بغیر ہی کوچ کر جائے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں ہوٹل کی بس میں بیٹھ کر ائیر پورٹ جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ جاپان ائیر لائن کے کاؤنٹر سے اپنا بورڈنگ کارڈ لے کر امیگریشن کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر لاؤنج میں بیٹھ کر اپنی پرواز کی روانگی کے اعلان کا انتظار کرنے لگا۔

فلائٹ کا اعلان ہو چکا تھا۔ جہاز کے دروازہ سے اندر داخل ہونے لگا تو دروازے پر کیمونو میں ملبوس ایک ائیر ہوسٹس کو کھڑا پایا جو بار بار رکوع میں جا جا کر جہاز میں داخل ہونے والے ہر مسافر کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ میری سیٹ پیچھے والے کیبن میں تھی۔ جہاز مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مجھے اپنی سیٹ تک پہنچتے پہنچتے کئی منٹ لگ گئے۔ مسافروں کا ہجوم تھا مگر ہر مسافر انتہائی مہذب طریقے سے نظم و ضبط اور صبر کے ساتھ اپنی سیٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دھکم پیل کا وہ مظاہرہ نہیں جو مشرقی ممالک کے جہازوں میں پایا جاتا تھا۔

بوئنگ کا B-747 جہاز تھا۔ میری سیٹ بائیں ہاتھ کی کھڑکی کے ساتھ تھی۔ اس سیٹ کے برابر ایک عمر رسیدہ جاپانی جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی سیٹ کی طرف اشارہ کیا تو وہ دونوں میاں بیوی سیٹ کے باہر آ کر کھڑے ہو گئے پھر رکوع میں جا کر مجھے سیٹ کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ جہاز کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اب جہاز رن وے پر ٹیک آف کے لیے تیار کھڑا تھا۔ پائلٹ نے انجن کو ول پاور دی۔ بریک ریلیز کیے اور جہاز نے رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا۔ جہاز کو دوڑ لگاتے ہوئے خاصا وقت ہو چلا تھا مگر ابھی اس کے فضا میں بلند ہونے کے کوئی آثار نظر

نہیں آرہے تھے۔ جب کبھی جہاز اتنی لمبی دوڑ کے بعد بھی فضا میں بلند نہ ہوتو میرے ہاتھوں کی گرفت سیٹ کے ہتھوں پر مضبوط ہوجاتی ہے کہ خدا خیر کرے۔

دراصل جہاز پرواز کی اُڑان کے لیے اس وقت تک دوڑ لگاتا ہے جب تک وہ ایک خاص رفتار تک نہ پہنچ جائے کیونکہ جب تک جہاز اس رفتار تک نہیں پہنچ جاتا اس کے پروں کو وہ لفٹ نہیں ملتی جو اس کو فضا میں بلند ہونے کے لیے سہار سکے۔ پھر اس رفتار کا انحصار مسافروں اور سامان کے وزن پر ہوتا ہے۔ وزن جتنا زیادہ ہوگا جہاز کی دوڑ بھی اسی تناسب سے لمبی ہوتی جائے گی۔ آج بھی یہی صورتِ حال تھی، جہاز فل لوڈ تھا۔ یہاں پر ایک اور چیز بھی قابلِ ذکر ہے۔

جہاز جب پرواز کی اٹھان کے لیے دوڑتے وقت اگر ایک رفتار سے تجاوز کر جائے اور کسی ہنگامی صورتِ حال کے تحت اس کو روکنے کی ضرورت ہو تو اس وقت جہاز کو روکا نہیں جاسکتا کیونکہ دوڑنے کے ازشیا Inertia کی وجہ سے جہاز کے ڈھانچا میں اس قدر توانائی آچکی ہوتی ہے کہ اگر اس وقت اس کے بریک لگائے جائیں تو جہاز کو اور مسافروں کو شدید نقصان کا خطرہ ہوتا ہے۔ جہاز کے تباہ ہونے کے امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت واحد حل یہ ہوتا ہے کہ جہاز کو فضا میں بلند کردیا جائے اور پھر ائرپورٹ کے گرد ایک مقررہ چکر لگا کر جہاز کو زمین پر اتار لیا جائے۔ نقصان کے امکانات تو اس صورت میں بھی ہوسکتے ہیں مگر اس نقصان سے کم جس کا سامنا اس وقت بریک لگانے سے ہوسکتا ہے۔ میری آج کی پرواز کو کسی نقصان کا سامنا نہیں تھا۔ وہ ساتھ خیریت کے فضا میں بلند ہوچکی تھی۔

آٹھ گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز نیویارک کے جان ایف کینیڈی ائرپورٹ پر اترنے کی تیاری کررہا تھا۔ فائنل اپروچ پر پہنچ کر اب ٹاپ آف ڈیسنٹ سے نیچے کی طرف اتر رہا تھا۔ اگلے دس پندرہ منٹ کے بعد نیویارک کی فلک بوس عمارتیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد جہاز زمین پر اتر کر اپنے پارکنگ گیٹ کی طرف جارہا تھا۔ لندن میں اس وقت رات گیارہ بجے کا وقت ہوگا لیکن نیویارک میں ابھی صرف شام کے چھ بجے تھے۔ اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ ہونے والا تھا۔

امیگریشن کا مرحلہ خیر سے گزرا۔ آخرش میں امریکا کی سرزمین میں داخل ہوچکا تھا۔ یہ وہ سرزمین تھی جو دنیا میں بسنے والے کروڑوں لوگوں کے خوابوں کی سرزمین تھی۔ وہ سرزمین جس کو دنیا کا ہر شخص اپنے مقدور بھر گالیاں دیتا ہے مگر اس کو اپنے بچوں کا مستقبل اسی سرزمین میں آباد ہونے میں نظر آتا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ ہماری بعض بڑی بڑی مذہبی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کے بچوں نے اسی ملعون سرزمین سے تعلیم حاصل کی ہے۔ اپنے مستقبل کو تابناک بنایا ہے۔

ائرلائن کے خرچے پر قیام وطعام کی عیاشی لندن میں ختم ہوچکی تھی۔ نیویارک میں رات گزارنے کا بندوبست مجھے اپنے خرچے پر کرنا تھا۔

پاکستان میں جس تعداد میں مشہور ریسٹورنٹ ہیں اس سے زیادہ تعداد میں امریکا میں یونیورسٹیاں ہیں۔ ریاست آیووا میں دو بڑی یونیورسٹیاں ہیں، یونیورسٹی آف آیووا جو سیڈار ریپڈز کے شہر میں واقع ہے اور آیووا اسٹیٹ یونیورسٹی جو ایمز کے شہر میں واقع ہے۔ میرا داخلہ آیووا اسٹیٹ یونیورسٹی میں ہوا تھا۔ مجھے نیویارک سے ایمز جانا تھا۔ نیویارک سے ڈی موئین تک ہوائی سفر پھر ڈی موئین سے ایمز تک زمینی سفر۔ میں رات نیویارک میں گزار کر ڈی موئین جانے کے لیے جان کینیڈی ائرپورٹ پہنچ چکا تھا۔

انگلستان کے مقابلے میں امریکا میں ہر چیز بڑی ہے۔ نیویارک کے لیے ائرپورٹ بھی تین بڑے بڑے استعمال ہوتے ہیں۔ جان ایف کینیڈی، لاگوارڈیا اور نیوارک جو کہ ریاست نیوجرسی کی حدود میں واقع ہے مگر نیویارک آنے والی بے شمار پروازوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، خاص طور سے سیاحت کی چارٹر پروازوں کے لیے۔ میری ڈی موئین کی پرواز کینیڈی ائرپورٹ سے تھی۔

کینیڈی ائرپورٹ پر ٹرمنل بھی کثیر تعداد میں ہیں۔ ہر ٹرمنل چند مخصوص ائرلائنز کے لیے مختص ہے، میری پرواز امریکن ائرلائنز کے ذریعہ تھی۔ اس کے لیے مجھے امریکن ائرلائنز کی ٹرمنل پر ہی اترنا تھا۔ میں امریکن ائرلائنز کی ٹرمنل پر پہنچ چکا تھا۔ ڈی موئین کی پرواز ایک گھنٹا بعد تھی۔ میں اپنا بورڈنگ کارڈ لے کر لاؤنج میں جاکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب میری پرواز کی روانگی کا اعلان ہوا تو میں گیٹ سے گزر کر جہاز میں داخل ہوگیا۔ میں پچھلے چار سال سے ائرلائن سے منسلک تھا۔ ہر روز ہوائی جہازوں سے واسطہ پڑتا تھا لیکن اس قسم کا جہاز میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آمنے سامنے دو لمبی سیٹیں لگی ہوئی تھیں جن پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سیٹ بیلٹ ندارد۔ سن رکھا تھا کہ امریکا وہ



ملک ہے جہاں ہر قسم کی آزادی ہے۔ مذہب کی آزادی، تقریر کی آزادی وغیرہ وغیرہ مگر ایسی بھی کیا آزادی کہ مسافر سیٹ بیلٹ سے بھی آزاد ہوں۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جہاز نے آہستہ آہستہ نیچے کی طرف اترنا شروع کردیا۔ یہ ایک اور حیرت کی بات تھی کہ جہاز نے اُڑنے سے پہلے اترنا شروع کردیا تھا۔ آخرکار جب جہاز مکمل طور پر زمین پر آگیا تو اس نے آگے بڑھنا شروع کردیا۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہ جہاز نہیں، ایک جہاز نما گاڑی تھی جو مسافروں کو ٹرمنل سے جہاز کی طرف لے کر جارہی تھی۔ جان میں جان آئی۔

سارے مسافر جہاز میں بیٹھ چکے تھے۔ جہاز کے دروازے بند کردیے گئے۔ انجن اسٹارٹ ہوچکے تھے۔ جہاز نے رن وے کی طرف چلنا شروع کردیا۔ کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ پندرہ بیس جہازوں کی ایک قطار ہے جو آہستہ آہستہ ٹیک آف پوائنٹ کی جانب رواں دواں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیویارک کا کینیڈی ائرپورٹ اس قدر مصروف ائرپورٹ ہے کہ ہر دو تین منٹ کے بعد یہاں سے کوئی نہ کوئی جہاز ٹیک آف کرتا ہے۔ یہاں پر چوبیس گھنٹے اُڑان بھرنے والے ہوائی جہازوں کی قطار لگی رہتی ہے۔ کینیڈی ائرپورٹ کے آگے ڈی موئین ائرپورٹ کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

ڈی موئین سے ایمز کا سفر گرے پاؤنڈ کی بس کے ذریعے تھا۔ میں ایمز پہنچ کر بس کی ٹرمنل میں داخل ہوچکا تھا۔ اب مجھے یونیورسٹی کے غیر ملکی طلبہ کے انچارج کو ٹیلی فون کرکے اپنی آمد کی خوشخبری سنانا تھی۔ ان کا ٹیلی فون نمبر میرے پاس تھا۔ کاؤنٹر پر جاکر ٹیلی فون کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہاں پر کھڑے ہوئے لڑکے نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ دیکھا تو وہاں پر ٹیلی فون بوتھ لگا ہوا تھا۔

کسی زمانہ میں کراچی میں بھی ٹیلی فون بوتھ لگائے گئے تھے۔ شہریوں کی آسانی کے لیے۔ مگر ہمارے بعض معزز اور فرض شناس شہریوں نے وہاں سے پہلے تو ہینڈ سیٹ اور ڈائل چرالیے پھر اس کے بعد جب اور زیادہ مہارت حاصل کرلی تو پورے پورے ٹیلی فون سیٹ غائب کردیے۔ بوتھ کا مقصد فوت ہوچکا تھا۔ حکومت نے ان کو ہٹا دیا کہ کہیں یہ بھی چوری نہ ہوجائیں۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ ہماری حکومت اور حکمرانوں نے خود پورے کا پورا ملک چرانے کا جامع منصوبہ تیار کر رکھا ہے جس پر ہر روز عمل درآمد جاری ہے۔

ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہوا تو ٹیلی فون تو موجود تھا لیکن ڈائل جیسی کوئی چیز نظر نہ آئی جبکہ ہم صرف ڈائل سے واقف تھے۔ اس وقت تک پاکستان میں پش بٹن رائج نہیں ہوا تھا۔ ایک چوکھٹے میں کچھ چوکور سے بٹن ضرور لگے ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہوچکا تھا کہ یہ میرے کسی ہم وطن کی کارستانی ہے کہ وہ یہاں سے بھی ٹیلی فون کا ڈائل چرا کر لے جاچکا ہے۔ میں سراسیمگی کی حالت میں ٹیلی فون بوتھ سے باہر نکل آیا۔ سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی میری ہونق شکل دیکھ کر گھبرا گئی پوچھنے لگی ''کیا ہوا!!!''

''مجھے یونیورسٹی فون کرنا ہے۔'' میں نے ان کو مطلع کیا۔ ''مگر کوئی ٹیلی فون کا نمبر گھمانے والا ڈائل چرا کر لے جاچکا ہے۔''

وہ بڑے زور سے ہنسی پھر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہوگئی۔

''یہ دیکھ رہے ہو؟'' ٹیلی فون میں لگے ہوئے چوکھٹے پر انگلی رکھ کر اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''جی ہاں'' میں نے جواب دیا۔

اس نے دوسرا سوال جڑ دیا۔ ''اس چوکھٹے کے اندر لگے ہوئے یہ چوکور بٹن بھی دیکھ رہے ہو جن پر صفر سے لے کر نو تک نمبر لکھے ہوئے ہیں۔''

مجھے اس کا بھی اقرار کرنا پڑا کہ میں وہ چوکور بٹن بھی دیکھ رہا تھا۔

اب اس نے میری طرف ایک فاتحانہ مسکراہٹ سے دیکھا اور گویا ہوئی۔

''یہ ٹچ ٹون ٹیلی فون ہے۔ اس میں نمبر گھمائے نہیں بلکہ دبائے جاتے ہیں۔'' اس کا لیکچر ختم ہوچکا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور مطلوبہ نمبر ایک کے بعد ایک دبانے شروع کردیے۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ میں اپنی زندگی کا پہلا ٹچ ٹون ٹیلی فون کامیابی کے ساتھ ڈائل کرچکا تھا۔ دو تین گھنٹیاں بجنے کے بعد دوسری طرف سے کسی خاتون کے بولنے کی آواز آئی۔

''فورین اسٹوڈینٹس آفس۔''

جواب میں میں نے اپنا تعارف کروایا۔

میں یونیورسٹی دو ہفتہ دیر سے پہنچا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے دیر سے آنے کا شکوہ کریں گی۔

بہت دیر سے در پہ آنکھیں لگی تھیں
حضور آتے آتے بہت دیر کر دی

مگر جب ان کی آواز میں کوئی مسرت انگیز ارتعاش

نہ محسوس ہوا تو میں نے جانا کہ انہوں نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔ دوبارہ اپنا نام بتایا۔

انہوں نے اسی سکون سے مجھ کو مطلع کیا کہ ان کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ میں کون ہوں۔ پھر مجھے یونیورسٹی کے ایک ہاسٹل کا نام پتا بتایا اور حکم صادر کیا ”تم وہاں جا کر کمرا نمبر 12 میں قیام کرو کل صبح میرے دفتر آجانا۔“ پھر جیسے ان کو کچھ یاد آ گیا۔

”گو کہ تم سولہ دن دیر سے یونیورسٹی آئے ہو لیکن ہاسٹل میں تم کو پورے کوارٹر کے پیسے جمع کروانے ہوں گے۔“

دیر سے آنے کے ضمن میں نہ تو انہوں نے کوئی شکوہ کیا اور نہ ہی دل تھام کر رہ گئیں۔ الٹا مجھ سے ہاسٹل کا ان دنوں کا کرایہ بھی دھروالیا جن دنوں میں نے ہاسٹل کو استعمال بھی نہیں کیا تھا۔

دنیا سدا سے بے انصاف رہی ہے۔

ہاسٹل میں جو کمرا مجھے ملا تھا وہ دو طالبعلموں کے لیے تھا۔ اس کمرے میں پہلے سے ہی ایک امریکی لڑکا پال قیام پذیر تھا۔ اس کی ڈگری مکمل ہونے میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا۔

امریکا کے لوگ عام طور سے اپنی حکومت کی طرح خبیث نہیں ہوتے۔ دوستانہ طبیعت رکھتے ہیں، جلد گھل مل جاتے ہیں۔ دل میں بات کو کم رکھتے ہیں، ہر بات منہ پر کہہ دیتے ہیں۔ مگر ان کی دوستی وقتی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی پائیداری نہیں ہوتی۔ جب تک آنکھوں کے سامنے ہیں آپ سے بڑھ کر ان کا کوئی دوست نہیں۔ لیکن آنکھ سے جیسے ہی دور ہوئے دل سے اور بھی زیادہ دور ہو گئے۔

پال نے پوچھا ”تم یونیورسٹی میں کیا کرنے آئے ہو۔“

”الیکٹریکل انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں MS کرنے کا ارادہ ہے۔“ میرا جواب تھا۔

”عام طور سے جو لڑکے MS کرنے آتے ہیں ان کی عمر بائیس، تیئس سال ہوتی ہے، تم کیا فیل ہوتے رہے ہو؟“

”صرف ایک لائسنس کے امتحان میں فیل ہوا ہوں۔ لیکن یہ میرے اتنی دیر سے MS کرنے کا سبب نہیں ہے۔“ میں نے پال کو آگاہ کیا۔

”دراصل میں BE کرنے کے بعد چار سال نوکری کرتا رہا ہوں، جس کی وجہ سے MS کرنے میں دیر ہو گئی۔“

پال کو میرے دیر یا سویر MS کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ سوال تو اس نے صرف برسبیل تذکرہ کر لیا تھا۔ کہنے لگا ”میں کھانا کھانے جا رہا ہوں چلو گے؟“

ابھی شام کے صرف چھ بجے تھے، کھانا کھانے کا کوئی تک نہ تھی میں نے جواب دیا۔ ”ابھی میں اپنا سامان جما رہا ہوں۔ اس کو ختم کرنے کے بعد نہا دھو کر تازہ دم ہو کر کھانا کھانے جاؤں گا۔ تم چلو!!“

”زیادہ دیر مت کرنا۔“ پال نے تاکید کی۔

میں نے آرام آرام سے اپنا سامان جمایا۔ نہا دھو کر تیار ہوا پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آٹھ بجے کے قریب ریفیکٹوری کا رخ کیا کہ کھانا کھا آؤں۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ جالی دار شٹر گرا ہوا ہے۔ اندر کچھ لوگ کام کر رہے ہیں۔ میں نے شٹر کو ہلا کر ان لوگوں کو متوجہ کرتے ہوئے سوال کیا ”شٹر کب کھلے گا؟“

ان میں سے ایک نے جواب دیا ”چھ بجے۔“

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ چھ بجے کیا معنی رکھتا تھا۔ یا تو میں نے غلط سنا تھا یا اس نے غلط کہا تھا۔ میں نے تصدیق کرنے کی خاطر پوچھا ”صبح کے چھ بجے؟“

جواب ملا ”ہاں صبح کے چھ بجے۔“

میں نے پوچھا ”پھر میں کھانا کیسے کھاؤں گا۔“

اس نے شانے اچکا دیے اور مشورہ دیا ”اگر کھانا کھانا ہو تو سات بجے تک یہاں آجایا کرو ہم ساڑھے سات بجے شٹر گرا دیتے ہیں۔“ اب میری سمجھ میں آیا کہ پال نے جاتے وقت مجھے جلدی ریفیکٹوری جانے کی ہدایت کیوں کی تھی۔

میں ہاسٹل واپس جانے کے لیے پلٹ رہا تھا۔ ریفیکٹوری والے لڑکے کو شاید میری حالت پر رحم آ گیا، کہنے لگا۔ ”تم یہاں سے جب باہر نکلو گے تو اپنے الٹے ہاتھ کی طرف مڑ جانا۔ مڑنے کے بعد جب تھوڑی دور آگے جاؤ گے تو تم کو وہاں تک شاپ نظر آئے گی وہاں چلے جانا۔ وہاں پر تمکو کافی، فروٹ پائی اور کیک وغیرہ رات گیارہ بجے تک مل سکتے ہیں۔ گیارہ بجے تک شاپ بند ہو جاتی ہے۔“

میں نے تک شاپ کا رخ کیا۔

تک شاپ میں کوئی سروس کاؤنٹر وغیرہ نہیں تھے۔ تمام کھانے پینے کی اشیا مشینوں سے حاصل کی جا سکتی تھیں۔ میں نے مشینوں میں مطلوبہ رقم کے کوئین ڈال کر مشینوں کے ڈسپنسر سے کافی اور چیری پائی نکال لیا۔ پائی انتہائی عمدہ بنی ہوئی تھی۔ اس کی شکل چوکور سموسہ کی طرح تھی۔ اندر وافر مقدار میں چیری بھری ہوئی تھی۔ کافی گاڑھی اور تلخ تھی۔ چیری پائی کی مٹھاس نے کافی کی تلخی کو دور کر دیا۔ کافی اور پانی سے پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد میں ہاسٹل



آکر سو گیا۔ سفر کی تکان اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ خواب میں چیری پائی کی مشین گھومتی رہی۔

صبح اٹھ کر نہا دھو کر تیار ہوا اور ناشتا کرنے ریفیکٹوری وقت پر پہنچ گیا۔ کل رات کا سبق یاد تھا۔ ناشتا ختم کرنے کے بعد میں نے غیر ملکی طلبہ کے دفتر کا رخ کیا۔

میں غیر ملکی طلبہ کے دفتر میں داخل ہوا تو وہاں ان ہی خاتون سے ملاقات ہوئی جن سے کل ٹیلی فون پر گفتگو ہو چکی تھی۔ کہنے لگیں۔ ”اس یونیورسٹی میں تعلیمی سال کا دورانیہ کوارٹر کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ کوارٹر میں گیارہ ہفتہ پڑھائی ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ امتحان اور ایک ہفتہ کی چھٹی جو امتحان کے اختتام پر دی جاتی ہے۔ تم نے تین ہفتہ ضائع کر دیے۔ اب تم کو پورے کوارٹر کی پڑھائی صرف آٹھ ہفتے میں مکمل کرنا ہوگی جس کے لیے تم کو بہت زیادہ محنت کرنا ہوگی۔“

خاتون کا لیکچر جاری رہا۔ تعلیمی دورانیہ کی تفصیل کے بعد انہوں نے امتحان کے طریق کار پر روشنی ڈالی۔ ”امریکا کا نظام تعلیم پاکستان کے نظام تعلیم سے بہت مختلف ہے۔“ وہ سانس لینے کے لیے رکیں۔ ”پاکستان میں صرف سالانہ امتحان پر زور ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں کوارٹر کے دوران لیے گئے ہر ٹیسٹ کو بھی کوارٹر کے اختتامی امتحان کے ساتھ جانچا جاتا ہے۔ شمار کیا جاتا ہے۔ اگر تمہاری کارکردگی ان تمام ٹیسٹ میں تسلی بخش نہیں ہوئی تو تم کو اچھے گریڈ نہیں مل سکتے۔“ لیکچر ختم ہو چکا تھا۔ لیکن یہ اطلاع میرے لیے نئی تھی۔ ہمارے ہاں تو سال بھر کھیل کود میں گزارنے کے بعد بھی صرف سال کے آخر میں محنت کر کے لوگ پاس ہو جایا کرتے ہیں۔ اب تو اس کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ صرف ایک با اثر باپ یا پستول کے زور پر کی گئی چیٹنگ کافی ہے۔

گریڈ کا چکر بھی میرے لیے نیا تھا۔ ہمارے یہاں ہر پرچے کے نمبر ملتے تھے۔ 33 فیصد نمبر پر پاس اور 60 فیصد پر فرسٹ ڈویژن۔ یہاں کا باوا آدم نمبروں کے بجائے گریڈ کا نظام تھا۔ A سب سے اعلیٰ گریڈ اور D سب سے ادنیٰ۔ گریڈ F ان خوش نصیبوں کے لیے مختص ہوتا ہے جو فیل ہونے کا کامیاب جھنڈا گاڑ کر سرخرو ہوتے ہیں۔ خاندان کا اور اپنے ملک کا نام روشن کرتے ہیں۔

میں ابھی گریڈ کے سمندر میں غوطہ کھا ہی رہا تھا کہ خاتون ایک دفعہ پھر سے مجھ پر مہربان ہو گئیں۔ ایک لفافہ میرے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے حکم دیا۔ ”یہ لفافہ لے کر ایڈمشن آفس چلے جاؤ باقی کارروائی وہیں پر ہوگی۔

## وکیل اخبار

ایک اصلاحی اخبار، شیخ غلام محمد نے انیسویں صدی کے اواخر میں امرتسر سے جاری کیا تھا۔ پہلے یہ ہفت روزہ تھا، بعد میں اسے سہ روزہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک روزنامہ بھی رہا۔ اس اخبار کے ادارہ تحریر سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبداللہ العمادی جیسی سربرآوردہ شخصیتیں وابستہ تھیں۔ اخبار نے مسلمانوں کے حقوق کے لیے زبردست جنگ کی۔ اسی ادارے کے زیر انتظام اسلامی تاریخ اور ادب پر کتب شائع ہوئیں۔ یہ اخبار، برعکس دوسرے اخباروں کے، شام کو چھپا کرتا تھا۔

## فلورا (Flora)

رومی دیومالا کی ایک دیوی، جس کا فریضہ فصل بہاراں کی نگہداشت تھا۔ اس کے پرستاروں کی سب سے بڑی تعداد قدیم وسطی اٹلی میں تھی جہاں اس کا تہوار Floralia بڑی دھوم دھام سے 28 اپریل سے 3 مئی تک منایا جاتا تھا۔ سرکس میکسیمس کے قریب کوئریل (روما کی ایک پہاڑی جس پر شاہ اٹلی کا ایک محل تھا) پر اس کا نہایت عالیشان مندر تھا، جہاں اس کی پوجا کے لیے دور دور سے یاتری آیا کرتے تھے۔ اسے روبیکس یا روبیگو پوموتا کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا رہا ہے۔

مرسلہ: ناہید خان نیازی، روہڑی

دروازے سے باہر نکل کر سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ جانا۔“

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ دروازے سے باہر نکل کر سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گیا۔ سامنے ہی ایڈمشن آفس کا بورڈ لگا ہوا دکھائی دیا۔

ایڈمشن آفس میں داخل ہوا تو ان فرشتوں کی صفائی کی داد دینا پڑا جنہوں نے سامنے بیٹھی ہوئی سیکریٹری کے خدوخال اور صورت کو تراشا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس لڑکی کو حسن کی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ فارن اسٹوڈنٹس آفس سے حاصل کیا ہوا لفافہ میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اس نے لفافہ چاک کر کے دیکھا پھر بائیں ہاتھ والے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا ”آپ اس کمرے میں جا کر مس ایڈمز سے رجوع کیجیے۔“ میں بائیں ہاتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے مس ایڈمز کو بیٹھے ہوئے

پایا۔ لفافہ ان کو تھما دیا۔ لفافہ میں رکھے ہوئے کاغذات پڑھنے کے بعد مجھ سے کلام کیا۔

’’تم EE میں MS کرنا چاہتے ہو!‘‘

یا خدا یہ "EE" کیا بلا ہے اور میں اس میں کیوں MS کرنا چاہوں گا۔ استفسار پر پتا چلا کہ "EE" الیکٹرکل انجینئرنگ کا مخفف ہے۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

’’EE میں پڑھائی شروع کرنے سے پہلے تم کو انگریزی کا امتحان پاس کرنا ہوگا۔‘‘ مس ایڈمز نے بتلایا۔ پھر کہنے لگیں۔ ’’اگر تم انگریزی کے امتحان میں فیل ہوگئے تو پہلے کوارٹر میں تم کو صرف انگریزی پڑھنا ہوگا۔‘‘ پھر الٹی میٹم دینے کے سے انداز میں ڈرایا۔ ’’اور اس وقت میں پڑھتے رہنا ہوگا جب تک کہ تم انگریزی زبان پر عبور نہ حاصل کرلو۔‘‘

مجھے PIA کا زمانہ یاد آ گیا کہ جہاں مجھے PIA کے گراؤنڈ ٹریننگ اسکول میں بنیادی سائنس کا امتحان دینا پڑا تھا تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ مجھ میں بنیادی بجلی کا کورس کرنے کی اہلیت ہے کہ نہیں حالانکہ میرے پاس NED کالج کی الیکٹرکل انجینئرنگ کی چار سالہ کورس کی ڈگری موجود تھی۔

بنیادی انگریزی کے چھوٹے سے مسئلے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر پاکستان واپس جانا مناسب نہ تھا۔ میں نے واپسی کا ارادہ ترک کردیا اور مس ایڈمز کو مخاطب کیا۔ ’’یہاں داخلہ سے قبل یونیورسٹی نے یہ شرط لگائی تھی کہ داخلہ ملنے سے پہلے مجھے انگریزی زبان کا ٹیسٹ Toefl جو امریکی قونسل کے زیرِ نگرانی ہوتا تھا۔ پاس کرنا ہوگا۔ میں نے یہ ٹیسٹ پاس کرلیا تھا اور اسی کی بنیاد پر مجھے داخلہ دیا تھا۔ اب دوبارہ ٹیسٹ کیوں پاس کرنا پڑے گا۔‘‘

مس ایڈمز ٹس سے مس نہ ہوئیں، مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ میں ٹیسٹ دینے کی غرض سے انگریزی کے شعبہ کی عمارت میں داخل ہوگیا۔

تین گھنٹے کا کثیر الجواب Multiple Choice پرچہ تھا۔ جو میں نے دو ڈھائی گھنٹے میں حل کرلیا۔ نتیجہ اگلے روز۔ جب اگلے دن میں نے اپنی رپورٹ دیکھی تو اپنا سر پیٹ لیا۔ رپورٹ پر یقین نہیں آرہا تھا کہ مجھے انگریزی کے کسی بھی امتحان میں 95 فیصد نمبر مل سکتے ہیں۔ پاکستان میں اگر بھی انگریزی زبان کے پرچہ میں 45 فیصد سے زیادہ نمبر مل جاتے تھے تو اپنے آپ کو انگریز کا خطاب دے لیا کرتے تھے۔ انگریزی کے امتحان کی رپورٹ میں نے مس ایڈمز کی خدمت میں پیش کی۔ خیال تھا کہ 95 فیصد نمبر دیکھ کر وہ مجھے گلے سے لگا لیں گی۔ مگر انہوں نے صرف ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ رپورٹ پر مجھ پر نہیں۔ حالانکہ میں ان دنوں کی مشہور اور کثیر الاستعمال مردانہ کولون ’’بروٹ‘‘ وافر مقدار میں اپنے کپڑوں پر چھڑک کر گیا تھا۔ لیکن شاید اس وقت تک ایروماتھریپی (خوشبوؤں سے علاج) کا طریقہ نے اتنی ترقی نہ کی تھی جتنی آج کر چکا ہے۔

بروٹ بنانے والوں کو شاید ان اجزاء کا پتا نہ تھا جو آج کل کے مردانہ کولون میں استعمال ہوتے ہیں کہ جب ان اجزاء سے تیار کردہ کولون کو اپنے بدن پر چھڑک کر کوئی نوجوان اپنی قمیص کو پھاڑتا ہوا اپنے سینہ کو برہنہ کرتے ہوئے سڑک پر چھلانگ مارتا ہے تو آس پاس سے گزرنے والی ہر لڑکی اس چھلانگ مارتے نوجوان کو گلے لگانے کے لیے تڑپ اٹھتی ہے۔ مضطرب اور بیتاب ہوجاتی ہے۔

گلے لگانا تو درکنار انہوں نے مجھ سے ہاتھ تک نہیں ملایا۔ اور بغیر کسی الطاف وعنایت کے اپنے دفتر کے اندر چلی گئیں۔ جب دفتر سے برآمد ہوئیں تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جو انہوں نے میرے ہاتھ میں پکڑا دیا اور حکم دیا کہ میں یہ لفافہ اور انگریزی کے ٹیسٹ کی رپورٹ لے کر "EE" چلا جاؤں۔

EE کے شعبہ میں وارد ہوا تو وہاں بھی پہلے تو وہی ڈراوا دہرایا گیا کہ بہت دیر کردی، اگر حد سے زیادہ محنت نہ کی تو تمہارے لیے کوئی امید نہیں ہے۔ بہتر تھا کہ اگلے کوارٹر کا انتظار کرتے۔ جب نصیحتوں کا مرحلہ اختتام پذیر ہوا تو مجھے ڈاکٹر اینڈرسن کے دفتر بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر اینڈرسن میرے ایڈوائزر تھے۔

ڈاکٹر اینڈرسن دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ چالیس پینتالیس کے پھیرے میں ہوں گے۔ عینک لگاتے تھے۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ ہنس مکھ۔ بات کرنے کا انداز دوستانہ۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر خیریت پوچھی پھر مخاطب ہوئے۔ ’’تم نے اپنے میجر کا انتخاب کرلیا۔‘‘

اگر یہ سوال مجھ سے پاکستان میں پوچھا جاتا تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ پاکستان میں کسی میجر کرنل وغیرہ سے تعلقات ہوں تو زندگی آسان ہوجاتی ہے۔ لیکن امریکا جیسے ملک میں جو اپنے آپ کو جمہوریت کا علمبردار گردانتا ہے، فوج کا یا میجر یا کرنل کا کیا



ذکر۔ یہ عقدہ بھی ڈاکٹر اینڈرسن نے حل کردیا۔

سارا قصور امریکا کے نظامِ تعلیم کا تھا۔ یہ نظامِ تعلیم ہمارے نظامِ تعلیم سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارے نظام میں ہر ڈگری کورس کے مضامین مقرر ہوتے ہیں۔ سوائے چند ایک مضامین کے اور اس ڈگری کے امیدوار کو یہ تمام مضامین پڑھنے اور پاس کرنا پڑتے ہیں۔ امریکی نظام میں طالبعلم کو ایک مرکزی مضمون کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جو میجر کہلاتا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ فروعی مضامین لینے پڑتے ہیں جو مائنر کہلاتے ہیں۔ میجر کی تفصیل بتانے کے بعد ڈاکٹر اینڈرسن نے پوچھا۔ ’’تمہارا رجحان الیکٹریکل پاور کی طرف ہے یا الیکٹرانکس کی طرف۔‘‘

’’الیکٹرانکس‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’وہ بھی کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سے متعلق۔‘‘

میرا جواب سن کر ڈاکٹر اینڈرسن مخاطب ہوئے۔ ’’چونکہ تم نے پاکستان میں اس قسم کے مضامین نہیں پڑھے ہیں۔ تم کو کچھ کورس آڈٹ کرنے پڑیں گے۔‘‘

آڈٹ کا سن کر میں گھبرا گیا۔ میں نے ڈاکٹر اینڈرسن سے کہا۔ ’’میں اکاؤنٹنٹ نہیں ہوں اور میرا آڈٹ کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی مجھے آڈٹ کرنے سے کوئی دلچسپی ہے۔‘‘

میرا جواب سن کر اینڈرسن نے میری کم عقلی اور نادانی پر ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا پھر رومال سے اپنے آنسو پونچھے۔

یہ اتنی ہی زور سے ہنستے تھے کہ ان کے آنسو نکل آئے تھے۔ میرے آنسو تو نہیں نکلے تھے لیکن پیشانی پر کچھ نمی سی ضرور محسوس ہوئی تھی۔

آنسو پونچھنے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک محظوظ ہوتے رہے اور میں اندر ہی اندر کھولتا رہا کہ دیکھیں کب ان کی حسِ مزاح ان کا پیچھا چھوڑتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولے ’’دوست یہ اکاؤنٹنٹ والا آڈٹ نہیں ہے۔‘‘ پھر اس کی تفصیل بتائی۔ ’’گریجویٹ کورس خاصے مشکل ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو ان کا پس منظر معلوم نہ ہو تو ان کو پڑھنا اور سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر کوئی طالبعلم کوئی ایسا گریجویٹ کورس کرنا چاہے جس کے متعلق اس نے پہلے کبھی نہ پڑھا ہو تو اس کو اس مضمون کے انڈر گریجویٹ کورس پڑھنے پڑھتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ان مضامین کا امتحان دینا لازمی نہیں ہوتا۔ چونکہ وہ اس مضمون کو پڑھتا تو ہے لیکن اس کا امتحان نہیں دیتا۔ ہم اس کو آڈٹ کہتے ہیں۔‘‘ ان گرانقدر معلومات کو بھی میں نے اپنی پہلی دفعہ والے کھاتے میں ڈال دیا۔ پھر اپنے مضامین کا انتخاب کیا۔

گریجویٹ کورس کے انتخاب میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی ان کا انتخاب میں نے خود کیا۔ آڈٹ والے کورس کا انتخاب ڈاکٹر اینڈرسن نے کیا۔ ایک کورس کا نام کچھ عجیب سا لگا۔ بولین الجبرا، خیال ہوا کہ شاید اس کا تعلق حضرت بلھے شاہ سے ہو۔ مجھے اندازہ تھا کہ بلھے شاہ نے کافیاں تو ضرور لکھی تھیں مگر یہ نہ معلوم تھا کہ ان کو الجبرا پر بھی دسترس حاصل تھی۔ کچھ حیرت ہوئی کیونکہ صوفی منش لوگ عام طور سے الجبرا وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ لیکن میں اس کی تصدیق ڈاکٹر اینڈرسن سے کروا کر ایک اور فلک شگاف نعرہ نہیں لگوانا چاہتا تھا۔ میں نے اینڈرسن سے کہا۔ ’’آپ کا مشورہ نہایت مناسب ہے مجھے پاکستان سے چلتے وقت سے ہی ایسے ہی کسی کورس کی تلاش تھی۔‘‘

جب کلاسیں شروع ہوئیں تو پتا چلا کہ بولین، کا بلھے شاہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ایک قسم کے سرکٹ ہیں جو کمپیوٹر وغیرہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی عقلمندی کو سراہا کہ ڈاکٹر اینڈرسن سے بلھے شاہ کا ذکر نہیں کیا تھا۔

کورس کا انتخاب مکمل ہوچکا تھا۔ دو کورس گریجویٹ دو آڈٹ، میں نے رجسٹریشن آفس جا کر فیس جمع کروادی۔ پیر سے کلاسیں شروع ہوجائیں گی۔

آج کلاس کا پہلا دن تھا۔ اتفاق سے میری پہلی کلاس اس کورس کی تھی جو مجھے آڈٹ کرنا تھا۔ یہ میرا امریکا کی کسی انڈر گریجویٹ کلاس میں جانے کا پہلا موقع تھا۔ کلاس میں جو منظر نظر آیا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ کلاس میں نظم وضبط کہیں نہ دکھائی دیتا تھا۔ ڈسپلن قسم کی کسی چیز کا کوئی وجود نہ تھا۔ نہ چال چلن کا اور نہ ہی لباس کا۔ کھانا پینا جائز تھا۔ ایک صاحبزادے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، دونوں پاؤں ڈیسک پر پھیلائے ہوئے لیکچر سننا چاہتے تھے۔ استاد کے اعتراض کرنے پر انتہائی ناگواری کے ساتھ پیروں کو ڈیسک سے ہٹا کر نیچے کرلیا۔

مغرب کی ان کلاسوں کی بہترین منظر کشی سڈنی ... پوٹیے کی مشہورِ زمانہ فلم ’’ٹو سر وِدھ لو‘‘ میں کی گئی ہے جس میں برطانوی اسکول کی عکاسی کی گئی ہے۔ نہیں معلوم کہ سڈنی پوٹیے کی شہرت اس فلم کا مرکزی کردار ادا کرنے کے بعد آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی یا وہ پہلے سے ہی اس

شہرت کو حاصل کر چکے تھے۔ اچھی اور قابلِ ستائش بات یہ ہے کہ انڈر گریجویٹ کلاسوں میں استادوں کے ادب کا فقدان، گریجویٹ کلاسوں میں پہنچ کر دوستی اور بے تکلفی میں ڈھل جاتا ہے۔ جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ استاد سے کسی قسم کا سوال کرنے سے نہیں گھبراتے کے یہ حدِادب ہے۔ ہمارے ملک میں یہ صورتِ حال نہیں تھی۔ NED کالج میں انجینئرنگ کے آخری سال میں پہنچ کر بھی طالب علم استاد سے سوال پوچھتے ہوئے گھبراتے تھے۔ یہ امریکی نظامِ تعلیم کا انتہائی اہم اور قابلِ تقلید مثبت پہلو ہے۔

ہمارے تدریسی اداروں میں ایک اور بھی خرابی ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی استاد کو کسی پوچھے گئے سوال کا جواب نہ معلوم ہو تو وہ اس کا اقرار کرنے میں اپنی ہتک محسوس کرتا ہے اور کسی نہ کسی بہانے سوال پوچھنے والے طالب علم کو ڈانٹ ڈپٹ کر بٹھا دیتا ہے.... وہ یہ حقیقت تسلیم کرنے میں عار محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی چیز سے ناواقف ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی امریکی استاد کو کسی پوچھے جانے والے سوال کا جواب معلوم نہیں ہوتا ہے تو وہ اعتراف کرتا ہے اور ذمے داری لے گا کہ وہ اگلی کلاس میں یا اور کسی وقت پوچھے جانے والے سوال کا جواب بتا دے گا۔

جیسے جیسے کلاسوں کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔ ماحول کی اجنبیت کم سے کم تر ہوتی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ دوسرے پاکستانی طالب علموں سے بھی مراسم ہو گئے۔ وقت اچھا گزرنے لگا۔

یونیورسٹی میں میرے علاوہ سات آٹھ اور بھی پاکستانی طالب علم تھے جن میں ایک کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ تین لڑکوں نے اسی کوارٹر میں ہی اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا۔ باقی ماندہ لڑکے پہلے ہی سے یہاں موجود تھے۔ نئے آنے والوں میں ایک چوہدری صاحب بھی تھے جن کا تعلق سندھ کے کسی گوٹھ سے تھا۔ وہ کسی حکومتی ادارے میں ملازم تھے۔ اسکالرشپ پر پڑھنے آئے تھے۔ پبلک ایڈمنسٹریشن میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سہل پسند ڈھیلے انداز میں بات کرتے تھے۔ کالے اور گورے امریکنوں کے فساد کے بارے میں بہت متفکر رہتے تھے۔ ایک دن بہت پریشان دکھائی دیے۔ معلوم کرنے پر کہنے لگے ”اگر یہاں پر کالے گوروں کا جھگڑا ہو گیا تو ہم تو دونوں طرف سے پٹیں گے!“ اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ ”گورے کہیں گے یہ گورے نہیں ہیں اور کالے کہیں گے یہ اتنے کالے نہیں ہیں۔“ خدا کا شکر ہے کے ان کے دورانِ قیام کالے گوروں کا جھگڑا نہیں ہوا۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ گروہ بندی کر لیتا ہے۔ کبھی چند گنے چنے لوگوں کے گروہ اور کبھی لاکھوں کے۔ کالے گورے لوگوں کے درمیان جھگڑے پر مجھے اپنے ملکوں کا خیال آ گیا کہ ہندوستان کی تقسیم کے دوران کس طرح لوگوں نے اپنے مخالف گروہوں کے ساتھ ظلم اور زیادتی کا سلوک کیا کہ درندے تک شرما جائیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان میں رہتے ہوئے مجھ میں ہندوستان اور ہندوؤں کے خلاف وہی متعصب جذبات تھے جو تقریباً ہر پاکستانی کے (اور ہندوستانی کے اسلام اور پاکستان کے خلاف) ہوتے تھے۔ سن 65ء کی جنگ کے دوران BBC کا نام ”آکاشوانی BBC“ رکھ دیا گیا تھا کہ ہمارا یہ یقین تھا کہ BBC ہندوستان کی بے جا طرفداری کر رہا تھا۔

آیوا یونیورسٹی میں اس وقت ستر اسی ہندوستانی طلبہ تھے جن میں سے ایک مسلمان طالب علم کے علاوہ باقی سب یا تو ہندو تھے یا سکھ۔ شروع شروع میں تو ان سے کھنچاؤ رہا لیکن آہستہ آہستہ ان سے بھی مراسم بڑھنے لگے۔ چند ہی ہفتے بعد گاڑھی چھننے لگی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی ناجائز بات کو بھی جائز ماننے لگے۔ صرف اتنا ہوا کہ بے معنی تعصب کی دیواریں آہستہ آہستہ گرنے لگیں اور ہندوستانی طلبہ سے اچھے خاصے مراسم ہو گئے۔ وہ بھی ہماری طرح انسان تھے۔ تعصب انفرادی سطح پر نہیں ہوتا۔ انفرادی سطح پر صرف دشمنی ہو سکتی ہے۔ تعصب یا تو گروہوں میں ہوتا ہے یا قوموں میں۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں زندگی گزارنے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے انسان اپنے ناجائز تعصبات سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں اس کے علاوہ متعصب گروہ اچھے برے وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ بھی دینے لگتے ہیں۔

جب 1970 میں مشرقی پاکستان میں سیلاب نے ناقابلِ بیان تباہی مچائی تو ہمارے ہندوستانی دوستوں نے اس جذبہ کے ساتھ متاثرہ لوگوں کے لیے چندہ جمع کیا جس جذبہ سے ہم پاکستانی طلبہ چندہ جمع کر رہے تھے۔

**جاری ہے**



# شوبز مین

شکیل صدیقی

**پاکستان کے گنے چنے اساتذۂ فن کے درجے پر پہنچنے والے اس باکمال شخص نے اس درجہ کمال کو حاصل کرنے کے لیے کتنی محنت کی، کس طرح وہ فن کی بلندیوں پر پہنچا اسی انتھک کوشش کا بیان**

## لیجنڈ کہے جانے والے فنکار کا تذکرۂ خاص

پاکستان ٹیلی وژن نیا تھا۔ جب اس کی نشریات باقاعدہ شروع ہوئیں تو نشریات شروع ہونے سے قبل قومی ترانے کے ساتھ پرچم لہراتا دکھائی دیتا تھا۔ پھر جب نشریات اپنے اختتام کو پہنچتی تھیں تب بھی قومی ترانہ پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اسکرین تاریکی میں ڈوب جاتا۔ پروگرام اس وقت توجہ سے پیش کیے جاتے تھے۔ چونکہ لوگوں کے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی اور سینما ہال تک جانا جیب پر بوجھ ڈالنے کے مترادف تھا، اس لیے لوگ ٹیلی وژن سے فوراً ہی

مانوس ہو گئے اور جھنڈے سے جھنڈے تک اسے دیکھنے لگے۔

اسی اثنا میں ضیاء محی الدین شو 1971ء میں پیش کیا گیا، جو ایک ٹاک شو تھا جس میں ملک کی مشہور و مقبول ہستیوں کو شریک ہونے کی دعوت دی جاتی تھی۔ ان سے دل چسپ سوالات کیے جاتے تھے۔ درمیان میں چند دوسرے فنکار بھی حصہ لیتے تھے اور شو کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے تھے۔ ان پروگراموں میں شامل ہونے والوں کی مکمل فہرست تو نہیں بنائی جا سکتی، البتہ یادداشت کے سہارے یہ بتایا جا سکتا ہے کہ معین اختر اس شو میں پہلی بار متعارف ہوا۔ اس کے علاوہ زیڈ اے بخاری، ابن صفی، ابن انشا، وحید مراد، محمد علی، خوش بخت، جمیل الدین عالی، جوش ملیح آبادی، انور مقصود، خالد عباس ڈار، رونا لیلیٰ اور نصرت بھٹو شامل تھے۔

اس شو کے آخر میں ضیاء خود کوئی نظم اپنے مخصوص انداز میں پڑھتا تھا اور اپنی آواز کا جادو جگاتا تھا۔ یہ شو بے پناہ مقبول ہوا، اس لیے کہ اس سے پیشتر ایسا کوئی شو ٹیلی ویژن سے پیش نہیں کیا گیا تھا۔ شو کی سب سے بڑی دل چسپی ضیاء محی الدین کے عجیب و غریب لباس ہوا کرتے تھے، جس کے بارے میں ضیاء نے بتایا تھا کہ وہ لباس اس نے براڈوے میں اسٹیج ڈراموں میں کام کرنے کے دوران سلوائے تھے۔ ضیاء محی الدین شو ٹنول فلیٹ کلب آڈیٹوریم میں ہفتے کی شام 8 بجے ریکارڈ کیا جاتا تھا اور لائیو ہوتا تھا، یعنی ناظرین تک براہِ راست پہنچتا تھا۔ (اسی لیے یہ دوبارہ پیش نہیں کیا جا سکا اور اس کی کوئی کیسٹ بھی دستیاب نہیں ہے) ضیاء شو کی ابتدا خود کرتا تھا۔ اس کے بعد دوسرے فن کاروں کو موقع دیا جاتا تھا۔ اسٹیج پر آنے والے فن کاروں، شاعروں یا ادیبوں کا ہلکا سا تعارف ضیاء کراتا اور اس کے بعد کہتا کہ فلاں صاحب آتے ہیں تو وہ صاحب اسٹیج پر تشریف لاتے۔ ضیاء تالیاں بجا کر ان صاحب کا استقبال کرتا۔ میزبانی کا یہ انداز اس سے پہلے اسٹیج پر پیش نہیں کیا گیا تھا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے حاضرین بھی ضیاء کے ساتھ تالیاں بجاتے۔ شو کے اختتام پر ضیاء محی الدین مائک ہاتھ میں تھام کر ایک انوکھے اسٹائل سے اسٹیج پر آتا تھا اور موسیقاروں کی طرف دیکھ کر کہتا تھا۔ ’ہاں، تو بھئی دینا ذرا ٹھیکا‘ جس کا مطلب یہ تھا کہ موسیقار دھن بجانا شروع کریں۔ پھر وہ کسی شاعر کی آزاد نظم اپنے مخصوص انداز میں لہرا کر پڑھتا تھا۔ جن شاعروں کا کلام اس نے زیادہ پڑھا ان میں ن م راشد اور فیض احمد فیض شامل تھے۔ رشید عمر تھانوی کی ایک نظم ان دنوں بہت مشہور ہوئی تھی، جس کے بول کچھ یوں تھے:

شاکرہ کی ماں یہ بولی
مجھے اپنی لڑکی کے لیے بر چاہیے
چاہے وہ گونگا ہو
چاہے ہو لنگڑا
مگر ہو سی ایس پی!

یہ شو بہت مقبول ہوا اور ضیاء کے بارے میں لوگ جاننے کے لیے متجسس رہنے لگے۔ معلوم ہوا کہ اس نے غیر ملکی (انگریزی) فلموں اور ڈراموں میں بھی کام کیا ہے اور وہ بہت ’بڑا اداکار‘ ہے۔ خود ضیاء کہتا ہے کہ یہ شو مقبول ہوا تھا کیوں کہ ان ہی دنوں جب میں کار سے نکل کر ایک دکان کی طرف بڑھ رہا تھا تو ایک بچی نے مجھے دیکھ کر اپنی والدہ سے کہا۔ ”امی، امی وہ دیکھیے ضیاء محی الدین شو جا رہے ہیں۔“

اس شو کی تیاری کے بارے میں حمید کاشمیری کہتے ہیں: کراچی ٹیلی وژن شو کے ابتدائی دنوں میں ضیاء محی الدین کے ساتھ ان کے شو کے سلسلے میں مجھے تین ماہ تک مسلسل کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا شو تھا۔ ضیاء کی آمد پر شوبزنس سے دل چسپی رکھنے والے حلقوں میں دھوم مچ گئی تھی۔ میں نصیر انور اور علی ظفر جعفری کے ساتھ مل کر اس شو کا اسکرپٹ لکھا کرتا تھا۔ اس اسکرپٹ کو لکھنے سے پہلے صلاح و مشورہ ہوتے تھے۔ یہ شو جب آن ائیر کیا گیا تو پاکستان ٹیلی ویژن کے مینجنگ ڈائرکٹر اسلم اظہر کی پیش گوئی کے مطابق دیکھتے دیکھتے شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں کو چھو گیا۔ اور کوئی دوسرا شو اس کی مقبولیت کی سطح کو نہ پہنچ سکا۔

میں اپنی ذمّے داریوں سے ہٹ کر محض اپنے شوق کی تکمیل کے لیے بہت سے کام رضاکارانہ طور پر شو کے لیے کرتا تھا۔ مثلاً بہت سے عوامی فن کار جن سے ضیاء خود متعارف نہیں تھے، میں انہیں تلاش کر کے شو کے لیے لاتا تھا۔ اس سلسلے میں، میں تراب علی کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ تراب علی کے بارے میں معلومات جنگ اخبار میں شائع ہونے والے منیر حسین کے ایک مضمون سے ملی تھیں، جس کی رُو سے تراب علی 1962ء کے ہیلسنکی اولمپکس میں پاکستانی فٹ بال ٹیم کے بہ حیثیت کپتان نمائندگی کر چکے تھے اور پاکستان کے لیے گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ لیکن ملک میں فٹ بال کا کوئی مستقبل نہیں تھا، اس لیے تراب علی کا بھی بہ حیثیت فٹ بالر کوئی مستقبل نہیں رہا۔ چنانچہ انہوں نے گزارے کے لیے ٹیکسی ڈرائیور کا پیشہ



اختیار کر لیا۔ میں نے ضیاء سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فوراً اسے شو میں پیش کرنے کی منظوری دے دی۔

یہاں تک تو مجھے معلوم تھا، لیکن اب وہ کہاں رہتا ہے، مجھے خود نہیں معلوم تھا۔ لہٰذا میں نے دو تین ٹیکسی ڈرائیوروں سے پوچھا، لیکن سب نے نفی میں جواب دیا۔ پھر میں نے ایک مکرانی سے پوچھا تو وہ بولا۔ ”اڑے کون نہیں جانتا تراب کو۔ امارے پاڑے کا ہے۔“ اس نے سینہ تان کر جواب دیا۔

یوں میں نے تراب علی کو تلاش کر لیا اور اس نے شو میں شرکت کی۔ تراب علی کو بہت ڈرامائی انداز میں لایا گیا تھا جسے ناظرین نے بہت سراہا۔ اسکرپٹ کے مطابق ضیاء نے تراب علی کو بہ حیثیت ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ناظرین سے متعارف کرایا اور تراب سے ٹیکسی ڈرائیوروں کے مسائل اور مسافروں کے مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ”اب تک جس ٹیکسی ڈرائیور سے ہم ٹرانسپورٹ کے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے وہ آج ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے، لیکن کل وہ پاکستان کی قومی فٹ بال ٹیم کا کپتان تھا جو ہیلسنکی اولمپکس میں پاکستانی ٹیم کی قیادت کر چکا ہے۔۔۔“

ضیاء کا تعارف ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے اور انہوں نے والہانہ انداز میں تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ اتنی دیر تک بہت کم شخصیات کے لیے تالیاں بجائی گئی ہوں گی۔

یہ یقیناً ایک یادگار پروگرام تھا، لیکن اس پوری سیریز کی جان جوش ملیح آبادی والا پروگرام تھا۔ اس شو میں جوش صاحب نے کمال کے فقرے بولے تھے۔ ایک مہمان کو بلانے کے بعد دوسرے مہمان کو بلانے کے لیے کسی طرح سے جوڑ ملانا پڑتا تھا۔ جوش صاحب کے بعد رقاصہ امی مینوالا کو اسٹیج پر پکارا جاتا۔ جوڑ ملانے کے لیے ضیاء نے جوش صاحب سے پوچھا۔ ”جوش صاحب! رقص کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

جوش صاحب بے ساختہ بولے۔ ”رقص اعضاء کی شاعری ہے۔“ لوگوں نے اس جواب پر تالیاں پیٹیں۔

پھر امی مینوالا اچھلتی کودتی اسٹیج پر آ گئیں۔ وہ ہائی جمپ اور لانگ جمپ لگانے لگیں۔ اس لیے کہ انہوں نے جو آئٹم تیار کیا تھا وہ پنجاب کا لڈی ڈانس تھا۔ جب کہ لڈی ڈانس جوش صاحب کے اس نازک فقرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ جوش صاحب نے گردن اٹھائی اور بولے۔ ”ہائیں! یہ تو جمناسٹک ہے۔“

ابن صفی جاسوسی ناولوں کے مصنف کی حیثیت سے برصغیر ہندو پاک میں شہرت اختیار کر چکے تھے۔ انہیں بلایا گیا تو حاضرین کی سانس رک گئی۔ ان سے پہلے خوش بخت عالیہ اسٹیج پر تشریف لا چکی تھیں۔ جب ابن صفی کا تعارف ہو گیا تو خوش بخت نے ان سے اسکرپٹ کے مطابق سوالات کرنا شروع کر دیے۔

خوش بخت: ”کتابوں کے شیلف میں مولانا ابوالکلام کی غبارِ خاطر، محمد حسین آزاد کی آبِ حیات، مولانا مودودی کی خلافت و ملوکیت رکھی ہو تو آپ کی کتاب کہاں رکھی جائے گی؟“

ابن صفی: ”میری کتابیں شیلف میں نہیں رکھی جاتیں، قارئین انہیں اپنے تکیوں کے نیچے رکھتے ہیں۔“

خوش بخت: ”ایک ناول میں آپ نے آدمیوں سے بن مانس بنائے تھے۔ (موت کی چٹان) اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“

ابن صفی: ”اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ آدمی ابھی تک انسان تو بن نہیں سکا، میں نے بن مانس کیوں بنا دیے۔ بہرحال بے فکر رہیے اب ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوگی۔“

ضیاء نے بہت سے لوگوں کو اپنے شو میں متعارف کرایا جو بعد میں بڑے فن کار ثابت ہوئے۔ انہوں نے ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا اس طرح موقع دیا جیسے مچھلی کو تیرنے کے لیے پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ فیض بلوچ پہلی بار ضیاء شو میں آئے تھے۔ ریہرسل کے دوران فیض نے گاتے گاتے تان لگائی، اسٹیج پر گھومے اور ایک پُرکشش ٹھمکا لگایا تو ضیاء کہنے لگے۔ ”یہ ایک دن بہت بڑا شو مین ثابت ہوگا۔“

بعد میں وقت نے ثابت کیا کہ جب بھی فیض بلوچ کسی شو میں آتے تھے تو اس شو کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ معین اختر اور انور مقصود بھی بڑے شو مین بنے۔

☆☆☆

ٹیلی ویژن پر ضیاء کا شو ختم ہوا تو اس کو ایک فلم ’مجرم کون‘ میں ہیرو کی حیثیت سے کام مل گیا۔ ضیاء کہتا ہے کہ ’اس فلم کی ہیروئن وہ اداکارہ تھی جو ٹیلی ویژن اشتہار میں چلتی ٹرین سے کہتی ہے کہ چائے چاہیے۔ جب کہ پلیٹ فارم پر کھڑا اداکار پوچھتا ہے، کون سی جناب؟ اداکارہ کہتی ہے لپٹن عمدہ ہے۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں کس اداکارہ کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس فلم کا ہدایت کار ایک کیمرا مین تھا۔ چنانچہ وہ چاہتا

تھا کہ ہر چیز نظم وضبط کے دائرہ کار میں ہو۔ اس کا اصرار تھا کہ میں فلم کی ہیروئن سے ملاقات کروں، تاکہ شوٹنگ سے پہلے ہمارے درمیان کچھ شناسائی پیدا ہو جائے۔ اگر ہم فلم میں ہیرو ہیروئن ہیں تو عام زندگی میں کم از کم دوست ضرور ہوں۔

یہ ملاقات ہیروئن کے اپارٹمنٹ میں ہونا قرار پائی۔ ہیروئن اپارٹمنٹ کی دوسری منزل پر رہتی تھی۔ ہم سہ پہر کو پانچ بجے وہاں پہنچ گئے۔ اطلاعی گھنٹی بجانے پر دروازہ کھلا اور ایک نوجوان کی صورت دکھائی دی۔ وہ ہم پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالتا ہوا زینے اترتا ہوا چلا گیا۔ ہم اندر گئے تو ہیروئن میرے اندازے سے زیادہ فربہ اور تجیم شحیم نکلی۔ وہ بیل باٹم میں تھی جو اس زمانے میں بہت مقبول تھا۔ اس نے ناخنوں پر نیل پالش لگا رکھی تھی، جو پچھلے ہفتے کی نیل پالش پر ہی کی گئی تھی۔ یہ بات میرے ذوق پر پوری نہیں اترتی تھی۔ ہیروئن نے میرا تعارف اپنی ماں سے کرایا، جو ایک لمبی سیٹی کے کنارے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور ہم کلام بھی نہ ہوئی۔ لیکن جب ہدایت کار نے اسے 'ممی' کہا تو اُس کی باچھیں کھل اٹھیں۔ میں ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ ہدایت کار نے میری بے چینی اور اضطراب کو محسوس کرلیا تھا، اس لیے وہ ممی سے میری تعریفیں کرنے لگا۔ اس کے بعد میری طرف مڑا اور ہیروئن کی تعریفیں کرنے لگا۔ ممی کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے چہرے کی خشکی برقرار رہی۔

تھوڑی دیر بعد چائے اور لوازمات آ گئے۔ ہدایت کار نے اپنی پلیٹ میں چند چیزیں نکال لیں۔ پھر اس نے مجھ سے کہا میں بھی کچھ لوں۔ میں ان دنوں خود پر غذائی کنٹرول کیے ہوئے تھا اور وقت مقررہ پر ہی نپا تلا کھانا کھاتا تھا۔ میرے انکار پر ہدایت کو شرارت سوجھی اس نے فلم کی ہیروئن سے کہا کہ اسے ضرور کچھ کھلاؤ۔ اس کے بعد اس نے ایک پیڑا پلیٹ سے اٹھایا اور پلیٹ ہیروئن کو دے دی کہ وہ مجھے کھانے پر مجبور کرے۔ میرے لیے یہ ایک لرزہ خیز پچویشن تھی۔

ہیروئن نے پلیٹ سے پیڑا انگلیوں سے تھاما اور میری طرف بڑھا دیا۔ اپنے چائے والے اشتہار کی طرح سے اس نے ناک سکیڑی تاکہ میں اس ادائے دلبری پر فریفتہ ہو کر اسے قبول کرلوں۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے شکریہ ادا کیا اور عذر یہ بتایا کہ میں نے دوپہر کو بھاری کھانا کھایا تھا اس لیے طبیعت نہیں چاہ رہی ہے۔

''ممکن ہے انہیں مقامی مٹھائی پسند نہ ہو۔'' ہیروئن نے مسکرا کر ہدایت کار سے کہا اور وہ پیڑا اپنے منہ میں رکھ لیا۔ پھر اس نے سینٹرل ٹیبل کی پلیٹ سے کیک کا ایک ٹکڑا اٹھا کر پلیٹ میں رکھا۔ اس کیک پر بھی شکر چھڑکی ہوئی تھی۔ اس نے وہ میری طرف بڑھایا تو میں نے کہا۔ ''نو تھینکس۔''

اس کی ممی کو یہ بہت ناگوار گزرا۔ اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تھینک یو، تھینک یو کیا کرتا ہے؟ کھاتا۔''

مجھے کھلانے کا کھیل جاری رہا۔ ہیروئن کوئی نہ کوئی میٹھی چیز اٹھاتی اور اپنی ناک سکیڑ کر پیشکش کرتی کہ میں اسے حلق کے پار اتاروں، لیکن میرے رویّے سے مایوس ہو کر اسے اپنے منہ میں رکھ لیتی۔

''مجھے اتنا نہیں کھانا چاہیے۔'' اس نے ہدایت کار سے کہا۔ ''کل سے میں ڈائٹنگ کروں گی۔''

ممی گوشت کا پہاڑ تھیں اور جب وہ بولتی تھیں تو ایسا لگتا تھا جیسے آسٹریلیا کا بڑا طوطا کرخت آواز میں ٹیں ٹیں کر رہا ہو۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اگر ہیروئن کے کھانے پینے کا یہی عالم رہا تو وہ چند ماہ میں اپنی ممی کی طرح ہو جائے گی۔

جب ہم اس اپارٹمنٹ سے باہر آ گئے تو میں نے ہدایت کار سے کہا۔ ''اسے چند پونڈ اپنے جسم سے ضرور جھٹکنا چاہئیں، تمہارا کیا خیال ہے؟''

اس نے مجھ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''البتہ میں تم سے کہوں گا کہ تم کچھ وزن بڑھاؤ، ہمارے ہاں کے ہیرو فربہ اور گول مٹول ہوتے ہیں۔ فربہ ہونا یوں بھی آسودگی کی علامت ہے۔''

فلم 'مجرم کون' ریلیز ہوئی تو اس کا ایک گیت مقبول ہوا:

ہونٹوں پر تبسم نظر سہی سہی
ہو گئی رے مجھے کیوں غلط فہمی

فلم البتہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ جیسا ملک میں دستور ہے، فلم کامیاب تو اداکار کامیاب اور اگر فلم ناکام تو اداکار ناکام۔ ضیاء پاکستانی اردو فلموں میں ناکام ہو گیا۔ کچھ ماہ بعد جب شمیم آرا نے 'سہاگ' بنائی تو اس کے لیے بھی ایک کردار اس میں رکھا۔ فلم کا ہیرو ندیم تھا۔ فلم باکس آفس پر کامیابی کے جھنڈے نہ گاڑ سکی۔ اس کے بعد ضیاء کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ بقول شخصے کہ وہ 'ہٹ' نہ ہو سکا۔ اس کی صداکاری سے سب متاثر ہوئے، لیکن بحیثیت اداکار کسی نے تحسین وتعریف کے ڈونگرے نہیں برسائے۔

'ضیاء محی الدین کے ساتھ ٹیلی ویژن ہی کا ایک



پروگرام تھا جس میں وہ فلسفیوں کا سا گیٹ اپ کر کے اسکرین پر آیا۔ سر کے بال بے حد لمبے، سفید داڑھی بھی سینے پر لہراتی ہوئی، اس کے سوا اسکرین پر کچھ نہیں ہوتا تھا، فلسفہ اور علم کی باتیں لوگوں کو سناتا یا پھر کتابوں کے شیلف میں سے کوئی کتاب نکال کر پڑھنے لگتا۔ پڑھے لکھے لوگوں نے ممکن ہے یہ پروگرام دیکھا ہو، لیکن عوام کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کے علاوہ اس نے ''چچا چھکن'' اور ڈراما ''مارخیم'' میں کام کیا۔

انہی دنوں رقاصہ ناہید صدیقی (عارفہ صدیقی کی خالہ) سے اس نے نکاح کرلیا۔ یہ اس کا دوسرا نکاح تھا۔ اس سے پہلے وہ ثروت نامی ایک لڑکی سے نکاح کر چکا تھا، جس سے دو بچے بھی تھے۔ ثروت جمیل الدین عالی کی سیکنڈ کزن ہے۔ ثروت سے علیحدگی، دیر سے گھر واپس آتا تھا۔ شو بزنس کے لوگوں کو اس پریشانی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس میں کون 'قصوروار' تھا، ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے لیکن ضیاء کہتا ہے کہ زندگی، زمانے اور وقت کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے باوجود یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دو محبت کرنے والے انسان آخر اچانک کیسے جدا ہو کر راستہ بدل لیتے ہیں۔ برداشت کرنے کا حوصلہ کہاں ٹوٹ کر گرتا ہے۔ پہلی شادی کے ٹوٹنے کی ذمّے داری میں قبول کرتا ہوں۔

ناہید سے شادی کے وقت ضیاء کی عمر چالیس برس کے قریب تھی۔ یہ شادی مروجہ شادیوں کے مطابق ڈھول تاشے کے ساتھ نہیں ہوئی تھی اور نہ ضیاء نے شیروانی پہن کر منہ پر رومال رکھا تھا، نہ ہار پہنے تھے، ناہید نے بھی ہاتھوں میں مہندی لگائی اور نہ ہی سرخ روایتی جوڑا پہنا، بلکہ نکاح وہیں ہوا تھا جہاں ناہید صدیقی کام کرتی تھیں۔ جب نکاح ہو گیا تو دونوں اپنے اپنے کام پر چلے گئے۔ رخصتی کے بارے میں اطلاع نہیں ملی کہ وہ کیسے اور کب ہوئی۔

ناہید صدیقی ایک کلاسیکی رقاصہ ہے۔ راولپنڈی میں پیدا ہوئی۔ 1971ء میں جب اس کی عمر 15 برس تھی، اس نے لاہور کے مہاراجا غلام حسین خٹک سے رقص کی تربیت لینا شروع کردی۔ اس کے بعد جب اس نے لاہور کے کالج آف ہوم اکنامکس سے گریجویٹ کرلیا تو پی آئی اے آرٹس اکیڈمی نے اسے ملازمت کی پیشکش کی۔ اکیڈمی کا رکن ہونے کی حیثیت سے اس نے متعدد ملکوں کا دورہ کیا۔ اکیڈمی نے ایک پروگرام ملکہ الزبتھ دوم کے لیے بھی پیش کیا۔

1973ء میں ضیاء محی الدین نے ناہید صدیقی سے نکاح کے پانچ سال بعد 1978ء میں ..... ناہید کے ساتھ مل کر ٹیلی وژن پر 'پائل' نامی پروگرام پیش کیا جس میں ناہید کلاسیکی رقص پیش کرتی تھی اور ضیاء تال دیتا تھا۔ ''تا تا تھیا..... تھیا۔'' اس پروگرام کو ایک بنگالی نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ اس پروگرام کی تیس قسطیں منظور ہو چکی تھیں، لیکن ناہید مشکل ہی سے چھ قسطیں ٹیلی کاسٹ کرا پائی ہو گی کہ اس پر پابندی لگ گئی۔ ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے ضیاء کہتا ہے۔

''حکومت تبدیل ہو چکی تھی۔ ضیاء الحق کی حکومت نے رقص پر پابندی لگا دی تھی۔ میں ان دنوں کتھک پر سیریل پیش کر رہا تھا۔ ہمارے وزیر ثقافت و کلچر نے اس کا ایک پروگرام دیکھ کر کہا کہ یہ تو بہت عریاں اور لچر پروگرام ہے، اس پر فوراً پابندی لگا دینا چاہیے۔ اخبارات میں، میں نے یہ تبصرہ بھی پڑھا کہ ناہید صدیقی ہماری نئی نسل کو تباہ و برباد کر رہی ہیں۔ اس تبصرے کو پڑھنے کے بعد ایسا لگا کہ ہماری ٹانگیں کٹ گئی ہوں اور ہم بے سہارا ہو چکے ہوں یا پھر اس ملک کے شہری نہ ہوں۔''

ناہید صدیقی کہتی ہیں ''رقص ایک روحانی ورزش ہے۔ رقص تو صوفی بھی کرتے ہیں۔ لال شہباز قلندر کے مزار پر ہر سال بڑا اجتماع ہوتا ہے اور سب دھمال ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ ترکی کے صوفی بھی رقص کرتے ہیں تو پھر یہ اسلام کے خلاف کیسے ہو گیا؟''

ضیاء اور ناہید 1979ء میں لندن چلے گئے۔ پھر ناہید نے برمنگھم میں آرٹس کونسل میں کتھک رقص پر تربیتی کلاسیں شروع کردیں۔ اس نے اپنی فن کاری کا مظاہرہ کر کے کئی ایوارڈ جیتے۔ 1991ء میں اسے نیشنل تھیٹر لندن میں ایوارڈ دیا گیا۔

لیکن وہ ایوارڈ اسے اپنی زندگی میں بہت پسند ہے جو اسے پہلی ہوم اسکول سے ملا جہاں سے اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اسے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے پرنسپل صاحب نے کہا: ''یہ ہمارے اسکول کی سب سے منفرد طالبہ ہیں۔''

ناہید سے پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک آرٹ کیا ہے؟

اس نے جواب دیا۔ ''ہم سب روز آسمان، سورج، چاند اور خوب صورت درختوں، پہاڑوں اور خوب صورت انسانی چہروں کو دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کیا دکھاتا ہے؟ اپنا آرٹ، ہم سب اللہ کا خوب صورت آرٹ ہی تو ہیں۔ جذبات اور احساسات سے بھرے ہوئے، ہمارا جسم، روح اور دماغ اللہ کا آرٹ ہی تو ہے۔''

☆☆☆

ضیاء کا کہنا ہے کہ یہ غلط ہے کہ میں بولتا بہت ہوں، یقین کیجیے کہ میں نے سنا بہت ہے۔ میں نے اردو کے اچھے بولنے والوں کو سنا ہے۔ جب میں صرف چھ برس کا تھا تو میں نے سر عبدالقادر، پنڈت برج موہن دتا تریا کو بولتے سنا۔ میں نے ان کے بارے میں یہی تبصرہ کر سکتا ہوں کہ وہ بہت شان دار آوازوں کے مالک تھے۔ اس کے علاوہ بھولا بھائی ڈیسائی بہت اچھی انگریزی بولتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے لگ بھگ میں نے ونیچکام اسٹیل کو بولتے سنا تھا۔ اس کے والد سینٹرل ٹریننگ کالج میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ وہ بے حد نفیس انسان تھے۔ یہ سب لوگ میری زندگی پر اثر انداز ہوئے۔

میرے والد کو کلاسیکی موسیقی سے شغف تھا، اس لیے میں نے موسیقی سے متعلق کافی کتابیں پڑھ ڈالیں اور اس کے بارے میں جان لیا۔ جہاں تک پڑھنے کا تعلق ہے تو میں نے اسجز آف مین کو جان گلیلگڈ سے اور شیکسپیئر کو میکس ایڈریان ڈوروتھی ٹیوٹن سے پڑھا ہے۔ اس کے بعد میں نے تقریباً پانچ برس تک شاعری اور نیشنل تھیٹر میں پڑھی۔ پھر کچھ کرنے کا حوصلہ ہوا۔ 1960ء کے آخر میں، میں نے مرحوم منصور بخاری کی نگرانی میں ای ایم آئی کے لیے فیض کا کلام ریکارڈ کرایا ’فیض کی یاد میں‘۔ اس ریکارڈ کا شیرٹن ہوٹل میں افتتاح ہوا، جہاں فیض صاحب مدعو تھے۔ پروگرام کے اختتام پر مجھے لوگوں نے دل کھول کر سراہا۔ خوب داد ملی۔ اس کے بعد سلسلہ چل پڑا اور میں نے اردو کلاسیک کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کا کلام ریکارڈ کرایا جس میں ’غالب کے خطوط‘ کی 3 جلدیں بھی شامل ہیں۔

ضیاء محی الدین کس پائے کا فن کار ہے، اس نے کہاں اور کس سے تربیت حاصل کی اور اس کا خاندانی پس منظر کیا ہے، یہ سب جاننے کے لیے ماضی کی سیر کرنا پڑے گی۔ وہ 20 جون 1933ء میں فیصل آباد (لائل پور) میں ایک اردو بولنے والے گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کے گھر کا ماحول خوش گوار تھا۔ ماں اور باپ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اس کا بچپن کیسا گزرا ؟ یہ اس سے خود پوچھ لینا چاہیے۔ ضیاء کا کہنا ہے۔

’’میرا بچپنا کوئی خاص نہیں تھا، وہی بے معنی بھاگ دوڑ، چھوٹی چھوٹی چیزوں کے پیچھے لڑائی جھگڑا۔ بھوت پریت‘ ڈائن اور چڑیلوں سے خوف زدہ ہونا۔ جن دنوں ہم اپنی پھوپی رقیہ کے ہاں قصور گئے تھے تو میں خاصا چھوٹا ہوا کرتا تھا۔ مکان سرکلر روڈ پر تھا اور اس کے سامنے خوب وسیع و عریض میدان تھا۔ جس کا سرا آسمان سے جا کر مل جاتا تھا۔ اس مکان کا صحن اور برآمدہ کچا تھا اس لیے جب جمعدارن جھاڑو دینے آتی تھی تو منہ پر کپڑا باندھ لیا کرتی تھی۔ وہ جھاڑو دیتی تھی تو خوب دھول اڑتی تھی۔

میں عموماً برآمدے میں اونچی نیچی اینٹوں پر بیٹھ جایا کرتا تھا جو فرش پر سلیقے سے جمی ہوئی تھیں۔ چیونٹیوں کی قطاریں کچے فرش پر اِدھر سے اُدھر رینگتی دکھائی دیتی تھیں۔ سامنے کا دروازہ کھلا ہوتا تھا تو اس سے خوب ہوا آتی تھی اور میدان میں درختوں کے پتے اڑتے نظر آتے تھے جو نہ معلوم کہاں سے آ جایا کرتے تھے۔

بچوں کو مکان کی چھت پر جانے سے منع کیا گیا تھا کیوں کہ ملحقہ مکان کے بارے میں بچوں میں مشہور تھا کہ اس میں ایک ڈائن رہتی ہے۔ اسے دیکھنے کا شوق اور جستجو تھی اور ڈر بھی لگتا تھا کہ نظر آنے پر نہ جانے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ بہر حال ایک دن جب گھر والے کام میں منہمک تھے میں دوڑ کر زینے پر چڑھ گیا۔ مگر لینڈنگ سے آگے جانے کی ہمت نہ پڑی۔ وہاں بہت سے خالی ٹین کے ڈبے پڑے رہتے تھے۔ کاٹھ کباڑ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ جب دل کی دھڑکنیں اعتدال پر آ گئیں تو چھت پر چلا گیا۔ چاروں طرف میرے قد کے برابر دیوار تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو پچھواڑے کوڑے کچرے کا ڈھیر نظر آیا۔ وہاں عام طور پر سناٹا رہتا تھا البتہ کبھی کبھار وہ ڈائن کوڑے کچرے میں کچھ تلاش کرتی نظر آ جاتی تھی جو ملحقہ مکان میں رہتی تھی۔ غالباً اس کا دروازہ بھی پچھواڑے کھلتا تھا۔ اس کی چیخیں گاہے گاہے سنائی دیتی تھیں۔ اپنا مرداں گئے اپنا بھوبر بھور دار ودھا۔ جمعدارن نے مجھ سے خاص طور پر کہا تھا کہ میں کوشش کروں کہ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈال سکے۔

خیال آیا کہ جب تک ملحقہ مکان کی دیوار تک نہیں جاؤں گا اس وقت تک کچھ دکھائی نہیں دے گا اس لیے جی کڑا کر کے اُدھر چلا گیا۔ صحن خالی تھا۔ میں تھوڑا سا جھکا تو ایک عورت دکھائی دی۔ اس کے بال پریشان اور الجھے ہوئے تھے اور لباس ملگجا سا تھا۔ وہ دوسری سمت میں دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً وہ صحن میں آ گئی اور پلٹ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ڈائن میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ٹانگیں ربڑ کی بنی ہوئی ہوں یا ان کی جان نکال لی گئی ہو۔ ڈائن نے میری طرف انگلی اٹھا دی اور اشارہ کیا کہ میں اس کے پاس چلا جاؤں۔ اب میں پلٹ کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ جیسے چھت میں مقناطیس لگا ہو اور پاؤں اس سے چپک گئے ہوں۔ معلوم نہیں کتنی دیر بعد وہ کیفیت ختم ہوئی تو میں پلٹ کر بھاگا اور لینڈنگ پر آ کر سانس لیا۔ ڈائن چیخنے چلانے لگی تھی۔ میری دھڑکنیں ایک بار پھر بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ لباس کی طرف دیکھا تو دھول میں اٹ گیا تھا۔ جا بجا دھبے پڑ گئے تھے۔ اس خوف سے کہ مار نہ پڑے۔ میں نے لباس اچھی طرح سے جھاڑ لیا۔ میرا خیال تھا کہ میں نارمل ہو گیا ہوں۔

میں نیچے گیا تو میری بڑی بہن کمرے سے نکل کر اس طرف آ رہی تھیں۔ انہوں نے جو مجھے دیکھا تو چونک کر کہا۔ ’’کہاں تھا اب تک؟ یہ کپڑوں کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کیا کر رہا تھا؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘ میں نے سہم کر کہا۔ ’’اوپر گیا تھا لیکن ڈائن مجھے دیکھ کر چیخنے چلانے لگی۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔‘‘

’’تجھے کتنی بار سمجھایا ہے کہ چھت پر اکیلے نہیں جانا۔ وہ ڈائن ہے۔‘‘

انہوں نے دو چار طمانچے مار کر گرد جھاڑ دی اور یہ لحاظ نہیں کیا کہ ہم اس وقت پھوپی کے گھر ہیں۔

’’وہ بے کس ہے۔ اسے ڈائن نہ کہو۔‘‘ میری پھوپی نے سمجھانے والے انداز میں کہا جو کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ رہی تھیں۔ ’’بدقسمت ہے۔‘‘

پھوپی کو دیکھ کر مجھے قدرے حوصلہ ہوا کہ اب شاید آپا میرے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کریں لیکن انہوں نے مجھے گھسیٹا اور صحن کے ایک گوشے میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ کی طرف گئیں، جہاں ایک عدد بالٹی مستقل رکھی رہتی تھی۔ انہوں نے میری کپڑے اتار ہینڈ پمپ چلایا اور بالٹی بھر کر نہلانا شروع کر دیا۔ انہوں نے میری شرم و حیا کی پروا کیے بغیر میرے جسم کو اپنے طاقتور ہاتھوں نے ملنا شروع کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری پیدائش سے لے کر اب تک وہی مجھے نہلا رہی تھیں، اس لیے پاک صاف رکھنا اپنا حق سمجھتی تھیں۔

بعد میں ان کی شادی پھوپی زاد بھائی کے ساتھ ہو گئی تو وہ مستقل طور پر پھوپی کی تحویل میں چلی گئیں۔

’’تم اسے گھورنا یا ستانا نہیں۔‘‘ پھوپی نے میرے نزدیک آ کر سمجھایا۔ ’’اس عورت کا سارا خاندان ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔‘‘ انہوں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ’’اللہ کی مرضی۔‘‘

☆☆☆

ضیاء بچپن ہی سے عمدہ لباس پہننے کا شوقین تھا۔ اگر لباس درست نہیں ہوتا تھا تو بہنوں کی شامت آ جاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور 1949ء میں گریجویٹ ہو گیا۔ وہ اپنے کالج میں مقرر بھی تھا۔ اس نے حصولِ تعلیم کے دوران 1951-52ء میں افسانہ نگاری بھی کی۔ اس نے پہلے اسٹیج ڈرامے میں اپنے والد کی زیرِ ہدایت ’’دیوتا‘‘ کے نام سے کام بھی کیا۔

اس کے والد خادم محی الدین دیال سنگھ کالج لاہور میں انگریزی کے لیکچرار تھے۔ موسیقی، فنون لطیفہ اور ڈرامے سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے۔ گویا ذوقِ لطیف ضیاء کو ورثے میں ملا۔ وہ کہتا ہے۔ ’’بہر حال میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ ہمارے ملک میں اداکار ہونا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جن دنوں میں لاہور میں ہوتا تھا اور بہ لحاظ عمر چھوٹا تھا تو بس میں بیٹھ کر اپنے ایک دوست کے مکان پر گیا۔ دوست تو نہیں ملا مگر اس کے والد مل گئے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے استفسار کیا کہ صاحبزادے آج کل کیا کر رہے ہو؟ میں نے بتایا کہ میں ان دنوں اداکاری کر رہا ہوں۔

’’اداکاری!‘‘ وہ چونک کر بولے۔ ’’ارے یہ بھی کوئی کام ہے؟ میں تمہارے والد سے واقف ہوں۔ وہ تو بہت شریف انسان ہیں۔ انہوں نے تمہیں کیسے اس کی اجازت دے دی؟‘‘

والد صاحب کا چہرہ بیضوی اور ناک لمبی لیکن باوقار تھی۔ ان کی پیشانی چوڑی تھی اور آنکھیں سیاہ اور کشادہ۔ بلاشبہ وہ پُرکشش تھیں۔ ان کے ہونٹوں کے گوشے معمول سے لمبے تھے، اس لیے ان کی طرف دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ جب وہ مسکرائیں گے تو ان کے لبوں پر لمبی سی مسکراہٹ ابھرے گی۔

وہ سر کو جھکا کر چلتے تھے تاکہ تفاخر اور رعونت کا تاثر نہ ابھرنے پائے۔ ان کے والد یعنی میرے دادا نے انہیں نصیحت کی تھی کہ وہ شرم و لحاظ اور فروتنی سے کام لیا کریں، وہ زندگی بھر اس نصیحت پر عمل کرتے رہے۔

والد صاحب قناعت پسند تھے اور میں نے کبھی انہیں حرص و لالچ کے عذاب میں گرفتار ہوتے نہیں دیکھا۔ انہوں نے کبھی لاٹری کا ٹکٹ نہیں خریدا، ریس کورس نہیں گئے اور نہ کبھی کسی ایسی اسکیم میں سرمایہ لگایا جس سے سرمایہ چند ماہ میں

دوگنا ہوجائے۔

میرے دادا کو انگریزوں نے ایک قطعہ اراضی شیخوپورہ سے کچھ فاصلے پر دے دی تو انہیں بھاری لگنے لگا اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس کا کیا کریں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ کہیں اتنی بڑی جائداد پا کر ان کی اولاد عیش پرست نہ ہوجائے۔ اس قطعہ اراضی میں میرے والد کا حصہ ایک تہائی تھا۔ رجسٹرار آفس کے چکر لگانا اور اس کے کاغذات بنوانا ان کے بس کی بات نہیں تھی، لہٰذا انہوں نے وہ پلاٹ ایک ٹھیکے دار کو دے دیا جس نے سالانہ کچھ رقم دینے کا وعدہ کیا۔

اس ٹھیکے دار سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ وہ سال میں ایک بار آتا اور اپنے ساتھ گھی اور گڑ کے تھیلے لاتا۔ انہیں ہمارے حوالے کرنے کے بعد صحن میں پڑی کرسی پر بیٹھنے سے پیشتر کہتا۔ ”سلام زمیں دار صاحب!“ میرے والد جز بز ہوتے اس لیے کہ انہیں زمیں دار ہونے کا خطاب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔

کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ شخص اپنا پگڑ اتار کر گلوگیر آواز میں کہتا۔ ”صاحب! بدقسمتی ہمارا پیچھا کررہی ہے۔ اس سال بارشوں نے پیچھا ہی نہ چھوڑا۔ سب فصل تباہ کردی۔ میں کچھ روپے لایا ہوں، معلوم نہیں کس طرح۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں، خدا گواہ ہے کہ میں نے خرچہ پانی کے لیے اپنے پاس کچھ نہیں رکھا ہے۔“ اس کے بعد وہ ایک لفافہ کوٹ کی جیب سے نکال کر والد صاحب کی طرف بڑھا دیتا۔

والد صاحب ہچکچاتے ہوئے کہتے۔ ”کیا تمہیں رقم کی ضرورت نہیں پڑے گی؟“

اس پر ٹھیکے دار اپنی جگہ سے کھڑا ہوجاتا اور ان کا ہاتھ تھام کر رو دینے والی آواز میں کہتا۔ ”اس آمدنی سے کچھ لینا میرے لیے حرام ہے۔ میں قیامت کے دن اپنے مالک کو کیا منہ دکھاؤں گا؟“

وہ ہر سال آکر ایسی ہی کہانیاں سناتا اور والد صاحب کو فریب دیتا اور معاہدے سے تقریباً نصف رقم انہیں تھما دیتا۔ میری والدہ اور بڑی بہن، والد صاحب سے اصرار کرتیں کہ وہ انہیں دھوکا دے رہا ہے۔ مگر والد صاحب اس ٹھیکے دار کی طرف داری کرتے اور کہتے ’ہوسکتا ہے کہ وہ سچ کہہ رہا ہو۔ ہمیں وہاں کے موسمی حالات کا کیا پتا؟ گھر بیٹھے رقم مل رہی ہے، شکر کرو۔

میں تقریباً ساری دنیا گھوما ہوا ہوں مگر میں نے کسی کو موسیقی کا اتنا دلدادہ اور سچا عاشق نہیں دیکھا جتنا میرے والد تھے۔ جب میری عمر صرف سات برس تھی تو وہ مجھے پٹیالہ لے گئے تھے اور انہوں نے مجھے استاد عبدالعزیز خان بین کار سے ملوایا تھا۔ استاد نے مجھ سے گفتگو تو نہیں کی لیکن میرے سر پر ہاتھ ضرور رکھا تھا۔ جب ہم اس تنگ و تاریک کمرے سے نکلنے لگے تو میرے والد نے کہا کہ اگر مجھے موسیقی سے کبھی محبت ہوئی تو میں ان کے اسٹور کو ضرور چھانوں اس میں مجھے کئی خزانے ملیں گے۔ وہ صحیح کہہ رہے تھے۔ کافی عرصے کے بعد ان کا اسٹور چھاننے سے مجھے وہاں سے کیا کچھ ملا اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔

ان کی زندگی ہی میں، میں نے جان لیا تھا کہ کم از کم طبلے میں کوئی ان کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ ان کا پسندیدہ ساز ’دلربا‘ تھا۔ افسوس کہ اب دلربا کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اس کا رواج ختم ہوچکا ہے۔ وہ ستار بھی اچھا بجاتے تھے اور جب موڈ میں ہوتے تھے تو گانے بھی لگتے تھے۔ معلوم نہیں کیا بات ہے کہ انہوں نے موسیقی کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔

وہ باہر جاچکے تھے اور غیر ملکی لباس پہنتے تھے لیکن جب خلافت تحریک میں شامل ہوئے تو انہوں نے اپنے تمام انگریزی کپڑے جلا دیے۔ انہوں نے موسیقی سیکھنے کے لیے مہاراشٹر کے چند گرو سے بھی ملاقاتیں کی تھیں۔ ان سے انہوں نے جو کچھ سیکھا تھا وہ کہیں نہ کہیں درج بھی کیا تھا اس لیے کہ جب مجھے موسیقی سے رغبت پیدا ہوئی تو میں نے ان کا اسٹور کھنگالا۔ مجھے ایک سیاہ نوٹ بک ملی جس کا کاغذ امتداد زمانہ سے پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نوٹ بک میں کوئی پونے دو سو کے قریب ’بندشیں‘ درج تھیں۔ انہوں نے جب وہ راگ سنے تھے تو ان کی تاریخیں تک درج کر رکھی تھیں۔ یہ سیاہ کتاب میرے لیے کسی اثاثے سے کم نہ تھی۔ میں نے اسے نہایت احتیاط سے ذاتی نوادرات میں شامل کرلیا۔

کافی عرصے بعد جب وہ یونی ورسٹی میں تعلیم دینے لگے تھے تو انہوں نے اعلیٰ حکام سے مذاکرات کیے کہ موسیقی کا ایک شعبہ بھی وہاں کھولا جائے۔ چانسلر کا کہنا تھا کہ بجائے ڈگری دینے کے اسے ایک اختیاری مضمون کے کورس میں شامل کردیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ موسیقی ’ہندوانی مضمون‘ ہے اس پر مسلمان طلبہ کو اعتراض ہوگا۔

میرے والد کو اس سے اختلاف تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اسے ڈگری کورس کی شکل میں پڑھایا جائے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم دونوں ایک بار بس میں ماڈل ٹاؤن سے لاہور جا رہے تھے تو ایک شخص نے جو والد صاحب کو پہچانتا تھا، کہنے لگا۔



”پروفیسر صاحب! آپ تو بہت شریف آدمی ہیں۔ یہ آپ راگوں کے چکر میں کیوں پڑ گئے؟“

”تاکہ میں شریف رہ سکوں۔“ میرے والد نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر فی الفور جواب دیا۔

یہ 1940ء کی بات ہے کہ دو چار ہندو لڑکیوں نے موسیقی کو بطور اختیاری مضمون لے لیا اس پر مسلمان والدین نے اعتراض کیا اور شور مچا دیا کہ ہماری لڑکیاں یہاں نہیں پڑھ سکتیں کیوں کہ یہاں ناچ گانا ہونے لگا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ موسیقی سیکھنے کے لیے کسی مسلمان گھرانے سے کوئی لڑکی یونی ورسٹی کی طرف نہیں آئی۔

”یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب والد حیات تھے۔ مجھے کتابوں کا شوق پیدا ہوچکا تھا، اس لیے ان کے کتب خانے میں جاکر کتابوں کو الٹتا پلٹتا رہتا تھا۔ ایک روز کتابوں کے درمیان ایک چھوٹا سا البم ملا۔ اس میں سیاہ و سفید تصاویر تھیں۔ لگتا تھا یہ ان دنوں کی تصاویر ہیں جب وہ انگلستان گئے تھے۔ بلند و بالا عمارات کی تصاویر تھیں اور کچھ پارکوں وغیرہ کی۔ وہ تین تصاویر تھیں۔ ایک میں گھاس پر نیم دراز، ان کا ہیٹ سامنے پڑا ہوا تھا۔ یقیناً سردی تھی اس لیے کہ وہ اوور کوٹ پہنے تھے اور پس منظر میں ایک لڑکی گھٹنوں سے اوپر اسکرٹ پہنے کھڑی تھی۔ اس نے ایک خوب صورت سا ہیٹ لگا رکھا تھا۔ اس کے گلے میں ایک نیکلس تھا جو اس کی کمر تک آرہا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ جیسی کہ رنگ ماسٹر کے ہونٹوں پر ہوتی ہے۔ میرے والد کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ نہ چاہتے ہوں کہ اس موقع پر تصویر کشی کی جائے۔

دوسری تصویر میں وہ میرے والد کے پہلو میں کھڑی تھی اور اس نے اپنا ایک ہاتھ والد کی کمر میں ڈال رکھا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر وہ مسکراہٹ تھی جس کے لیے فوٹو گرافر آخری لمحات میں گزارش کرتا ہے۔ والد نئے سوٹ میں تھے اور ان کے جوتے خوب چمک رہے تھے۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ جب تم روم جاؤ تو ویسا ہی کرو جیسا کہ رومی کرتے ہیں۔

ان کی پیشانی پر ابھری ہوئی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ متفکر ہیں کہ جب ان کے بچے یہ تصاویر دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے؟

تیسری تصویر میں وہ لڑکی موٹر سائیکل کی سائڈ کار میں بیٹھی تھی جب کہ میرے والد موٹر سائیکل پر تھے۔ تیسرا شخص کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔

## نسائی

امام، معروف غوث فقیہ، نام احمد بن شعیب بن علی بن سنان کنیت ابوعبدالرحمٰن 215ھ/830ء نساء میں پیدا ہوئے جو خراسان میں مرو کے پاس ایک جگہ ہے۔ ایک عرصے تک مصر میں رہے۔ مقصد حدیثیں جمع کرنا تھا۔ یہاں خاصا چرچا رہا۔ پھر دمشق چلے گئے جہاں بنو امیہ سے ناراض رہنے کی وجہ سے جب مارا پیٹا گیا تو مکہ چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مار پیٹ کی وجہ سے مکہ میں 130 ھ 215ء 3 اگست 915ء میں وفات پائی اور صفا و مروہ کے ستونوں کے درمیان مدفون ہوئے۔ حدیث پر آپ کی چھ مستند کتب موجود ہیں جو نسائی، کہلاتی ہیں۔ بدعاۃ المسلم کے بعد سب سے زیادہ مستند ہیں۔ ان میں کچھ ابواب احادیث کے علاوہ بھی ہیں۔ یہ ”سنن کبریٰ“ بھی کہلاتی ہیں۔ لکھنے کے بعد ان میں سے غیر مستند باتیں حذف کرکے ہی طباعت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ان میں ”سنن صغریٰ“، ”سنن سنائی“ خصائص امیر المومنین علی ابن ابی طالب وغیرہ شامل ہیں۔

## نخلہ

مکہ اور طائف کے درمیان مکہ معظمہ سے یک شبانہ روز کی مسافت پر ایک مقام، اھ میں طائف سے واپسی پر آنحضورؐ اسی مقام پر ٹھہرے تھے۔ نینوا سے آنے والی جنات کی جماعت سے بھی یہیں ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے قبل یہاں ایک تاریخی واقعہ پیش آیا جو واقعہ نخلہ، کے نام سے مشہور ہے۔ ہوا یوں کہ اس سن ہجری میں حضور پاکؐ نے عبداللہ بن جحش کی قیادت میں بارہ رکنی وفد بھیجا تاکہ وہ دشمنوں کی حرکات کا جائزہ لے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک بند خط دیا تھا جسے دو روز بعد کھولنے کی ہدایت کی تھی۔ نخلہ پہنچ کر یہ خط کھولا گیا۔ اس میں قریش کی نقل و حمل پر نگاہ رکھنے کی ہدایت درج تھی جس کی باقاعدہ رپورٹ دینا تھی۔ مگر ان لوگوں پر ہدایت کے برخلاف لڑائی مسلط ہوگئی اور قریش کا سردار حضرمی مارا گیا۔ اس کے انتقامی جذبے نے بعد میں جنگ بدر کو پیدا کیا۔ آنحضرتؐ نے اس کو خون بہا ادا کیا۔ یہ ایک زمانے میں سرسبز و شاداب مقام تھا۔ اور یہاں کھجوروں کے باغات بکثرت تھے۔

مرسلہ: خولہ عطاری، میرپور خاص

ان تصاویر کو دیکھ کر بڑی بہن تو سوچ میں پڑ گئیں کہ وہ کون ہو سکتی ہے۔ البتہ وہ بہن جسے والد سب سے زیادہ چاہتے تھے اور جو انگریزی ناولیں اور لٹریچر پڑھتی تھی اور اس کا فرمایا ہوا مستند تھا قیاس کے انداز میں بولیں کہ اس لڑکی کا نام جین ہے اور یہ اس مکان کی مالکہ ہے جہاں والد رہتے تھے۔

جب میرے اور والد کے درمیان کافی بے تکلفی ہو گئی اور ہم دونوں ایک دوسرے کے سگرٹ بھی پینے لگے تو میں نے ان سے جین کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے حقے کا ایک کش لگا کر بتایا کہ اس کا نام ایڈتھ بروکس تھا اور وہ اس ٹوورنگ کمپنی کی ممبر تھی، جس کا تعلق چوچن چاؤ سے تھا۔

پھر وہ مستفسرانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میرا یہ سوال کہ وہ لڑکی ان کے لیے کیا حیثیت رکھتی تھی، لبوں پر ہی دم توڑ گیا۔

☆☆☆

ضیاء کہتا ہے۔ ”یہ میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ میرے والد نے خاموشی سے بستر پر انتقال کرنے کے بجائے ایک بس اسٹاپ پر دل کا دورہ پڑنے سے جان دے دی۔ وہ یونی ورسٹی جانے کے لیے بس کا انتظار کر رہے تھے۔ غالباً انہیں کچھ کاغذات جمع کرانا تھے۔ ایک شخص جو نزدیک ہی بیٹھا تھا اس نے دوڑ کر میرے والد کی مدد کرنا چاہی لیکن اس سے پہلے ہی وہ اس دنیائے فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ کاش کہ انہوں نے میرے زانوؤں پر سر رکھ کر جان دی ہوتی!

اپنے بچپن میں مجھے جس کھیل سے والہانہ عشق تھا، وہ کرکٹ ہے۔ جن دنوں ہم راٹیگن روڈ پر رہتے تھے۔ ان دنوں یہ عشق عروج پر تھا۔ لاہور کے علم الحیوانیات کالج سے ایک گلی سیدھی ہمارے گھر کو آتی تھی۔ وہاں ایک چوکور قطعۂ اراضی تھا جس پر ’مولا‘ قابض تھا اور وہاں اپنی گائیں باندھا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ پلاٹ اس کا ہے۔ اس لیے کہ اس کے خاندان کے ایک بزرگ کی قبر وہاں موجود ہے۔ (وراثت کے لیے یہ نہایت عجیب ثبوت تھا) بہرحال از راہِ عنایت وہ ہمیں اس کمپاؤنڈ میں کرکٹ کھیلنے کی اجازت دے دیا کرتا تھا۔ ہفتے میں دو بار ہمارا وہاں میچ ہوا کرتا تھا۔

بالر جہاں سے گیند پھینکتا ہے، وہاں لکڑی کا ایک چھوٹا ڈنڈا گاڑ دیا جاتا تھا، یہ ہمارے لیے وکٹ تھی۔ بلّے باز جہاں کھڑا ہو کر اپنے کمالات دکھاتا تھا وہاں پر بھی مروجہ وکٹیں نہیں ہوتی تھیں، بلکہ لکڑی کے دو چار کریٹ رکھ کر وکٹ بنالی جاتی تھی۔ کریٹ میسر نہ ہوتے تھے تو چارپائی کھڑی کر دیتے تھے۔

جب میچ ہوتا تھا تو مخالف ٹیم دوسرے گاؤں سے آتی تھی۔ کھلاڑی سفید کپڑے پہنے ہوتے تھے۔ مولا ان کے لیے چارپائیوں کا بندوبست کر دیتا تھا۔ پھر وکٹیں لگائی جاتی تھیں، جن پر بیلز نہیں ہوا کرتی تھیں۔

ہماری ٹیم کا کپتان پاشا ہوا کرتا تھا (وہ بعد میں فلم انڈسٹری میں چلا گیا تھا اور لوگ اسے ہدایت کار انور کمال پاشا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ وہ فلم انڈسٹری کا دھانسو ہدایت کار کہلاتا تھا اس لیے کہ اس کی بنائی ہوئی فلمیں لگاتار کامیاب ہوئی تھیں) وہ ٹاس جیت کر مہمان ٹیم کو پہلے کھیلنے کا موقع دیا کرتا تھا۔ جب وہ ٹاس ہار جاتا تھا تو جیتنے والی ٹیم کے کپتان سے کہتا۔ ”تم پہلے بیٹنگ کرنا پسند کرو گے، ٹھیک ہے نا؟“

مہمان ٹیم کے کپتان میں اتنی ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ وہ انکار کر دے۔ دراصل بات یہ تھی کہ میچ ختم ہونے کے بعد پاشا کھانا پانی، چائے وغیرہ اپنے گھر سے لاتا تھا۔ اس کے علاوہ پاشا کو بالنگ کرانے کا شوق تھا اور وہ ابتدائی چھ یا سات اوور خود کرایا کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو جایا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں یہ افواہ مشہور تھی کہ اس کا کئی لڑکیوں سے عشق چل رہا ہے اور وہ ان میں سے کسی ایک سے ملاقات کرنے جایا کرتا ہے۔

وہ میڈیم فاسٹ بالر تھا اور بال کو زمین پر زور سے پٹخا کرتا تھا اور بلّے بازوں کو اپنی بالنگ کی حکمت عملی کے بجائے ڈرا دھمکا کر وکٹیں لینے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

وہ دراز قامت اور متناسب جسم والا نوجوان تھا۔ اس کے سر کے بال گھنگریالے تھے اور اس کی مونچھیں ترشی ہوئی ہوتی تھیں۔ اس کی ماں نچلے اسٹول پر بیٹھی حقہ پیتی رہتی تھی۔ پاشا گراؤنڈ ہی سے اپنی ماں کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتا اور اپنی فتح کی کہانیاں سنایا کرتا۔ اس کی ماں بظاہر تو بے زاری کا مظاہرہ کرتی لیکن دل ہی دل میں خوش ہوا کرتی تھی۔

پاشا کے والد حکیم احمد شجاع تھے۔ وہ ادبی حلقوں کی ایک نامور شخصیت تھے اور لاہور میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا تھا۔ وہ شہری انتظامیہ میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے اس لیے لوگوں کی آمد و رفت ان کے دروازے پر لگی رہتی تھی۔ انہوں نے چند ڈرامے آغا حشر کاشمیری کے انداز پر لکھے تھے۔ وہ ہر ملاقاتی کو بتایا کرتے تھے کہ آغا حشر کے ڈرامے ’یہودی کی لڑکی‘ میں ہیروئن کا کردار انہوں نے ہی ادا



کیا تھا۔ میرے والد نے حکیم احمد شجاع کو بتایا تھا کہ میں نے اسکول کے ایک ڈرامے میں چینی لڑکی کا کردار ادا کیا تھا۔ اس بنا پر وہ مجھ پر شفقت کیا کرتے تھے اور بعض اوقات مجھے اپنے قریب بھی بٹھا لیا کرتے تھے۔ عموماً وہ گول شیشوں والی عینک پہنا کرتے تھے جن سے ان کی ذہانت سے بھرپور آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔

ہاں تو ذکر کرکٹ میچ کا ہو رہا تھا، جب پاشا بالنگ کرا کے واپس آتا تو ٹانگوں پر پیڈ باندھ لیا کرتا۔ بعض اوقات وہ صرف بائیں ٹانگ پر ہی پیڈ باندھا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے ہی کام چل سکتا ہے۔ وکٹ پر جو کھلاڑی کھیل رہے ہوتے تھے، ان میں سے ایک اپنا بلّا ہلاتا ہوا گراؤنڈ میں چلا جاتا اور پاشا اس کی جگہ کھیلنے لگتا۔ مخالف ٹیم کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اس لیے کہ میچ کے بعد ان کو ناشتا پانی کرنا ہوتا تھا اور وہ پاشا ہی مہیا کرتا تھا۔ وہ خاص انداز سے بیٹنگ کیا کرتا تھا۔ جوں ہی بالر گیند پھینکتا وہ پچ کے وسط میں جا کر رقص کرتا اور وحشیانہ انداز سے بلّا گھماتا۔ اگر بال اور گیند کی ملاقات ہو جاتی تو بال فضا میں اڑتی ہوئی سامنے کے مکان کے پھاٹک تک چلی جاتی۔ جب ہم نزدیک جاتے تو چوکیدار کی جھڑکیاں سنے بغیر گیند واپس نہ ملتی۔

کرکٹ کا یہ شوق لندن جا کر بھی ختم نہ ہوا۔ حالانکہ میں وہاں اداکاری سیکھنے گیا تھا اور پھر فلموں، ڈراموں اور ٹیلی ویژن پر کام کرنے لگا تھا۔ مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ بہت سے اداکار کرکٹ شوق سے کھیلتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بھی کھیل جاری رکھا اور اپنے شوق کی آبیاری کرتا رہا۔ جس کے نتیجے میں میں نے پولیس گراؤنڈ میں چونسٹھ رن بنائے اور ناٹ آؤٹ رہا۔

☆☆☆

ضیاء نے اپنی فن کارانہ زندگی کا باقاعدہ آغاز ریڈیو پروگراموں میں صداکاری سے کیا، پھر خبریں پڑھیں اور آخر کار ریڈیو میں باقاعدہ ملازمت کر لی۔ لیکن یہ سلسلہ تادیر نہیں چلا اور اسے تربیت کے لیے آسٹریلیا بھیج دیا گیا۔

ریڈیو پاکستان میں ملازمت کرنے کے دوران جب اسے فلسفہ پڑھنے کے لیے آسٹریلیا بھیجا گیا تو اس نے وہاں اپنا کورس مکمل کرنے کے بعد اپنے والد کو خط لکھا کہ وہ اداکار بننا چاہتا ہے اور لندن جائے گا۔ والد نے اسے نیک خواہشات کے ساتھ اجازت دے دی۔

لندن میں اس نے رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹس میں داخلہ لے لیا اور 1953ء تا 1956ء اداکاری کی تربیت حاصل کی۔ اسی دوران بی بی سی کے 50 سے زائد ڈراموں میں حصہ لیا۔ اس کے بعد پیش آنے والے حالات خود اسی کی زبانی سنیے:

جب میں نے اداکاری کی تربیت حاصل کر لی تو میں ہر ناگوار اور واہیات کام کرنے کے لیے آزاد تھا۔ اس زمانے میں عموماً نو سیکھیے اداکار ڈربی پر کسی اسٹیج منیجر کے نائب بن جاتے تھے، جیسے کہ عموماً ہمارے ہاں موٹر مکینک بننے والے لڑکے کسی ’استاد‘ کے زیرِ نگرانی اس کی کڑوی کسیلی باتیں سنتے رہتے ہیں اور زبان سے اف تک نہیں کرتے۔ تکنیکی طور پر یوں سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے اور مجھ جیسے دوسرے فارغ التحصیل لوگوں کو زیرِ تعلیم ہی سمجھا جاتا تھا، اور ان سے توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ اپنی باری آنے کا انتظار کریں، جب کسی اداکار کی جگہ خالی ہو جائے گی تو اسے چانس مل جائے گا۔

مجھے چانس ملا تو اس قسم کا کہ میں اسٹیج پر لگائی گئی سینریوں کو ضرورت پڑنے پر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا کر رکھوں۔ (ڈرامے کی مناسبت سے اسٹیج کے پس منظر میں سینریاں لگائی جاتی ہیں، پھر شہر یا دیہات کا ماحول بنایا جاتا ہے۔ جب ڈرامے کا ایکٹ تبدیل ہوتا ہے تو یہ سینریاں ہٹا کر دوسری سینریاں لگا دی جاتی ہیں)، فہرست بناؤں کہ اسٹیج پر ضرورت کی کیا کیا چیزیں اکٹھا کرنا ہیں۔ اس کے علاوہ جب اداکار اور اداکارائیں کافی یا چائے پی لیں تو ان کے مگ اکٹھا کروں اور کچن میں لے جا کر رکھوں، یقین کیجیے کہ ان میں سے زیادہ تر مگوں کے ہینڈل ٹوٹے ہوئے ہوتے تھے اور انہیں تھامنے میں بہت دشواری ہوتی۔ قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ میں ان مگوں کو دھو کر صاف کرتا، پھر دوسرے وقت کی چائے یا کافی بنانے کے لیے دکان سے جا کر دودھ لاتا۔

2.30 پر گڈ ووڈ اسٹریٹ پر جا کر ڈرامے کی ہیروئن کی طرف سے گھوڑوں پر داؤ لگاتا۔ پھر ہیرو کے لیے ایک گلاس میں ایسپرین گھول کر تیار رکھتا، اس لیے کہ اسے گیس کی شکایت تھی اور اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھتے تھے۔

میں صبح سے شام تک جتا رہتا، بعض اوقات ایسے معلوم ہوتا جیسے دن ختم ہی نہیں ہونے میں آ رہا ہے۔ اس کے باوجود میں تھکتا نہیں تھا، اس لیے کہ اسٹیج منیجر جیوفرے کومبس ایک نفیس شخص تھا۔ اس نے کبھی مجھ پر حکم نہیں چلایا، نہ کبھی درشتی سے مخاطب ہوا۔ میں قرب و جوار میں نہیں ہوتا تو وہ خود ہی اگلے ہوئے کام کر ڈالتا۔ ان سب اعصاب شکن کاموں کا معاوضہ

چھ گنی فی ہفتہ کی شکل میں ملتا۔ (گنی سونے کا سکہ تھا، جو 21 شلنگ کے مساوی ہوتا) ہم اتوار کے دن بھی کام کرتے، اس لیے کہ پیر کے دن نیا ڈراما شروع ہوتا تھا۔ اتوار کے دن سونے کے دل والا جیوفرے کو بس اپنے کھانے میں مجھے شریک کرلیا کرتا۔ اس کے پاس ایک بڑی سے روٹی ہوا کرتی، جس میں سے دو سلائس کاٹ کر وہ میری طرف بڑھا دیتا، جس کا میں سینڈوچ بنالیا کرتا۔ جیوفرے کی اس عنایت سے میرے ایک یا دو شلنگ بچ جایا کرتے تھے۔

1950ء میں ایک لفظ shambolic بہت استعمال ہوتا تھا، جس کے معنی بے ترتیب یا بے ہنگم ہوتے ہیں۔ اگر میں جیوفرے کے لیے یہ لفظ استعمال کروں تو انتہائی مناسب ہے، اس لیے کہ وہ بے حد دراز قامت اور دبلا پتلا تھا۔ اس کے اوپر کا جسم نچلے جسم سے مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ اس پر لفظ بے ہنگم فٹ آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی نقص تھا، جس کی وجہ سے اس کی عینک کے شیشے تھوڑی سی دیر میں دھندلا جایا کرتے، جنہیں وہ خوب اچھی طرح سے رگڑ کر صاف کیا کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے اسے عینک صاف کرنے کے سوا کوئی کام نہیں آتا۔ وہ دنیا میں پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اپنی عینک کے شیشے صاف کرتا رہے۔ جب وہ اپنی عینک چند لمحوں کے لیے اتارتا تو مجھے ایسا لگتا جیسے قدرت نے دیدوں کی جگہ اس کی آنکھوں میں دو انڈے چپکا دیے ہوں۔

جیوفرے اسٹیج منیجر کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اس حالت پر مطمئن تھا، اس لیے کہ اپنے دماغ سے وہ، یہ بات نکال چکا تھا کہ وہ اداکار بننا چاہتا ہے۔ میں نے اس پیشے میں اس جیسا بے غرض شخص نہیں دیکھا۔ وہ تھیٹر سے اور اپنے اطراف میں رہنے والے لوگوں سے محبت کرتا تھا۔ میں نے اسے کبھی لوگوں سے حقارت اور بے ہودہ گوئی سے کلام کرتے نہیں دیکھا، حد یہ ہے کہ وہ اسٹیج پر کام کرنے والی اداکاراؤں سے بھی شائستگی سے پیش آتا تھا۔ اداکاروں کو عموماً جمعہ کو تنخواہ ملتی تھی، لیکن بہت سے جمعرات ہی کو کنگال اور مفلس ہو جاتے تھے۔ انہیں یقین ہوتا تھا کہ اگر وہ جیوفرے کی طرف دستِ طلب بڑھائیں گے تو مایوس نہیں کرے گا۔ اسے نہ معلوم کیوں یہ وہم ہو گیا تھا کہ مجھ میں صلاحیتیں ہیں اور میں بہت آگے جا سکتا ہوں۔ اس نے بارہا مجھے مشورہ دیا کہ میں یہ کمپنی چھوڑ کر کسی دوسری کمپنی میں کام کروں۔ ممکن ہے وہاں کسی کی نظر مجھ پر پڑ جائے اور میری قسمت کھل جائے۔

میں خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا اور مستقبل کا ادراک رکھتا تھا، اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ اداکاروں کو ابتدا میں بے روزگاری اور درماندگی کے سوا کچھ دیکھنا نہیں پڑتا۔ ان کے چہروں پر چمک دمک بہت دیر سے آتی ہے۔ اسی اثنا میں اسٹیج ڈرامے 'لانگ ڈیز جرنی انٹو نائٹ' اور 'جولیس سیزر' میں رول مل گئے، جس میں کچھ کچھ بات بن گئی۔ لوگ آشنا ہو گئے۔ ایک ڈرامے 'ہے فیوز' کی ہدایت کاری ملی۔ اسے نوئل کوورڈ نے پروڈیوس کیا تھا۔

ای ایم۔ فوسٹر کے لکھے ہوئے ناول 'اے پیسج ٹو انڈیا' کو جب اسٹیج پر پیش کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو ہدایت کار فرینک ہاؤسر نے مجھے اس میں ایک مشرقی کردار کرنے کے لیے چنا، جس کا نام ڈاکٹر عزیز تھا۔ یہ ڈراما ویسٹ اینڈ میں 1960ء میں پیش کیا گیا۔ میں اسے اپنی بڑی کامیابی متصور کرتا ہوں، اس لیے کہ یہ بین الاقوامی سطح کا ڈراما تھا۔ اس زمانے میں ویسٹ اینڈ میں کامیاب ہونے والے ڈرامے براڈوے، امریکا میں دکھائے جاتے تھے۔ چنانچہ اسے بھی براڈوے پر دکھانے کا پروگرام بنایا گیا، مگر اس کا شومین یا پروموٹر لارنس لینگر اس میں لندن کی کاسٹ شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس زمانے میں انگریز اداکار جب شہرت حاصل کر لیتے تھے تو نیویارک چلے جاتے تھے، اس لیے اداکاروں کی یونین بھی اس کے حق میں نہیں تھی کہ چھوٹے چھوٹے کرداروں کے لیے انگریز اداکاروں کو کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

میں نے اس ڈرامے کا مرکزی کردار ادا کر کے شہرت حاصل کر لی تھی، لیکن ہدایت کار میری جگہ بین گزارا کو لینا چاہتا تھا جس کا اس وقت براڈوے میں طوطی بول رہا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی ہے کہ اس کے فیصلے پر ای۔ ایم فوسٹر نے پانی پھیر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ اس وقت تک اس ڈرامے کو نیویارک میں اسٹیج کرنے کی اجازت نہیں دے جب تک کہ اسے یہ یقین نہ دلا دیا جائے کہ ڈاکٹر عزیز کا کردار میرے علاوہ کوئی اور ادا نہیں کرے گا۔ چنانچہ لارنس لینگر کو خاموشی اختیار کرنی پڑی اور اپنے مطالبے سے دستبردار ہونا پڑا۔

جب میں مین ہٹن، امریکا گیا تو مجھے وہاں کا ماحول بہت اچھا لگا۔ وہاں کے گلی کوچوں سے ایک عجیب طرح کی خوش بو آیا کرتی تھی۔ مجھے وہاں کے ہاٹ ڈاگ بھی پسند آئے۔ وہاں کی زندگی کا ٹیمپو بہت تیز تھا، ہر شخص بھاگتا ہوا لگتا تھا۔ اس کے برعکس میں میڈیسن ایونیو میں آہستہ قدمی سے چلتا تھا، ہر دکان پر ٹھہر کر چیزوں کو دیکھتا ہوا۔



براڈوے میں مجھے امریکا کے نامور اداکار اپنی فن کاری کا مظاہرہ کرتے نظر آئے۔ وہاں مجھے پہلی بار ادراک ہوا کہ 'بلنگ' کی کتنی اہمیت ہے۔ بلنگ کا مطلب یہ تھا کہ اخبارات میں جب ڈرامے کا اشتہار دیا جا رہا ہے تو آپ کا نام کہاں اور کس جگہ آ رہا ہے یا جس پے رول سے آپ کو تنخواہ دی جا رہی ہے، اس میں آپ کا نام کہاں درج ہے، یعنی آپ کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے۔ ڈراما کمپنی کی انتظامیہ اداکاروں کو لالچ دیتی تھی کہ اگر وہ کم معاوضہ طلب کریں تو ان کا نام اوپری لائن میں درج کیا جائے گا، ورنہ معاوضہ زیادہ دینے کی صورت میں نام ان کی خواہش کے مطابق کہیں بھی درج کیا جا سکتا ہے۔ اداکار کم معاوضہ لینا پسند کرتے تھے، لیکن یہ شرط رکھتے تھے کہ ان کا نام اشتہار کی پہلی سطر میں درج کیا جائے۔ نیویارک میں بلنگ ایک دیوانہ پن تھا۔

اے پیسج ٹو انڈیا کو براڈوے پر پیش کرنے میں تین دن باقی تھے کہ گلڈیز کوپر نے مطالبہ کر دیا کہ اس کا نام ڈرامے کے اشتہارات میں پہلی سطر میں آنا چاہیے۔ وہ بڑی اداکارہ تھی اور سب کمپنیاں اس کا احترام کیا کرتی تھیں۔ اس موقع پر ایجنٹ ولیم موریس نے کہا کہ میرا نام بھی اداکاروں کی فہرست میں سب سے اوپر آنا چاہیے۔ اس نے یہ بات گلڈیز سے کہی تو اس نے رعونت سے جواب دیا کہ صرف اس کا نام ہی سرفہرست ہونا چاہیے۔ میں جانتی ہوں کہ اس کا کردار ڈرامے میں اہمیت کا حامل ہے اور اسے مرکزی حیثیت بھی حاصل ہے، لیکن اسے زیادہ اہمیت دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مجھ جیسی اداکارہ سے آگے نکل جائے گا اور میری کوئی وقعت ہی نہیں رہے گی۔

اس کا قیاس درست نکلا، ڈراما چلتے ہوئے دوسری رات تھی کہ میرا نام سب سے اوپر چلا گیا اور اس کے بعد گلڈیز کا نام آنے لگا۔ اس کے بعد میں نے کوئی تیس پینتیس فلموں اور اسٹیج ڈراموں میں کام کیا۔ رول چھوٹے موٹے تھے، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میں نے فلم کے میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔"

1956ء میں ضیاء وطن واپس آ گیا۔ ایک فلم ""آخرِ شب"" میں کام مل گیا۔ شوٹنگ شروع ہوئی اس کا کام پسند کیا گیا۔ غالباً قابل اجمیری اس کے ڈائرکٹر تھے۔ اخبار جہاں کے کالم نگار جعفری نے ایک بار اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ ضیاء نے اس فلم میں بے پناہ اچھی اداکاری کی تھی۔ اس کا کردار اسکرین سے باہر آتا محسوس ہوتا تھا۔ یہ فلم مالی بحران کی وجہ سے مکمل نہ کی جا سکی اور ڈبوں میں بند ہو کر رہ گئی، اس طرح

### ضیا نے جن فلموں، ڈراموں اور ٹیلی ویژن سیریز میں کام کیا

**Movies**
- Lawrence of Arabia
- Khartoum
- Behold a Pale Horse
- Sailor from Gibraltar
- Deadlier Than the Male
- A Boy Ten Feet Tall
- Adam Adamant lives
- Bombay talkie

**Stage roles**
- Long Day's Journey into Night
- Julius Caesar
- A Passage to India
- Valpone
- The merchant of Venice
- Guide
- Homer's Odyssey

**TV**
- The Jewel in the Crown
- The dead man walk
- Danger man
- Visit to Spain
- A strange and distant place
- The journey of Poh Lin
- The hidden truth
- Sammy going south
- The Joel brand story
- Night flight to Andorra
- Wax fruit
- Work is a 4- letter word
- Shadow of the panther
- some you win some you lose
- Hunt the peacock
- Gangsters
- Land of no mercy
- Staying on
- Diamonds are a girl's worst enemy
- Death of a princess
- A touch of eastern promise
- King of the ghetto
- We are the children
- Immaculate conception
- Gummed labels
- Doomsday gun

سے ضیاء کو پاکستانی فلموں میں ابھرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

ڈائریکشن کی طرف توجہ کی اور بہت سے اردو ڈرامے اسٹیج کر ڈالے۔ جن میں حفیظ جاوید کا ترجمہ کردہ ”جولیس سیزر“ اور خواجہ معین الدین کا تحریر کردہ ”لال قلعے سے لالوکھیت“ شامل ہے۔

1963ء میں اسے ’لارنس آف عربیا‘ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ ایک بڑی فلم تھی جسے ڈیوڈ لین نے ڈائریکٹ کیا تھا، جس میں ضیاء کا چھوٹا سا کردار تھا۔ اس زمانے میں ڈیوڈ لین بہت توپ شے تھا۔ وہ نیویارک میں رہتا تھا۔ اس سہ پہر وہ لوفٹی کے مضافاتی مکان پر تھا۔ وہ اپنی فلم ”دی برج آن دی ریور کوائی“ کے لیے آسکر ایوارڈ حاصل کر چکا تھا، لہٰذا اب یہ سوچا جا سکتا تھا کہ امریکا کی دولت اس کے قدموں میں پڑی ہے۔ لارنس آف عربیا میں ضیاء نے گائڈ تفاس کا کردار ادا کیا جو غلط کنویں سے پانی پی لیتا ہے تو عمر شریف اسے گولی مار دیتا ہے۔ اس اثنا میں اس نے بہت سے چھوٹے موٹے ڈراموں اور فلموں میں کردار ادا کیے۔ ’اے پیج ٹو انڈیا‘ مقبول ہوئی تو بعد میں اسے بی بی سی ٹیلی ویژن پر پیش کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس میں بھی ڈاکٹر عزیز کا کردار ضیاء محی الدین نے ہی ادا کیا۔ پھر 1969ء تک وہ ڈراموں اور فلموں میں مصروف رہا۔ اسی دوران میں اس نے ایک ہفتہ وار کلچرل پروگرام ”ہیئر اینڈ ناؤ“ دس برس تک پیش کیا۔ جب 1971ء میں وطن عزیز میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت قائم ہوئی تو اسے وطن عزیز آنے کی دعوت دی گئی۔ ٹیلی ویژن اسٹیشن باقاعدہ قائم کیے گئے اور کراچی اسٹیشن سے ضیاء محی الدین شو پیش کیا گیا۔

☆☆☆

اپنے دوستوں‘ ساتھیوں کے بارے میں لکھتا ہے ”ڈیوڈ لین کا قصہ زبان پر آئے اور لی لالین کا تذکرہ نہ آئے یہ کیسے ہو سکتا ہے، جب کہ اس سے وابستہ رومان انگیز یادیں اب بھی میرے دل میں کروٹیں لیتی رہتی ہیں۔

میں ایک جگہ مدعو تھا۔ وہاں پہنچا تو ڈرائنگ روم میں‘ میں نے لی لالین کو ایک صوفے پر بیٹھے دیکھا۔ وہ ڈرائنگ روم مہارت سے سجایا گیا تھا۔ لیلا وسطی صوفے پر براجمان تھی۔ اس کے دونوں پاؤں میں سونے کے چھلے جگمگا رہے تھے۔ اس کے نزدیک دو تین مہمان بیٹھے نہایت توجہ سے اس کی گفتگو سن رہے تھے۔ جب میرا تعارف اس سے ...... کرایا گیا تو گفتگو میں تھوڑی دیر کے لیے تعطل پیدا ہو گیا۔ پھر کچھ اور مہمان آگئے تو اس کے گرد مہمانوں کا نیا حلقہ وجود میں آگیا۔ مگر اس نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی جنبش نہیں کی۔

یہ وہی لیلا مدھوکر تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کھجراہو مندر کے علاوہ اگر انڈیا میں دیکھنے والی کوئی ہستی ہے تو وہ لیلا مدھوکر ہے۔ اس کے لمبے بالوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اس کی کمر سے نیچے تک پہنچتے ہیں۔ خوبصورتی میں وہ کسی مغل مصور کا شہکار معلوم ہوتی ہے۔ اس کی مقناطیسی آنکھیں اور ستواں ناک دیکھنے والوں پر سحر طاری کر دیتی ہیں۔

ڈیوڈ لین جو امریکا کا نامور ہدایت کار تھا، جب سیر و تفریح کے لیے 1950ء میں انڈیا پہنچا تو اس نے حسنِ مشرق لیلا کو دیکھا۔ وہ لیلا سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے فوراً اسے شادی کا پیغام دے دیا۔ وہ دونوں متعدد جگہوں پر ایک ساتھ دیکھے گئے۔ فوٹو گرافروں نے ان کے ایسے پوز بنائے جن میں وہ ڈیوڈ لین کے بازوؤں کا سہارا لے کر لیٹی ہوئی تھی۔ ان کا اسکینڈل سارے انڈیا میں پھیل گیا۔ دس برس کے بعد یعنی 1960ء میں لیلا مدھوکر نے لیلا لین کا روپ دھار لیا۔ میں نے یہ کہانیاں انڈیا اور انگلستان کے دوستوں سے سنی تھیں۔

مشہور تھا کہ صنعت کار مدھوکر اس کی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا اور اسے وہ مقام نہیں دیتا تھا جس کی وہ مستحق تھی۔ لیلا ایسی عورت تھی کہ اس کی ناز برداریاں اٹھائی جاتیں۔ مہاراشٹر کے اس معزز شخص مدھوکر کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کی بیوی نے ڈیوڈ سے شادی کر لی ہے تو وہ اتنا دل گرفتہ ہوا کہ اس نے دنیا کو تیاگ کر کے ایک آشرم میں بسیرا کر لیا۔

ڈیوڈ لین غیر معمولی طور خوبرو اور دل کش تھا۔ اس کے لبوں پر ہمہ وقت ایک ملکوتی مسکراہٹ پھیلی رہتی تھی۔ وہ اس سے پیشتر چار شادیاں کر چکا تھا اور اکتایا سا رہتا تھا۔ اسے نت نئے جنسی تجربات کا شوق تھا۔ لیلا ایک مشرقی عورت تھی۔ دل کش و دل نواز جو اس کے مشاغل پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس سے شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

وہ بمبئی سے لیلا کو لے اُڑا اور اس نے لندن جا کر دم لیا۔ اسے بیسل اسٹریٹ کے ہوٹل نکسس برگ میں ٹھہرایا اور اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔ وہ فلم انڈسٹری کی توپ شے تھا۔ دھانسو شخصیت۔ ہر فلمی ستارہ متمنی ہوا کرتا تھا کہ اس کی فلم میں کام کرے۔ ’برج آن دی ریور کوائی‘ میں بہترین ہدایت کار کی حیثیت سے اسے آسکر ایورڈ دیا گیا تو اس کی شخصیت میں چار چاند لگ گئے۔ یقیناً اب امریکا کی دولت کو اس کے قدموں میں ہونا تھا۔



ہاں تو میں اس ملاقات کا احوال گوش گزار کر رہا تھا۔ لیلا بہت تیز اور جلدی بولتی تھی۔ اس کے فقرے آپس میں مل جاتے تھے۔ چنانچہ انہیں سمجھنا بعض اوقات دشوار ہو جاتا تھا۔ جب لوگ لنچ کے لیے اٹھنے لگے تو اس نے مجھ سے کہا میں اس کے قریب آ کر بیٹھوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے لنچ کی جلدی نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے حیدرآبادی اردو میں گفتگو شروع کر دی۔ اس کا لہجہ صاف وشفاف تھا اور اس کی رواں اردو میں ہندی کی آمیزش بالکل نہیں تھی۔

جب ڈیوڈ لین انڈیا میں تھا تو تقریباً ہر اداکار کی کوشش یہ تھی کہ وہ لیلا کے توسط سے ڈیوڈ سے ملاقات کر لے۔ حد ہے کہ دلیپ کمار نے بھی اس سے ملاقات کی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ ڈیوڈ تک رسائی ہو جائے۔

لیلا نے اس زمانے میں میرے ڈرامے دیکھے تھے اور میری اداکاری سے متاثر تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں ڈیوڈ سے ملاقات کروں۔ میرا تازہ ترین ڈراما وہ ایک بار پھر دیکھنا چاہتی تھی اس لیے کہ ڈیوڈ نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

اسے اتنے قریب سے دیکھنا اور نظر انداز کر دینا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ قیمتی ساڑی میں ملبوس تھی اور اس کی انگوٹھیوں کے نگینے خوب چمک رہے تھے۔ وہ گفتگو کرنے کے بعد اٹھی اور اس نے لنچ کیا۔ اس کے بعد میٹھی ڈش کا انتظار کیے بغیر چلی گئی۔ اسے کوئی ضروری کام تھا۔ ہر چند کہ سب کی خواہش تھی کہ وہ کچھ لمحوں کے لیے مزید ٹھہرتی، لیکن وہ معذرت کیے بغیر چلی گئی۔

اپنے وعدے کے مطابق وہ میرا ڈراما دیکھنے آئی اور وقفے کے دوران اسٹیج کے پیچھے بنے کمرے میں ڈیوڈ کے ساتھ مجھ سے ملاقات کرنے آئی۔ میں گردن پر تولیا لپیٹے کھڑا تھا، کچھ عجیب سی سچویشن تھی۔ ابھی میں تذبذب کے عالم میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کہ ڈیوڈ نے میری مشکل آسان کر دی۔ اس نے کہا وہ وہاں بیٹھنے نہیں آیا ہے۔ بس کھڑے کھڑے ملاقات مقصود تھی۔ چنانچہ مجھے اضطراب میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ڈیوڈ نے کہا کہ اس نے فوسٹر کا ناول ’اے پیج ٹو انڈیا‘ پڑھا ہے اور وہ اس پر فلم بنانا چاہتا ہے، مجھے چاہیے کہ میں فوسٹر سے اس سلسلے میں گفتگو کروں۔ میں نے اسے بتایا کہ فوسٹر امریکی ہدایت کاروں کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ وہ اس کے ناول کو فلم بند کریں۔ لیلا نے اس موقع پر مداخلت کی اور زور دیا کہ مجھے اس کے پاس جانا چاہیے۔ لیلا نے ڈیوڈ سے کہا ہمیں چاہیے کہ ہم ضیاء کو لنچ پر مدعو کریں۔

ڈیوڈ نے اس سے اتفاق کیا۔ پھر ڈیوڈ اور لیلا وہاں سے چلے گئے۔

اس کے جانے کے بعد ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ہر اداکار پُر یقین تھا کہ اب ڈیوڈ کی اگلی فلم میں کاسٹ کیا جانے والا ہے۔ سب یہی پوچھ رہے تھے کہ فلم کی شوٹنگ کب شروع ہوگی؟ انہیں معلوم تھا کہ لیلا انڈین ہے اور میں بھی مشرقی ہوں اس لیے ڈیوڈ سے میرا تعلق پیدا ہو گیا ہے۔

میں نے وقت نکال کر ای ایم فوسٹر سے ملاقات کی اور اسے ڈیوڈ کی خواہش سے آگاہ کیا۔ فوسٹر کا جواب نفی میں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ امریکی ہدایت کاروں میں سے کسی کو بھی اس کا اہل نہیں جانتا کہ وہ اس کے ناول کو فلم بند کر سکیں۔ بات ختم ہو گئی اور میں بے نیل و مرام واپس آگیا۔

لیلا نے جب مجھے فون کر کے بتایا کہ لنچ پر آنا ہے تو میں اس ہوٹل میں چلا گیا جہاں ان دونوں کا قیام تھا۔ میرے گھنٹی بجانے پر لیلا نے دروازہ کھولا اور حیدرآبادی انداز میں سلام کیا۔ اس نے معذرت کی کہ لنچ پر بلانے میں انہیں تاخیر ہو گئی اس لیے کہ ڈیوڈ یورپ کے دورے پر نکلا ہوا تھا، اسے سیاحت کا بہت شوق تھا۔

لیلا اس وقت فرشی غرارہ اور آدھی آستین کا جمپر پہنے ہوئے تھی۔ اس کا ملکوتی حسن، کھلا پڑ رہا تھا۔ اس کا دوپٹا گردن میں جھول رہا تھا مگر اس کے شباب کو ملفوف کرنے میں ناکام تھا۔ اس کے لمبے سیاہ بال کمر تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے حسن میں ناک کی کیل اضافہ کر رہی تھی۔ نگاہ بار بار جا کر اس ہیرے پر جا کر ٹک جاتی تھی جو کیل میں جگمگا رہا تھا۔ وہ برہنہ پا تھی اور اس کے دونوں پاؤں کے انگوٹھوں میں چاندی کے چھلے چمک رہے تھے۔

وہ جا کر ایک سیٹی پر نیم دراز ہو گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ انگریزوں کی طرح بیٹھے گی تو بے آرامی محسوس کرے گی۔ ”میں صوفے پر بیٹھنے کے بجائے تخت پر بیٹھنا پسند کرتی ہوں۔“ اس نے قدرے مسکرا کر کہا۔

”اور پاندان؟“ میں نے مذاق میں پوچھا۔

”ہاں پاندان بھی تھا جو نواب صاحب چھتاری نے تحفے میں دیا تھا۔ کافی دنوں تک میرے پاس رہا۔ اصل پاندان تو میرے پاس حیدرآباد میں تھا۔“

میں اس کی طرف دیکھنے سے اجتناب کر رہا تھا کہ اپنے جذبۂ فریفتگی کے ہاتھوں شکست نہ کھا جاؤں۔ دائیں گوشے

میں ایک تان پورا رکھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اسے ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ اس لیے کہ وہ ہر صبح پابندی سے ریاض کرتی ہے۔ مجھے گفتگو کرنے کے لیے ایک سرا ہاتھ آگیا۔ میں اس سے راگ اور سُروں پر تبادلۂ خیال کرنے لگا۔ حیدرآباد میں اس نے جن استادوں کو اپنے گھر پر مدعو کیا تھا وہ ان کے بارے میں بتانے لگی۔ اس نے اردو کی چند غزلوں کے مصرعے دھیمی آواز میں گا کر سنائے۔

ڈیوڈ لین اب تک کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ ان دنوں وہ 'لارنس آف عربیا' کے اسکرپٹ پر کام کر رہا تھا۔ لیلا کا قیاس تھا کہ یقیناً وہ کسی نکتے پر اسکرپٹ رائٹر سے بحث کر رہا ہوگا۔ یہ اس کی خاصیت تھی کہ جب وہ اپنے کام میں الجھا ہوتا تو سب کچھ فراموش کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ لیلا نے لنچ کا آرڈر دے دیا۔ وہ سبزی خور تھی، جب کہ میرے سامنے جو کچھ رکھ دیا جاتا میں قبول کر لیتا۔ بہرحال میں نے گاجر کے کٹلس اور سلاد کھانا پسند کیا۔

کھانے کے بعد وہ پھر اپنی سیٹی پر نیم دراز ہوگئی۔ میں ان لمحوں میں از حد محتاط تھا کہ ممکن ہے ڈیوڈ لین آجائے اور مجھے عالم فریفتگی میں دیکھ کر قیامت نہ ڈھا دے۔ اس نے بھی محسوس کر لیا کہ اس وقت میرے احساسات و جذبات معنوی ہیں اور میرے لبوں پر سہمی ہوئی مسکراہٹ ہے اس لیے اس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا کہ وہ آرام کرنا چاہتی ہے، لہٰذا میں نے رخصت چاہی۔ اس نے بتایا کہ ڈیوڈ نے مجھے 'لارنس آف عربیا' میں کاسٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اس کا فیصلہ تھا اور اس سلسلے میں وہ کوئی سفارش سننے کا عادی نہیں تھا۔ ڈیوڈ بہرحال بڑا ہدایت کار تھا اور میں اس کے ساتھ کام کرنا چاہتا تھا اس لیے جب لیلا نے یہ تجویز پیش کی کہ ڈیوڈ جو کردار بھی دے وہ مجھے قبول کر لینا ہوگا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا اور وہاں سے آگیا۔

لارنس آف عربیا کی شوٹنگ پر آکابا جانے سے پیشتر میری اس سے صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب فلم کی افتتاحی تقریب ہونے لگی تو اس نے مجھے پاس بلایا۔ مجھے اس سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اس لیے کہ وہ اور ڈیوڈ بڑی بڑی فلمی ہستیوں میں گھرے کھڑے تھے۔ میں اس کے نزدیک ہونے کے باوجود بھی دور تھا۔ اس نے بھی صورتِ حال کے پیشِ نظر مجھ سے کلام نہ کیا۔ سردی تھی اس لیے اس نے ساڑی پر سیاہ موٹی مخملیں شال اوڑھی ہوئی تھی۔ ساڑی کے ساتھ اس نے زیورات بھی پہن رکھے تھے۔ اس وقت وہ حسین ہونے کے ساتھ پُر وقار اور ذی شان لگ رہی تھی۔

جب آکابا میں شوٹنگ شروع ہونے لگی تو ہم سب کے لیے ٹینٹ لگائے گئے۔ وہ ریگستانی علاقہ تھا اس لیے چھولداریاں ہی مناسب تھیں۔ کچھ فاصلے پر فوج کی بیرکیں اور ایک بنگلا جہاں ڈیوڈ کے ٹھہرنے کا بندوبست تھا۔

بنگلے کے سامنے ایک بڑا ٹینٹ نصب کیا گیا تھا جہاں ہم سب کھانا کھایا کرتے تھے۔ وہ میاں بیوی بھی کبھی کبھار ہم لوگوں کے ساتھ ڈنر کر لیتے تھے۔ اس ریگستانی علاقے میں آکر لیلا نے سونے کے زیورات پہننا چھوڑ دیے اور پھولوں کا زیور پہننے لگی۔ یہ پھول خاص طور پر اس کے لیے عمان سے آتے تھے، جن کو اس کی ملازمہ گوندھ کر ہار، بندے اور کنگن بنایا کرتی تھی۔

جب ہمارے افسانے نگاہوں کی زباں سے دل تک پہنچنے لگے تو ایک روز لیلا نے ڈیوڈ سے کہا کہ ضیاء کو بنگلے کے ایک حصے میں جگہ دے دی جائے۔ لیلا کا دین پر کامل یقین تھا۔ میں نے جان لیا تھا کہ وہ محبت کی بھوکی ہے۔ کسی نے اسے ٹوٹ کر نہیں چاہا۔ وہ بچپن ہی سے بیگانگی کا شکار تھی۔ لوگ اس سے محبت جتاتے تھے لیکن وہ جس قسم کی محبت کی طلب گار تھی وہ اس سے گریز کرتے تھے۔ اس کی ماں اس کے مقابلے میں زیادہ حسین و جمیل تھی۔

اس جگہ سے ہم وسطی ریگستان کی طرف منتقل ہوگئے۔ ڈیوڈ حقیقت پسند ہدایت کار تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر پردۂ سیمیں پر ریگستان کو دیکھ کر لوگوں کا حلق نہ سوکھنے لگے اور وہ یہ نہ محسوس کریں کہ اڑتی ہوئی ریت کا طوفان ان کی ناک اور منہ میں جا رہا ہے تو پھر میں نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ لیلا ریگستان کی تمازت برداشت نہ کر سکی اور عمان واپس چلی گئی۔ وہ تھی بھی ایسی نازک اندام!

ڈیوڈ دن کا سارا وقت تو اپنے کام میں منہمک رہتا تھا، لیکن شام کو اپنا وقت اسٹاف کی ایک لڑکی کے ساتھ گزارتا تھا۔ وہ امریکی تھا اور خالص امریکیوں کے انداز سے رہتا تھا۔

شوٹنگ کی نوعیت کے مطابق جب میرا کام ہلکا ہوگیا تو مجھے اور چند دوسرے اداکاروں کو عمان کے سب سے بڑے ہوٹل بھیج دیا گیا۔ لیلا کو میری آمد کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ وہ ایک امریکی سہیلی کے ساتھ ایک عالی شان ولا میں ٹھہری ہوئی تھی۔

لیلا نے مجھے ولا میں آنے کی دعوت دی۔ میں جب



وہاں پہنچا تو امریکی میزبان نے کہا کہ اب میں ہوٹل واپس نہ جاؤں وہیں ٹھہر جاؤں۔ لیلا نے وہی لباس زیب تن کر لیا تھا جس سے اسے نسبتِ خاص تھی، یعنی ریشمی ساڑی، کانوں میں جھالے اور پاؤں کے انگوٹھوں میں سونے کے چھلّے۔ وہ جب بھی مجھ سے اردو میں گفتگو کرنے لگتی تھی تو اس کی امریکی سہیلی لوئن اسے ٹوک دیتی تھی۔

اس سے ملاقات پر میں اس سے زیادہ گفتگو نہیں کر پایا اس لیے کہ لوئن درمیان میں آموجود ہوئی تھی، جیسے کباب میں ہڈی۔ دوسری صبح جب میں وہاں سے آنے لگا تو لیلا کی آنکھوں میں اداسی تیر رہی تھی۔

چند روز بعد لوئن نے مجھے ایک پوسٹ کارڈ بھیجا جس میں بتایا گیا تھا کہ لیلا غیر مقررہ مدت کے لیے انڈیا چلی گئی ہے۔ کون جانے کب واپس آئے گی۔

پھر تین برس گزر گئے۔

جب میں نیویارک میں تھا اور ون مین شو کی تیاری کر رہا تھا۔ میں ایک لائبریری میں گیا۔ جب میں وہاں سے آ رہا تھا تو بارش ہونے لگی۔ سب بخوبی جانتے ہیں کہ سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا تو ممکن ہے، لیکن بارش میں مین ہٹن میں کسی ٹیکسی کا ملنا ناممکن ہے۔ میں نے خود کو کوسا کہ میں ہیٹ لگا کر اور اوورکوٹ پہن کر کیوں نہیں آیا۔ میں تھوڑی سی دیر میں چوہے کی طرح بھیگ گیا۔ اس وقت عجیب سی حالت تھی، میں ہر پہلی ٹیکسی کے پیچھے ہاتھ ہلاتا ہوا دوڑ رہا تھا۔

پھر ایک ٹیکسی نزدیک آکر رکی اور اس کا عقبی دروازہ کھلا اور کسی نے ملائم لہجے میں کہا۔ "آیئے میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔"

میں نے بڑبڑاتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور پچھلی سیٹ پر ان صاحب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ بھاری تن و توش کے تھے اور ان کا چہرہ گول مٹول تھا۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا کہ وہ دلیپ کمار کے بھائی اسلم خان ہیں۔ انہوں نے کہا وہ مجھ سے بخوبی واقف ہیں۔ میں جہاں کہوں گا، وہ مجھے چھوڑ دیں گے مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ میں ان کے گھر چل کر ایک پیالی چائے پی لوں؟ وہ مہذب اور تعلیم یافتہ معلوم ہو رہے تھے اس لیے میں نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

جب وہ مجھے لے کر اپارٹمنٹ پر پہنچے تو میری ملاقات اپنی چھوٹی ہمشیرہ فریدہ اور بھائی احسان سے کرائی۔ میں ان دونوں سے پہلے سے واقف تھا اور بمبئی میں مل چکا تھا۔ میں نے شام ان کے ساتھ گزاری۔ پھر وہ سب مجھے چھوڑنے نیچے تک آئے۔ احسان نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہاں ایک خاتون لوگوں سے آپ کے بارے میں پوچھتی پھر رہی ہیں۔ ان کا نام لیلا ہے۔"

"سب خواتین ضیاء کے بارے میں ہی پوچھتی ہیں۔" فریدہ نے ہنس کر کہا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ نیویارک میں ہیں۔ ورنہ ان سے ضرور ملاقات کرتا۔" میں نے کہا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔

پھر چند روز بعد فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے لیلا کی آواز سنائی دی۔ اس نے ایک سانس میں بہت سے سوالات کر ڈالے۔ میں اب تک اس سے کیوں نہیں ملا؟ کیا میں اسے فراموش کر چکا ہوں؟ کیا میں کوئی بڑی چیز ہو گیا ہوں؟ وہ جانتی ہے کہ میں کافی دنوں سے مین ہٹن آیا ہوا ہوں۔ اسلم خان اس سے ملاقات کر چکا ہے اور اسی نے بتایا تھا کہ میں کہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اب اسی نے مجھے فون کیا ہے، جب کہ مجھے اس کی توفیق بھی نہیں ہوئی۔ "بس

## ولیدِ بن یزید

گیارہواں اموی خلیفہ (جلوس 1743-744ء)

عیش و عشرت کا دلدادہ تھا، فوج پر نظرِ کرم رکھتا تھا۔ قتل ہو کر مرا۔ وجہ قتل یہ تھی کہ یہ اپنے دو بیٹوں میں سے ایک کو جو کنیز کے بطن سے تھا تخت کا والی وارث بنانا چاہتا تھا۔ شاہی خاندان و درباریوں کو یہ سخت ناگوار گزرا۔

مرسلہ: سلطنت بیگم کراچی

## ولید خارجی

حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے جنگ صفین کے نتیجے میں پیدا ہونے والے "خوارج" فرقہ کا مشہور سردار تھا جو فرقہ کی نسبت سے خارجی کہلاتے تھے۔ یہ عباسی عہد حکومت کی ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس کی ہمشیرہ بلند پایہ شاعرہ تھیں۔ شوہر کی موت پر انہوں نے عربی مرثیہ لکھا جو شاعری میں ممتاز درجہ رکھتا ہے۔

مرسلہ: سلطنت بیگم کراچی

کل تک آجاؤ۔" اس نے آخری جملہ کہا اور خاموش ہوگئی۔

وہ ففتھ ایونیو پر واقع ایک چھوٹے سے ہوٹل ہملٹن میں مقیم تھی۔ اس ہوٹل کی لابی تنگ و تاریک تھی۔ اس کا کمرا آراستہ و پیراستہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا، لیکن بہرحال آرام دہ تھا۔ اس کے ایک گوشے میں تان پورا رکھا ہوا تھا۔ اس کے گرد کی روپہلی فریم شدہ تصویر میز پر رکھی تھی۔

لیلا نے وہی روایتی لباس پہن رکھا تھا، کریم رنگ کی ساڑی، ہلکے جواہرات اور گردن میں بریسلٹ۔ "تم ہر اعتبار سے مکمل ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر کوئی مصور یہاں ہوتا تو کینوس پر تمہاری تصویر پینٹ کرنا شروع کردیتا۔"

کافی...... کو حلق سے اتارنے اور پستے سے شغل کرنے کے دوران اس نے اپنے انڈیا میں رہنے کا قصہ سنایا۔ وہ سفر جو اس نے شمال سے جنوب کی جانب کیا تھا۔ وہ بولی۔ "کبھی کبھار مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے زندگی کا مقصد پالیا ہے۔ جب میں سوکر اٹھتی اور برہنہ پا گھاس کے کسی قطعے پر مٹرگشت کرنے لگتی یا پھر جب سورج اپنی تابناکیاں بکھیر کر مغرب میں ڈوب رہا ہوتا تو میں وارفتگی میں نغمہ سرا ہوجاتی۔ مگر ان سب زندگی افزا لمحات میں، میں ایک عجیب سی بے چینی اور بے کلی محسوس کرتی تھی۔ اس لیے کہ جب میں اپنے دوستوں کے نزدیک ہونا چاہتی تھی تو وہ دور رہتے تھے، مجھ سے اجتناب برتتے تھے۔ میں ہالی ووڈ کی شوبزنس کی دنیا سے تعلق رکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ مجھے اس دنیا کے لوگ قبول کریں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوا۔ کیوں کہ شوبزنس کی دنیا کے افراد راک ہڈسن اور ولیم ہولڈن کے اسکینڈل سننا چاہتے ہیں، جب کہ اس کے پاس سنانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

وہ امریکا کیوں واپس آئی اس لیے کہ ڈیوڈ لین کا اسکرپٹ رائٹر سام اسپیگل چاہتا تھا کہ 'لارنس آف عربیا' کے پریمئر پر وہ ڈیوڈ کے داہنے بازو پر کھڑی ہو۔ وہ حسنِ مشرق کا جیتا جاگتا پیکر ہے اس لیے ہر ایک کی نگاہ کا مرکز بنی رہے گی۔ پھر جب ڈیوڈ نے بھی فون پر یہی بات کہی تو وہ انڈیا سے آگئی۔

میں نے اسے بتایا کہ میں اس سے گریزاں کیوں تھا اس لیے کہ ڈیوڈ اپنے تئیں یہ مفہوم نہ اخذ کرلے کہ مجھے کام کی تلاش ہے اسی لیے میں اس کے گرد چکر کاٹ رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ "اور جب میں تم سے ملنے عمان گیا تھا تو ڈیوڈ کچھ مضطرب سا تھا۔ وہ مجھ سے سرد مہری برت رہا تھا۔

"بعض اوقات وہ مجھ سے بھی کچھ اسی طرح سے پیش آتا ہے۔" اس نے تلخی سے مسکرا کر کہا۔ "میں نے اسے بتایا کہ غلط فہمیاں لوئن نے پیدا کی ہیں جو عمان کے ولا میں اس کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔"

موسم خزاں کی آمد تک میری اس سے چند اور ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے کئی بار اسے پیشکش کی کہ کیوں نہ ہم باہر چل کر کھانا کھائیں لیکن قباحت یہ تھی کہ اس کی صبح آدھا دن گزرنے پر ہوتی تھی۔ بعد میں مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ کھلی جگہوں پر جانے کے بجائے بند کمرے میں بیٹھنے کو ترجیح دیتی ہے۔

اسے ڈیوڈ کی سیکرٹری کی طرف سے قلیفے کے طور پر ایک معقول رقم ملتی تھی جو اس کی ساڑیوں کی دھلائی اور اس کے میک اپ کے سامان کے لیے کافی تھی۔ وہی سیکرٹری یہ بھی نوٹ کیا کرتی تھی کہ وہ ہوٹل سے کس کے ساتھ باہر گئی۔ اسے لیموزین استعمال کرنے کی اجازت تھی مگر کہیں جانے سے پیشتر سیکرٹری کو آگاہ کرنا ضروری تھا۔ وہ اس قید و بند کی کیفیت سے جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوجاتی تھی۔ میرے اصرار پر اس نے کئی بار تان پورا اٹھایا اور چند راگ اور راگنیاں سنائیں۔ اس کی آواز اچھی تھی لیکن اسے موسیقی کی سمجھ نہیں تھی۔

اس نے کبھی میرے کام کے بارے میں گفتگو نہیں کی۔ وہ جب ہمکلام ہوتی تھی تو نواب صاحب چھتاری یا پھر نواب بہادر یار جنگ کے بارے میں رطب اللسان رہتی جن کی وہ شیدائی اور معتقد تھی۔ اس نے بارہا کہا کہ وہ میری محبت میں بھی گرفتار ہوسکتی ہے لیکن اسے اندیشہ ہے کہ کہیں میں پیٹھ دکھا کر بھاگ نہ جاؤں۔

یہ بات سن کر میں اضطراب میں مبتلا ہوجایا کرتا تھا اس لیے کہ کچھ اور افراد بھی تھے جو اس کی دمسازی کا دم بھرتے تھے۔ کیا ان سب سے اس نے یہی کہا ہوگا؟

ایک برس کے بعد میں نیویارک چلا گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ڈیوڈ نے اس کے لیے لاس اینجلس کے ایک کمرے والے ہوٹل میں بندوبست کردیا ہے۔ لوگ اس سے ملاقات کے لیے آتے تھے وہ ان کے ساتھ باہر بھی جاتی تھی لیکن دن کا بیشتر حصہ اسے تنہا ہی گزارنا پڑتا تھا۔ پھر وہ اپنی تنہائی میں آفتاب کو شامل کرلیتی اور غروب آفتاب کا منظر دیکھتی رہتی۔

اب ڈیوڈ اس سے اپنی سیکرٹری کے توسط سے گفتگو کرتا تھا، اس کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ اس کے پاس آکر غم گساری کرتا۔

میں نے کہا کہ وہ انڈیا واپس کیوں نہیں چلی جاتی؟ اس



پر اس نے جواب دیا کہ کیا کرنے؟ وہاں اس کی ایک بیٹی ہے جس کے کئی بچے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک تنگ سے فلیٹ میں رہنا اور بچوں کا اسے نانی کہنا اس کے لیے جان لیوا تھا۔ وہ یہ سوچ کر ہی لرز جاتی تھی۔

میں جانتا تھا کہ اب ڈیوڈ اس کی زندگی میں واپس نہیں آئے گا اس لیے کہ ان دنوں اپنی ایک سیکرٹری پر اس کی نظرِ عنایت تھی۔

پندرہ برس بعد جب میں لندن میں ایک ڈرامے کی ریہرسل کررہا تھا تو ایک معمولی سے اداکار نے مجھ سے کہا کہ لیلا لین نے اسے ڈنر پر مدعو کیا ہے اور ہدایت دی ہے کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لائے۔

میں وہاں گیا تو میں نے اس کا ڈرائنگ روم مہمانوں سے بھرا دیکھا۔ جن میں آرٹسٹ، گلوکار اور اداکار شامل تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں دونوں۔ لیلا کو معلوم تھا کہ لوگوں کو اپنی طرف کیسے متوجہ کیا جاتا ہے۔ وہ کہیں نظر نہیں آئی تو میں کچن میں چلا گیا۔ لیلا وہیں تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں، جیسے میں نے اسے زندگی کے کسی موڑ پر فریب دیا ہو، لہٰذا اب وہ میری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ گزرے ہوئے وقت کی شکنیں اس کے چہرے سے عیاں تھیں اور وہ شکستہ اور درماندہ سی نظر آرہی تھی۔ اس کے بالوں کی رنگت بھوری ہوچکی تھی۔ وہ ہونٹ جو کبھی مرطوب ہوا کرتے تھے اور جنہیں دیکھ کر رعنائی اور دل فریبی کا احساس ہوا کرتا تھا، اب ماند پڑ چکے تھے۔ تب وہ دو قدم آگے بڑھی اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں وہاں سے تھوڑی دیر بعد چلا آیا۔ حسبِ روایت اس نے مجھے نہیں روکا۔ "پھر آنا اور اپنی بیگم کو بھی ساتھ لانا۔" وہ بولی۔ "میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی خوب صورتی بے مثال ہے۔ وہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہے۔"

اس کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ پھر اس کے بارے میں کوئی خبر بھی نہ ملی۔ وہ اس ہوٹل کو چھوڑ کر کہیں اور جا بسی تھی۔ مگر کہاں، یہ کسی کو خبر نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ فضا میں تحلیل ہوچکی ہو!

زمینی حقائق بہت تلخ ہوتے ہیں۔ بہرحال انہیں قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ 18 برس کی رفاقت کے بعد ڈیوڈ لین نے اس سے 1978ء میں علیحدگی اختیار کرلی۔

☆☆☆

ضیاء کہتا ہے۔ "مجھے اس بات کا بڑا صدمہ ہے کہ ماضی میں اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے اپنے کئی عزیز ترین اور قریبی ساتھیوں سے دور ہوگیا تھا۔ کیوں کہ فلموں کی شوٹنگ کی وجہ سے مجھے کئی کئی روز باہر رہنا پڑتا تھا۔ یہ مصروفیت میرے اور میری بیوی ناہید کے درمیان طلاق کا سبب بنی۔ یہ درست ہے کہ ہم نے ساتھ رہنے کی کوشش بھی کی اور ہمارے درمیان کوئی بڑا جھگڑا یا تنازع بھی نہیں تھا، جب کہ ہم دونوں نے معاملات سلجھانے کی بہت کوشش کی مگر بات بن نہیں سکی۔"

1990ء میں ضیاء نے تیسرا نکاح عذرا سے کرلیا، جب کہ ضیاء کی عمر 57 برس کے لگ بھگ تھی۔ اس نکاح کے نتیجے میں ایک لڑکی ہوئی۔

2002ء میں اس نے لاہور سے "جو جانے وہ جیتے" پیش کیا۔ یہ پروگرام کافی حد تک کون بنے گا کروڑ پتی کی طرز پر تھا۔ جسے ناظرین نے بہت پسند کیا۔

2005ء میں جنرل پرویز مشرف نے نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹس، کراچی کی بنیاد رکھی، تاکہ ملک میں اداکاری اور صداکاری کو فروغ حاصل ہوسکے۔ اس اکیڈمی کا چیئرمین ضیاء محی الدین کو مقرر کیا گیا۔ نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹس ہندو جیم خانہ میں قائم کی گئی ہے۔ فائن آرٹس کی خدمت کرتے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے اور اب اس کی عمر تقریباً 80 برس ہوچکی ہے، مگر وہ اب بھی چاق چوبند اور متحرک ہے۔

وہ ہر سال محرم میں مرثیہ خوانی بھی کرتا ہے۔ اس نے روزنامہ "دی نیوز" میں تھوڑے عرصے کے لیے ہر اتوار کو ایک ادبی کالم بھی لکھا۔ ایک ذاتی فرہنگ مرتب کرنے کا بھی خیال تھا، جس میں حال ہی میں متروک ہونے والے محاورے اور ضرب الامثال شامل ہوں گے۔

اس نے قرآن مجید کی چند سورہ کا ترجمہ بھی اپنی مخصوص آواز میں ریکارڈ کرایا ہے۔

ان سورہ کی تلاوت قاری صداقت علی نے کی ہے۔ ان سورہ میں فاتحہ، رحمان، مزمل، مدثر، زلزال، قارعہ، قیامۃ، انفطار، انشقاق شامل ہیں۔

آغا ناصر کا کہنا ہے:

ضیاء محی الدین آج بھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے۔ گزشتہ کئی برسوں کے دوران اس نے محفلِ شعر و نثر کے زیرِ عنوان جو پروگرام پیش کیے ہیں وہ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ یہ بالکل اچھوتے اور معیاری قسم کے پروگراموں کا سلسلہ ہے۔ جب سامعین ایک فن کار کو تن تنہا

اپنے سامنے اسٹیج پر اردو یا انگریزی کے شہپاروں کو پڑھتے ہوئے سنتے ہیں تو ان پر کیف و مستی کا ایک ایسا عالم طاری ہوجاتا ہے، جس کی لذت سے وہ پہلے نا آشنا تھے۔ ''ون مین شو'' کا یہ سلسلہ ضیاء محی الدین کی اپنی اختراع ہے، جس میں اس نے خاصی مہارت حاصل کی ہے۔ ضیاء محی الدین ان کی تجسیم و تہذیب میں ملکہ رکھتا ہے۔ وہ اشعار کے علاوہ لفظوں اور جملوں کو بھی اس قدر پرکشش بنا دیتا ہے کہ سامعین مسحور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان ''یک فن کار'' پروگراموں میں وہ پڑھنے کے لیے ادب پاروں کا انتخاب بھی خود کرتا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے وہ ایک ایک ادب پارے کو مدتوں پرکھتا ہے اور اس کے بعد فیصلہ کرتا ہے کہ اسے سامعین کے سامنے پیش کیا جائے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے اس کا انتخاب اس قدر جامع ہوتا ہے کہ سامعین اش اش کر اٹھتے ہیں۔ اس کا منتخب کلام سماعتوں کے ذریعے سے سامعین کے ادراک و شعور کی گہرائیوں میں اپنی تمام تر آفرینی کے ساتھ اترتا چلا جاتا ہے۔ ضیاء محی الدین اپنے طرزِ تخاطب اور اندازِ تکلم کے ذریعے سامعین کی روح میں بوند بوند تازگی اور فرحت کا رس بکھیرتا ہے اور محفل پر سکوت طاری ہوجاتا ہے۔ تب ایسا لگتا ہے جیسے اس کی بات اپنے ہدف تک پہنچ گئی اور یہی تکمیلِ آرزو کی گھڑی ہے۔

امریکا کے شہر نیویارک میں 1998ء میں منعقد ہونے والے ایک فلمی میلے میں 'مین آف آل سیزن' کا ایوارڈ دیا گیا۔ بلاشبہ ضیا اس ایوارڈ کا مستحق تھا۔ کیوں کہ وہ ہالی ووڈ کی فلموں میں اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھلا رہا تھا۔ ہالی ووڈ کی بعض فلموں میں اس نے واقعی منفرد کردار ادا کیے ہیں جن میں 'ڈیڈلی فیملیز' میں اس نے رچرڈ جانسن اور ریگلی سمرز کے ساتھ اپنے کردار کو ادا کیا ہے۔ اسی طرح سے 'سم گرلز ڈو' بلین ڈالر وومن اور بلیک پائریٹ میں اس نے شان دار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ان میں سے کچھ کی نمائش پاکستان میں بھی ہوچکی ہے۔

قومی سطح پر اس کے پروگرام اب بھی پیش کیے جاتے ہیں اور پرائیوٹ طور پر بڑے ادارے اس کی خدمات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ وہ آرٹ فلمیں بنانے والوں کو اپنے تجربات اور مشوروں سے بھی نوازتا رہتا ہے۔ اس کی طویل فنکارانہ خدمات کو سراہتے ہوئے 14 اگست 2012ء میں اسے صدر آصف علی زرداری نے ہلالِ امتیاز پیش کیا۔

اپنے بارے میں ضیاء کا کہنا ہے۔ ''میں ذاتی طور پر بے حد شرمیلا ہوں۔ یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ شو بزنس میں شرمیلے آدمی کا کوئی کام نہیں۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ میں اس میدان میں آیا ہی اس لیے تھا۔ خود میں اور دنیا کا ہر اداکار میری رائے میں دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ سخت شرمیلا پن اور نام و نمود کی خواہش۔ شرمیلا پن ہی انسان کو اپنی ذات کے اظہار کے لیے دوسری چیزوں کا سہارا لینے پر مجبور کرتا ہے۔ میں اپنے شوق کی وجہ سے اداکاری کے میدان میں آیا تھا کیوں کہ ہر شخص میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ پہچانا جائے۔ میں سچا آدمی ہوں اس لیے اعتراف کرتا ہوں کہ جب لوگ مجھے پہچانتے ہیں تو ذاتی طور پر مجھے خوشی ہوتی ہے۔ میں اُس وقت سے ڈرتا ہوں جب لوگ مجھے پہچاننا چھوڑ دیں گے۔

شرمیلا ہونے کے علاوہ میں جذباتی بھی ہوں۔ اس کا مجھے خود بھی نہیں پتا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ٹائمز کے ایک ڈرامے میں کام کر رہا تھا جس کا نام ''امن کی آشا'' تھا۔ یہ دونوں ملکوں کی ثقافت کو قریب لانے کے لیے ایک پروگرام تھا۔ اس وقت جب کہ میں بہت مصروف تھا اور سر کھجانے کی بھی مہلت نہ تھی ایک صاحب کی طرف سے تحریری پیغام ملا کہ وہ میرے والد کے ہم عصروں میں سے ایک شخص کا بیٹا ہے اور مجھ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے وقت نکالا اور اس سے لنچ پر ملاقات کی۔ میں اس سے واقف تھا۔ اس نے پرانے زمانے کی باتیں چھیڑ دیں۔ میں خواہ مخواہ جذباتی ہوگیا اور میری آنکھوں سے آنسو بھی ٹپک پڑے۔ اس وقت احساس ہوا کہ میں جذباتی بھی ہوں۔

اپنے ذاتی مشغلوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ اسے کھانے کے علاوہ پکانے کا بھی شوق ہے۔ مجھے فرانس کی روٹی بہت پسند آئی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب میں پیرس گیا تھا۔ اپنے وطن میں ایک بار لاہور میں والد صاحب دہلی مسلم ہوٹل لے گئے تھے، وہاں کی تندوری روٹی اور شوربہ کھایا تھا، اس کا ذائقہ آج تک زبان سے محو نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ ٹھنڈے گوشت بھی پسند ہیں۔

اردو کلاسیک شاعروں میں مجھے میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، مومن، غالب پسند ہیں تو جدید شاعروں میں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض اور ن م راشد اچھے لگتے ہیں، جب کہ انگریزی میں شیکسپیئر اور چند دوسرے شعرا۔ میں نے انگریزی اور اردو ڈراموں دونوں میں کام کیا ہے۔ اب آپ یہ پوچھیں گے کہ میری اصلیت کیا ہے۔ اس کے لیے میں معروف مزاح



نگار پطرس بخاری کا ایک جملہ پیش کرتا ہوں ... جو انہوں نے اپنے ہی بارے میں کہا تھا کہ میں دوغلا نہیں دہرا ہوں۔ دوغلا اور دہرا کے فرق سے آپ بخوبی واقف ہوں گے، اس لیے مجھے اس کی وضاحت نہیں کرنا چاہیے۔

لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ فلم، ٹیلی ویژن اور اسٹیج میں کہاں کام کرنا دشوار ہے۔ میں کہوں گا کہ اسٹیج پر کام کرنا دونوں کی نسبت دشوار ہے۔ اس لیے کہ ناظرین سے فن کار کا فاصلہ محض چند فٹ ہوتا ہے اور اس کی ہر لغزش پکڑی جاتی ہے۔ اسی لیے جب فن کار اسٹیج پر آتا ہے تو اسے اپنا حلق خشک محسوس ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے جیسے اس کے پیٹ میں بہت سی تتلیاں بھری ہوں۔ جوں جوں اس کے تجربے میں اضافہ ہوتا ہے وہ ان چیزوں پر قابو پالیتا ہے، لیکن کنفیوز وہ بہر حال رہتا ہے۔ اسی لیے میرا مشورہ ہے کہ جن حضرات کے اعصاب کم زور ہوں وہ اسٹیج پر کام نہ کریں۔

ایک اچھے اداکار کی تعریف یہ ہے کہ وہ شاہ بلوط کے درخت کی طرح جڑیلا اور مضبوط ہو۔ سرد و گرم چشیدہ اور بارش کا مقابلہ کرسکتا ہو۔

میں نے برطانیہ میں اسٹیج پر کام کیا ہے اور شیکسپیئر کا کردار کنگ لیئر ادا کیا ہے، مگر اب اتنا اسٹیمنا نہیں ہے کہ ایسے کردار ادا کرسکوں۔

مغربی مصنفوں میں مجھے ای ایم فوسٹر پسند ہے۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو اس کی عمر ستر برس تھی۔ وہ ہر اعتبار سے مہذب اور دانش مند لگتا تھا۔ اس نے مجھے بولنے سے زیادہ سننے کے آداب سکھائے۔ جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے میری باتیں اتنی توجہ سے سنیں کہ مجھے گمان ہوا جیسے میں کوئی دانش ور ہوں۔

موسیقی مجھے پسند ہے۔ جب میں بچہ تھا تو روزانہ میرے والد ریڈیو پر کام دار غلاف اتار کر ریڈیو آن کرتے اور کلاسکی موسیقی کا کوئی اسٹیشن لگا دیتے تھے۔ میں بھی ان کے نزدیک بیٹھ کر موسیقی سنا کرتا تھا، حالانکہ میری سمجھ میں اس وقت کچھ نہیں آتا تھا۔ مگر وہ سب کچھ میرے دل و دماغ میں اتر گیا اور اب کام آرہا ہے۔ ہمارے ہاں لوگوں کو کلاسکی موسیقی کی سمجھ نہیں ہے۔ جب بھی کوئی پروگرام پیش کیا جاتا ہے سننے والوں میں نوے فی صد افراد سمجھ نہیں پاتے، لیکن خوب واہ وا کرتے ہیں۔

میں نے ایک ناول بھی لکھا تھا ''غیر حقیقی شہر'' مگر اسے اشاعت کے لیے یوں نہیں دیا کہ وہ مجھے کچا اور خام محسوس ہوا۔ یہ ناول میں نے لندن کے ماحول سے اخذ کیا تھا، جہاں میں نے کافی عرصہ گزارا تھا۔

میں کام بہت کرتا ہوں۔ ''ناپا'' میں میں ساڑھے آٹھ بجے تک بیٹھتا ہوں۔ اس کے بعد گھر چلا جاتا ہوں اور وہاں جا کر لائبریری میں بیٹھ جاتا ہوں۔ کوئی کتاب پڑھنے لگتا ہوں۔ کھانا دیر سے کھاتا ہوں۔ بعض اوقات مطالعہ اتنی محویت سے کرتا ہوں کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا، یہاں تک کہ فجر کی اذان ہونے لگتی ہے، اس وقت بستر پر لیٹ کر تھوڑی سی نیند لے لیتا ہوں۔

ناپا 2005ء میں صدر پرویز مشرف کے کہنے پر قائم کیا گیا تھا تاکہ ملکی ثقافت کو فروغ دیا جائے اور اس ورثے کو سنبھال کر رکھا جائے جو ہمارے بزرگوں سے ہمیں ملا ہے۔ میں نے اس میں رقص، موسیقی، ڈرامے کی کلاسیں شروع کی ہیں۔ اس کے علاوہ میک اپ کرنے کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ گزشتہ سات برسوں میں ہم نے 175 طالب علموں کو تیار کرلیا ہے۔

بعض اوقات مجھے خیال آتا ہے کہ میں شاید وہ کچھ نہ کرسکوں جس کا منصوبہ میرے ذہن میں ہے، لیکن بہر حال میں نے اس کی بنیاد ڈال دی ہے، اب لوگ آتے جائیں گے اور میرے مشن کو آگے بڑھائیں گے۔

اس اکیڈمی پر ایک تنقید یہ کی جاتی ہے کہ یہاں اردو اور انگریزی کلاسیکی ادب کو زیادہ پڑھایا جاتا ہے لیکن بین الاقوامی سطح کی اداکاری نہیں سکھائی جاتی۔ میں اس سے اختلاف کروں گا۔ ایک اداکار کو مکالموں کی ادائی کا ماہر ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ وہ لفظ ''قبول'' کو ''کبول'' کہتا ہو۔ اس کے علاوہ اسے اپنی سانس پر قابو رکھنا بھی آتا ہو۔ وہ جب مکالمہ بولے تو اس کا سانس نہ ٹوٹے اور آخری الفاظ ہوا میں نہ تحلیل ہوجائیں۔

**اس مضمون کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی گئی**

A CARROT IS A CARROT-ZIA MOHI[illegible]DDIN

۲۔ صداکاری کا اوجِ کمال۔ ضیاء محی الدین۔ آغا ناصر

۳۔ پاکستانیکا۔ مرتب: سید قاسم محمود

۴۔ شخصیت۔ حمید کاشمیری نمبر

۵۔ انٹرویو' گلف نیوز'۔ جولائی 2010ء

۶۔ ہمہ صفت آرٹسٹ۔ روزنامہ جنگ۔ 1998ء

۷۔ ضیاء محی الدین۔ مصنف: زین

# سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط:85

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرونِ ملک آ گیا آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا جو شہلا کے ہاتھ لگ

گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں جائینز بریف کیس حاصل کرلوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلالیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہوچکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے ای میل بھیج کر ایمن کو بھی بلوالیا۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ...... ہکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ فتح خان نے اندازہ لگالیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں گل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کردیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنادی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہوجاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیرلیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زرودکی نے ہم دونوں کو پکڑلیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جارہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑلیں۔ صابر تو پکڑ میں آگیا مگر شہلا نکل گئی۔ ہم اس گھر سے نکل کر راسمو کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرودکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرودکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی کی تھی۔ میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہوچکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جارہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر کر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کرکے بانو کو اپنے بیڈ روم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوالیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزار لی تو بانو بری ہوجائے گی۔ میں نے راسن پر حملہ کردیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ منشی دل جی آگیا اور اس نے راسن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ نائیک اور راسن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔" میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر ہاتھ مارا پستول نکل کر دور جاگرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام...... کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ شملہ پہنچ کر راجا صاحب سے بات کی۔ انہوں نے ہوٹل میں کمرا دلوادیا۔ میں راج کنور کو یرغمال بنا کر پاکستان پہنچنے کی تیاری کررہا تھا۔ اسپتال جہاں کنور کو رکھا گیا تھا وہاں سے نکل رہا تھا کہ پستول کی نال میری گردن پر آگئی اور راسن کی آواز ابھری۔ "ملامت شہباز۔" میں نے اسے گھونسے مار کر بے ہوش کیا اور عقبی گلی سے نکل آیا۔ ہوٹل پہنچ کر اسکائپ کے ذریعہ تمام دوستوں اور اپنے گھر والوں سے بات کی۔ میں نے پلان بنایا تھا کہ کنور کو اغوا کرکے ہیلی کاپٹر کے ذریعہ بارڈر کراس کرلوں گا۔ اسے اغوا کرنے اسپتال پہنچا اور جیسے ہی اندر داخل ہوا ڈاکٹر امرت سنگھ سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں سرجیکل نائف تھی۔ اس نے چونک کر پوچھا آپ یہاں کیا کررہے ہیں۔ اسے میں نے قابو کرلیا۔ اس نے بتایا کہ راسن راج کنور کو نکال لے گیا ہے۔ میں نے فوراً پلان بنایا کہ ہیلی کاپٹر سے راج کنور کا پیچھا کروں گا اور اسے اغوا کرکے پاکستان لے جاؤں گا۔ کامیابی مل گئی اور میں راج کنور کو لے کر سرحد پار کرگیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کرلیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جارہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے ہیلی کاپٹر لانے کو کہا۔ سنگاری جب ہیلی کاپٹر واپس لارہا تھا کہ میزائل پھٹ گیا اور ہمارا ذہن تاریک ہوگیا۔ دھماکے سے ہیلی کاپٹر پانی پر گرا تھا مگر ہم سب محفوظ رہے، میں نے سڑک پر پہنچ کر ایک ٹرک کو روکا اور اس پر سوار ہوکر چلا تو بی ایس ایف کے کچھ سپاہیوں نے ہمیں گھیرلیا۔ ان کو ٹھکانے لگا کر ہم آگے بڑھے اور ایک طیارہ کرایہ پر لے کر نئے سفر پر چل پڑے۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناکابندی کرنے جا پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں جیتو نے سڑک پر نوکیلی کیلیں بچھادی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچی ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو جیتو کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کردیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا۔ اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ میں جیتو کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے



کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا۔ سیتا کا شوہر ارون اسے حراساں کررہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیرلیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شاہ کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔

## (اب آگے پڑھیں)

آواز صاف منشی دل جی کی تھی اور اس کا طرزِ تخاطب بتا رہا تھا کہ وہ نہ صرف ڈیوڈ شا سے مخاطب ہے بلکہ وہ اس سے یوں مخاطب ہونے کا حق بھی رکھتا ہے۔ پوجا کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اسے شاید اندازہ ہوگیا تھا کہ اس سے نہ صرف سنگین غلطی ہوئی ہے بلکہ ہونے والی غلطی پکڑی جا چکی ہوگی اور اب اسے سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کی غلطی سے میں نے وہ سن لیا تھا جو مجھے نہیں سننا چاہیے تھا۔ وہ کچھ دیر ساکت کھڑی رہی پھر اس نے دوبارہ برتن سمیٹنا شروع کردیے۔ ابھی وہ یہ کام کررہی تھی کہ اس کے لباس سے پھر بپ کی آواز آئی اور اس بار اس نے بٹن دباتے ہوئے کہا۔ "یس سر...." اس کا رنگ مزید زرد پڑ گیا۔ اب کے اس کے لہجے میں لرزش تھی۔ "یس سر...."

پھر وہ ٹرالی لیے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی بیتو نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "شوبی یہ کیا تھا.... یہ حرامی دیدی کے بارے میں کیوں پوچھ رہا تھا۔"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔" میں نے کہا اور کسی قدر بلند آواز سے بولا۔ "لیکن اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اصل میں سعدیہ کو وہاں سے نکالنے جارہے ہیں۔ ورنہ میں کسی بھی گڑبڑ کا ذمّے دار ڈیوڈ شا کو سمجھوں گا۔"

میں نے اپنے لہجے سے جتادیا تھا کہ میں یہ بات ڈیوڈ شا سے کہہ رہا ہوں۔ ایک بار پھر مجھے احساس ہوا کہ منشی دل جی محض ایک مہرے کے طور پر اس کھیل میں شامل نہیں تھا بلکہ وہ اس کھیل کا ایک کھلاڑی تھا تب ہی وہ ڈیوڈ شا سے یہ سوال کرنے کا مجاز ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ڈیوڈ شا نے اسے کیا جواب دیا۔ وہ کسی پر مکمل اعتماد کرنے والا شخص نہیں تھا۔ جس طرح وہ مجھ سے بہت چھپا رہا تھا اسی طرح وہ یقیناً منشی دل جی سے بھی بہت کچھ چھپا رہا ہوگا۔ بے شک آنے والے دنوں میں منشی دل جی اس جاگیر کا مالک ہوتا مگر فی الحال وہ ایک عام آدمی تھا اور اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں تھی۔ اگر وہ کنور پیلس کا رازداں نہ ہوتا تو شاید اس کی یہ حیثیت بھی نہ ہوتی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ اس نے ڈیوڈ شا سے یہ سوال کیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس کے بعد پوجا دکھائی نہیں دی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک اور ملازمہ ہمارے لیے چائے اور گرین ٹی لے کر آئی تو میں نے اس سے کہا۔ "میں ڈیوڈ شا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

اس نے سر ہلایا اور رخصت ہوگئی۔ جب تک ہم چائے سے فارغ ہوئے فتح خان وارد ہوگیا۔ اس کی آمد خالی از علت نہیں تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "شہباز خانا فکر مت کرو.... منشی دل جی کا کوئی حیثیت نہیں ہے اور اسے کچھ نہیں معلوم ہے۔"

"میں کیسے مان لوں؟ وہ ڈیوڈ شا سے سوال کررہا تھا تو کسی حیثیت کے برتے پر کررہا ہوگا۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "بہرحال یہ میرا مسئلہ نہیں ہے کہ منشی دل جی کو کچھ معلوم ہے یا نہیں لیکن اگر اس نے کوئی حرکت کی تو اس کی ذمّے داری ڈیوڈ شا پر ہوگی۔"

"وہ کوئی حرکت نہیں کرے گا۔" فتح خان نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ "میں تم کو یہی بتانے آیا تھا۔"

"فتح خان میں تمہاری بات مان لیتا ہوں جب تک اس کے برخلاف نہیں ہوتا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے کچھ اور بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ جاتے ہوئے رک گیا۔ "کرو۔"

"تم بھی کنور پیلس پر حملے میں شامل ہوگے، اپنے ساتھیوں سمیت؟"

اس نے سر ہلایا۔ "بالکل۔"

"تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟"

"آدمی تو بہت ہیں لیکن کام کے بندے چھ ہیں۔" اس نے کہا۔ "سب لڑنے مرنے اور مارنے والے ہیں۔ کوئی پیچھے نہیں ہٹے گا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "صرف نرے لڑاکا ہیں یا تربیت یافتہ بھی ہیں۔"

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "تم کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں تم اور تمہارے آدمی میرے ساتھ رہیں۔ وہ مقامی ہیں اس لیے ان سے کمیونیکیشن میں آسانی رہے گی۔ میرے ساتھ جو جائیں گے وہ ہیلی کاپٹر میں ہوں گے۔ کیا تمہارے آدمیوں کو اس کا تجربہ ہے؟"

"ہیلی کاپٹر کا نہیں ہے باقی ہر طرح کا تجربہ ہے۔"

"انہیں معلق ہیلی کاپٹر سے رسی کے سہارے اترنا پڑے گا۔"

"میں سمجھ گیا۔" فتح خان نے سر ہلایا۔ "میں خود دیکھتا ہے کہ وہ اس کام میں کتنا ماہر ہے۔ پھر تم کو بتائے گا۔"

"ہمارے پاس دو دن ہیں اگر تمہارے آدمی اس میں ماہر نہیں ہیں تو ان سے کہو پریکٹس کر لیں۔ میری پہلی ترجیح تم اور تمہارے آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس لڑکی سے ایک غلطی ہوئی ہے کیا اسے سزا ملے گی۔" میرا اشارہ پوجا کی طرف تھا۔

"نہیں.... البتہ اسے یہاں سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اس کی جگہ دوسرا عورت آئے گا۔" فتح خان نے کہا اور چلا گیا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ دوسری خادمہ آ بھی چکی تھی۔ بیتو لاتعلقی سے سن اور دیکھ رہا تھا فتح خان کے جانے کے بعد اس نے کہا۔

"شوبی یہ شرارتی آدمی ہے۔"

"ہاں لیکن ابھی کوئی شرارت نہیں کر سکتا ہے۔" میں نے کہا اور اس کے برابر میں بستر پر دراز ہو گیا.... "برخوردار تم سوتے میں خراٹے بہت خوفناک لیتے ہو۔ مجھے تو اس بے چاری پر ترس آ رہا ہے جسے تمہارے ساتھ سونا پڑے گا۔"

بیتو جھینپ گیا۔ "شوبی ابھی ایسا کوئی بے چاری نہیں ہے اور ہم کو پتا نہیں چلتا کہ سونے کے بعد ہم کیسا خراٹا لیتا ہے؟"

"آج رات میں ریکارڈ کر کے تمہیں سناؤں گا۔"

"کیسے ریکارڈ کرے گا؟"

"اس لیپ ٹاپ سے، اس میں آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ کا بندوبست بھی ہے۔"

بیتو کو فکر لاحق ہو گئی۔ "شوبی ہم واقعی خوفناک خراٹے لیتا ہے؟"

"بہت زیادہ۔ مجھے صحیح معنوں میں کل رات پتا چلا.... وہ تو شکر ہے نیند آ گئی ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا میں ساری رات جاگتا رہوں گا۔"

"تب ایسا ہے کہ پہلے آپ سو جاؤ ہم جاگتا ہے جب آپ سو جائے گا تب ہم سوئے گا۔" بیتو نے تجویز پیش کی۔ "اس طرح آپ کا نیند خراب نہیں ہوئے گا۔"

"دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ "میں ذرا ٹہل کر آتا ہوں۔"

"کہاں جا رہا ہے؟"

"باہر لان میں۔"

"ہم بھی چلے۔"

"آ جاؤ۔" میں نے جیکٹ پہنتے ہوئے سر ہلایا۔ باہر خاصی سردی تھی اور کسی گرم چیز کے بغیر گزارا مشکل تھا۔ بیتو نے بھی جیکٹ لے لی تھی۔ ہم باہر نکل آئے۔ کسی نے روکا نہیں عمارت کے سامنے موجود پختہ روش پر ٹہلنے لگے۔ باہر آنے کا اصل مقصد بیتو سے بات کرنا تھا۔ اگرچہ یہاں بھی مجھے اطمینان نہیں تھا کہ کوئی ہماری بات نہیں سنے گا۔ آج کل ٹیکنالوجی بہت ترقی کر گئی ہے۔ ممکن ہے بہت طاقتور مائک ہوں جو دور سے بھی ہماری آواز کیچ کر لیں۔ مگر بات کرنا بھی ضروری تھا۔ میں نے پہلے بیتو کو وہ ساری گفتگو سنائی جس میں وہ موجود نہیں تھا۔ اس میں منصوبہ بھی شامل تھا کہ ہم کس طرح سے کنور پیلس پر حملہ کرتے۔ پھر میں نے وسیم کی تجویز سامنے رکھی۔

"وسیم کا کہنا ہے اس مشن میں بڑے اور چھوٹے دونوں کنوروں کا خاتمہ کرنا ہے۔ میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔"

"ہم متفق ہے۔" بیتو بولا۔ "اس میں منشی جی کو بھی شامل کر لو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اول تو وہ مشن میں ہوگا نہیں.... مطلب اندر گھسنے والوں میں نہیں ہوگا۔ دوسرے اس وقت وہ ڈیوڈ شا کی وجہ سے حلیف ہے۔ لیکن دونوں کنور دشمن ہیں۔ منشی دل جی بھی ڈیوڈ شا کے ساتھ اسی لیے شامل ہوا ہے کہ وہ ان دونوں کا خاتمہ کر کے خود جاگیر کا وارث بننا چاہتا ہے۔"

بیتو منشی دل جی کے بارے میں فیصلے سے مطمئن نہیں تھا۔ "شوبی اگر اس مشن میں نہیں تو اس کے بعد اس کا خاتمہ ضروری ہے ورنہ وہ دیدی کا دشمن بن جائے گا اور ہمارے پیچھے پڑا رہے گا۔"

"اسے بھی دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو مسئلہ دونوں کنور ہیں۔ وہ سادی کے بھائی ہیں اور سادی بھی



وہیں ہو گی۔ اس کی موجودگی میں یا اس کے سامنے ان دونوں کا خاتمہ آسان نہیں ہوگا۔"

بیتو نے غور کیا۔ "یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"اب یہ تمہارا کام ہے کہ ان دونوں کا خاتمہ کرو اور سادی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔"

بیتو نے پھر غور کیا اور بولا۔ "ان کا کام ہم تمام کرے گا۔ دیدی کو آپ لاعلم رکھو۔"

"ٹھیک ہے، سادی میری ذمے داری ہو گی۔" میں نے سر ہلایا۔ "تم کنور پیلس کے نقشے سے واقف ہو؟"

"ہم نے آج تک دیکھا بھی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے کل تم دیکھ لینا، یہاں کرنل کے آدمیوں نے پورے پیلس کا تھری ڈی نقشہ تیار کیا ہے۔ تم اسے دیکھنا اور جب ہم وہاں جائیں گے تو ہمارے پاس ڈیجیٹل نقشے بھی ہوں گے۔"

"ڈیجیٹل نقشہ کیا شوبی؟"

"آئی فون جیسا اسکرین والا آلہ ہوتا ہے اس میں پیلس کا مکمل نقشہ ہوگا۔"

"شوبی ہم کو ہتھیار استعمال کرنا ہوگا۔ ادھر دوسرا ہتھیار ہو سکتا ہے۔" بیتو نے نقطہ اٹھایا۔ "نیا ہوگا تو عین موقع پر استعمال کرنا مشکل ہوگا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہمیں پریکٹس کی ضرورت ہو گی۔ اب دو دن ہیں تو ہمیں بہت سی تیاری کرنی ہو گی۔ صرف ہتھیار ہی نہیں بہت سے آلات بھی ہوں گے، ان کے استعمال کی پریکٹس بھی کرنی ہو گی۔"

ہم کوئی آدھے گھنٹے باہر رہے۔ اس کے بعد سردی اثر کرنے لگی تھی تو ہم اندر آ گئے۔ میں نے سونے سے پہلے غسل کیا۔ ہمارے لیے پاجامے اور کرتے پر مشتمل آرام دہ.... نائٹ سوٹ بھی آ گئے تھے۔ میں لباس بدل کر لیٹ گیا۔ بیتو وعدے کے مطابق جاگنے کی کوشش کر رہا تھا اور ٹی وی دیکھتے ہوئے وقت گزاری کر رہا تھا۔ اس نے آواز بند کر رکھی تھی۔ میں کچھ دیر بعد سو گیا تھا۔ اس کے بعد بیتو کب سویا اسے بھی نہیں پتا چلا تھا۔ رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو ٹی وی چل رہا تھا اور بیتو بستر پر نیم دراز سو رہا تھا۔ اس نے کمبل بھی نہیں لیا تھا۔ میں نے ٹی وی بند کر کے اس پر کمبل ڈالا اور پھر سو گیا۔

صبح جلدی آنکھ کھل گئی تھی۔ ورزش اور شاور سے فارغ ہو کر میں نے ناشتا طلب کیا۔ دوسری لڑکی تقریباً پوجا کی عمر کی تھی۔ اس کا نام ساریہ تھا۔ دیکھنے میں وہ پوجا سے زیادہ خوب صورت تھی لیکن مجھے یقین تھا اسے صرف شکل صورت کی وجہ سے یہاں نہیں رکھا گیا ہوگا یقیناً اس میں اور خصوصیات بھی ہوں گی۔ جیسی کہ پوجا میں تھیں۔ اس نے ناشتے کا آرڈر نوٹ کیا اور جانے لگی تھی کہ میں نے روکا۔ "مجھے کرنل جیمز سے بات کرنی ہے فوری۔"

"یس سر۔" اس نے کہا تھا۔ چند منٹ بعد ایک آدمی آیا اور ایک واکی ٹاکی دے کر چلا گیا۔ ایسا ہی واکی ٹاکی میں نے کرنل اور ڈیوڈ شا کے پاس دیکھا تھا۔ وہ اس سے آپس میں رابطے میں رہتے تھے۔ چند لمحے بعد واکی ٹاکی سے بپ ہوئی تو میں نے ریسیور کا بٹن دبایا۔ دوسری طرف کرنل تھا اس نے پوچھا۔ "یس مسٹر ملک؟"

"کرنل میں آج ان تمام آلات اور ہتھیاروں کا ڈیمو چاہتا ہوں جو ہمیں اس مہم میں استعمال کرنے ہیں خاص طور سے جو ٹیم میرے ساتھ جائے گی۔"

"دوپہر تک ہو سکے گا۔ ابھی کچھ چیزیں نہیں ہیں، منگوائی ہیں۔" اس نے جواب دیا اور پھر پوچھا۔ "تم کھان اور اس کے آدمیوں کو ساتھ رکھنا چاہتے ہو؟"

"ہاں وہ سب مقامی ہیں اور ان سے کمیونی کیشن میں آسانی رہے گی۔"

کرنل میرے اس فیصلے سے متفق نہیں تھا اس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔ "ہیلی کاپٹر سے مشن مشکل ہوتا ہے اور اس میں آدمی کو زیادہ تربیت یافتہ ہونا چاہیے۔ میرے پاس اس مقصد سے تربیت یافتہ بہترین آدمی موجود ہیں۔"

"فتح خان اپنے آدمیوں کو اس لحاظ سے چیک کر لے گا۔ اس کے بعد ہی حتمی فیصلہ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ویسے تمہارے آدمی بھی ہوں گے۔ نو افراد ہم ہوں گے اور کم سے کم تین افراد اور درکار ہوں گے۔"

"اوکے اس پر ملاقات میں بات کریں گے۔" کرنل نے کہا۔ "ممکن ہے جو ہیلی کاپٹر ملے وہ اتنا بڑا نہ ہو جس میں درجن بھر افراد جا سکیں۔"

"ایک منٹ، اگر میں تم سے رابطہ کرنا چاہوں تو؟"

"دو نمبر دبانا.... ایک نمبر ڈیوڈ شا کا ہے۔ میں ڈیمو کا بندوبست کر کے تمہیں کال کروں گا۔"

ڈیوڈ شا یہاں بھی ایک نمبر تھا۔ میں نے واکی ٹاکی بند

کرتے ہوئے سوچا۔ میں نے محسوس کیا کہ کرنل فتح خان اور اس کے ساتھیوں کی میرے ساتھ موجودگی پر کچھ معترض تھا لیکن اس نے کھل کر یہ بات نہیں کہی اس کے بجائے اس نے ان کے غیر تربیت یافتہ ہونے پر اعتراض کیا تھا۔ ناشتے کے ساتھ اخبارات بھی آئے تھے اور یہ سارے انگریزی کے تھے اس لیے ناشتے کے بعد بیتو ٹی وی میں لگ گیا۔ میں بھی جلد بور ہو گیا کیونکہ اخبارات میں تقریباً ساری خبریں انڈیا سے متعلق تھیں اور اگر کوئی خبر پاکستان کی تھی تو اس میں تعصب کا رنگ نمایاں تھا۔ اس دوران میں بیتو نے کچھ پاکستانی نیوز چینل تلاش کر لیے تھے۔ اس نے ایک چینل لگایا تو ہم دونوں ہی چونک گئے تھے۔ اس میں درگاہ مرشدیہ پر ہونے والے عرس کے بارے میں رپورٹ پیش کی جا رہی تھی۔ رپورٹر جو مرشد کا چمچہ تھا کہہ رہا تھا۔

"پچھلے کچھ عرصے سے بعض جرائم پیشہ افراد اس مقدس درگاہ اور اس کے متولیوں کے پیچھے پڑے ہیں۔ درگاہ کے موجودہ سجادہ نشین اعلیٰ حضرت مرشد علی کے چھوٹے بھائی نادر علی پر قاتلانہ حملہ ہوا جس میں وہ شدید زخمی ہو کر کئی مہینے تک زندگی و موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد جامِ شہادت نوش کر گئے۔ حکومت نے قاتلوں کی گرفتاری کے لیے کچھ نہیں کیا الٹا دباؤ ڈلوا کر قاتلوں کے خلاف مقدمے ختم کرا دیے گئے۔ اعلیٰ حضرت مرشد علی پر بھی کئی بار قاتلانہ حملے ہوئے لیکن اللہ نے ان کی نیکیوں کے طفیل انہیں محفوظ رکھا۔ دہشت گردوں نے ایک بار درگاہ پر بھی حملہ کیا اور کئی افراد اس حملے میں شہید ہوئے۔"

رپورٹر کی بکواس کے بعد مرشد علی کی مختصر تقریر دکھائی گئی جس میں وہ اپنے جاہل مریدوں کے جمِ غفیر سے خطاب کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ وہ باطل قوتوں کے آگے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے گا چاہے اسے بھی اس کے بھائی کی طرح شہید کر دیا جائے۔ یہ تقریر مرشد نے گزشتہ روز کی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ ہمارے خلاف اعلانِ جنگ کر رہا ہے۔ اس کے بارے میں میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ مرشد کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی اور وہ اپنی فطرت کے مطابق شرارت پر اتر آیا تھا۔ اس نے میرے خلاف قانونی لڑائی ترک کر دی تھی مگر اب وہ دوسرے طریقوں سے میدانِ جنگ سجا رہا تھا۔ رپورٹ دیکھ کر میں نے وسیم اینڈ کمپنی سے رابطہ کیا۔ وہ بھی یہ خبر دیکھ چکے تھے اور فکر مند تھے۔ وسیم نے کہا۔ "وہ اپنی اوقات سے باہر ہو گیا ہے۔"

"اس لیے اب اسے دوبارہ اپنی اوقات پر لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "اب دشمن کے وار کا انتظار کرنا بیکار ہے اس سے صرف اسے شہ ملتی ہے۔"

وسیم خوش ہو گیا۔ "یہی تو میں آپ سے کہتا تھا۔ اگر آپ مجھے فری ہینڈ دیں تو میں اس کا دماغ درست کر دوں گا۔ ویسے بھی بہت عرصے سے بیکار بیٹھا ہوں، میرے اکثر آدمی بھی چھٹیاں گزار رہے ہیں۔"

"ان سب کو واپس بلا لو۔" میں نے کہا۔ "بھگوال والی حویلی کو مرکز بنا کر کارروائی کرو اور فیض آباد والی کوٹھی میں سرگرمیاں محدود کر لو.... اسے محفوظ رہنا چاہیے۔"

"اس صورت میں میں عضوِ معطل بن جاؤں گا۔" عبداللہ نے فریاد کی۔ "یہاں کا نگران میں ہوں۔"

"کوئی بات نہیں اسے خالی چھوڑ دو.... یا دیکھ بھال کے لیے ایک آدھ بندہ یہاں رکھ لو۔ باقی سب بھگوال منتقل ہو جائیں۔"

"اور بانو...."

"میں سوچ رہا ہوں اسے بھی حویلی منتقل کر دیا جائے۔" میں نے کہا تھا کہ عقب سے بانو کی آواز آئی۔

"میں کہیں نہیں جا رہی۔" وہ عبداللہ اور وسیم کے عقب میں نمودار ہوئی۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "آپ بھول رہے ہیں میں اب گھریلو لڑکی نہیں ہوں اور آپ نے ہی مجھے لڑنا سکھایا ہے اب گھر بٹھانے کی بات کر رہے ہیں۔"

"تمہیں لڑنا آتا ہے لیکن ہمارے لیے تم لڑکی اور ذمے داری ہو۔ اس لیے تمہیں محفوظ بنانا ہماری پہلی ترجیح ہے۔"

"میں آپ لوگوں کے ساتھ خود کو محفوظ سمجھتی ہوں۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اس لیے میں کہیں نہیں جا رہی۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے یار۔" سفیر نے بھی ٹانگ اڑائی۔ "یہ بھی چلی گئی تو چاروں طرف اپنی جیسی منحوس صورتیں رہ جائیں گی۔"

"تو ایسا کر مونا کو بھی بلا لے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "کچھ دن میں اللہ نے چاہا تو سادی بھی آ جائے گی اور تم لوگوں کے اچھی صورتیں دیکھنے کے سارے ارمان پورے ہو جائیں گے۔"

"جناب ہمیں کیوں رگڑ رہے ہیں۔" عبداللہ نے



جلدی سے کہا۔ "صرف سفیر کی خواہش ہے۔"

"اچھا بیٹھے بتاؤں کل رات تم کیا کہہ رہے تھے۔"

"میں تو چلتی ہوں۔" بانو نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں فضول باتیں شروع ہو گئی ہیں۔"

"اور اس پر بھی تم ان کے ساتھ رہنے پر مُصر ہو۔"

وہ جاتے جاتے رک گئی۔ "وہ الگ بات ہے۔ جب میں پاکستان واپس آئی تب ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ آپ کی جنگ اب میری جنگ ہے اور میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی رہوں گی۔"

"او کے اس پر بعد میں بات ہو گی۔" میں نے موضوع ختم کیا۔

"امن و امان کے خراب حالات کی وجہ سے اب شہر میں سیکورٹی سخت کی جا رہی ہے۔" عبداللہ نے کہا۔ "اس لیے بھی اس کوٹھی کو مرکز بنانا ٹھیک نہیں ہو گا۔"

"صرف شہر نہیں بلکہ مضافات پر بھی نظر رکھی جا رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "آئے دن نواحی علاقوں میں چھاپے پڑتے ہیں اور دہشت گرد پکڑے جاتے ہیں۔ اس لیے حویلی کو بھی بہت محفوظ مت سمجھو۔ پھر دیہی علاقے میں لوگ اپنے آس پاس مکمل نظر رکھتے ہیں وہاں کچھ چھپانا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے نہ صرف محتاط رہو بلکہ کسی سیٹ اپ کے ساتھ رہو تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

"سیٹ اپ سے آپ کی کیا مراد ہے؟" وسیم نے پوچھا۔

"یہی کہ تم میں سے کوئی شوقین مزاج جاگیردار بن جائے جو جنوبی پنجاب سے تعلق رکھتا ہے اور آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے یہ حویلی کرائے پر حاصل کی ہے۔ اس کے ساتھ اس کے چیلے چمچے ہوں گے۔"

"جاگیردار کون بنے گا؟" عبداللہ نے سوال کیا۔

"یہ دونوں غریب غربا ہیں۔" سفیر نے حقارت سے وسیم اور عبداللہ کی طرف اشارہ کیا۔ "انہیں کیا پتا کہ جاگیردار کیسے رہتے ہیں؟"

"تو تمہیں پتا ہے؟" عبداللہ نے خفگی سے کہا۔

"ہاں مابدولت.... جدی پشتی جاگیردار ہیں۔" سفیر نے گردن اکڑائی۔ "میں جاگیردار بنوں گا۔"

"اور ہم تمہارے حالی موالی ہوں گے؟" وسیم نے طنز کیا۔ "تمہیں تو بیوی کچھ نہیں سمجھتی تو دوسروں سے کیا توقع کرتے ہو؟"

"صحیح بولا۔" بیتو نے خوش ہو کر کہا۔ "جاگیردار سنجیدہ ہوتا آپ مسخرہ ہوتا۔"

اس سے پہلے کہ لڑائی مزید بڑھتی میں نے ہاتھ اوپر کیا۔ "خدا کے لیے آپس میں لڑنا بند کرو۔ تم لوگوں کو کسی مرشد کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے ہم آپس میں مشورہ کر کے کوئی سیٹ اپ بناتے ہیں۔" وسیم نے کہا۔ "آپ نے ٹھیک کہا مقامی لوگوں کو کوئی مشکوک بات نظر نہیں آنی چاہیے۔"

"اس سے اسلحہ بھی کور ہو جائے گا۔" عبداللہ نے کہا۔ "آج کل معمولی سا جاگیردار بھی چار پانچ مسلح محافظ تو رکھتا ہے، بے شک اسے سوائے اپنی بیوی کے اور کسی سے خطرہ نہ ہو۔"

سفیر نے فوراً پنگا لیا۔ "اب تم نے بھی بات بات پر بیوی کا ذکر شروع کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہارے دل میں بھی بیوی کا ارمان انگڑائیاں لے رہا ہے۔"

وہ باز آنے والے نہیں تھے۔ سفیر مجھ سے مختلف فطرت کا تھا ہر ایک سے دو منٹ میں بے تکلف ہو جانے والا۔ عبداللہ اور وسیم میرا احترام کرتے تھے اس لیے مجھ سے وہ کبھی اس طرح بے تکلف نہیں ہوئے جیسے سفیر سے ہو گئے تھے۔ پھر دن رات کا ساتھ تھا۔ دکھ سکھ میں شریک تھے اس لیے ان میں یہ محبت بھری نوک جھوک فطری امر تھا۔ سفیر کے مزاج نے ان کے لیے آسانی کر دی تھی۔ اچانک سفیر نے کہا۔ "یار تو نے کتنے دنوں سے حویلی کال نہیں کی ہے، مونا بتا رہی تھی سویرا بہت اداس ہے۔"

میں گڑبڑا گیا۔ "ہاں یار بس مجھے مناسب نہیں لگا۔"

"کر لے یار.... میرا خیال ہے اب اتنا خطرہ نہیں ہے۔"

"خطرہ ہو گا...." وسیم نے مداخلت کی۔ "انڈین شہباز کے بارے میں جانتے ہیں تو اس کے گھر والوں کے بارے میں بھی جانتے ہوں گے۔ ممکن ہے انہوں نے حویلی کے مواصلاتی رابطوں پر کوئی ٹیپ لگا رکھا ہو۔ آج کے دور میں یہ ناممکن نہیں ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے اس سے وہ میرا سراغ لگا سکتے ہیں؟"

"بالکل اور آپ ڈیوڈ شا کے ساتھ خود کو محفوظ مت سمجھیں۔" وسیم نے مشورہ دیا۔ "آج کل آپ بہت زیادہ اسکائپ یوز کر رہے ہیں، مانی کا کہنا ہے کہ یہ محفوظ نہیں

ہے۔اس کی نگرانی کی جاسکتی ہے اور کال کرنے والے کا پتا لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔شاید میں ڈیوڈ شا کی قید میں آنے کے بعد کچھ بے پروا ہو گیا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ میری حفاظت کی ذمے داری اس پر ہے حالانکہ کوئی مشکل آتی تو وہ مجھے چھوڑ کر فرار ہونے میں ایک منٹ کی تاخیر نہ کرتا۔اس لیے میں نے وسیم سے اتفاق کرتے ہوئے اسکائپ بند کر دیا اس پر بیتو کو کچھ مایوسی ہوئی۔"شوبی مزہ آرہا تھا۔آپ نے جلدی بند کر دیا۔"

"وہ تو ہے یار پر احتیاط بھی ضروری ہے۔"میں نے کہا۔

"ابھی آپ کرنل کے پاس جائے گا تو ہم بھی جائے گا؟"بیتو نے پوچھا۔میں نے سر ہلایا۔

"بالکل تمہیں بھی سب جاننا ہے۔"

"ہم کو انگریزی نہیں آتا ہے۔"

"میں بتاؤں گا تم فکر مت کرو۔"

کرنل نے دوپہر کا کہا تھا اس سے میں سمجھا کہ اس کی مراد ایک دو بجے ہو گی لیکن میں بھول گیا تھا کہ بارہ بجے سے انگریزوں کے لیے دوپہر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔واکی ٹاکی نے بپ دی۔کرنل نے کہا۔"شہباز اسی کنٹرول سینٹر میں آجاؤ ڈیمو کے لیے۔"

"میں آرہا ہوں۔"میں نے کہا۔کنٹرول سینٹر سے اس کی مراد وہی ایک منزلہ عمارت تھی جس میں کمپیوٹر والے بیٹھے تھے۔میں نے بیتو سے کہا۔"تیار ہو جاؤ برخوردار۔"

وہ فکر مند ہو گیا۔"شوبی ابھی لنچ نہیں کرنا ہے؟"

"لنچ واپسی پر۔"

ہم باہر آئے اس بار بھی کسی نے نہیں روکا اور نہ ہی سر پر مسلط ہونے کی کوشش کی۔کرنل نے مجھے تفصیل سے خبردار کر دیا تھا کہ کسی بھی پختہ روش سے اترنے کی صورت میں اسنائپر گن خودکار انداز میں شوٹ کر دے گی اس لیے ایسی غلطی بھی خودکشی کے مترادف ہو گی۔میں نے بیتو کو ایک بار پھر بتایا کہ پختہ روش سے نیچے پاؤں بھی مت رکھنا۔وہ اسنائپر گن کے بارے میں سن کر حیران ہوا تھا۔"شوبی یہ اتنا خطرناک ہتھیار ہے؟"

"سوچ سے بھی زیادہ، اسے کمپیوٹر کنٹرول کرتا ہے اور اس میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا ہے۔"

"شوبی انسان کو مارنے کا ٹیکنالوجی اتنا ترقی کر گیا جب کہ وہ ایک چاقو ایک پتھر سے بھی مر جاتا ہے۔تب اسے بچانے کا ٹیکنالوجی نے اتنا ترقی کیوں نہیں کیا؟"

"کیونکہ ٹیکنالوجی کے خالقوں کو اس میں دل چسپی نہیں ہے۔"میں نے اسے آگاہ کیا۔"ورنہ یہ دنیا آج اتنی بری جگہ نہ ہوتی۔"

ہم عمارت تک پہنچے دروازہ خود بہ خود کھل گیا۔یقیناً دیکھا جا رہا تھا کہ ہم پہنچ گئے ہیں۔کرنل اندر اپنے دفتر میں ہمارا منتظر تھا۔مگر مجھے وہاں ڈیمو کا کوئی بندوبست نظر نہیں آیا۔اس نے اٹھ کر مجھ سے اور بیتو سے ہاتھ ملایا۔میں نے محسوس کیا کہ وہ مکمل پروفیشنل آدمی تھا۔سرد اور ایک متوازی رویّے کا مالک۔کسی سے نہ تو فری ہوتا تھا اور نہ ہی بلاوجہ کسی سے الجھنے کی کوشش کرتا تھا۔اس نے کہا۔"میرے ساتھ آؤ۔"

وہ ہمیں ایک مختصر میٹنگ ہال میں لایا جہاں ایک بڑی میز تھی مگر اس وقت یہ میز میٹنگ کے بجائے ڈیمو کا مرکز بنی ہوئی تھی اس پر کئی طرح کے جدید ہتھیار اور آلات سجے ہوئے تھے۔انہیں تین حصوں میں بانٹ کر الگ الگ رکھا ہوا تھا جس حصے میں ہتھیار تھے اس کے بھی دو حصے تھے۔ایک میں عمومی ہتھیار تھے اور دوسرے میں کچھ خاص ہتھیار رکھے ہوئے تھے۔کرنل میز کے ایک سرے پر آگیا اور اس نے اشارہ کیا۔"یہ تمام چیزیں اس مشن میں ہمارے کام آئیں گی۔ان آلات کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو الگ الگ مقاصد کے لیے ہیں۔پہلا مقصد دشمن سے خبردار رہنا ہے۔اس کے لیے ہمارے پاس یہ آلات ہیں۔"اس نے ایک نائٹ ویژن گاگل اٹھا کر دکھائی۔وہ اس نے پہن لی۔"یہ رات میں دیکھنے والی عینک ہے،لیکن اس وقت یہ نارمل موڈ پر ہے۔اگر تم اس کے اوپر لگا ہوا یہ چھوٹا سا ابھار دباؤ گے تو یہ نائٹ ویژن موڈ پر آجائے گی اور اسی بٹن کو دبانے سے یہ نارمل ہو جائے گی۔ایک بات یاد رکھنا۔نائٹ ویژن موڈ پر صرف تاریکی میں استعمال کیا جائے دوسری صورت میں پنسل ٹارچ کی روشنی بھی ایسی لگے گی جیسے تم نے براہ راست دوپہر کے سورج کو دیکھ لیا ہے۔تیز روشنی بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔آدمی چند سیکنڈ میں اندھا ہو سکتا ہے۔تم اس کا تجربہ کر سکتے ہو۔"

میں نے ایک عینک اٹھا کر پہنی۔اس میں کمانی کے بجائے لچکیلا پٹا تھا جو سر پر فٹ آجاتا اور اس کے گرنے کا کوئی خدشہ نہیں رہتا چاہے آدمی قلابازیاں کھائے۔جیسے ہی



میں نے اسے نائٹ موڈ پر کیا ایسا لگا جیسے روشنی کا سیلاب آگیا ہو۔حالانکہ کمرے میں نارمل روشنی تھی۔میں نے دوبارہ بٹن دبایا تو روشنی نارمل ہو گئی۔بیتو نے بھی تجربہ کر کے دیکھا۔اس کا استعمال آسان تھا اور یہ بہت کام کی چیز تھی۔کرنل نے کہا۔"اب تاریکی میں اس کا تجربہ کرتے ہیں۔"

اس نے چٹکی بجائی تو ہال تاریک ہو گیا۔ہمیں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔لیکن جیسے ہی میں نے نائٹ ویژن موڈ آن کیا منظر ہلکی سبز روشنی میں دکھائی دینے لگا۔یہ بہت اچھی کوالٹی کا نائٹ ویژن تھا کیونکہ اس میں صرف ہیولے نظر نہیں آرہے تھے بلکہ ایک ایک چیز اپنی تفصیل کے ساتھ نمایاں تھی۔اسی حساسیت کی وجہ سے یہ روشنی بہت زیادہ دکھاتا تھا اور کرنل نے اسی چیز سے خبردار کیا تھا۔پھر اس نے ایک چھوٹا سا اسکرین والا آلہ دکھایا۔"یہ چالیس فٹ کے فاصلے تک کسی بھی زندہ اور متحرک چیز کی نشان دہی کر سکتا ہے۔چاہے درمیان میں کوئی دیوار یا رکاوٹ ہی کیوں نہ ہو۔"

اس نے تجربہ کر کے دکھایا۔کمرے سے باہر افراد اسکرین پر نقطے کی صورت میں دکھائی دینے لگے یہی نہیں ان کا فاصلہ بھی لکھا ہوا آرہا تھا۔کرنل نے کہا۔"اس کے چھ سیٹ ہیں اس لیے ہر ٹیم کو دو آلے دیے جائیں گے۔"

وہاں ایک ٹیب نما آلہ بھی رکھا ہوا تھا یہ کسی زندہ چیز کی نشان دہی کرنے والے آلے سے خاصا بڑا تھا۔میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔"یہ کیا ہے؟"

کرنل نے اسے اٹھا کر آن کیا۔"یہ ڈیجیٹل کمپاس ہے۔اس کے علاوہ یہ سمت بھی بتاتا ہے۔اس نے اس کے ٹچ اسکرین مینو پر ایک بٹن چھوا تو اس پر تھری ڈی نقشہ ابھر آیا۔یہ کنور پیلس کا مکمل نقشہ تھا۔اس میں تمام عمارتیں، ان کے اندر کے راستے اور مکانیت واضح تھی۔اسکرین پر ایک کونے میں چھوٹی سی اسکرین الگ ہو رہی تھی۔کرنل نے اس کی طرف اشارہ کیا۔"یہ بتا رہی ہے کہ تم مجموعی نقشے میں کہاں ہو۔چاہو تو اسے بڑا بھی کر سکتے ہو۔"کرنل نے دو انگلیوں سے پھیلانے کا اشارہ کیا تو یہ چھوٹا نقشہ پوری اسکرین پر محیط ہو گیا۔وہ کچھ دیر اس کے فنکشن سمجھاتا رہا۔"یہ بھی چھ ہیں اور ہر ٹیم کے پاس دو آلے ہوں گے۔"

"یہ میں لے جا رہا ہوں۔"میں نے ڈیجیٹل کمپاس اٹھا لیا۔کرنل نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور وہ دوسرے حصے کی طرف آیا۔وہ بھی سمجھتا تھا کہ ہم پہلے سے اسے استعمال کر کے بعد میں اس سے بہتر کام لے سکتے تھے۔اس نے اس حصے میں پھیلے آلات کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ حفاظتی، مواصلاتی اور خبردار کرنے والے آلات ہیں۔یہ بلٹ پروف ہے اور سب پہنیں گے۔یہ دس فٹ کے فاصلے سے چلائی جانے والی شاٹ گن کی گولی بھی روک سکتا ہے۔یہ ریڈیو ہیڈ سیٹ ہیں۔انہیں دونوں کانوں میں پہننا لازمی ہو گا۔اس کی وجہ میں ابھی بتاتا ہوں۔"کرنل نے لمبی نوز والے ائرفون دکھائے۔ان کی ساخت ایسی تھی کہ یہ کان کے سوراخ میں فٹ ہو جاتے۔باریک تار نکل کر ایک چھوٹے سے ریڈیو تک جا رہا تھا۔اسے جیکٹ پر سامنے والی جیب میں رکھا جا سکتا تھا۔اس کے سامنے والے حصے کو چھونے سے مائک کام کرتا تھا۔پھر کرنل نے ایک چھوٹی سی سیٹی دکھائی۔"اگر کسی وجہ سے ریڈیو خراب ہو جائے یا کام نہ کرے اور آس پاس کوئی دوسرا ساتھی نہ ہو تو بچھڑنے والا اسے بجا کر دوسروں کو بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔"کرنل نے ایک جدید قسم کا گیس ماسک اٹھایا۔"یہ آنسو گیس سے لے کر اعصابی اور تمام زہریلی گیسوں سے محفوظ رکھتا ہے۔حملے کے بعد اسے لازمی استعمال کرنا ہو گا۔کیونکہ ہم باہر سے گیس والے گرنیڈ بھی فائر کریں گے۔اسے پہنتے ہوئے خیال رہے کہ یہ پوری طرح منہ پر فٹ ہو اور کوئی خلا باقی نہ رہے۔"

میں کرنل کی باتوں کو ذہن نشین کر رہا تھا۔بیتو کا انداز ذرا بے پروا تھا لیکن مجھے معلوم تھا اس کی یادداشت بہت اچھی ہے اور وہ مشکل سے ہی کوئی بات بھولتا تھا۔یہ اور بات تھی کہ اس کی انگریزی معمولی سی تھی اور مجھے بعد میں اسے سب سمجھانا تھا۔اس نے اٹھا کر سیٹی بجائی تو ایک بہت باریک، کریہہ اور کانوں کو چبھنے والی آواز آئی تھی۔اس نے گھبرا کر سیٹی واپس رکھ دی۔کرنل مسکرایا۔"اگر اسے زور سے بجایا جائے تو اس کی آواز ایک میل تک صاف سنائی دیتی ہے۔"

"اگر یہ کان سے لگے ہوں تب بھی اس سیٹی کی آواز سنائی دے گی؟"میں نے ائرفون کی طرف اشارہ کیا۔

"بالکل یہ بہت ہائی پچ کی باریک آواز نکالتی ہے۔اگر تم اسے کسی گھوڑے یا کتے کے سامنے بجاؤ تو وہ بدک جائے گا۔کیونکہ ان کے لیے یہ آواز بہت زیادہ ہو گی۔میرا خیال ہے تم یاد کر رہے ہو جو میں بتا رہا ہوں۔"

میں نے سر ہلایا۔"اگر کوئی کسر رہ جائے گی تو ہم پریکٹس سے پوری کر لیں گے۔"

"کل تک میرے سارے آدمی آجائیں گے اور فل

ڈریس ریہرسل ہوگی۔"

"ہم ٹارگٹ پریکٹس بھی کرنا چاہتے ہیں۔"

"وہ بھی ہوگی.... تمام ہتھیار نئے ہیں ان کی آزمائش بھی لازمی ہوگی۔" اس نے کہا اور ہتھیاروں والے حصے کی طرف آیا۔ اس نے ایک چھوٹے دستے اور چھوٹی نال والی رائفل اٹھائی۔ "یہ دنیا کی جدید ترین اسالٹ رائفل ہے۔ اسے AK74U کہتے ہیں۔ کلاشنکوف کا ایک ورژن ہے۔ چھوٹی، ہلکے وزن کی، ایکوریٹ اور دور مار رائفل ہے۔ اس کی مار برسٹ موڈ پر ساڑھے تین سو گز اور سنگل موڈ پر پانچ سو گز ہے۔ پانچ سو گز بعد نشانے میں صرف ایک سینٹی میٹر کا فرق آتا ہے۔ اس پر یہ لیزر ٹارگیٹڈ پوڈ لگا ہے۔" کرنل نے رائفل کے اوپری حصے میں ایک ذرا ابھرے ہوئے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ "لیزر کی حد چھ سو گز ہے۔ پینتالیس گولیوں کا میگزین لگتا ہے۔ ایک منٹ میں چھ سو راؤنڈز فائر کرتی ہے۔"

میں نے رائفل اٹھا کر دیکھی۔ رائفل کی لمبائی مشکل سے ڈھائی فٹ تھی۔ اس کا دستہ اور نال سے نیچے ہاتھ سے پکڑنے والا حصہ جدید قسم کے فائبر سے بنا ہوا تھا۔ یہ وزن میں ہلکا تھا اوپر لگا ہوا لیزر پوڈ بہت مختصر اور رائفل میں جڑا ہوا تھا۔ یقیناً یہ استعمال میں آسان تھی۔ باقی خصوصیات کرنل نے بتا دی تھیں۔ اس نے مزید کہا۔ "ہم افغانستان میں ایم سولہ رائفل استعمال کرتے تھے لیکن یہ اس کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔ جام نہیں ہوتی ہے اور نہ اس کی نال بہت جلد گرم ہوتی ہے۔"

میں نے اس کا میگزین نکالا پھر اس کا بولٹ کھسکایا۔ اس کا دستہ مختصر تھا اس لیے فکس تھا۔ "تمام افراد کے پاس یہی ہوگی؟"

"نہیں ہمارے چھ افراد بھاری مشین گنیں اٹھائیں گے۔" کرنل نے ایک بھاری مشین گن کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ امریکی ساختہ اٹریز شرائنگ گن ہے۔ ڈبل ایکشن بلٹ پمپ کی وجہ سے یہ بے انتہا فائر پاور رکھتی ہے۔"

یہ گن عام حصے سے الگ رکھی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ رائفل کا وزن تو بہت زیادہ نہیں تھا مگر اس کے ساتھ گولیوں کا بڑا سا پوڈ لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ مجموعی وزن چھ سات کلوگرام ہو رہا تھا۔ یقیناً اسے بہت طاقتور افراد ہی چلا سکتے تھے۔ کرنل نے اشارہ کیا۔ "اس میں پونے دو سو بلٹ ہوتے ہیں۔"

چھوٹے ہتھیاروں میں بریٹا تھے۔ یہ سروس پسٹل تھے جو عام طور سے آرمی افسران کو دیے جاتے ہیں۔ ان میں سولہ گولیوں کا میگزین لگتا تھا اور میں پہلے بھی اسے استعمال کر چکا تھا۔ اس کی مار زیادہ اور نشانہ اچھا ہوتا ہے۔ بھاری مشین گن کے ساتھ ایک چھوٹی اور موٹی نال والی گن رکھی تھی۔ اس کے پیچھے ریوالور جیسا بڑا سا گھومنے والا چیمبر تھا۔ اس کے اوپر بڑی اور خاصی جدید قسم کی دوربین فٹ تھی۔ کرنل نے اس کے بارے میں بتایا۔ "یہ امریکی ساختہ ایم بتیس گرنیڈ لانچر ہے۔ دھماکا خیز اور دھوئیں کے گرنیڈ فائر کرسکتا ہے۔ اس کی مار ایک ہزار گز ہے۔ یہ دو کلوگرام وزنی ہیٹ یا اسموک گرنیڈ فائر کرسکتا ہے۔ ایک وقت میں چھ راؤنڈ ہوتے ہیں جو دس سیکنڈ میں فائر کیے جاسکتے ہیں اور اسے ایک منٹ میں دوبارہ لوڈ کیا جاسکتا ہے۔ راستہ صاف کرنے کے لیے بے مثال چیز ہے۔ یہ بیس ملی میٹر موٹی فولادی چادر کو اُڑا سکتا ہے۔"

"اسے بھی ماہر استعمال کرے گا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل اس کے بھی ماہر ہیں ہمارے پاس۔ ماہروں کی تعداد تین ہے اس لیے تین ہی لانچر لے جاسکتے ہیں۔" کرنل نے سر ہلایا۔ "تم نے آٹومیٹک اسنائپر گن کے بارے میں جو تجویز دی تھی وہ قابلِ عمل نہیں ہے۔ اس میں کوئی بھی بھاری مشین گن نصب کی جاسکتی ہے لیکن اسے اے پی سی پر نصب کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اسے ریموٹ کنٹرول کیا جاسکتا ہے ہاں اسے آن آف کیا جاسکتا ہے۔"

باقی ہتھیاروں میں ہاتھ سے پھینکنے والے گرنیڈ، دھوئیں کے بم، چھوٹے فکس ہونے والے ٹائم بم، ان پر دس سیکنڈ کا وقت مقرر ہوتا تھا۔ یہ کسی بھی سطح پر چپک سکتے تھے۔ ان پر تین بٹن لگے تھے جنہیں باری باری دبانے سے یہ ایکٹو ہو جاتے۔ ان کے ساتھ ایک باڈی اسپرے سائز اور شکل کی چیز رکھی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"واکس بم۔" کرنل نے کہا اور اٹھا کر دکھایا۔ "اس کا یہ کلپ کھینچ کر پھینک دو تو دس سیکنڈ بعد یہ ایسی آواز خارج کرتا ہے جو تیس میٹر کے دائرے میں کسی بھی شخص کا دماغ ماؤف کرنے کے لیے کافی ہے۔ تم لوگوں کے کانوں میں لگنے والے ائیر فون تمہیں اس بم کی آواز سے محفوظ رکھیں گے اس لیے ائیر فون لازمی پوری طرح لگے ہوں۔"

"واقعی کام کی چیز ہے کیونکہ اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں جائے گا اور اس سے حفاظت کا خیال بھی کم ہی آئے گا۔"

"کیا کہہ سکتے ہیں، دشمن بھی ہماری طرح کا انسان ہوتا ہے جو ہم سوچ سکتے ہیں وہی وہ بھی سوچ سکتا ہے۔" کرنل نے شانے اچکائے اور آگے بڑھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ مکمل لباس مع جوتوں اور دستانوں کے آویزاں کیا گیا تھا۔ یہ آرمی کمانڈوز اسٹائل کا لباس تھا۔ کرنل نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ "تم نے کنور پیلس کے گارڈز دیکھے ہیں یہ ان کی وردی سے کس حد تک مختلف ہے؟"

"بالکل مختلف ہے لیکن تاریکی میں اپنے پرائے کی پہچان کیسے ہوگی؟"

"یہ دیکھو۔" اس نے جیکٹ کے دونوں شانوں پر ابھرے ہوئے سیاہ دھات کے بنے دو ڈسکوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہیٹ سنکر ہیں، جسم سے حرارت لے کر چھوڑیں گے۔ نائٹ ویژن سے یہ واضح نظر آئیں گے۔ دور بیٹھے اسنائپرز کو بھی۔ جن کے شانے پر یہ ہوں گے وہ اپنے ہوں گے اور باقی پرائے ہوں گے۔"

یہ اچھی ترکیب تھی اس سے اپنے پرائے کی شناخت بہت آسان ہوگئی تھی۔ خاص ہتھیاروں میں ایک بڑی رائفل اسٹینڈ پر کھڑی تھی۔ دیکھنے میں ہی یہ دور مار ہتھیار لگ رہا تھا۔ کرنل نے میری دل چسپی بھانپ لی۔ اس نے رائفل پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ "یہ بارہ اعشاریہ سات کیلی بار کی برٹش ساختہ اے ایس ففٹی اسنائپر رائفل ہے۔ مار اور درستگی میں دنیا کے کم ہتھیار اس کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ اس کی حد اٹھارہ سو میٹرز ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارے اسنائپرز کو زیادہ بلند اور زیادہ محفوظ مقامات پر ہونا چاہیے کیونکہ ہماری کامیابی کا بہت زیادہ انحصار ان پر ہوگا۔ کنور پیلس میں بھی اسنائپرز کی موجودگی عین ممکن ہے اور وہ ہمارے اسنائپرز کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ اس لیے اب ہمارے اسنائپرز بارہ سو سے پندرہ سو میٹرز کی دوری پر ہوں گے۔"

"یہ اچھا فیصلہ ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔

تمام ہتھیاروں کے ساتھ ان کا ایمونیشن بھی موجود تھا۔ سب سے آخر میں کرنل نے ایک لمبے پائپ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ جدید ترین روسی ساختہ مین فائر گائیڈڈ میزائل ہے۔ یہ تین کلومیٹرز کی حد میں کسی ٹینک، گاڑی یا چھوٹی عمارت کو تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

"اس کی تباہ کاری کا دائرہ کار کتنا ہے؟"

"تقریباً بیس میٹرز کے دائرے میں ایک فٹ تک موٹی کوئی بھی کنکریٹ یا تیس ایم ایم کی دھاتی چادر محفوظ نہیں رہے گی۔"

"تب اسے بہت احتیاط سے استعمال کرنا ہوگا۔" میں نے فکرمندی سے کہا۔ "اپنے آدمیوں سے کہنا کہ اسے یقینی طور پر صرف راستے تباہ کرنے کے لیے استعمال کریں عمارت کے اسٹرکچر کو نقصان نہ ہو۔"

"تم بے فکر رہو اسے استعمال کرنے والے افراد ماہر ہیں اور پھر اس کا سسٹم اتنا جدید ہے کہ اگر کسی جگہ پین سے نصف انچ کا دائرہ بنا دیا جائے تو تین کلومیٹر دور بیٹھا آپریٹر ٹھیک اس دائرے پر میزائل مار سکتا ہے۔"

یہ بریفنگ تقریباً دو گھنٹے جاری رہی تھی۔ بیٹو کو انگریزی کی زیادہ سمجھ نہیں تھی اس لیے وہ عملی طور پر ہتھیار دیکھ رہا تھا اور ہاتھوں میں لے کر سمجھ رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ بھوک اس کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اس لیے میں نے واپسی کا فیصلہ کیا اور جانے سے پہلے کرنل سے کہا۔ "آج شام تاریکی کے بعد ہم ٹارگٹ پریکٹس کرنا چاہتے ہیں۔"

"کھلے میں تو ممکن نہیں ہے لیکن یہاں ایک زیرِ زمین پریکٹس ہال ہے۔"

"کوئی بات نہیں ہم روشنیاں کم کر کے پریکٹس کریں گے۔" میں نے کہا۔ "ہاں یاد آیا تم نے منشی دل جی سے یقیناً کنور پیلس کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لی ہوں۔"

اس نے سر ہلایا۔ "تقریباً تمام اہم معلومات حاصل کر لی ہیں۔"

"پاور سپلائی کے بارے میں کیا معلوم کیا ہے؟"

"کنور پیلس کو مرکزی گرڈ سے لائن دی ہوئی ہے۔ اس کا گرڈ اسٹیشن تک اپنا ہے۔ پہلے مرحلے میں لائن اُڑا دی جائے گی۔ دوسرے مرحلے میں ہم جنریٹر تباہ کریں گے وہ گرڈ اسٹیشن کے ساتھ ہے۔ اس کے باوجود ہر عمارت کے لیے یو پی ایس پاور بیک اپ ہے۔ مکمل طور پر بند کرنا ممکن نہیں ہے۔"

"بالکل ممکن ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "اس کی ایک آسان سی ترکیب ہے۔ ہر عمارت میں گھسنے والے سب سے پہلے کسی بھی ساکٹ میں تار ڈال کر اسے اُڑا دیں۔"

''تم نے اچھی تجویز دی ہے۔'' وہ بولا۔ ''یہ آسان سا کام ہے اور جب تک ساکٹ میں وائر رہے گی فیوز اُڑتا رہے گا۔''

میں اور بیتو میٹنگ روم سے نکل رہے تھے کہ کرنل جیمز نے آواز دی۔ ''شہباز ملک..... مجھے اس عورت کی تصویر چاہیے جسے ہم نکالنے جارہے ہیں، میرے ہر آدمی کو اس کی صورت سے واقفیت ہونی چاہیے تاکہ کسی قسم کی کوئی غلطی نہ ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہونا؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''تصویر مل جائے گی..... تم اسے پرنٹ کروالینا۔''

''یہ کام ہوجائے گا۔''

میں اور بیتو واپس آئے اور لنچ کا آرڈر دیا۔ میں نے کم کھایا تھا اور جلد اٹھ گیا۔ اسکائپ آن کرکے رابطہ کیا۔ سفیر آن لائن تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''سادی کے چہرے کی واضح تصویر بھیج دو۔''

''کیسے؟'' سفیر نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے اسکائپ سے بھی ٹرانسفر ہوجاتی ہے لیکن پہلے تصویر تو دیکھو۔ اگر نہیں ہے تو وسیم سے معلوم کرو۔''

''دس منٹ بعد کال کرتا۔'' سفیر نے کہا۔

میں نے ساریہ سے اپنے لیے کافی منگوائی اور دس منٹ بعد کال کی۔ سفیر نے کہا۔ ''تصویر ہے وسیم کے پاس..... وہ مانی سے اسکین کرارہا ہے۔''

''عبداللہ کہاں ہے؟''

''وہ حویلی گیا ہوا ہے۔ وسیم کے آدمی آنا شروع ہوگئے ہیں۔'' سفیر نے مطلع کیا اسی اثنا میں وسیم یو ایس بی لے آیا اور اس نے لگا کر اسکائپ سے فائل ٹرانسفر کی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ سادی کی بہت واضح تصویر تھی۔ وہ حویلی کے پس منظر میں کھڑی تھی اور اس کے بال ہوا کے ساتھ اُڑ رہے تھے۔ چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ تصویر لینے والا وسیم تھا۔ میں نے اسے محفوظ کرلیا اور پھر ان لوگوں کو آج کی میٹنگ کا مختصر احوال سنا کر اسکائپ بند کردیا۔ بیتو لنچ سے فارغ ہوگیا تھا۔ اس نے مجھے آگاہ کیا۔ ''شوبی آج سے ہمارا دوا ختم ہوگیا ہے اور ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ زخم ٹھیک ہے۔ آج ہم نہائے گا۔''

''ٹھیک ہے لیکن ہاتھ پر اتنا زور مت دینا کہ زخم متاثر ہو۔ ایک ہفتہ پورا ہوگیا ہے لیکن گولی کا زخم اتنی جلدی نہیں بھرتا ہے۔''

''ہم نے ہر طرح سے ہاتھ ہلا کر اور استعمال کرکے دیکھ لیا ہے ہم کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہورہا ہے۔''

''آج ٹارگٹ پریکٹس کے بعد پھر ڈاکٹر کو دکھالینا۔'' میں نے کہا اور کرنل سے رابطہ کیا۔ ''تصویر آگئی ہے۔''

''بلوٹوتھ پر سی جے نام کا آئی فون سرچ کرکے اس پر بھیج دو۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور یہیں بیٹھے بیٹھے سادی کی تصویر کرنل کے پاس پہنچ گئی اس نے مطلع کیا۔ ''مل گئی ہے۔''

''مجھے فتح خان سے بات کرنی ہے۔''

''تین نمبر دباؤ اس پر کھان ملے گا۔''

میں نے تین نمبر دبایا تو فتح خان کی مخمور آواز آئی۔ ''شہباز خانا..... اس وقت کیسے یاد کیا؟''

''تو پھر کس وقت یاد کروں..... ویسے سہ پہر کے تین بج رہے ہیں۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''فوراً؟'' اس نے ہچکچا کر پوچھا۔

''اگر تم مصروف ہو تو کچھ دیر بعد بھی مل سکتے ہو۔''

''بہت مصروف ہے..... آہ.....'' فتح خان نے کہتے ہوئے آہ بھری اور عقب سے آتی نسوانی ہنسی نے راز فاش کیا کہ مصروفیت کی نوعیت کیا تھی۔ میں نے وا کی ٹا کی بند کردیا۔ بیتو نے کہا۔

''شوبی ہمارا ہاتھ میں خارش ہورہا ہے اس کا مطلب ہے مار دھاڑ ہوگا اور ہم اس میں حصہ لے گا۔''

''ظاہر ہے نہ ہم کنور پیلس پر پھول برسانے جارہے ہیں اور نہ وہ ہار پھول لے کر ہمارا استقبال کریں گے۔''

''شوبی ہم کو دیدی کا فکر ہے۔''

''مجھے بھی اس کی فکر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ کنور پیلس کی مرکزی عمارت میں ہے۔''

''حملے سے پہلے تصدیق کرے گا کہ وہ وہاں ہے یا کہیں اور تو نہیں بھیج دیا ہے۔''

یہ تصدیق سفیر کرسکتا تھا۔ سادی نے بتایا تھا کہ وہ پیلس میں اپنے کمرے میں تھی اور وہاں اسے فون کی سہولت دی گئی تھی۔ اس سے براہِ راست رابطہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ہم نہ تو اسے کوئی اشارہ دے سکتے تھے اور نہ کہہ سکتے تھے کہ وہ کسی ناگہانی صورتِ حال میں اپنے کمرے میں رہے۔ اسے تو خبر بھی نہیں تھی کہ اسے چھڑانے کے لیے ہم ہالی ووڈ کی موویز جیسا ایکشن کرنے جارہے تھے۔ اس میں مار



دھاڑ ہوتی اور نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کون بچتا اور کون مارا جاتا۔ اگر سادی کو پتا چل جاتا تو وہ یقیناً مخالفت کرتی کیونکہ وہ اپنے لیے کسی کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہ تو میرے بارے میں کہہ رہی تھی کہ یہاں خطرہ تھا اور میں واپس پاکستان چلا جاؤں۔ مگر میں اس کی یہ بات نہیں مان سکتا تھا۔ ایک گھنٹے بعد فتح خان آیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی جو یقیناً ناوقت شراب وشباب سے شغل کا فطری نتیجہ تھا اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے بد مزگی سے کہا۔ ''شہباز خانا تم نے غلط وقت پر کال کیا..... میرا سارا مزہ خراب ہوگیا۔''

''کوئی بات نہیں یہاں یقیناً تم پر مزے کرنے کی کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ بعد میں تم مزے کو وہیں سے شروع کرسکتے ہو جہاں چھوڑا ہوگا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''تم نے اپنے آدمیوں سے بات کی؟''

''ہاں میں نے ان کو بتادیا ہے وہ تیاری کررہا ہے۔ کرنل کا آدمی ان کا تربیت کررہا ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے، اس کا مطلب ہے تمہارے آدمی ہی میرے ساتھ ہوں گے؟''

''تم نے فرمائش کیا تو وہ پورا ہوگا نا..... میں نے بتایا تھا شا تمہارے لیے سب کرے گا۔''

''تم نے کہا تھا اس بار تم دل سے ساتھ نہیں ہو اس کی وجہ؟''

''ہم اس خنزیر کا بچہ کرنل زریسکی کے پیچھے تھا۔ اِدھر شاصیب کا حکم آگیا کہ انڈیا آؤ..... ہم اس کے پاس پہنچ گیا تھا پر کیا کرتا..... اسے چھوڑ کر اِدھر آنا پڑا۔''

اب میری سمجھ میں آیا کہ فتح خان بیزار کیوں تھا۔ اس کی کرنل زریسکی سے ٹھن گئی تھی۔ میں نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ ''صرف یہی وجہ ہے یا کوئی بات اور بھی ہے؟''

''اور کیا بات ہوسکتا ہے؟''

''اس بار تم ڈیوڈ شا کے بعد دو نمبر نہیں ہو..... کرنل جیمز دو نمبر ہے۔''

اس کے چہرے پر ایک لمحے کو تلخی آئی لیکن پھر اس نے بے پروائی سے شانے ہلائے۔ ''ہم کو اس کا پروا نہیں ہے..... شاصیب باس ہے وہ جسے چاہے دو نمبر بنائے اور جسے چاہے دس نمبر بنادے۔'' کہتے ہوئے فتح خان کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آگئی تھی۔

''اس مہم کے بعد تم واپس چلے جاؤ گے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی مجھے یہاں رکنا ہے جب تک شاصیب جانے کا اجازت نہ دے۔''

میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا فتح خان کو ہمالیہ والی مہم میں بھی شامل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ کرنل جیمز اور اس کے آدمی بھی شامل ہوں۔ میں نے کہا۔ ''امید ہے نکشی دل جی کے بارے میں جو طے ہوا تھا اس پر عمل کیا جارہا ہوگا۔''

''تم اس کا فکر مت کرو۔ اب اس کا شاصیب سے رابطہ بھی نہیں ہے۔ وہ کرنل کے پاس ہے اور ابھی اسے اِدھر اُدھر جانے کا اجازت بھی نہیں ہے۔''

''وہ بہت شاطر آدمی ہے اس نے بیک وقت دونوں کنوروں کو بے وقوف بنایا اور دونوں اسے اپنا آدمی سمجھتے رہے جب کہ وہ صرف اپنے لیے کام کررہا تھا۔ پھر پول کھلنے پر وہ ان کے ہاتھ نہیں آیا کامیابی سے وہاں سے فرار ہوگیا۔''

''چالاک سے چالاک آدمی بھی جب حالات کے شکنجے میں آتا ہے تو کچھ نہیں کرسکتا۔ پھر اسے معلوم ہے ڈیوڈ شا کو دھوکا دینے کی صورت میں اس کے ساتھ کیا ہوسکتا ہے۔'' فتح خان نے سر ہلایا۔ ''یہ بتاؤ تم کو کسی چیز کا ضرورت تو نہیں ہے۔''

''ابھی تک تو ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑی ہے جس کے لیے خاص طور سے تمہیں کہنا پڑے۔'' میں نے کہا۔

''اِدھر بہت اچھا جم اور سوئمنگ پول بھی ہے اگر استعمال کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔''

یہ اچھی خبر تھی۔ ''کہاں ہے؟''

''میرے ساتھ آؤ۔'' فتح خان بولا۔ جم اور پول والی عمارت اس عمارت کے عقب میں تھی اور اسی لیے مخصوص تھی۔ سوئمنگ پول بڑا نہیں تھا مگر تیراکی کے لیے کافی تھا۔ موسم کی مناسبت سے اس میں گرم پانی تھا۔ جم میں تمام آلات اور مشینیں تھیں۔ یہاں تیراکی کے لیے زنانہ اور مردانہ دونوں طرح کے ملبوسات دستیاب تھے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک گھنٹے تک سوئمنگ کرکے میں واپس آیا تو خود کو تازہ دم محسوس کررہا تھا۔ اس دوران میں بیتو بھی نہا دھو کر تازہ دم ہوگیا تھا۔ خاصے دن بعد اسے کھل ہاتھ کا موقع ملا تھا اس لیے خوش تھا۔

''شوبی ہمارا وزن ایک کلو کم ہوا ہے؟''

”وہ کیسے؟“

”اتنا میل اترا ہے۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”حالانکہ تم اس حالت میں بھی نہاتے دھوتے رہے ہو زخم بچا کر۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”تیار ہو جاؤ کچھ دیر میں تاریکی ہو جائے گی تو ہمیں جانا ہوگا۔“

”شوبی پہلے چائے نہ پی لے۔“

”پی لو۔“ میں نے کہا تو اس نے ساریہ کو بلایا۔ چائے تو ایسے ہی تھی اصل میں اس نے ریفریشمنٹ کا آرڈر دیا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ اس عمر میں ہمہ وقت تو کھانے کے چکر میں نہیں ہوتا تھا لیکن کچھ بھی اور کتنا بھی کھالیتا سب ہضم ہو جاتا تھا۔ چند گھنٹے بعد پھر سے کھانے کو تیار ہوتا تھا۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے اور بیتو کو شوق بھی تھا۔ مانی اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ بیتو کی صحت پھر بھی اچھی تھی مانی نازک اندام نوجوان تھا۔ اسے دیکھ کر بالکل نہیں پتا چلتا تھا کہ وہ اتنا کھاتا ہوگا۔ چائے اور دوسرے لوازمات سے نمٹتے ہوئے باہر تاریکی چھا گئی تھی۔ اس سے پہلے میں کرنل کو کال کرتا اس کی کال آگئی۔ ”شہباز میں باہر تمہارا منتظر ہوں۔“

”ہم آتے ہیں۔“ میں نے کہا اور بیتو کو اشارہ کیا تو وہ بادلِ ناخواستہ کچوری کی پلیٹ چھوڑ کر اٹھا تھا۔ ٹارگٹ پریکٹس کے لیے رینج اس عمارت کے نیچے تہ خانے میں تھی جہاں ڈیوڈ شا ہوتا تھا۔ تہ خانہ تقریباً پوری عمارت کے برابر تھا۔ یہاں شوٹنگ کے مکمل انتظامات تھے۔ مختلف طرح کے ٹارگٹس تھے اور ان میں حرکت کرنے والے ٹارگٹس بھی تھے۔ ہتھیاروں کی مکمل رینج تھی۔ کیونکہ جگہ بند تھی اس لیے آواز بہت زیادہ گونجتی اور اس گونج سے کانوں کو بچانے کے لیے ہیڈ فون جیسے آلے تھے جو کانوں کو مکمل طور پر ڈھک لیتے تھے۔ ان سے کانوں کو شور برداشت کرنے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ یہاں وہ دونوں ہتھیار تھے جو ہمیں ملتے یعنی رائفل اور پستول۔ اس کے علاوہ ہینڈ گرنیڈز، اسموک بم اور وائس بم ملتے مگر ان کی پریکٹس نہیں کی جا سکتی تھی۔ میرا نشانہ پستول سے اچھا تھا اور رائفل سے اتنا اچھا نہیں تھا اس لیے میں نے پستول منتخب کیا۔ بیتو نے رائفل منتخب کی۔ کرنل نے کہا۔

”برسٹ تین سیکنڈ سے زیادہ کا نہ ہو ورنہ رائفل کے جام ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے جب برسٹ مارو تو ذہن میں گنتی بھی گنو۔“

میں نے بیتو کو سمجھایا تو اس نے سر ہلایا۔ ”ہم وسیم بھائی سے سب سیکھ چکا ہے اس کو بولو اپنا منہ بند رکھے۔“

”یہ مشن کمانڈر ہے۔“ میں نے یاد دلایا۔

”ہوگا۔“ بیتو نے بے نیازی سے کہا اور رائفل کو سنگل موڈ پر کر کے اس نے ایک ٹارگٹ پر لگاتار فائر کیے۔ کرنل کے ساتھ میں بھی حیران رہ گیا جب تمام گولیاں ٹارگٹ کے سر اور سینے پر لگیں۔ کرنل نے بے ساختہ کہا۔

”ایکسی لنٹ ینگ مین۔“

بیتو نے مختلف انداز میں فائرنگ کی مشق کی۔ گھوم کر، زمین پر قلابازی کھا کر اور زمین پر گر کر..... یہ تمام دشمنوں سے مقابلے کے دوران پیش آنے والی صورتِ حال کے مطابق حرکات تھیں ..... بہت تیز حرکت اور اس دوران میں درست نشانہ ہی آپ کو بچاتا ہے۔ سستی یا غلط نشانے دونوں کی سزا عام طور سے موت کی صورت میں ملتی ہے۔ بیتو کے بیشتر نشانے درست لگے تھے۔ پھر اس نے پستول سے نشانے بازی کا مظاہرہ کیا۔ اس بار بھی اس کے نوے فیصد نشانے درست لگے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس نے اتنا کچھ سیکھ لیا۔ کرنل نے میری طرف دیکھا۔ ”اسے کچھ سکھانے کی ضرورت نہیں ہے یہ تمام ٹیکٹز جانتا ہے۔“

”یہ سب تو مجھے بھی نہیں آتا ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”لڑکا بہت شارپ شوٹر ہے۔“ کرنل نے کہا۔

بیتو بہت تیزی سے گر اور اٹھ رہا تھا۔ مجھے خدشہ ہونے لگا کہ اس کے زخم کو ٹھیس نہ لگے۔ مگر میں نے اسے ٹوکا نہیں۔ ہم تقریباً دو گھنٹے تک اپنے ہتھیار اور نشانے آزماتے رہے تھے۔ میں نے زندگی میں کبھی اتنی گولیاں مشق کے دوران نہیں چلائی تھیں جتنی اس دن چلائی تھیں۔ مجموعی طور پر دو سو سے زائد فائر کیے تھے۔ کرنل کچھ دیر ہمارے ساتھ رہا تھا پھر وہ چلا گیا۔ اس کے کچھ آدمی آگئے تھے اور اس نے انہیں بریف کرنا تھا۔ باقی کل صبح پہنچ جاتے۔ کرنل کے جانے کے بعد بیتو نے کہا۔ ”شوبی اس گورے کا انداز ایسا ہے جیسے ہم کو کچھ نہیں آتا ہے۔“

”اب نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے تو مجھے حیران کر دیا ہے، تمہارا نشانہ اتنا اچھا ہے اور تم تو باقاعدہ کمانڈو اسٹائل میں گن استعمال کر رہے ہو۔“

”سب وسیم بھائی نے سکھایا ہے پھر ہم کو بہت سارا گن چلانا سکھایا جو نہیں تھا وہ انٹرنیٹ سے نکال کر اور اس کا ویڈیو کی مدد سے بتایا کہ یہ کیسے چلتا ہے۔ ادھر میز پر جو ہتھیار



رکھا تھا وہ سب ہم کو چلانا آتا ہے۔ بس میزائل چلانا نہیں آتا۔“

”وہ بھی مشکل نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

دو گھنٹے کی مشق نے میرا نشانہ بہت بہتر کر دیا تھا۔ بیتو نے بھی اچھی خاصی مشق کر لی تھی۔ ہم باہر نکلے تو تہ خانے کے دروازے پر ایک خادمہ موجود تھی۔ بہ ظاہر وہ ہماری خدمت گزاری کے لیے تھی لیکن اصل میں اسے اس لیے تعینات کیا گیا تھا کہ ہم اس عمارت میں مٹرگشت کی کوشش نہ کریں اور مشق کر کے یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ ہم اس کے ساتھ دروازے تک آئے اور باہر نکلے تھے کہ منشی دل جی سے سامنا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کا منہ بگڑ گیا تھا۔ کیونکہ اب وہ کنوروں کی منشی گیری نہیں کر رہا تھا اس لیے اسے ظاہری اخلاق برتنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے افسوس سے کہا۔ ”تم اصل میں منشی گیری کے قابل ہو۔ بالکل بنیا ذہنیت ہے تمہاری..... راجپوت کہیں سے نہیں لگتے۔“

”شہباز جی آپ کچھ زیادہ ہی بول رہے ہیں۔“ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”آپ جانتے ہیں میں شروع سے زیادہ بولنے کا عادی ہوں۔ آیئے ذرا چہل قدمی ہو جائے۔“

ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے وہ انکار کر دے گا۔ مگر پھر اس نے سر ہلایا اور ہمارے ساتھ ہو لیا۔ بیتو نے محسوس کیا کہ اس کی موجودگی ضروری نہیں تھی اس لیے وہ اجازت لے کر چلا گیا۔ میں اور منشی دل جی لان کی پختہ روش پر ٹہل رہے تھے جس کے دونوں طرف موت تھی۔ صرف ایک قدم رکھنے کی دیر ہوتی اندھی گولی آ کر کام تمام کر دیتی۔ بیتو کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ”منشی جی..... میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ آپ کے ارادے کیا ہیں اور ڈیوڈ شا تک آپ کی رسائی کیسے ہوئی؟ البتہ یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کنوروں کی جاگیر پر قبضے کے سلسلے میں اتنے پُر امید کیوں ہیں؟“

میرے سوال پر وہ چونکا اور پھر اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ان دونوں بھائیوں کے بعد میں ہی واحد مرد بچتا ہوں۔ ظاہر ہے میں ہی جاگیر کا مالک ہوں گا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر کنوروں کی دونوں بہنوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی راج کنور کی اولاد ہے۔ بے شک وہ ابھی بچے ہیں لیکن ان کا حق بنتا ہے تم کس کھاتے میں آتے ہو یہ میں سمجھ نہیں پا رہا۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو مہاشے جی.....“

”مجھے فضول اور مکارانہ ناموں سے پکارنے کے بجائے میرا نام لو۔“ میں نے اسے ٹوک دیا۔

”ٹھیک ہے شہباز جی..... تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”منشی جی یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی ہے کہ کئی قریبی اور قانونی وارثوں کے ہوتے ہوئے بھی تم جاگیر پر کیسے قبضہ کر لو گے۔ کم سے کم قانونی لحاظ سے یہ ممکن نظر نہیں آتا ہے۔ جب کہ تم نے ڈیوڈ شا سے کہا ہے کہ تم جاگیر پر قبضے کے بدلے اس کی مدد کر رہے ہو۔ مجھے تو لگ رہا ہے تم اسے بھی دھوکا دے رہے ہو۔“

منشی دل جی کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی تھی۔

”تمہیں کیا دلچسپی ہے اس سے؟“

”جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے تم کسی اور چکر میں ہو۔“

”اگر میں کسی اور چکر میں ہوں تو تمہیں کیا؟“

”منشی جی اگر میرے کسی کام میں رخنہ پڑا تو تمہارا نام بھی میرے دشمنوں میں شامل ہو جائے گا اور دشمن مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے میری کوشش ہے کہ کوئی میرا دشمن باقی نہ رہے یا تو وہ انسان کا بچہ بن جائے یا پھر اس دنیا میں نہ رہے، میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”فکر مت کرو، میں تمہارے کام میں ٹانگ نہیں اڑاؤں گا۔“ اس نے کہا اور پلٹ کر اس عمارت کی طرف چلا گیا۔ میں فکر مند ہو گیا کیونکہ فتح خان نے مجھے یقین دلایا تھا کہ منشی جی اب کرنل کی تحویل میں ہے اور وہ اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ لیکن وہ آزادی سے گھوم رہا تھا اور اس عمارت میں جا رہا تھا جس میں ڈیوڈ شا مقیم تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ منشی دل جی صرف ایک آلۂ کار کے طور پر ان لوگوں کے ساتھ شامل نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا کچھ اور مقصد بھی تھا۔ آج کے دور میں وارثوں کے ہوتے ہوئے کسی کی دولت اور جائداد پر قابض ہو جانا آسان کام نہیں تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ہضم نہیں تھی کہ منشی صرف کنوروں سے انتقام لینے کے لیے ڈیوڈ شا سے ملا تھا جب کہ ڈیوڈ شا میرے ساتھ کمٹ منٹ کر چکا تھا کہ دونوں کنوروں پر میرا اختیار ہوگا۔ ہو سکتا تھا میں ان کے ساتھ کچھ رعایت کر دیتا لیکن منشی انہیں ایک لمحہ زندہ رہنے کی اجازت نہ دیتا۔ میں واپس آیا تو بیتو کسی سوچ میں گم تھا۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

”کیا سوچ رہے ہو برخوردار؟“

اس نے میری طرف دیکھا۔ ''شوبی ..... یہ منشی کنوروں کا دشمن ہے؟''

''ایسا ویسا اس کا بس چلتا تو انہیں اب تک جہنم رسید کر چکا ہوتا۔''

''تب آپ خود کیوں مانگ رہا ہے اس پر چھوڑ دو؟''

میں بیتو کا مطلب سمجھ گیا، وہ کہہ رہا تھا کہ میں کنوروں کو مانگنے کے بجائے ان کی قسمت کا فیصلہ منشی اور ڈیوڈ شا پر چھوڑ دوں۔ لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ایسا کر کے میں غلطی کروں گا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ منشی جی خالص انتقام یا جاگیر پر قبضے کے لیے ڈیوڈ شا کے ساتھ ہے تو شاید میں اس چیز سے دست بردار ہو کر کنوروں کا انجام ان لوگوں پر چھوڑ دیتا۔ مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ اس کی یہی نیت ہے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اصل چکر کچھ اور ہے۔ یہ بات میں یہاں کھل کر نہیں کہہ سکتا تھا اس لیے میں نے بیتو سے کہا۔ ''وہ ہمارے مجرم ہیں اس لیے ان کی قسمت کا فیصلہ بھی ہم کریں گے۔''

''شوبی کیا منشی ہمارے ساتھ جائے گا؟''

اگرچہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ منشی دل جی ہمارے ساتھ جائے گا یا نہیں، مگر میں نے اپنے طور پر سوچ لیا تھا کہ منشی نہیں جائے گا اس کا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ اس کی طرف سے مہیا کیے جانے والے آدمی باہر رہ کر مدد کرتے۔ میں ان میں سے کسی کو پہلے ہی لے جانے سے انکار کر چکا تھا۔ مجھے اس بارے میں مکمل معلومات حاصل نہیں تھیں۔ میں نے کرنل سے رابطہ کیا۔ ''منشی دل جی اور اس کے آدمی اس مشن کے دوران کہاں ہوں گے؟''

''آف کورس..... آؤٹ سائیڈ پیلس۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا اس کی موجودگی ضروری ہے؟''

''ہاں اپنے آدمیوں کو وہی کنٹرول کرے گا۔''

''کیا مطلب وہ تمہاری کمانڈ میں نہیں ہوں گے؟''

''منشی میری کمانڈ میں ہوگا اس لیے وہ بھی میری کمانڈ میں ہوں گے۔ میرا حکم منشی کے توسط سے پہنچے گا۔ یہاں زبان کا مسئلہ ہے۔''

''اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟''

''دو درجن آدمی ہیں۔ وہ پورا علاقہ بند کر دیں گے۔ اگر اس دوران میں کوئی پولیس پارٹی آ گئی تو وہی اس سے نمٹیں گے۔'' کرنل نے کہا پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ ''مسٹر ملک میرا ایک مشورہ ہے..... یہاں نیٹ کا استعمال کم سے کم کرو۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟

''ہاں اور میں پہلے ہی اس پر عمل کر رہا ہوں۔''

''شملہ ایک حساس جگہ ہے اور پاکستان کے لیے نیٹ ٹریفکنگ مقامی حکام کو چوکنا کر سکتی ہے۔''

کرنل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ شروع میں میں بہت محتاط تھا۔ مگر ہم پاکستانیوں کی عادت ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم ریلیکس ہو جاتے ہیں اور بے پروا ہو جاتے ہیں۔ میں بھی بے پروائی کر رہا تھا جب کہ مجھے زیادہ محتاط رہنا چاہیے تھا۔ دشمن کو کمزور سمجھنے والا ہمیشہ احمق ہوتا ہے۔ میں نے کرنل سے کہا۔ ''اگر یہاں کوئی غیر متوقع صورتِ حال پیش آتی ہے تو تمہارے پاس کوئی حفاظتی میکنزم ہے؟''

''کیسی صورتِ حال؟''

''مقامی حکام چڑھ دوڑتے ہیں اس صورت میں ہم کیا کریں گے؟''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ ایسی کسی صورت میں ہمیں پہلے سے پتا چل جائے گا اور ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔''

''ایک مشورہ میرا بھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''واکی ٹاکی کا استعمال کم سے کم کرو..... بے شک یہ بہت جدید ہوں گے اور ان کی فریکوئنسی پکڑنا مشکل ہوگا لیکن ناممکن نہیں ہے۔ آج کل ریڈیو سے متعلق آلات بہت جدید آ گئے ہیں۔ بچے بھی ان کی مدد سے آس پاس کی نشریات پکڑتے ہیں۔ خاص طور سے وہ کارڈلیس کی نشریات پکڑ کر لوگوں کی نجی گفتگو سنتے ہیں۔''

اس بار کرنل نے میری بات تسلیم کی اور واکی ٹاکی بند کر دیا۔ سارہ دستک دے کر اندر آئی اس نے ڈنر کا پوچھا۔ کیونکہ ہمیں اپنے کمرے میں ڈنر کرنا تھا اس لیے ہم نے اپنی پسند کی چیزیں بتائیں۔ آدھے گھنٹے میں ڈنر آ گیا تھا۔ مجھے بھوک خاصی لگ رہی تھی لیکن اس بار بھی میں نے ہاتھ ہلکا رکھا۔ خوراک کی زیادتی جسم کو سست کرتی ہے اور اس کی کمی انسان کو چست رکھتی ہے۔ اس مشن کے دوران میں مکمل طور پر چست رہنا تھا اس لیے میں نے ابھی سے خوراک کم کر دی تھی۔ بیتو نے نوٹ کر لیا۔ ''شوبی کیا بات ہے آپ دو دن سے کم کھا رہا ہے؟''

میں نے اسے اپنا نقطہ نظر بتایا تو اس نے ہاتھ روک لیا۔ ''تب تو ہم کو بھی کم کھانا چاہیے۔''



''تمہیں فرق نہیں پڑے گا۔ ایک تو تم نوعمر ہو، اس عمر میں آدمی جو کھا لے اور جتنا کھا لے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ دوسرے تمہارا خون ضائع ہوا ہے اور زخم تقریباً بھرا ہے۔ تمہیں خوراک کی زیادہ ضرورت ہے اس لیے دبا کر کھاؤ۔''

بیتو خوش ہو گیا۔ ''تب ٹھیک ہے۔''

کھانے کے بعد میں نے چہل قدمی کی۔ پھر شاور لیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ زندگی کا ایک چکر بن گیا تھا جب تک آزاد رہتا۔ کھانے اور آرام کا موقع کم ملتا تھا۔ بھاگ دوڑ اور ہنگامہ آرائیاں زیادہ ہوتی تھیں۔ آرام اور ٹھیک سے کھانے کا موقع دشمن کی قید میں ملتا تھا۔ اگلی ہنگامہ آرائیوں کے لیے جسم کی بیٹری چارج ہو جاتی تھی۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ کنور پیلس سے چھٹکارے کے بعد چند دن بہت سخت اور بے آرام گزرے تھے۔ ہمالیہ ہوٹل جیسی جگہ قیام کا بھی فائدہ نہیں ہوا تھا اور آخری دو دن تو بہت سخت گزرے تھے۔ مگر ڈیوڈ شا کی قید میں آنے کے بعد میں آرام کر رہا تھا۔ میری سب سے بڑی ٹینشن کا حل نظر آنے لگا تھا اس لیے ذہنی طور پر بھی سکون سے تھا۔ اس سکون کا اثر مجھ پر ہوا تھا۔ پہلے جو چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے آ گئے تھے، دو دن کے آرام سے ٹھیک ہو گئے تھے۔ مجھ سے زیادہ بیتو پر اثر ہوا تھا۔ اس کا زخم اسی وجہ سے بہت تیزی سے بھر گیا تھا ورنہ بھاگ دوڑ اور بے آرامی میں یہ اتنی آسانی سے نہ بھرتا۔

عام زندگی میں بھی بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو بہت کم آرام کرتے ہیں، وہ اپنے کام میں بہت زیادہ لگے ہوتے ہیں۔ اتنا زیادہ کہ کھانے، پینے اور سونے کا ہوش بھی نہیں ہوتا۔ قدرت نے ہر آدمی کے لیے توازن رکھا ہوا ہے کہ اسے ساری زندگی میں وہ سب کرنا ہے جو ایک آدمی کا مقدر ہوتا ہے لیکن وہ اپنے طور پر بعض چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے جیسے آرام اور کھانے پینے کو، تو قدرت ایسے لوگوں کو دوسرے طریقے سے آرام کا موقع دیتی ہے۔ وہ اچانک بیمار پڑ جاتے ہیں یا کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے اور وہ بستر تک محدود ہو جاتے ہیں۔ یوں اپنے مقدر کا آرام حاصل کرتے ہیں۔ میرے لیے دشمن کی قید ایسا ہی مقدر تھی جس میں، میں اپنے حصے کا آرام حاصل کرتا تھا۔

کئی دن سے وقت پر کھانا پینا اور سونا جاگنا ہو رہا تھا ورنہ پوری روٹین ڈسٹرب ہوتی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ سرے سے کوئی روٹین ہی نہیں ہوتی تھی۔ جب موقع ملا کھا لیا اور جب موقع ملا تو سو لیے۔ میں نیند میں تھا اور اچانک میری آنکھ کھلی تو مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں کھلی ہے مگر اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ آواز بلند نہیں تھی مگر انداز عجلت والا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ بیتو خراٹے لے رہا تھا۔ البتہ یہ خراٹے نیند شکن نہیں تھے۔ میں اٹھ کر دروازے تک آیا۔ ''کون ہے؟''

''ام ہے فتح خان۔'' فتح خان کی پریشان آواز آئی۔ ''شہباز جلدی کھولو۔''

میرے اندر گھنٹی بجنے لگی تھی اور میں نے دروازہ کھول دیا۔ فتح خان تیزی سے اندر آیا۔ ''جلدی کرو..... ادھر سے نکلنا ہے..... صرف دس منٹ ہے۔ اسے بھی اٹھاؤ اپنا سامان لو۔''

میں نے بیتو کو جھنجوڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''کیا ریڈ ہونے والا ہے؟''

''ہاں۔'' فتح خان باہر جاتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا آدمی ہے اندر، اس سے پہلے پتا چل گیا..... سب کو ادھر سے جانا ہے۔''

دس منٹ ہمارے لیے کافی تھے۔ بیتو جاگ گیا تھا اور فتح خان کی بات سن کر ہوشیار ہو گیا۔ اس نے جلدی سے سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ ہمارے کپڑے اور دوسرا سامان ایک بیگ میں تھا وہ میں نے اٹھا لیا۔ لیپ ٹاپ اور رقم والا بیگ بیتو کو دے دیا۔ چند گھنٹے پہلے میں نے کرنل سے جس خدشے کا اظہار کیا تھا وہ اچانک ہی حقیقت بن گیا تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ پولیس یا جو ایجنسی بھی چھاپا مارنے والی تھی اس کی وجہ کیا تھی؟ بہرحال وجہ جو بھی رہی ہو یہ اچھا ہوا کہ ڈیوڈ شا نے پہلے سے سدِباب کر رکھا تھا اور ہم بروقت ہوشیار ہو گئے تھے۔ دس منٹ سے پہلے ہم منہ پر پانی مار کر باہر آ چکے تھے۔ سرد پانی نے ہمیں ہوشیار کر دیا تھا۔ ہم عمارت سے باہر آئے تو فتح خان بے تابی سے ٹہل رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ.....''

میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ اچانک کیا چکر ہوا ہے؟''

''کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔'' فتح خان بولا۔ ''ادھر ڈیوڈ شا کا پیغام آیا ہے کہ سب آدھے گھنٹے کے اندر یہاں سے نکل جائیں..... سارا سامان لے کر۔''

''ڈیوڈ شا یہاں نہیں ہے؟''

''وہ اکثر یہاں نہیں ہوتا ہے۔'' فتح خان بولا۔ ہم

پیلس کے اگلے حصے کی طرف جا رہے تھے۔ سردی سے بچنے کے لیے ہم نے جیکٹس پہن لی تھیں۔ فتح خان نے روش کے بجائے لان پر قدم رکھا تو ہم رک گئے۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”تم خطرناک جگہ قدم رکھ رہے ہو۔“

”اوہ.... فکر مت کرو.... وہ گن بھی ہٹا لیا ہے۔ اب خطرہ نہیں ہے۔“

ہم لان کے شارٹ کٹ سے ہوتے ہوئے پیلس کے وسیع و عریض پورچ تک پہنچے جہاں چھ عدد بڑی لگژری گاڑیاں تھیں۔ ان میں تین لینڈ روور تھیں اور تین عدد نسان جیپ تھیں۔ ایک طرف درمیانے سائز کی سامان والی وین تھی اس کے عقبی حصے میں سامان بار کیا جا رہا تھا۔ جب ہم پہنچے تو دو گاڑیاں اسٹارٹ ہو کر گیٹ کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر چکی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ اگر یہاں چھاپا پڑنے والا تھا تو لازمی باہر سے نگرانی بھی کی جا رہی ہوگی تو اس صورت میں یوں کھلے عام رخصت ہونا نامناسب تھا۔ میں نے فتح خان سے یہی سوال کیا تو اس نے کسی قدر چڑ چڑا کر جواب دیا۔ ”میرے کو نہیں معلوم.... جو کہا گیا ہے وہ کر رہا ہے.... ادھر سوچنے اور حکم دینے کا کام دوسرے کا ہے۔“

میں نے سکون محسوس کیا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو یہ لوگ یقیناً خیال رکھتے۔ ہماری والی گاڑی سب سے آخر میں نکلی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ تمام گاڑیاں قافلہ بنا کر سفر کریں گی لیکن جب ہم پہاڑی سے نیچے آئے تو وہاں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ نہ ہمارے آگے اور نہ ہی پیچھے کوئی گاڑی تھی۔ پچھلی سیٹ پر فتح خان سمیت میں اور بیتو تھے۔ دو آگے بیٹھے تھے اور تین پیچھے بیٹھے تھے۔ ہمارے بیگ ہمارے پاس تھے کیونکہ پیچھے قطعی کوئی جگہ نہیں بچی تھی جہاں سامان رکھا جا سکتا۔ فتح خان خالی ہاتھ تھا۔ آگے بیٹھے دونوں افراد گورے تھے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ انہیں معلوم ہے ہمیں کہاں جانا ہے۔ گاڑی پہاڑی سے اترنے کے بعد بائیں طرف گھومی اور ہم کچھ غیر معروف سڑکوں سے ہوتے ہوئے شمال مشرق کی طرف جانے لگے۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ”اگر راستے میں مڈبھیڑ ہو گئی تو....“

”تو کیا؟“

”ہم خالی ہاتھ ہیں۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”فکر مت کرو اس صورت میں تمہیں سب مل جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پر کچھ نہیں ہوگا ہم بروقت نکل آیا ہے۔“

”باقی کہاں ہیں؟“

”وہ دوسرے راستے سے جا رہا ہے۔“ فتح خان نے کہا۔

اچانک گاڑی کی رفتار کم ہوئی اور ڈرائیور نے امریکی لہجے میں کہا۔ ”گائز ہیر از پرابلم۔“

سامنے ایک پولیس موبائل کھڑی تھی اور اس کے ساتھ موجود دو پولیس والے ہاتھ سے گاڑی کو رکنے کا کہہ رہے تھے۔ انہوں نے روایتی رائفلیں اٹھا رکھی تھیں۔ فتح خان یک دم ہیجان زدہ ہو گیا۔ اس نے غرا کر انگریزی میں کہا۔ ”سب تیار ہو جائیں۔“

میں نے اسے ٹوکا۔ ”ایک منٹ! ان کا انداز نارمل ہے، یہ صرف چیکنگ کر رہے ہیں دوسری صورت میں الگ انداز میں ہمیں روکتے۔“

”ہم چیکنگ کی اجازت نہیں دے سکتے۔“ فتح خان بولا۔ ”گاڑی میں اسلحہ ہے۔“

”ضروری نہیں ہے وہ چیک کریں۔“ میں نے کہا۔ ”کسی کے پاس خاموش پستول ہے؟“

”ہاں ہے۔“ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے امریکی نے کہا۔

”مجھے دو اور باقی بھی ہوشیار رہیں، اگر ہمیں ان کو ٹھکانے لگانا پڑا تو یہ کام خاموشی سے ہونا چاہیے۔ کوئی دھماکے والی چیز استعمال نہ ہو۔ میری بات سمجھ میں آ گئی ہے؟“

سب خاموش رہے اس کا مطلب ہے وہ متفق تھے۔ میں نے کہا۔ ”گاڑی پولیس کار سے ذرا پہلے روک لو۔“

ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ گاڑی رکتے ہی دونوں سپاہی آگے بڑھے۔ انہوں نے سنگل شاٹ رائفلیں اٹھا رکھی تھیں۔ وہ بے چارے عام سے سرکاری ملازم تھے۔ نزدیک آنے پر میں نے بٹن دبا کر شیشہ نیچے کیا اور تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”کیوں روکا ہے.... ٹھاکر صاحب کو دیر ہو رہی ہے .... چیف منسٹر کے ڈنر سے واپس آ رہے ہیں۔“ میں نے چینی نقوش رکھنے والے فتح خان کو ٹھاکر بنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔ ٹھاکر صاحب اور چیف منسٹر کا سن کر سپاہی مرعوب ہوئے تھے۔ ایک نے کہا۔

”معافی صاحب.... اوپر سے حکم ہے کہ ادھر سے گزرنے والی ہر گاڑی کا تلاشی لیا جائے۔“

”تلاشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہو تو تمہاری شملہ میں پولیس چیف سے بات کرا دی جائے۔“

وہ کانسٹیبل تھے اور پولیس چیف ان سے بہت اوپر کی چیز تھی۔ بولنے والا ہچکچایا تھا مگر اس کا ساتھی چالاک تھا اس نے سامنے بیٹھے گوروں کو دیکھ لیا تھا اس نے پوچھ لیا۔ ”یہ گورے ہیں؟“

”ہاں ٹھاکر جی کے گورے گارڈ ہیں۔ ان کو گورے ملازم رکھنے کا شوق ہے۔“ میں نے کہا اور ہزار کا ایک نوٹ نکال کر یوں مٹھی میں دبا لیا کہ اس کی جھلک نظر آئے۔ ”بہت دیالو ہیں.... غریبوں کا خیال رکھتے ہیں.... تم لوگ اس سردی میں ڈیوٹی دے رہے ہو۔“

اس بار دوسرا سپاہی بھی متاثر ہوا تھا پہلے والے نے کہا۔ ”بس کیا کریں سرکاری نوکری تو غلامی ہوتی ہے۔“

”یہ رکھو.... بچوں کے لیے کچھ لے جانا۔“ میں نے نوٹ بولنے والے کو تھما دیا۔

”دوسرے کو الگ سے دو۔“ فتح خان فوراً دیالو ٹھاکر بن گیا۔ رقم میری جیب سے جا رہی تھی مگر کون سے میری حق حلال کی کمائی تھی اس لیے میں نے دوسرے کی خدمت میں بھی ہزار کا نوٹ پیش کیا۔ نوٹ لے کر انہوں نے سلام کیا۔ مگر یہ کام انہوں نے اتنی صفائی سے کیا کہ موبائل میں موجود باقی پولیس والوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے پیچھے ہٹ کر جانے کا اشارہ کیا تو ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ تقریباً سب نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اگرچہ پولیس والے اسلحے اور تربیت کے لحاظ سے ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور امکان یہی تھا کہ وہ سب مارے جاتے مگر اس صورت میں نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ قانون نافذ کرنے والوں کا قتل کسی بھی ملک میں سنگین ترین واقعہ سمجھا جاتا ہے اور پوری انتظامیہ حرکت میں آ جاتی ہے۔ پھر پولیس والے بہرحال مسلح تھے اور جب گولیاں چلتی ہیں تو نہیں کہا جا سکتا کہ کون بچے گا اور کون مارا جائے گا۔ باقی سب خوش تھے مگر فتح خان خوش نہیں تھا اس نے آہستہ سے کہا۔

”شہباز خانا لگتا ہے تم آج کل کچھ امن پسند ہوتا جا رہا ہے۔“

”امن پسند میں ہمیشہ سے تھا۔“ میں نے تصحیح کی۔ ”ورنہ تم اب زندہ کیسے گھوم رہے ہوتے۔“

”تمہارے معاملے میں تو میں بھی امن پسند ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”مگر اس وقت میرے ہاتھ میں کھجلی ہو رہا تھا۔“

”اپنی کھجلی کو قابو رکھو۔ یہاں مار دھاڑ ہوتی تو پولیس پیچھے لگ جاتی۔ ہمارے ہتھیار بے آواز تھے پولیس کے نہیں اور یہاں ہونے والی فائرنگ سارے شہر میں سنائی دیتی۔ مار دھاڑ کا وقت زیادہ دور نہیں ہے تم دل کھول کر ہاتھ کھجانے کا موقع ملے گا۔“

فتح خان قائل ہو گیا۔ ”ہاں یہ تم نے اچھا کیا۔“

”شوبی ہمیشہ اچھا کرتا ہے۔“ بیتو نے مداخلت کی۔ ”یہ تو تم جیسا لوگ ہے جو غلط کرتا ہے۔“

خلافِ توقع فتح خان مشتعل نہیں ہوا۔ اس نے تسلیم کیا۔ ”تم ٹھیک کہتا ہے، ہم غلط آدمی ہے اس لیے غلط کرتا ہے۔ شہباز خانا ٹھیک ہے اس لیے ٹھیک کرتا ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ گاڑی شملہ سے باہر کی طرف جا رہی تھی۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

ہاشم بن عتبہ کی کنیت ابو عمرو تھی اور لقب مرقال تھا۔ آپ مشہور صحابی اور فاتح ایران تھے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بھتیجے۔ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے بعد میں ہونے والی تمام اسلامی جنگوں میں حصہ لیا۔ فتوحات شام میں خالد بن ولید کے ہمراہ تھے۔ جنگ یرموک میں ایک آنکھ سے محروم ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے جنگ قادسیہ کے وقت آپ کو چھ ہزار فوج دے کر مدد کے لیے بھیجا۔ آپ جنگ کے دوسرے روز فوج لے کر پہنچے جس سے ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور مسلمان فوج فاتح بن کر آگے بڑھی۔ سعد بن ابی وقاص نے انہیں 12 ہزار فوج دے کر جلال بھیجا۔ جہاں آپ نے بادشاہ یزدگرد کو شکست دی اور دجلہ کو فتح کرتے ہوئے مہر در پہنچے۔ دجلہ مکمل فتح کرنے کے بعد جلال فتح کیا جس میں دس لاکھ روپے کا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کی حمایت میں لڑے۔ جنگ صفین جو حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے مابین 36ھ کے اواخر میں لڑی گئی اور صفر 37 کے پہلے ہفتے تک جاری رہی۔ اسی جنگ میں ہاشم بن عتبہ حضرت علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

مرسلہ: ملک ہاشم تو ناری، بہاول پور

فتح خان نے شانے اچکائے۔ ”پتا نہیں .... کمانڈر کرنل ہے وہی لے جا رہا ہے۔“

”تب تمہیں یہ بھی نہیں معلوم ہوگا باقی سب نے بھی وہیں جانا ہے جہاں ہم جا رہے ہیں یا الگ جانا ہے۔“

”تمہیں باقی سب سے کیا؟“

”مجھے باقی سب سے نہیں لیکن منشی دل جی سے ہے۔ تم نے غور نہیں کیا کہ اس کے آتے ہی یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ آخر انڈین حکام کو کیسے پتا چلا یہاں کا؟“

”کھٹک تو ہم کو بھی ہوا۔“ فتح خان نے سر ہلایا۔ ”ابھی سب سامنے آئے گا۔ اگر اس نے کوئی حرامی پن کیا تو بھگتے گا۔“

”بہ شرط کہ ہم بچ گئے ورنہ اسے موقع ملا تو وہ پھر مروائے گا۔ اس پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔“

فتح خان نے غور کیا اور ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا۔ اس نے گاڑی روکی تو فتح خان موبائل نکالتا ہوا نیچے اتر گیا اور گاڑی سے اتنی دور جا کر بات کرنے لگا کہ اس کی آواز ہمیں نہ سنائی دے اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کسے کال کر رہا ہے۔ دو منٹ بعد وہ واپس آیا اور ہم آگے روانہ ہو گئے۔ فتح خان نے نہیں بتایا کہ اس نے کس سے اور کس سلسلے میں بات کی تھی نہ میں نے پوچھا۔

آدھے گھنٹے بعد ہم شہر سے باہر تھے یہاں سڑک اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان سے گزر رہی تھی اور کہیں کہیں کھائیاں تھیں۔ ٹیلوں پر بنگلے اور کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ مگر عام آبادی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس قسم کی زمین پر غریب غربا آباد نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ یہاں پانی نہیں ہوتا ہے اور ناہموار زمین کی وجہ سے کاشت کاری بھی نہیں کی جا سکتی ہے۔ البتہ دولت مندوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ دولت کے بل بوتے پر اس ویرانے میں بھی تمام سہولتیں حاصل کر سکتے تھے اور انہوں نے حاصل کی ہوئی تھیں بڑک کے دائیں ٹیلوں پر بنے مکانوں تک جانے کے لیے پختہ راستے بنے ہوئے تھے۔

گاڑی اچانک ایک ایسے ہی راستے پر گھوم گئی۔ یہ خاصا بڑا اور اوپر سے مسطح ٹیلا تھا جس پر یہ دو منزلہ مکان کھڑا تھا۔ پتھروں اور لکڑی سے بنے اس مکان کے سامنے وسیع کار پورچ تھا اور وہاں دو گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔ یہ ہم سے پہلے روانہ ہوئی تھیں۔ جب ہم نیچے اترے تو باقی گاڑیاں بھی نظر آ گئیں۔ وہ مکان کی سائیڈ میں موجود تھیں۔ ان میں سامان والی وین بھی تھی۔ وہ کسی اور راستے سے آئی تھیں اور بغیر رکے آئی تھیں اس لیے ہم سے پہلے پہنچ گئی تھیں۔ اتنی گاڑیوں کے باوجود وہاں بہت خاموشی تھی اور سوائے چند ایک افراد کے جو مکان کی نگرانی اور حفاظت پر مامور تھے باہر کوئی نہیں تھا۔ روشنیاں بھی بہت کم آن تھیں اور تقریباً نیم تاریکی تھی۔ یہ اچھی حکمت عملی تھی۔ باہر سے بہ ظاہر یہ مکان ویران یا خوابیدہ نظر آ رہا تھا۔ لیکن اندر اس کے برعکس تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو نشست گاہ اور اس سے آگے والے کمرے میں خاصی گہما گہمی تھی۔ نشست گاہ میں بیٹھے ہوئے لوگ مختلف اقسام کے الکوحل زدہ مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اصل کام دوسرے کمرے میں ہو رہا تھا۔ کرنل وہیں تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو کرنل نے میری طرف دیکھا۔

”تم نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا جو مار دھاڑ کی نوبت نہیں آئی۔“

”میں بلا وجہ کی مار دھاڑ سے گریز کرتا ہوں۔“ میں نے دل چسپی سے دیکھا۔ کرنل کے کمپیوٹرز والے آدمی اپنا سامان سیٹ کر رہے تھے۔ ”لگتا ہے تم سب لے آئے ہو۔“

”ایک ایک چیز۔“ اس نے سر ہلایا۔

”مسئلہ کیا ہوا؟“

کرنل نے شانے اچکائے۔ ”مقامی پولیس اور شاید کوئی ایجنسی مل کر چھاپا مارنے والے تھے۔ ہمیں پہلے پتا چل گیا اور ہم وہاں سے نکل آئے۔“

”وجہ کیا تھی؟“ میں نے پوچھا مجھے محسوس ہوا کہ وہ اس واقعے کو ہلکا لے رہا تھا۔

”وجہ کوئی بھی رہی ہو....“

”معاف کرنا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اگر تم وجہ ساتھ لے آئے ہو تو یہ جگہ بھی غیر محفوظ ہو جائے گی۔“

کرنل نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“

منشی دل جی ایک کونے میں موجود تھا اور میری طرف سے بے نیاز نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ”اگر یہ چھاپا اندر کے کسی آدمی کی وجہ سے مارا جا رہا ہے تو اس کا دوبارہ امکان بھی ہے۔ یہ جگہ بھی محفوظ نہیں رہے گی۔“

کرنل مضطرب ہو گیا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا .... میرا



ایک ایک آدمی اعتماد کا ہے۔“

”یہاں تمہارے آدمیوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں۔“ میں نے سرسری انداز میں منشی دل جی کی طرف دیکھا۔ ”جن کے بارے میں تم زیادہ نہیں جانتے ہو۔“

اس بار منشی دل جی نے خونی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس کا ذکر کر رہا ہوں۔ کرنل کچھ دیر غور کرتا رہا پھر اس نے مجھے اشارہ کیا اور ہم مکان سے باہر صحن میں آئے۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“

”فوری طور پر تمام افراد سے ان کے موبائل فون لے لو.... کسی کے پاس موبائل فون نہیں ہونا چاہیے.... یہاں کوئی لائن فون ہے؟“

”نہیں۔“

”ٹھیک ہے وائرلیس ڈیوائسز تمہارے قبضے میں ہونی چاہئیں۔ تمام افراد کو خبردار کر دو اگر کسی کے پاس سے ایسی کوئی چیز نکلی تو اسے غدار سمجھا جائے گا۔“

کرنل نے گہری سانس لی۔ ”ابھی تک کنفرم نہیں ہے کہ ریڈ کس وجہ سے ہوا ہے۔“

”ریڈ ہو گیا ہے؟“

”ہمارے نکلنے کے دس منٹ بعد پولیس اور سادہ لباس خفیہ ایجنسی کے ایجنٹس پہنچ گئے تھے۔ اصل ریڈ ایجنسی کا تھا پولیس شامل تھی۔ ہمیں پولیس مخبر نے اطلاع دی۔“

”مجھے تو یہ بھی مشکوک لگ رہا ہے کہ ہم اتنی آسانی سے وہاں سے نکل کر آ گئے۔ اگر معاملہ ایجنسی کا ہے تو یہ بات اور بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ کوئی وہاں نگرانی نہیں کر رہا تھا۔“

کرنل نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”یہ تو مجھے بھی مشکوک لگ رہا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے اچانک کئی غیر ملکیوں کی آمد پر مقامی ایجنسیاں چونکی ہوں۔“

”شملہ ایک معروف سیاحتی مقام ہے۔ یہاں روزانہ سیکڑوں کی تعداد میں غیر ملکی آتے ہیں، ان میں اکثر مغربی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایجنسیاں نظر رکھتی ہیں مگر ہر ایک کو چیک نہیں کرتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کرنل تم بھی یہاں نئے ہو بہتر ہے اس سلسلے میں ڈیوڈ شا سے رہنمائی حاصل کرو۔ اسی نے تمہیں خبردار کیا ہے نا؟“

”میں یہی کروں گا تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“

”ابھی پریشان ہونا بہتر ہے بہ نسبت بعد میں مشکل میں پڑنے کے۔“ میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ عارضی ٹھکانا ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ لو.... کسی ایمرجنسی کے لیے رکھا تھا۔ اب کام آیا۔“

”اس کے بارے میں کون کون جانتا ہے؟“

”صرف ڈیوڈ شا، اسی نے اطلاع کے ساتھ مجھے یہاں کا پتا بھی بھیجا تھا۔“

مجھے خیال آیا۔ ”تمہارے پاس وائرلیس کمیونیکیشن کا سراغ لگانے والے آلات ہیں۔“

”بالکل ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”ہمارا پورا سیٹ اپ ہے جو کسی قسم کے وائرلیس کمیونیکیشن کا سراغ بھی لگا سکتا ہے اور اسے بلاک بھی کر سکتا ہے۔“

”تو بس اسے آن کر لو۔“ میں نے مشورہ دیا۔ جیتو نشست گاہ میں شور سے بے نیاز ایک صوفے پر اونگھ رہا تھا میں نے اسے اٹھایا۔ فتح خان یہاں پہنچ کر غائب ہو گیا تھا۔ جیتو اور اپنا سامان لے کر میں اوپر آیا۔ ایک کمرا خالی دکھائی دیا جس میں ڈبل بیڈ تھا میں نے اس پر قبضے کا فیصلہ کیا۔ بستر ملتے ہی جیتو گر کر سو گیا تھا۔ میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر کمرے کی تلاشی لی مگر وہ خالی نکلا۔ اس کے بعد میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور لیٹ گیا مگر نیند نہیں آئی۔ کچھ دیر لیٹا رہا پھر اٹھ گیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ میں دروازہ اندر سے لاک کر کے باہر آیا۔ اب خاموشی تھی اور پینے پلانے والے سو چکے تھے یا مدہوش تھے۔ البتہ کرنل اپنے کنٹرول روم میں جاگ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

”تمہیں بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔“

”ظاہر ہے یہ اصل میں میرا مشن ہے۔ مجھے اس کی زیادہ فکر ہونی چاہیے۔“ میں نے ایک طرف رکھی کافی کی الیکٹرک کیتل سے مگ میں کافی نکالی۔ اس میں ہلکی شکر اور کریم ملائی۔ کافی سے نیس کیف کی مخصوص خوشبو آ رہی تھی۔

”میں نے جیمر آن کر دیا۔“ کرنل نے ایک چھوٹی کمپیوٹرائز مشین کی طرف اشارہ کیا۔ ایک بڑے سائز کے ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر جیسی مشین کے ساتھ ایل سی ڈی اور دوسرے آلات منسلک تھے۔ اسکرین پر لائنیں آ رہی تھیں اور فی الحال یہ لائنیں سیدھی تھیں۔ ”اب اس گھر کی حد میں کوئی وائرلیس ڈیوائس استعمال نہیں ہو سکے گی۔“

”انٹرنیٹ ڈیوائس بھی نہیں۔“

”کوئی بھی نہیں۔“ کرنل نے کہا۔ ”اگر کوئی ایسی

کوشش کرے گا تو یہ آلہ نہ صرف اسے پکڑ لے گا بلکہ بلاک بھی کر دے گا۔''

''تم تجربہ کر کے دکھاؤ گے؟''

''کیوں نہیں۔'' کرنل نے اپنا آئی فون نکالا۔ اسے آن کیا اور فوراً اسکرین پر ایک لائن لہرانے لگی۔ پھر کرنل نے کال کرنے کی کوشش کی اور آئی فون میرے کان سے لگایا تو آگے سے ریڈیائی شور سنائی دیا تھا۔ ''تم نے سنا جیمر نے رابطہ ختم کر دیا۔''

''یہ اچھی چیز ہے لیکن اگر رابطہ کرنا ہو تو؟''

''اس کی حد سو گز ہے اس سے باہر جانا ہوگا۔'' کرنل نے کہا۔

''اس دربدری کا ہمارے پلان پر کوئی اثر پڑے گا؟''

''بالکل بھی نہیں.... تمام افراد ساتھ ہیں اور تمام آلات اور ہتھیار ہم لے آئے ہیں۔ اب ہمیں ایک کیل کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ جنہوں نے صبح آنا تھا وہ بھی اتفاق سے نکلنے سے ایک گھنٹے پہلے پہنچ گئے تھے۔''

کرنل کے پاس دو درجن بہترین تربیت یافتہ افراد تھے جن میں سے بیشتر سابقہ فوجی تھے جو مختلف جنگوں میں حصہ لے چکے تھے۔ باقی تمام بھی کسی نہ کسی لڑائی کا تجربہ رکھتے تھے۔ چھ افراد فتح خان کے ساتھ تھے۔ میں، کرنل، فتح خان اور جیتو اس کے علاوہ تھے۔ منشی دل جی بھی دو درجن مقامی بدمعاش لا رہا تھا جو باہر سے ہمیں سپورٹ کرتے۔ سورج نکلنے تک میں اور کرنل حملے کے منصوبے پر بات کرتے رہے۔ میرے تجربے اور معلومات کی بنیاد پر کرنل نے کنور پیلس کے تین اطراف میں تین مقامات کو اسنائپرز اور میزائل حملوں کے لیے منتخب کیا۔ یہاں تین میزائل مین اور چھ اسنائپرز تعینات کیے جاتے۔ حملے کا آغاز ان ہی مقامات سے ہوتا۔ ہیلی کاپٹر میں دو پائلٹ کے علاوہ آٹھ افراد کی گنجائش تھی۔ اس سے بڑا ہیلی کاپٹر کوشش کے باوجود نہیں ملا تھا۔ میرے اور جیتو کے علاوہ فتح خان اور اس کے پانچ آدمی ہوتے۔ دونوں بکتر بند گاڑیوں میں آٹھ آٹھ افراد جاتے۔ ایک بکتر بند میں کرنل ہوتا اور وہ کنور پیلس سے باہر موجود افراد کی کمانڈ کرتا۔

''دونوں بکتر بند گاڑیاں کنٹینر میں بند کنور پیلس کے پاس موجود ہیں۔'' کرنل نے کہا۔ ''دوپہر میں ہماری پہلی ٹیم روانہ ہو جائے گی وہ موبائل ٹاور اور بجلی کی ہائی ٹینشن وائر ٹاور میں وائرلیس کنٹرول بم نصب کرے گی۔ بجلی بند ہوتے ہی سب سے پہلے میزائل بردار میزائل فائر کریں گے۔ ہر ایک تین تین میزائل فائر کرے گا۔ عمارتوں کے داخلی دروازوں کے علاوہ گرڈ اسٹیشن، جنریٹر اور ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنایا جائے گا۔ اس دوران میں اسنائپرز گارڈز کو نشانہ بنانا شروع کر دیں گے۔ میزائلوں کے بعد اسموک اور گیس گرینیڈز پھینکے جائیں گے۔ یہ ذمے داری بھی میزائل چلانے والوں کی ہوگی۔''

''اگر کسی میزائل کا نشانہ خطا گیا تو؟''

''ہر ایک کے پاس چار میزائل ہوں گے یعنی ایک ایک اضافی میزائل ہوگا وہ اسی مقصد کے لیے ہوگا۔''

''کنور پیلس بڑی عمارت ہے اور سب سے سخت سیکورٹی یہیں ہوتی ہے۔ وہاں سخت جان گارڈز ہوتے ہیں جو جان کی قیمت پر اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ وہ سخت مزاحمت کریں گے۔ ہمیں تین منزلیں اترنا پڑے گا اور ہر منزل پر مزاحمت کو صاف کرنا ہوگا۔ اس صورت میں کامیابی حاصل کرنے میں وقت لگ سکتا ہے۔ سوال یہ ہے ہیلی کاپٹر کتنی دیر انتظار کرے گا۔''

''تمہیں اور تمہاری ٹیم کو اتار کر ہیلی کاپٹر پون گھنٹا فضا میں رہ سکتا ہے، اس میں کل ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کا ایندھن ہو گا۔''

پون گھنٹا کافی تھا لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ ناکافی ہو جاتا۔ ہمیں توقع سے زیادہ وقت لگ جاتا۔ اس صورت میں ہمارا نکلنا مسئلہ بن جاتا۔ اس علاقے سے نکلنے کا تیز ترین ذریعہ ہیلی کاپٹر ہی تھا۔ زمینی راستے پر بہت خدشات تھے۔ مجھے باقی افراد کی فکر نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کرنل اور ڈیوڈ شا کو بھی نہیں ہو گی۔ کیونکہ ان لوگوں کو معاوضہ ہی خطرات کا سامنا کرنے کا دیا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا اور کہا۔ ''نہیں ہیلی کاپٹر فضا میں نہیں رہے گا۔ فتح خان مجھے قابو کر کے ہیلی کاپٹر میں شملہ لایا تھا۔ جہاں اس نے ہیلی کاپٹر اتروایا تھا وہ جگہ بہت مناسب اور کنور پیلس سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں سے ہیلی کاپٹر دو منٹ میں کنور پیلس آ سکتا ہے۔''

''ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔'' کرنل نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''لیکن رات کا وقت ہو گا.... خیر اس کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔ میں کمان سے بات کرتا ہوں۔''

''اس سے ہمیں فری ہینڈل جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر دیر ہو گئی تب بھی ہم ہیلی کاپٹر سے واپس آ سکیں گے۔ اسے ڈن سمجھو۔''

''ٹھیک ہے پھر مجھے اپنے آدمیوں کو کہنا ہو گا۔ ہیلی پیڈ تیار کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر رات میں کسی بھی جگہ اترنا بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔''

''یہ کام بھی فتح خان کے سپرد کر دو۔'' میں نے مشورہ دیا۔ ''ڈیوڈ شا سے بات ہوئی ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''حتمی طور پر معلوم نہیں ہوا ہے لیکن ریڈ اطلاع پر مارا گیا تھا۔''

''اس غدار کا پتا چلانا بہت ضروری ہے ورنہ سب چوپٹ ہو سکتا ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں.... میں نے سب کے موبائل لے لیے ہیں۔ جن کے پاس انٹرنیٹ کی سہولت تھی وہ بھی واپس لے لی ہے۔''

''ان آلات سے کی جانے والی کالز کا پتا چلایا جا سکتا ہے؟''

''ہاں اگر وہ ان کے ریکارڈ میں ہوئیں تو۔'' کرنل نے کہا۔ ''میں نے چیک کیا ہے کہ کس نے مقامی کال کی ہے اور کہاں کی ہے؟ مگر اس سے بھی کوئی سراغ نہیں ملا۔ میرے آدمی کلیئر ہیں۔''

''منشی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

کرنل ہچکچایا۔ ''وہ ہمارا ساتھ دے رہا ہے اور اس کا مفاد بھی ہے، اگر ہم ناکام رہے تو وہ بھی ناکام ہو جائے گا۔''

''ممکن ہے وہ اپنا مفاد کسی اور طریقے سے حاصل کر لے۔''

''ڈبل کراس.... لیکن یہ بھی آسان نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ مشن ناکام ہو جائے گا۔ بالآخر اسے ڈیوڈ شا کو جواب دینا ہو گا۔''

''ڈیوڈ شا خدا نہیں ہے جو ہر ایک اسے جواب دے....'' میں نے بدمزگی سے کہا۔ ''جب انسان خدا کو خاطر میں نہیں لاتا ہے تو ڈیوڈ شا کی کیا حیثیت ہے، اسے بھی دھوکا دیا جا سکتا ہے اور دھوکا دے کر سینہ تان کر رہا بھی جا سکتا ہے۔''

کرنل خاموش ہو گیا۔ شاید وہ مجھ سے متفق نہیں تھا لیکن میں نے ڈیوڈ شا کے بارے میں حقیقت بیان کی تھی۔ بے شک وہ بعض معاملات میں توپ ہو گا لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک اس کی بالادستی تسلیم کر لے۔ ہر ایک کے اپنے مفادات ہوتے ہیں اور وہ ان کی روشنی میں فیصلے کرتا ہے۔

اسے آقا کہنے والے مرشد نے کتنی آسانی سے اس کی ضمانت اس کے منہ پر دے ماری تھی۔ کچھ دیر میں باہر روشنی ہونے لگی تھی اور مکان میں پھر سے گہما گہمی کا آغاز ہوا۔ کچن میں ناشتا تیار کیا جا رہا تھا۔ ابلے انڈوں کے ساتھ، پورج، سیریل اور دودھ تھا۔ ساتھ میں چائے کافی تھی۔ جیتو ابھی تک سو رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ آرام کر لے۔ میں ناشتے کے بعد کافی کا مگ لے کر باہر نکل آیا۔ مکان والے ٹیلے کے عقب میں ایک گہری کھائی تھی اور اس کے پار ایک بڑی ڈھلان تھی جو بتدریج بلند ہوتے ہوئے شمال مشرق میں بلند پہاڑوں سے جا کر مل گئی تھی۔ یہاں سے ان برف پوش چوٹیوں کا نظارہ ممکن تھا جن پر سارے سال برف نہیں پگھلتی۔ مکان کے عقبی حصے میں پختہ ٹیرس تھا اور کھائی کے کنارے ریلنگ لگی تھی۔ کچھ فاصلے سے سرو کے درخت تھے۔ سورج بلند ہو گیا تھا اور اس کی روشنی میں پہاڑوں کی چوٹیاں نہایت نمایاں تھیں۔ برف کی چمک یہاں تک آ رہی تھی۔

”خوب صورت منظر ہے۔“ پاس سے فتح خان کی آواز آئی۔

”خدا کا بنایا ہوا ہر منظر خوب صورت ہے، اسے بدصورت انسان بناتا ہے۔“ میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”تم کل رات سے کہاں غائب تھے؟“

”میں کام سے گیا تھا؟“

میں چونکا۔ ”تم یہاں نہیں تھے؟“

”میں فوراً چلا گیا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”میرے آدمی یہاں نہیں ہیں ان کو ایک اور جگہ رکھا ہے۔ ان کو دوسری جگہ چھوڑنا تھا۔“

”تمہیں خطرہ تھا کہ وہاں بھی چھاپا پڑ سکتا ہے؟“

”لازمی بات ہے..... جب ایک جگہ کا مخبری ہو سکتا ہے تو دوسرا جگہ کا بھی ہو سکتا ہے۔“

”ویسے تمہارے آدمیوں کو یہاں ہونا چاہیے تھا۔ آج رات سے پہلے روانگی ہے۔“

”وہ دوپہر تک یہاں آ جائیں گے۔“ فتح خان بولا۔

”کرنل نے تم سے ہیلی کاپٹر اتارنے کی بات کی ہے؟“

”ہاں میرا آدمی پہلے وہاں جائے گا اُدھر ہیلی کاپٹر اتارنے کا بندوبست کرے گا اور وہیں سے ہیلی کاپٹر پر سوار ہو گا۔ تم اور میں اِدھر سے جائے گا۔“ اس نے کہا اور میری طرف دیکھا۔ ”تم بلا وجہ کا پریشان ہو رہا ہے۔ اِدھر سب ٹھیک ہے۔“

”بلا وجہ تو میں کبھی پریشان نہیں ہوا..... میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔“

”کچھ ہونا ہوتا تو اب تک ہو جاتا.....“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایک ناکام چھاپے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ سکون سے بیٹھ جائیں گے۔ ہماری تلاش جاری ہو گی اور شملہ کوئی بہت بڑی جگہ نہیں ہے۔“

فتح خان نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”تم کیا کہتا ہے پھر کیا کرے؟“

”ہمیں جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے، شملہ سے جتنا دور جائیں گے اتنا ہی محفوظ رہیں گے۔“

”یہ تو تم کرنل سے کہو..... انچارج تو وہ ہے۔“ فتح خان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔

”فتح خان لگتا ہے یہ بات تم کو پسند نہیں آئی ہے؟“

”کیسے پسند آئے گا..... کوئی پہلی بار شا کے لیے کام کر رہا ہے..... اس سے پہلے اس کا کتنا کام کیا..... اسے کبھی شکایت نہیں ہوا..... اب ایک گورا لا کر بولتا ہے یہ انچارج ہے..... وہ فوجی ہے لڑ چکا ہے..... پر جو تجربہ فتح خان کے پاس ہے وہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ جلد شا کو پتا چل جائے گا۔“

”فتح خان وہ مخصوص ذہنیت کا گورا ہے۔ تم میرے دشمن ہو لیکن میں تمہاری بات تسلیم کرتا ہوں۔ اب تک جتنے لوگوں سے میرا واسطہ پڑا ہے ان میں سب سے شاطر اور چالاک آدمی تم ہو۔ تم خطرے کو بھانپ کر بہت تیزی سے حرکت میں آتے ہو اور اسی لیے میں نے تمہیں اور تمہارے آدمیوں کو اپنی ٹیم میں رکھا ہے۔ یہ گورے آسمان سے نہیں اترے ہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو لاکھوں کی تعداد میں مسلح ترین فوج چند ہزار افراد کے سامنے یوں زچ نہ ہوتی۔ یہاں ان کی جدید ترین ٹیکنالوجی اور تربیت بھی کام نہیں آ رہی ہے۔“

فتح خان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”شہباز خانا ہم کو بھی اعتراف ہے تم ایک باظرف دشمن ہے..... کاش کہ تم ہمارا دوست ہوتا۔“

”معذرت کے ساتھ تمہارے جو خیالات اور نظریات ہیں ان کے ہوتے ہوئے تمہیں شاید ہی کوئی



دوست ملے، ہاں مفاد پرست ساتھی ضرور ملیں گے جو صرف مفاد کی حد تک ساتھ ہوں گے۔“

اس نے سرد آہ بھری۔ ”تم ٹھیک کہتا ہے..... ہم بوتا جَو ہے اور خواہش گندم کی کرتا ہے۔“

”فتح خان۔“ میں نے موضوع بدل دیا۔ ”ہیلی کاپٹر میں آٹھ افراد کی گنجائش ہو گی لیکن آٹھ افراد ساتھ جائیں گے۔ میرے، تمہارے اور جیتو کے علاوہ تمہارے پانچ آدمی ہوں گے۔ تم ان میں سے پانچ منتخب کر لو جو سب سے بہتر ہوں وہی ہمارے ساتھ جائیں گے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”اب بھی آدمی کم ہے..... پر پلان پر ٹھیک سے عمل کیا تو ہم کامیاب رہے گا۔ ہم کو اطمینان ہے پلان تمہارے مشورے سے بنا ہے۔“

”کرنل زریسکی سے تمہارا ٹکراؤ کہاں ہوا؟“

فتح خان کا چہرہ پھر بگڑ گیا اور اس نے پشتو کی چند نستعلیق گالیوں سے آغاز کیا۔ ”وہ تخم خنزیر ہم کو سوات سے اوپر ملا تھا۔ تم کو وہ کیبن یاد ہے جہاں سے تم کو انڈیا والا ہیلی کاپٹر میں لے گیا تھا۔“

”بالکل یاد ہے۔“

”وہ وہیں تھا۔ وہ میرا کیبن ہے اور اس کا دیدہ دلیری دیکھو اسے استعمال کر رہا تھا۔ اُدھر اسلحے کا ایک بڑا کھیپ آنے والا تھا۔“

”کرنل منگوا رہا تھا؟“

فتح خان نے سر ہلایا۔ ”وہ کچھ مقامی جنگجو گروپوں کو اسلحہ بیچتا ہے۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وطنِ عزیز میں چاروں طرف سے اسلحہ آ رہا تھا۔ پتا نہیں آنے والے وقت میں کیا ہونے والا تھا مگر بے پناہ غیر قانونی اسلحے کی موجودگی کا مطلب تھا کہ اس کے استعمال کے نت نئے راستے نکلتے رہیں گے اور پورے ملک میں انارکی کا تاثر برقرار رہے گا۔ ہم پہلے ہی صوبوں، زبانوں اور فرقوں میں بٹے لوگ ہیں۔ ہماری مخالفت کو اب زبان کے ساتھ اسلحہ بھی مل گیا ہے۔ مختلف ذرائع سے جو چشم کشا رپورٹس سامنے آ رہی ہیں ان سے صرف چند دردمندوں کے سینوں میں اضطراب پیدا ہوتا ہے لیکن عوام کی اکثریت اور اربابِ اختیار خوابِ خرگوش میں مگن ہیں۔ ایک طرف امریکا جیسے ملک میں قانونی اسلحے کو محدود کرنے کی مہم چل رہی ہے تو دوسری طرف ہمارے ہاں غیر قانونی اور مہلک اسلحے کے پھیلاؤ میں اوپر سے لے کر نیچے تک سب لوگ ملوث ہیں۔ متعدد غیر ملکی خفیہ ایجنسیاں اس کام میں ملوث ہیں کیونکہ یہ ہمیں تباہ کرنے کی سب سے آسان ترکیب ہے۔ اس جذباتی اور کم سمجھ قوم کو اسلحہ دے دو مرنے مارنے کے راستے یہ خود نکال لے گی۔

”کس سوچ میں پڑ گیا ہے۔“ فتح خان نے کہا تو میں خیالوں سے چونکا۔ میں نے خفت سے کہا۔

”وہ میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔“

فتح خان نے سر ہلایا۔ ”میں جانتا ہے تم کس سوچ میں پڑ گیا ہے۔ کبھی کبھی میں خود بھی سوچتا ہے کہ مجھ سے بڑے مجرم تو وہ لوگ ہیں جن کا کام ہی اس ملک کی حفاظت کرنا ہے اور وہ خود اس کا جڑ کھود رہا ہے۔ پر میں کچھ نہیں کر سکتا ..... میں چھوٹا مجرم ہے۔ شہباز خانا تم بھی کچھ نہیں کر سکتا تم جیسا لوگ بہت تھوڑا ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”لیکن میرا ایمان ہے مشکلات آدمی اور قوموں کو اوپر لے جانے کے لیے آتی ہیں اور جب وہ ان آزمائشوں سے کامیاب نکلتے ہیں تب ہی کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔“

”ہم ایسا نہیں سوچتا ہے۔“ فتح خان نے گہری سانس لی۔

دن کے وقت مکان سے باہر صرف دو تین آدمی تھے اور وہ بھی اسلحہ چھپائے ہوئے نمایاں ہونے سے گریز کر رہے تھے۔ خاص طور سے ان کی کوشش تھی کہ سڑک سے نظر نہ آئیں۔ رات میں سامنے رکنے والی گاڑیوں کو بھی اب سائیڈ پارکنگ میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ یہاں یہ سڑک سے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ تمام کھڑکیوں پر پردے تھے تاکہ اندر کی سرگرمیاں دکھائی نہ دیں۔ یہ احتیاطی تدابیر اچھی تھیں مگر صرف عام حالات میں..... ابھی ہم شدید خطرے میں تھے۔ کل رات ہم پکڑے جانے سے بال بال بچے تھے اور کچھ پتا نہیں تھا کہ انڈین اس جگہ کا پتا بھی لگا لیں۔ ہمیں جلد از جلد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ میں اندر آیا تو جیتو کچن میں بیٹھا ہوا ڈبل روٹی اور مکھن نگل رہا تھا۔ یہ اس کے لیے خوفناک ناشتا تھا۔ ابلے انڈوں سے وہ پہلے ہی انصاف کر چکا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ لیپ ٹاپ والا بیگ ساتھ لایا تھا اس نے اوپر چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ میں نے اپنے لیے کافی نکالی۔ یہاں سیلف سروس تھی۔ سب اپنے لیے خود ہی ناشتا تیار کر رہے تھے۔ اب مجھے کرنل

کی تلاش تھی۔ وہ کنٹرول روم میں نہیں تھا۔ وہ اوپری منزل میں اپنے کمرے میں ملا تھا۔ کمرے کا مجھے ایک آدمی نے بتایا۔ دستک کے جواب میں اس نے پوچھا۔ ''ہواز دیئر۔''

''شہباز۔''

''آجاؤ۔'' کرنل نے کہا تو میں اندر آیا۔ وہ صرف نیکر اور بنیان میں قالین پر ڈپس لگا رہا تھا۔ وہ بدستور ڈپس لگاتے ہوئے بولا۔ ''کوئی خاص بات؟''

''کرنل میرے خیال میں ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔''

''ہم یہاں سے تین بجے نکلیں گے۔''

ابھی نو بج رہے تھے۔ ''کرنل دیر کی وجہ؟''

''جلدی کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔'' اس نے کسی قدر سرد لہجے میں کہا۔

''خطرہ تو ہے۔'' میں نے اصرار کیا۔ ''اگر ہم چند گھنٹے پہلے بھی نکل جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے گہری سانس لی۔ میں نے خود کمانڈ کی پیشکش قبول نہیں کی تھی اور اب کمانڈر کرنل تھا فیصلہ اس نے کرنا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''اچھا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اپنی پارٹی کے ہمراہ ابھی روانہ ہو جاؤں؟''

''آخر تمہیں کس بات کا خطرہ ہے؟''

''میں نہیں جانتا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے ہمیں جلد از جلد روانہ ہو جانا چاہیے۔''

''ہمیں بہت تیاری کرنی ہے۔'' کرنل نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''اگر میں ابھی حکم دوں تب بھی ہمیں روانہ ہوتے ہوتے بارہ بج سکتے ہیں۔''

''چلو بارہ بجے ہی سہی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس سے زیادہ تاخیر مناسب نہیں ہوگی۔ میں تمہاری کمانڈ میں مداخلت نہیں کر رہا ہوں اسے میری درخواست سمجھ لو۔''

کرنل کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے دروازہ کھول کر کسی جوزف کو آواز دی۔ ایک اسپینش نقوش والا تنومند آدمی آ گیا۔ ''یس کرنل؟''

''تیاری کرو ہمیں بارہ بجے روانہ ہونا ہے۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ''تھینک یو کرنل، تم نے میری بات مان لی۔''

''میں کمانڈر ضرور ہوں مگر یہ مشن تمہارے لیے ہے۔''

اس نے کہا۔ ''میں خود بھی چھٹی حس کے اشارے پر عمل کرتا ہوں۔ بہت بار میری چھٹی حس نے مجھے بچایا ہے۔''

مجھے وسیم کی بات یاد آئی اور میں نے مناسب سمجھا کہ اس سے تصدیق کر لوں۔ ''تم نے ایک ایسے جنگی مشن میں اپنے چوبیس ساتھیوں کو بچایا تھا جس میں تم سب کا بچنا بہت مشکل تھا؟''

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''تمہیں کیسے علم ہوا؟''

''تم غیر معروف نہیں ہو اور تم بھول رہے ہو میں بھی اسی خطے سے تعلق رکھتا ہوں۔''

''ہاں اسی مشن میں، میں شدید زخمی ہوا تھا اور دو سال تک میرا علاج جاری رہا تھا۔'' اس نے تولیے سے جسم صاف کرتے ہوئے کہا۔ اب میں نے دیکھا اس کے پورے اوپری جسم پر زخموں کے بے شمار مدھم نشانات تھے۔ ''میرا خیال ہے میں بھی تیار ہو جاتا ہوں۔''

اس کا اشارہ سمجھ کر میں وہاں سے رخصت ہو گیا اور میرا ارادہ بھی تیاری کا تھا۔ جوزف مجھے راستے میں مل گیا۔ اس نے میرا جائزہ لیا اور بولا۔ ''میرے ساتھ آؤ اپنی کٹ لے لو۔''

ایک کمرے میں دیوار پر ویسے ہی سوٹ لٹکے ہوئے تھے جیسا کرنل نے مجھے ڈیمو میں دکھایا تھا۔ جوزف نے کہا۔ ''اس میں سے اپنے اور اپنے ساتھی کے ناپ کا نکال لو۔''

ٹی شرٹ، ٹراؤزر اور جیکٹ کے ساتھ بلٹ پروف بھی تھا۔ ایک طرف قطار میں جوتے رکھے تھے۔ مخصوص دستانے جو ہتھیلیوں کو حرارت اور سخت چیز کی رگڑ سے بچاتے ہیں، ان میں سے صرف نصف انگلیاں باہر ہوتی ہیں تاکہ ٹریگر دبانے یا انگلیوں والے کسی کام میں رکاوٹ نہ ہو۔ ساتھ میں گیس ماسک بھی تھا۔ یہ منہ اور ناک کو مکمل ڈھک لیتا اور شفاف پلاسٹک کا بنا ہونے کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے رکاوٹ نہیں بنتا تھا۔ اس کے نیچے ایک گول ڈسک لگی تھی جس پر شہد کی مکھی جیسا چھتا بنا ہوا تھا۔ یہ فلٹر تھا جس سے صرف ہوا گزر کر اندر جا سکتی تھی۔ ہر سوٹ کے ساتھ پشت پر باندھنے والا اسکول سائز کا بیگ تھا۔ فی الحال یہ خالی تھا۔ میں نے اپنے اور بیتو کے ناپ کے سوٹ لیے۔ پھر جوتے منتخب کیے اور اپنے کمرے میں آیا۔ بیتو وہاں موجود تھا اور وہ غسل کر چکا تھا۔ اس نے اطلاع دی۔



''شوبی میرا کھر نڈ بھی پکا ہو گیا ہے۔''

''گڈ اب تم تیار ہو جاؤ جب تک میں نہاتا ہوں۔ ہمیں بارہ بجے یہاں سے نکلنا ہے۔''

باتھ روم بڑا نہیں تھا مگر تمام سہولیات سے آراستہ تھا۔ گرم پانی آ رہا تھا۔ میں نہا کر باہر آیا۔ بیتو نے سوٹ اور بلٹ پروف پہن لیا تھا مگر اس کی ڈوریاں ٹھیک سے نہیں بندھی تھیں۔ میں نے انہیں درست کیا اور ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں پہن چکا تھا۔ بیتو نے مجھے بلٹ پروف پہنایا۔ اس سے پہلے بھی میں ایک دو بار پہن چکا ہوں۔ کسی قدر بھاری اور گتھے ہوئے میٹریل سے بنا ہونے کی بنا پر یہ گولی کو گزرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے لیکن گولی کا دھچکا بہرحال انسان کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر سامنے سے گولی لگے تو دھچکے سے پسلی بھی ٹوٹ جاتی ہے لیکن جان بچ جاتی ہے اور یہی اس کا اصل مقصد ہے۔ یہاں موسم زیادہ سرد نہیں تھا اور پھر ابھی دن کا وقت تھا اس لیے جیکٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ جوتے ہمیں پورے تھے۔ گیس ماسک ایک تسمے کی مدد سے گردن میں بلٹ پروف کے ساتھ جھول رہا تھا اور بہ وقت ضرورت اسے منہ پر جمانے میں چند سیکنڈ لگتے۔ بیتو نے پوچھا۔

''باقی سامان اور اسلحہ کب ملے گا۔''

میں نے ڈیجیٹل نقشہ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے روانگی کے وقت نہیں ملے گا یہ منزل پر پہنچ کر ملے گا۔''

ٹراؤزر ملٹری ڈیزائن کا تھا مگر جیکٹ سادہ خاکی رنگ کی تھی۔ ہمیں ابھی سفر کرنا تھا اور راستے میں لوگ چونک سکتے تھے اس لیے جیکٹ کو سادہ رکھا تھا۔ کرنل نے ہر زاویے سے نظر رکھی تھی۔ بیتو نے بیگ لہرایا۔ ''شوبی اس کا کیا کرنا ہے؟''

''فی الحال اسے لیپ ٹاپ اور رقم کے لیے رکھ لیتے ہیں لیکن ابھی اور سامان ملے گا جس کی ضرورت ہوگی۔ وہ اسی بیگ میں جائے گا۔''

بیتو نے اپنے بیگ میں لیپ ٹاپ اور رقم ڈال لی۔ اب تک مجھے اپنے ساتھیوں سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے سوچا کہ راستے میں بات کروں گا۔ یہاں ویسے بھی جیمر لگا ہوا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے ہم نیچے آئے تو بھاری اسلحہ اور سامان وین میں لادا جا رہا تھا۔ باقی سب بھی تیار دکھائی دے رہے تھے۔ جوزف سب کو

## ھارون

حضرت موسیٰ کے بڑے بھائی اور پیغمبر خدا اور بار فرعون میں وکالت موسیٰ کی۔ جب حضرت موسیٰ جبل طور پر تشریف لے گئے تو بنو اسرائیل کا نگران آپ ہی کو مقرر کر گئے تھے۔ اس وقت بچھڑے اور سامری کا واقعہ پیش آیا تھا جس پر واپسی پر آپ حضرت ہارونؑ سے ناراض ہوئے اور بنو اسرائیل کو لعنت ملامت کی۔ آپ کا نسب ولادت چند واسطوں سے حضرت یعقوب تک پہنچتا ہے جو یوں ہے۔ عمران بن قامت بن لاوی بن یعقوبؑ۔ قرآن پاک میں سورہ بقرہ نساء انعام، طلٰہ، انبیاء، مومنون، فرقان، شعرا، قصص میں۔ 140 مقامات پر آپ کا نام مبارک مذکور ہوا ہے۔ آپ کے والد کا نام عمران اور والدہ یوکابد تھا۔ جب بنی اسرائیل نے ارض مقدس میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے ان کو اطلاع دی کہ انہیں چالیس برس اسی سرزمین میں بھٹکنا پڑے گا۔ دونوں پیغمبر بھی موجود رہیں گے۔ سو آپ وہیں رہے ایک روز حکم خدا سے آپ اپنے بھائی کے ساتھ میدان رتیہ، میں ہور، نامی پہاڑ پر چڑھے۔ وہاں چند روز عبادت کی۔ وہیں حضرت ہارونؑ نے انتقال فرمایا۔ حضرت موسیٰ نے اس مقام پر تجہیز و تکفین کی اور اس کے بعد بنو اسرائیل کو آپ کی وفات سے آگاہ کیا۔ تورات میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ ''اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت قادس سے روانہ ہو کر کوہ طور پر پہنچی اور خدا نے کوہ طور پر جو ادوم کی سرحد سے ملا ہوا تھا موسیٰ اور ہارونؑ سے کہا۔ ہارونؑ اپنے لوگوں میں جا ملے گا، کیونکہ اس ملک میں وہ جا نہیں سکے گا جو میں نے بنی اسرائیل کو دیا ہے...... جب ہارونؑ نے وفات پائی تو اسرائیل کے گھرانے کے لوگ تیس دن تک ماتم کرتے رہے۔''

بحوالہ: اسلامی انسائیکلو پیڈیا

مرسلہ: تنزیل عدنان صدیقی، ڈی آئی خان

ایک ایک بیگ بانٹ رہا تھا۔ اس میں پانی کی لیٹر والی دو بوتلیں اور کھانے کا پیک سامان تھا۔ ایک چھوٹا میڈیکل پیک بھی تھا۔ اس میں مرہم پٹی کا سامان اور ہنگامی حالات میں کام آنے والی دوائیں تھیں۔ بیتو نے کہا۔ ''شوبی اس میں تو سب ہے۔''

''ہاں ہمیں وہاں جس چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے وہ اس میں ہے۔''

فتح خان باہر موجود تھا اور ماچس کی تیلی سے دانتوں میں خلال کر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ ''میرا آدمی آ گیا ہے راستے میں ایک جگہ ملے گا۔ ہم وہاں سے ان کے ساتھ جائے گا۔''

''یہ اچھی بات ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔ فتح خان نے بھی وہی لباس پہن لیا تھا اور کچھ بے چین لگ رہا تھا۔ وہ ڈسپلن والا آدمی نہیں تھا۔ یہ بے چینی شاید اسی وجہ سے تھی۔ بارہ سے کچھ پہلے گاڑیاں ایک ایک کر کے روانہ ہونے لگیں۔ مجھے کل ایک بار کے بعد منشی دل جی نظر نہیں آیا تھا۔ مگر وہ یہیں تھا۔ پہلی گاڑی میں، میں، بیتو، فتح خان اور پانچ دوسرے افراد تھے۔ ہم تینوں درمیانی نشست پر تھے۔ باہر نکلتے ہی میں نے لیپ ٹاپ نکال کر آن کیا اور یو ایس بی ڈیوائس لگائی۔ مگر یہاں اس کے سگنل نہیں تھے۔ میں نے مایوس ہو کر انہیں واپس بیگ میں رکھ دیا۔ کنور پیلس کی طرف جانے والی ہائی وے پر چڑھنے کے لیے ہمیں شملہ شہر سے ہو کر گزرنا پڑا تھا اور مجھے وہاں پولیس یا قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کوئی ایسی سرگرمی نظر نہیں آئی جس سے لگتا کہ وہ ہماری تلاش میں ہیں۔ بلکہ مجھے تو چھاپا بھی نمائشی لگ رہا تھا۔ ہم بہت آرام سے وہاں سے نکل آئے تھے۔ شہر میں یقیناً انٹرنیٹ کے سگنل تھے لیکن وہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ بیس منٹ میں ہم شہر سے گزر کر ہائی وے پر آ گئے تھے۔ میں نے فتح خان سے پوچھا۔ ''تمہارے آدمی کہاں ہیں؟''

''وہ آگے ہیں۔'' فتح خان نے جواب دیا۔ ''وہ انتظار کرے گا پھر ہم ایک ساتھ سفر کرے گا۔''

شہر سے باہر آ کر میں نے پھر کوشش کی اور اس بار مجھے سگنل مل گئے۔ میں نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا اور میں اتر کر باہر آ گیا۔ بیتو میرے ساتھ تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کال کرنے جا رہا ہوں۔ سفیر آن لائن تھا۔ یقیناً وہ لوگ کمپیوٹر سے لگے بیٹھے ہوں گے۔ میری کال ریسیو کی گئی۔ اسکرین پر وسیم نمودار ہوا تھا۔ ''السلام علیکم آپ کہاں ہیں؟''

''ہم بڑے بھیا کے گھر کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''امید ہے کل تک بہنا کو لے آئیں گے۔''

''انشاء اللہ!'' وسیم نے کہا۔ اس سے گفتگو کے دوران سفیر اور عبداللہ بھی آ گئے۔ بلکہ ایاز بھی تھا۔ ان سب سے سلام دعا ہوئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ وقت کم ہے دورانِ سفر ان سے بات نہیں ہو سکتی۔۔۔ اور میں اس وقت گاڑی سے اتر کر بات کر رہا ہوں۔ بیتو نے بھی سلام دعا کی آج کسی نے اسے نہیں چھیڑا سب کو احساس تھا کہ ہم ایک خطرناک مشن پر جا رہے ہیں اور سب ہمارے لیے فکر مند تھے۔ دس منٹ بعد کال کاٹ کر میں نے سویرا کا نمبر ملایا۔ اس پر بیل جا رہی تھی مگر وہ ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ دو کوششوں کے بعد میں نے کوشش ترک کر دی اور ہم گاڑی میں آ گئے۔ وقت کم تھا میں آگے جا کر کوشش کر سکتا تھا۔ گاڑی روانہ ہوئی تو فتح خان نے آہستگی سے کہا۔

''تم اُدھر بات کر رہا تھا؟'' اس کا اشارہ سرحد پار کی طرف تھا میں نے سر ہلایا۔ اس نے سرد آہ بھری۔

''ہمارا کوئی نہیں ہے جس سے بات کرے۔''

''تمہارے گھر والے.... بہن بھائی؟''

''ماں باپ گزر گیا..... دو بھائی ہے پتا نہیں کہاں ہے ہماری طرح کا کام کرتا ہے.... ایک بہن ہے وہ اپنے گھر میں آباد ہے اس کا شوہر شریف آدمی ہے اس لیے ہم خود دور رہتا ہے۔''

''شادی تم نے کی نہیں بس اس بے چاری لڑکی کو دھوکا دیا تھا۔'' مجھے بھاگ بھری یاد آ گئی۔ جسے فتح خان مالِ غنیمت کی طرح لے گیا تھا اور ایک نام نہاد نکاح نامے کی مدد سے اس پر قبضہ جما لیا تھا۔ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی پھر میں نے اسے فتح خان کے چنگل سے نکالا اور اس دوران میں زخمی ہونے سے اس کا حمل ضائع ہو گیا تھا بعد میں اسے اور اس کے باپ کو راجا عمر دراز نے اپنے محل میں رکھ لیا تھا۔ اس کے بعد میں نے معلوم نہیں کیا تھا مگر امید تھی وہ وہاں خوش ہو گی اور ہو سکتا ہے اس کا گھر بھی آباد ہو گیا ہو۔ یہ بات فتح خان کے علم میں نہیں تھی۔ البتہ اسے شک ضرور تھا کہ بھاگ بھری ہمارے پاس ہے۔ اس نے ایک دو بار پہلے بھی اس کا ذکر کیا تھا مگر میں نے انکار کیا تو وہ خاموش ہو گیا تھا۔



''وہ مجھ کو یاد آتا ہے۔'' فتح خان نے سرد آہ بھری۔ ''اسے تم لے گیا تھا اور میرے کو یقین ہے اسے تم نے کہیں رکھا ہے۔''

''تم کچھ بھی سمجھنے میں آزاد ہو۔'' میں نے شانے اچکائے۔ ''ویسے تم کسی طرح بھی اس پر حق نہیں رکھتے ہو۔ بلکہ تم نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کر دی۔''

فتح خان چپ ہو گیا۔ یقیناً وہ مجھ سے متفق نہیں تھا۔ گاڑی اب پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتی جانی پہچانی سڑک سے گزر رہی تھی۔ میں اس سڑک پر اتنا سفر کر چکا تھا کہ اب مجھے اس کے موڑ اور نشانیاں بھی یاد ہو گئی تھیں۔ بیتو اداس تھا۔ یقیناً اسے سب یاد آ رہے تھے اور وہ واپس جانا چاہتا تھا۔ ارادہ تو میرا بھی یہی تھا کہ سادی کے ساتھ ہم بھی واپس جائیں گے۔ بارہ بج رہے تھے اور ابھی کم سے کم دو سے ڈھائی گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہمیں فتح خان کے آدمی ایسی ہی ایک گاڑی میں منتظر ملے۔ ہم اتر کر اس میں آ گئے اور اس میں سے ایک آدمی اتر کر دوسری گاڑی میں چلا گیا۔ فتح خان پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ اس کے ساتھ کون سے پانچ آدمی جائیں گے۔ اکیلا جانے والا اداس تھا۔ یہاں بھی ہم درمیان والی نشست پر آ گئے۔ یہ پیچھے سے بڑی تھی اور اس میں آخری حصے میں چار نشستیں تھیں۔ اسی وجہ سے آٹھ آدمی آرام سے آ گئے تھے۔ اب تک کے سفر میں مجھے دوسری گاڑیاں نہیں نظر آئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ فاصلے سے سفر کر رہی تھیں کیونکہ ہائی وے تو یہی تھی۔

ڈیڑھ بجے ہم اس قصبے تک پہنچے جہاں سیتا دیوی اپنے گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ بے خوف رہ رہی ہو گی کیونکہ اس کا سابق عفریت نما شوہر اپنی تمام خطرناکیوں سمیت دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ پتا نہیں اس کی لاش ملی تھی یا پہاڑوں پر پائے جانے والے گوشت خور جانوروں کی خوراک بن گئی تھی۔ یہاں سے آگے بڑھے۔ بیتو نے پہلی بار زبان کھولی۔ ''شوبی یہاں سے کھانے کو کچھ لے نہیں سکتا ہے؟''

''یہ مناسب نہیں ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''ہمیں پلان کے مطابق عمل کرنا ہے اور اس میں کسی آبادی میں رکنے سے گریز کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر ہم ڈبل روٹی اور مکھن سے لنچ کرتا ہے۔'' بیتو نے کہا اور اپنے بیگ سے ایک بڑی ڈبل روٹی، مکھن کا ڈبا اور چھوٹی سی پلاسٹک کی چھری نکالی اور سلائس پر مکھن لگا لگا کر کھانے لگا۔ اس کا چند پیک چیزوں سے گزارا ہونے والا نہیں تھا۔ اس نے مجھے بھی پیشکش کی لیکن میرا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ راستے میں میں بار بار انٹرنیٹ کنکشن چیک کرتا رہا تھا مگر اس کے سگنل صرف آبادی میں مل رہے تھے اور میں وہاں بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہم آخری آبادی کے پاس پہنچے تھے اس کے بعد کنور پیلس تک کوئی اور آبادی نہیں تھی۔ اچانک مجھے راستے میں ایک دیہاتی موبائل فون پر بات کرتا ہوا نظر آیا۔ وہ آبادی کی طرف جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک خیال آیا اور میں نے گاڑی روکنے کو کہا۔

''کیا ہوا؟'' فتح خان نے حیرت سے کہا۔

''گاڑی روکو۔'' میں نے کہا تو اس نے ڈرائیور سے کہا اور اس نے گاڑی روک دی۔ دیہاتی دس بارہ قدم آگے نکل گیا تھا میں اتر کر عجلت میں اس کے پیچھے آیا۔ ''اے رکو..... بھائی۔''

وہ رک گیا اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور کچھ مقامی زبان میں کہا۔ ''مجھے ہندی آتی ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''تم ہندی سمجھتے ہو؟''

''کیا بات ہے بابو؟'' اس بار اس نے اردو میں کہا۔

''مجھے یہ موبائل چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''بہت ضروری سمجھو۔ میں اس کی قیمت دوں گا۔''

''نہیں بیچنا۔'' اس نے انکار کیا۔

میں نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ یہ ہزار والے نوٹ تھے۔ میں نے دس نوٹ الگ کیے اور اس کی طرف بڑھا دیئے۔ ''یہ اس سیٹ کی قیمت سے دوگنے سے زیادہ ہیں۔''

پہلے اس کا منہ کھلا رہ گیا پھر اس پر لالچ غالب آ گیا۔ ''بابو بیس دے گا تو دوں گا۔''

میں نے گہری سانس لی۔ وہ ایک عام سا آدمی تھا اگر اسے ایک ہاتھ رسید کرتا تو وہ خود موبائل دے کر بھاگ جاتا۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرے پاس رقم تھی اور اس کے پاس موبائل تھا۔ مجھے رقم کی اتنی ضرورت نہیں تھی جتنی موبائل کی تھی اور اس کے ساتھ معاملہ الٹا تھا۔ میں نے دس نوٹ اور نکالے۔ مگر اسے دینے سے پہلے پوچھا۔ ''اس میں بیلنس ہے؟''

''ابھی ہزار کا بیلنس ڈلوایا ہے۔'' اس نے ٹھنڈی

سانس لی۔ ”بے شک دیکھ لو۔“

”مجھے دکھاؤ؟“ میں نے مطالبہ کیا تو اس نے بیلنس چیک کرایا اس میں پچ ہزار سے اوپر کا بیلنس تھا۔ میں نے اسے بیس ہزار دیئے۔ ”لو عیش کرو۔ مگر سم بلاک کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہارے گھر آجاؤں گا۔“

اسے خبردار کر کے میں پلٹ آیا۔ اب مجھے ایک ذریعہ مل گیا تھا۔ ایک اجنبی موبائل کا استعمال بہت کم رسکی تھا۔ کنور پیلس کے پاس سگنل ہوتے اور میں کال کر سکتا تھا۔ بیس منٹ بعد ہم اس ٹیلے تک پہنچ گئے جہاں سے ہیلی کاپٹر ہمیں لے گیا تھا۔ گاڑی بہ آسانی اس پہاڑی پر چڑھ گئی۔ ایک کسی قدر ہموار جگہ گاڑی رکی تو ہم نیچے اتر آئے۔ جو ہیلی کاپٹر ہمیں کنور پیلس لے جاتا وہ سائز میں اس ہیلی کاپٹر سے بڑا تھا جس میں فتح خان ہمیں شملہ لے گیا تھا۔ فتح خان نے اوپری حصے کا جائزہ لیا اور پھر اپنے آدمیوں کو جھاڑیاں اور درختوں کی شاخیں کاٹنے پر لگا دیا تاکہ ہیلی کاپٹر کسی دقت کے بغیر اتر سکے۔ وہ بیٹری سے چلنے والی سپاٹ لائٹس لایا تھا۔ اس نے زمین پر چونے سے نشانات بنوائے اور پھر ان سے چاروں سمت ڈوری کی مدد سے ایسی چیزوں کا فاصلہ ناپا جن سے ہیلی کاپٹر کا پنکھا ٹکرانے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہ اس بات کو یقینی بنا رہا تھا کہ ایسا کوئی حادثہ نہ ہو۔ ان کاموں میں تین بج گئے تھے۔ میں نے فتح خان سے پوچھا۔

”کرنل اور اس کے آدمی کہاں ہیں؟ ان سے رابطے کی کیا صورت ہے۔“

فتح خان گاڑی سے ایک بڑے سائز کا جدید ریڈیو نکال لایا۔ یہ ایمرجنسی لائٹ کے سائز کا تھا۔ ”اس سے رابطہ کرے گا۔ مگر ابھی نہیں.... وہ ادھر آگیا ہوگا اس کا آدمی بجلی اور موبائل ٹاور میں بم لگا رہا ہوگا۔“

”اس نے رابطہ کرنا چاہا تو؟“

”یہ آن ہے۔“ فتح خان نے ریڈیو کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہم کو پتا چل جائے گا۔“

یہاں موبائل سگنل نہیں تھے۔ غیر متوقع طور پر فتح خان کے ساتھی چائے اور کافی تھرماس بھروا کر لائے تھے۔ فتح خان نے کافی نکالی تو میں خوش ہو گیا۔ ”یہ کیا ہے کام۔“

”یہ کھانا بھی لایا ہے۔“ فتح خان نے انکشاف کیا۔ ”مرغ کی بجی بنوا کر لایا ہے۔“

”تم اب بتا رہے ہو۔“ بیتو نے خفگی سے کہا۔ ”مجھے لنچ میں بھی ڈبل روٹی اور مکھن کھانا پڑا تھا۔“

”وہ شام کے لیے ہے۔“ فتح خان نے کہا۔ ”ابھی تو میرے آدمیوں نے بھی نہیں کھایا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے ہمیں کم سے کم پانچ گھنٹے پہلے کھانے پینے سے فارغ ہو جانا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ یہاں بلندی زیادہ نہیں تھی۔ فتح خان کی گھڑی میں آلٹی میٹر تھی اس نے بتایا۔

”یہاں بلندی پانچ ہزار نو سو فٹ ہے۔“

اسی لیے یہاں کچھ گرمی تھی خاص طور پر جب ہم پہنچے تھے تو دھوپ بہت تیز تھی اور ہمیں بلٹ پروف بھی چبھنے لگا تھا اس لیے سب نے اتار دیے تھے۔ مگر چار بجے کے بعد جب سورج مغربی افق کی طرف جھک چکا تھا تو گرمی تیزی سے کم ہوئی۔ پہاڑوں میں اگر چند دن بارش نہ ہو اور کھل کر دھوپ نکلے تو بہت اذیت ناک قسم کی گرمی ہو جاتی ہے کیونکہ چٹانیں اور پتھر دھوپ سے تپ جاتے ہیں۔ یہاں شاید ایک دو دن پہلے بارش ہوئی تھی کیونکہ زمین میں معمولی سی نمی تھی اس لیے گرمی بہت زیادہ نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد ریڈیو سے کرنل کی آواز ابھری۔ ایف کے.... ایف کے.... ڈو یو ریڈ می....“

”یس ایف کے ہیئر۔“ فتح خان نے ریڈیو کا ایک بٹن دبا کر کہا۔ ”ہم تیار ہیں۔“

”گڈ.... سب اپنی جگہ پہنچ گئے ہیں۔ سب اوکے ہے۔“

”اوکے.... کاپی۔“ فتح خان نے کہا اور کرنل نے رابطہ ختم کر دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”سب اپنی اپنی جگہ پہنچ گیا ہے۔ اب اگلا مرحلہ ہے۔“

اگلے مرحلے سے مراد بجلی اور موبائل کے ٹاورز میں بم لگانا تھا اور میزائلوں اور اسنائپر کے لیے موزوں جگہ تلاش کرنا تھی۔ اس کے لیے ابھی کئی گھنٹے تھے۔ ہمیں نصف رات کے بعد کارروائی کرنا تھی۔ چھ بجے کے بعد تیزی سے سردی اور تاریکی آئی تھی۔ فتح خان کے ساتھیوں نے الاؤ جلانے کی اجازت مانگی تو اس نے شاندار الفاظ میں ان کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہا کہ وہ لوگ پکنک منانے نہیں آئے تھے۔ البتہ تاریکی ہونے کے بعد کھانا گرم کرنے کے لیے آگ جلائی تھی مگر اسے بھی آڑ میں جلایا تھا اور کھانا اور کافی گرم کرتے ہی اسے بجھا دیا گیا تھا۔ فتح خان اس حوالے سے بہت محتاط تھا۔ کھانے اور کافی سے فارغ ہو کر سب



ستانے لگے تھے۔ اس دوران میں کرنل نے دو بار رابطہ کیا۔ ایک بار اس نے بتایا کہ انسٹالیشن مکمل ہو گئی ہے۔ یعنی بم لگ گئے ہیں اور باہر سے حملہ کرنے والے اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ گئے ہیں۔ دوسری کال میں اس نے جی پی ایس لوکیشن پوچھی تھی۔ فتح خان نے جی پی ایس پر دیکھ کر اسے لوکیشن بتائی۔ سردی ہونے کے بعد سب نے بلٹ پروف اور اس پر جیکٹ پہن لی تھی۔

”اسلحہ کہاں ہے؟“ میں نے فتح خان سے پوچھا۔

”گاڑی میں ہے۔“ اس نے کہا اور اپنے آدمی کو اسلحے والے بیگ لانے کا حکم دیا۔ وہ اندر سے دو بڑے بیگ نکال لایا۔ یہ خاص اسلحہ رکھنے والے بیگ تھے۔ اس میں رائفلیں ٹکڑوں میں تقسیم تھیں۔ سب اپنی اپنی رائفلیں جوڑنے لگے۔ ہر رائفل کے ساتھ چار اضافی میگزین تھے۔ یہ ایک خاص پلاسٹک کے بکٹ میں تھے۔ بکٹ کو جیکٹ سے منسلک کیا جا سکتا تھا اور صرف ایک سیکنڈ میں میگزین تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ جیکٹ کے سامنے والے حصے میں مختلف گرنیڈ رکھنے کی جگہ تھی۔ پستول کے لیے جیب میں جگہ تھی۔ میں نے رائفل میں میگزین لوڈ کیا تو ایک عجیب سی سنسنی کا احساس ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی بارہا اس قسم کے مشن پر جا چکا تھا۔ بہت قتل و غارت گری دیکھی اور کی تھی لیکن یہ احساس سب سے الگ تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ مشن سے بڑھ کر جنگ لگ رہی تھی۔ ہم بہت بڑے پیمانے پر کارروائی کرنے جا رہے تھے اور اس میں یقیناً بہت سارے انسان زندگی ہار جائیں گے۔ انسانی جان کی میرے نزدیک ہمیشہ بہت اہمیت رہی ہے۔ میں نے کبھی انسانوں کو بے دریغ قتل کرنے کو اچھا نہیں سمجھا۔ میری کوشش رہی کہ میرے ہاتھ سے سوائے اشد ترین ضرورت کے کوئی انسانی جان ضائع نہ ہو۔ بہت کم ایسا ہوا کہ میں نے کسی انسان کو سوچ سمجھ کر مارا۔ ورنہ زیادہ تر جان بچانے کی کوشش میں مارے گئے تھے۔ اس لیے جب ایسا کوئی موقع آتا تو مجھے اندر سے عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔

”کیا سوچ رہا ہے شہباز خانا؟“ فتح خان نے پوچھا تو میں چونکا۔

”کچھ نہیں....“ میں کھڑا ہو گیا۔ ”میں ذرا آگے تک جا رہا ہوں۔“

فتح خان کسی قدر مضطرب ہو گیا۔ ”کدھر جاتا ہے؟“

”جہاں موبائل سگنل مل سکیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے ایک بہت ضروری کال کرنی ہے۔ وہ کال جس کے لیے میں نے یہ موبائل لیا ہے۔“

فتح خان سمجھ گیا تھا کہ میں کسے کال کرنے جا سکتا ہوں۔ اس نے سر ہلایا اور گھڑی دیکھی۔ ”ابھی نو بج رہا ہے بہت وقت ہے پر کوشش کرنا جلدی آجاؤ۔“

”تم فکر مت کرو میں ایک گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”شوبی ہم بھی چلے گا۔“ بیتو نے کہا۔

”نہیں تم یہیں رکو۔“ میں نے انکار کیا۔ ”یہ رکھو اور اس میں دیکھ کر کنور پیلس کا نقشہ سمجھنے کی کوشش کرو۔“ میں نے ڈیجیٹل نقشہ اسے تھمایا اور ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔ بیتو نے میرے لہجے سے سمجھ لیا تھا کہ میں اسے لے کر نہیں جاؤں گا اس لیے اس نے دوبارہ نہیں کہا۔ پیدل کا راستہ اچھا خاصا تھا مگر بہت زیادہ بھی نہیں تھا۔ تقریباً تین سو گز کے بعد سڑک آ گئی۔ میں نے موبائل نکال کر دیکھا مگر سگنل غائب تھے۔ میں کنور پیلس کی طرف چل پڑا۔ سگنل اسی طرف ملتے۔ کنور خاندان نے دولت کے بل بوتے پر اس ویرانے میں اپنے لیے جدید زندگی کی تمام سہولتیں حاصل کر لی تھیں، ان میں موبائل فون سروس اور انٹرنیٹ سروس بھی شامل تھی۔ میرا اندازہ تھا کنور پیلس یہاں سے کوئی تین سے چار کلو میٹرز کے فاصلے پر تھا اور مجھے اس سے پہلے سگنل مل جائیں گے۔ تاریکی میں میں محفوظ تھا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں اس لیے بہت چھوٹا سا چاند تھا اور آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے روشنی بہت کم تھی۔ جب کوئی گاڑی آتی تو میں ڈھلان پر چڑھ کر کسی درخت یا پتھر کی آڑ لے لیتا۔ میرا حلیہ ایسا نہیں تھا کہ میں کسی کے سامنے آنے کا خطرہ مول لیتا۔ میں سر سے پاؤں تک مسلح تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں اس سڑک کے ساتھ تھا جو کنور پیلس کی طرف جاتی تھی۔ یہاں سگنل تھے۔ میں ذرا اوپر درختوں کے درمیان آیا۔

اب تک مجھے نہ تو کرنل کا کوئی آدمی نظر آیا تھا اور نہ ہی کوئی گاڑی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ تھے اسی علاقے میں مگر انہوں نے خود کو اچھی طرح کیموفلاج کر لیا تھا۔ یہ اچھی بات تھی کیونکہ کنور پیلس سے تعلق رکھنے والے افراد کی آمد و رفت ہو سکتی تھی اور وہ یہاں مشکوک افراد کو دیکھ کر پیلس والوں کو ہوشیار کر سکتے تھے۔ جب کہ ہمارے منصوبے کا انحصار ہی رازداری پر تھا۔ میں نے ایک ایسی جگہ منتخب کی جہاں سے

میں سڑک پر نظر رکھ سکتا تھا اور مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سویرا کا نمبر ملایا۔ مجھے امید تھی کہ اس بار وہ موبائل کو سینے سے لگائے گھوم رہی ہوگی۔ پہلے اس نے شاید کسی کام سے رکھ دیا ہوگا مگر اجنبی نمبر دیکھ کر وہ سمجھ گئی ہوگی کہ میری ہی کال ہو سکتی ہے۔ میرا اندازہ درست نکلا جب اس نے دوسری بیل پر کال ریسیو کی اور پھولی سانسوں کے درمیان بولی۔

''شہباز.....''

''ہاں سویرا میں۔'' میں نے کہا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' اس کے لہجے سے تڑپ ظاہر تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں سادی کو لینے جا رہا ہوں۔''

وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کس خطرے میں جا رہا ہوں اور وہاں سے میری صحیح سلامت اور کامیاب واپسی بہت سی باتوں اور دعاؤں سے مشروط تھی۔ اس نے کہا۔ ''شہباز میں آپ کو روکوں گی نہیں لیکن آپ وعدہ کریں کہ آپ واپس آئیں گے۔''

''میں یہ وعدہ کیسے کر سکتا ہوں جب کہ زندگی و موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

وہ دبی آواز میں رونے لگی۔ ''میرا دل بیٹھ رہا ہے مجھے لگ رہا ہے.... اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہوا تو میں بھی مر جاؤں گی۔''

میں نے نرمی سے کہا۔ ''تم اللہ سے بہتری کی امید رکھو اور دعا کرو مجھے اس وقت سب سے زیادہ ضرورت دعاؤں کی ہے۔ ماں جی سے بھی کہنا کہ دعا کریں۔''

''میں ضرور دعا کروں گی، میرا رُواں رُواں دعا کرے گا۔'' اس نے کہا۔ ''جب آپ کی کال آئی تو میں نہا رہی تھی۔''

''نکھر گئی ہوگی۔'' میں نے ماضی کو یاد کیا۔ کبھی کبھی سویرا پر بھوت سوار ہوتا تو وہ خود صفائی پر تل جاتی تھی۔ اصل میں اسے صفائی تو میرے کمرے کی کرنی ہوتی تھی مگر اس بات کو چھپانے کے لیے وہ پورے رہائشی پورشن کی صفائی کر ڈالتی تھی اور بھوت بن جاتی۔ پھر نہا دھو کر آتی تو اس کا رنگ و روپ ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ وہ بولی تو اس کے لہجے میں شرم تھی۔

''آپ کو یاد ہے؟''

''میں بھولا کچھ بھی نہیں ہوں۔'' میں نے اس کا موڈ بدلنے کے لیے ذرا شوخ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا رنگ و روپ بھولنے والی بات بھی نہیں ہے۔''

''توبہ ہے کن لوگوں کی صحبت میں رہ رہے ہیں۔'' اس نے بڑبڑا کر کہا۔ ''کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔''

''یہاں چاروں طرف میری جیسی صورتیں ہیں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہاں خیالوں میں تم ہوتی ہو میرے ساتھ۔''

''شہباز آپ سچ مچ بھی میرے ساتھ ہوں گے پلیز وعدہ کریں؟'' وہ پھر جذباتی ہوگئی۔

''سویرا میں وعدہ نہیں کرتا لیکن میری کوشش پوری ہوگی کہ واپس آؤں تمہارے لیے۔''

''میں آپ کا انتظار کروں گی۔'' اس نے کہا۔ ''آپ ابھی کہاں ہیں؟''

''سمجھ لو سادی کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو وہ صبح کا سورج نکلنے سے پہلے ہمارے پاس ہوگی اور امکان ہے کہ چوبیس گھنٹے سے پہلے ہم واپس آجائیں گے۔''

''سچ کہہ رہے ہیں؟''

''ارادہ تو یہی ہے آگے جو اللہ کی مرضی۔'' میں نے کہا۔

''نہیں مجھے یقین ہے اللہ آپ سب کو بہ حفاظت واپس لائے گا۔'' سویرا نے یقین سے کہا۔ اسی لمحے پاس کسی گاڑی کی آواز آئی اور میں چپ ہوگیا۔ سویرا نے محسوس کرلیا اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''شش کوئی پاس ہے۔'' میں نے کہا۔ اگرچہ گاڑی سڑک سے گزر رہی تھی لیکن یہاں سناٹا شدید تھا اور احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں خاموش رہوں۔ گاڑی گزر کر آگے چلی گئی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا دس بجنے والے تھے۔ میں نے سویرا سے کہا۔ ''وقت کم ہے زندگی رہی تو خوشخبری کے ساتھ دوبارہ بات کروں گا۔''

''ایک منٹ۔'' سویرا نے کہا وہ اتنی دیر سے خاموش تھی۔

''بولو۔''

سویرا کچھ دیر بعد بولی۔ ''میں کچھ پڑھ کر آپ پر پھونک رہی تھی اس لیے خاموش تھی۔ شہباز میں آپ کا انتظار کروں گی۔''



اسے الوداع کہنا مشکل کام تھا مگر کہنا تو تھا۔ میں کال کے بعد بوجھل دل کے ساتھ واپس روانہ ہوا۔ سڑک ویران تھی بائیں طرف کوئی بیس پچیس گز آگے وہ موڑ تھا جو کنور پیلس کی طرف جا رہا تھا۔ گاڑی کنور پیلس والی سڑک پر مڑی تھی۔ میں مڑا اور واپس ٹیلے کی طرف چل پڑا۔ میرے قدم سست اور بوجھل تھے۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر سویرا کا بھیگا لہجہ آ رہا تھا۔ میری جب اس سے بات ہوتی تو اس کا اختتام سویرا کے آنسوؤں پر ہوتا تھا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے ذہن میں اس کی آواز اور سسکیاں گونج رہی تھیں۔ شاید اسی لیے میں عقب میں آنے والے آدمی کے قدموں کی آہٹ نہیں سن سکا تھا۔ پھر وہ بہت دبے قدموں آیا تھا۔ بالکل آخری لمحوں میں مجھے آہٹ آئی لیکن اس سے پہلے میں مڑتا کوئی چیز میرے سر سے ٹکرائی اور میں نیچے گر گیا۔ ضرب شدید تھی اور میرا ذہن جیسے کسی تاریک دلدل میں دھنسنے لگا تھا۔ چند لمحے کی غفلت نے یہ وقت دکھایا تھا۔ میں نے کسی کی آواز سنی۔ ''میں نے ٹھیک کہا تھا نا بندہ ہے موبائل کی لائٹ تھی۔''

''یہ تو پوری طرح ہتھیار بند ہے۔'' دوسرے نے کہا۔ وہ دونوں ہندی میں بات کر رہے تھے۔ ''سیدھا کر اسے۔''

میں منہ کے بل گرا تھا۔ کسی نے مجھے ٹھوکر مار کر سیدھا کیا اور حیرت سے بولا۔ ''یہ تو وہی ہے بڑے کنور والا بندہ....''

''ہاں وہی ہے لے چل اسے....'' دوسرا جوش سے بولا۔ ''بڑا کنور اس کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ اپنے تو وارے نیارے ہو جائیں گے بڑا کنور انتا دے گا۔''

''سمجھ لے لاٹری نکل آئی ہے۔ تو اس کے پاس رک اور اس کے ہاتھ پیر باندھ دے میں گاڑی لاتا ہوں۔'' پہلے نے کہا اور چلا گیا دوسرا میرے پاس بیٹھ کر مجھے ٹٹولنے لگا تھا۔ اس نے رائفل شانے سے اتارنا چاہی تو میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑا اس نے بدک کر کہا۔

''ہوش میں ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے میرے سر پر ایک وار اور کیا۔ اس بار میں فوراً بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہائے ری قسمت.... کمند دو چار ہاتھ نہیں بلکہ دو چار انچ لبِ بام سے پہلے ٹوٹ گئی تھی۔ میں سادی کو آزاد کرانے آیا تھا اور خود اسیر ہو گیا تھا۔ میری تیاری کنور پیلس کی حفاظت کے لحاظ سے تھی

عربی لفظ وقوف کے معنی قیام کرنا، ٹھہرنا، رکنا، حج کے دوران مختلف مقامات پر قیام کرنے کو وقوف کہتے ہیں۔ ان کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا۔ یہ ایک قسم کی عبادت ہے، یہاں بندہ خدا کے حضور کھڑا ہوتا ہے۔ جب 9 ذوالحج کو حاجی منیٰ سے میدان عرفات میں آتے ہیں تو ان کے لیے دوپہر سے غروب آفتاب تک میدان میں قیام کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسے ''وقوف عرفہ'' کہتے ہیں۔ اس وقت امام ایک طویل خطبہ پڑھتا ہے یہاں سے مزدلفہ کی طرف کوچ ہوتا ہے۔ جہاں ظہر و عصر کی نماز یکجا ادا کی جاتی ہے۔

اس موقع پر حاجی استغفار پڑھتے ہیں، دعا مانگتے اور تکبیر و تہلیہ کہتے ہیں۔ دوسرا وقوف دس ذوالحج کی صبح کو مزدلفہ میں ہوتا ہے۔ منیٰ جانے سے قبل حاجی مشعر الحرام پر نماز فجر پڑھنے سے قبل آجاتے ہیں اور ایک پہر تک ٹھہرتے ہیں۔ اسی طرح پتھر مارنے کے بعد 11-12 اور 13 ذوالحج کو بھی منیٰ میں وقوف کی ہدایت ہے۔ صفا و مروہ کے درمیان جب حاجی تقریباً دوڑتے ہوئے گزرتے ہیں تو یہ بھی وقوف ہی کہلاتا ہے۔

مرسلہ: نعیم الحسن سید، میاں چنوں

مگر مجھے بڑے کنور کے دو معمولی ملازموں نے قابو کر کے اسیر کرلیا تھا۔ میری معمولی سی غلطی سے.... میں نے سوچا نہیں تھا کہ میرے کان سے لگے موبائل کی اسکرین کی روشنی کسی کو نظر آسکتی ہے۔ وہ گاڑی پر یہاں سے گزر رہے تھے اور یقیناً یہ اتفاق تھا کہ ایک نے دیکھ لیا۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ وہ نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کے بجائے موڑ کے بعد رک گئے اور پھر خاموشی سے میرے پیچھے آئے۔ رائفل سے انہوں نے اندازہ کرلیا کہ میں خطرناک آدمی ہوں اور مجھے بے خبری میں قابو کرنا ہی مناسب ہوگا۔ انہوں نے کامیابی سے اس پر عمل کیا۔

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں ایک کرسی پر اس حالت میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ پشت پر ہتھکڑی سے بندھے

تھے اور مجھے ہوش میں لانے کے لیے چہرے پر پانی پھینکا گیا تھا۔ میری جیکٹ، بلٹ پروف اور جسم سے تمام ہتھیار اور دوسری چیزیں اتار لی گئی تھیں۔ میرے جسم پر شرٹ، ٹراؤزر اور جوتے تھے۔ مگے سے پھینکا جانے والا پانی سرد تھپڑ کی طرح میرے منہ پر لگا اور بہہ کر شرٹ پر آیا تھا۔ دوسرے مگے پر مجھے ہوش آگیا۔ سر شدت سے دکھ رہا تھا۔ دوسری ضرب نے سر پھاڑ دیا تھا اور خون بہہ کر میرے گال تک آیا ہوا تھا۔ پانی پڑا تو جما خون بھی بہنے لگا تھا۔ چوٹ ٹھنڈی ہو کر دکھ رہی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر منہ اٹھایا اور بے ساختہ کراہا تھا۔ سر ہلانے سے قیامت کا درد اٹھا تھا۔ جب ذرا درد کم ہوا تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ میرا خیال تھا سب سے پہلے بڑے کنور سے سامنا ہوگا۔ مگر سامنے ہی رامن اور نائیک اپنی مکروہ صورتوں کے ساتھ موجود تھے۔ رامن طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ”میری لک.... تم خود گرفتار ہو کر آگئے۔“

”تمہاری لک؟“ میں نے جوابی طنز کیا۔ ”یا تمہارے آقا کی لک۔“

”جو تم سمجھ لو۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”اس خیال میں مت رہنا کہ تم اب یہاں سے بچ کر نکل سکو گے۔“

”خوش فہمیاں میں نے کبھی نہیں پالیں۔“ میں نے کسمسا کر اس جگہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ کمرے سے اندازہ ہو گیا کہ میں کنور پیلس کے قید خانے میں تھا جہاں پہلی بار آمد پر مجھے رکھا گیا تھا۔ دھات سے بنی کرسی زمین میں فکس تھی اور اسے ہلانا بھی ناممکن تھا۔ اس میں ہاتھ پیروں کو جکڑنے کے لیے خصوصی انتظامات تھے۔ رامن کی نسبت نائیک کے تاثرات زیادہ خطرناک تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ رامن شریف تھا۔ وہ لکڑ بھگے کی فطرت رکھنے والا عیار شخص تھا جو اپنے جذبات آخر وقت تک چھپائے رکھنے کا ماہر تھا۔ میری نظر کسی گھڑی کی تلاش میں تھی جس سے مجھے وقت کا اندازہ ہو۔ مجھے ہوش میں لایا گیا تھا اور اگر یہ کام کنور پیلس میں لاتے ہی کیا گیا تھا تب بھی میں آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت بے ہوش رہا تھا اور میں دس کے آس پاس میں بے ہوش ہوا تھا۔ یعنی کم سے کم ساڑھے دس ہو رہے تھے۔ لیکن یہ ایک اندازہ تھا ہو سکتا تھا میں اس سے زیادہ دیر بے ہوش رہا ہوں۔ میری کلائی سے گھڑی اتار لی گئی تھی اور وہاں دیواروں پر سوائے آلاتِ تشدد کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہ جگہ انٹروگیشن سیل تھا۔ جہاں کنور خاندان کے معتوبوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ نائیک اور رامن دونوں کی کلائیوں پر گھڑی تھی لیکن ان کے ڈائل میری سمت نہیں تھے۔ ورنہ میں ان سے وقت کا پتا چلا سکتا تھا۔ چند منٹ میں درد میں کسی قدر کمی آئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

”وہ کون تھے جنہوں نے مجھے بے ہوش کیا تھا؟“

”میرے آدمی تھے۔“ رامن نے دانتوں کی نمائش کی۔ ”یہ اتفاق ہے تم ان کے ہتھے چڑھ گئے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ میری گرفتاری اتفاقیہ تھی۔ ورنہ ہوش میں آنے کے بعد مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ حملے کے بارے میں بھی نہ جان گئے ہوں۔ رامن کسی قدر آگے آیا۔ ”لیکن تم اس طرح کمانڈو بنے یہاں کیا کر رہے تھے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے میں کیا کر سکتا ہوں؟“ میں نے الٹا سوال کیا۔

”یہ اسی کو آزاد کرانے آیا ہوگا۔“ نائیک نے گھٹیا لہجے میں کہا۔

”نہیں میں تمہاری ناپاک روح کو تمہارے جسم سے آزاد کرانے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے مجھے اس کا موقع ضرور ملے گا۔“

”خود موت کی کرسی پر بیٹھے ہو اور باتیں سنو۔“ نائیک نے فلمی ولن کے انداز میں قہقہہ لگایا۔

میں نے جھک کر دیکھا۔ کرسی مکمل طور پر دھاتی تھی اور اس سے ایک موٹا تار نکل کر نزدیکی سوئچ بورڈ تک جا رہا تھا جس سے ایک ریگولیٹر اور ایک ہینڈل منسلک تھا۔ ریگولیٹر کرنٹ کنٹرول کرنے کے لیے تھا اور ہینڈل گھمانے سے کرسی میں کرنٹ دوڑ جاتا ہوگا۔ میرے جسم میں خوف کی سرد لہری دوڑ گئی۔ کرنٹ کیسے آدمی کو توڑتا ہے مجھے اس کا تجربہ تھا جب اکرام چشتی نے مجھ پر کرنٹ کا تجربہ کیا تھا۔ مگر میں نے اپنا ظاہر پُرسکون رکھا تھا۔ میں نے رامن کی طرف دیکھا۔ ”اگر تمہارا مقصد مجھے زیادہ سے زیادہ عذاب سے مارنا ہے تو دیر کس بات کی ہے اپنا کام شروع کرو۔“

”فکر نہ کر جلد اس کا وقت بھی آئے گا۔“

”تب تم کیا چاہتے ہو.... بڑے کنور کے لیے میرا خون نچوڑنا چاہتے ہو؟“

اس نے میرا سوال نظر انداز کیا اور بولا۔ ”ابھی تو



میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کس مقصد کے لیے یہاں آئے ہو؟“

”ظاہر ہے سادی کو آزاد کرانے اور اسے واپس لے جانے کے لیے۔“

رامن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”شہباز تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ تم کنور پیلس کی سیکورٹی سے اچھی طرح واقف ہو۔ ایک آدمی اس کے گیٹ میں بھی نہیں گھس سکتا ہے اور تم اندر گھسنے کا دعویٰ کر رہے ہو۔ میں نہیں مان سکتا۔“

”نا مانو۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”ویسے ایک سوال ہے؟“

”کیا؟“

”یہاں کا حکمران بڑا کنور ہے یا پھر کوئی انقلاب آگیا ہے؟“

”بڑا کنور ہی یہاں کا حکمران ہے۔“ رامن نے چالاکی سے کہا۔

”تب مجھے اس کی تحویل میں ہونا چاہیے لیکن ایسا لگ رہا ہے اسے یہاں میری موجودگی کی خبر بھی نہیں ہے۔“

”تمہارا اندازہ درست ہے۔“ رامن نے کہا۔ ”میں نے کہا نا وہ دونوں میرے آدمی تھے۔“

رامن انہیں اپنے آدمی قرار دے رہا تھا جب کہ بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے ان کی جو گفتگو سنی تھی اس سے لگ رہا تھا وہ بڑے کنور کے ملازم تھے اور مجھے اس کے حضور پیش کر کے انعام و اکرام کے لیے پُرامید تھے۔ مگر اس وقت مسئلہ یہ نہیں تھا کہ میں کس کے قبضے میں تھا۔ اس وقت رامن اور بڑا کنور میرے لیے برابر تھے۔ مجھے فکر تھی کہ فتح خان اور دوسرے میرے غائب ہونے سے کسی تذبذب کا شکار نہ ہو جائیں اور حملہ ترک کر دیا جائے۔ اب حملہ ہونا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ میں یہیں پھنسا رہ جاتا۔ رامن میرے پاس سے برآمد ہونے والا اسلحہ دیکھ رہا تھا۔ یہ سب ایک طرف میز پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے وائس بم والا سلینڈر اٹھایا تھا۔ وہ اس کی چابی کے ساتھ چھیڑ کرنے جا رہا تھا کہ میں نے خبردار کیا۔ ”چابی مت چھیڑنا.... ورنہ یہ پھٹ جائے گا۔“

”میں احمق نہیں ہوں۔“ رامن نے اطمینان سے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے یہ وائس بم ہے۔ یہ رائفل، پستول، گرنیڈ اور اسموک گرنیڈ حاصل کر لینا کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن یہ....“ اس نے وائس بم اوپر کیا۔ ”بہت ہائی ٹیک ہتھیار ہے۔ اسے ہر شخص حاصل نہیں کر سکتا ہے۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے.... ٹیکنالوجی کی ترقی اور اس سے زیادہ چور بازاری کی ترقی نے ہر ممنوع چیز کو قابلِ حصول بنا دیا ہے۔ تمہارے پاس پیسا ہے تو تم سب خرید سکتے ہو۔“

رامن ذرا آگے آیا اور جھک کر میرے چہرے کے پاس منہ لا کر بولا۔ ”شہباز مجھے تمہاری بات کا ذرا اعتبار نہیں ہے۔“

”مت کرو۔“ میں نے بے پروائی سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میری نظر اس کی کلائی پر بندھی گھڑی پر تھی۔ مجھے ٹھیک سے ڈائل نظر نہیں آیا لیکن ایسا لگا جیسے گیارہ بجنے والے ہیں۔ میرا دل ایک لمحے کو دھڑکا تھا۔ طے ہوا تھا کہ نصف رات کے بعد حملہ ہوگا۔ وقت کا تعین کرنل کرتا۔ وہ جب مناسب سمجھتا حملے کا حکم دیتا۔ مگر حملہ رات دو سے صبح چار بجے کے درمیان ہوتا۔ اگر گیارہ بجے تھے تو حملے میں تین سے پانچ گھنٹے کا وقت تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کم سے کم تین گھنٹے کا وقت میں کیسے گزاروں گا؟ رامن کے تیور بتا رہے تھے وہ مجھ سے حقیقت اگلوانے کے لیے کچھ کر گزرنے کو بے تاب تھا۔ یقیناً اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوگا کہ ہم کس پیمانے پر کارروائی کرنے جا رہے تھے؟ شاید اسے خیال ہوگا کہ میرے کچھ اور ساتھی بھی ہوں گے اور وہ مجھ سے ان کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

رامن نے جھکے جھکے گردن گھما کر نائیک کی طرف دیکھا تو جیسے اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ وہ دیوار پر لگے سوئچ اور ریگولیٹر کی طرف بڑھا۔ اس نے ریگولیٹر کا ڈائل گھما کر کرنٹ کے وولٹیج طے کیے۔ اس نے یقیناً کرنٹ اتنا رکھا تھا کہ میں مروں نہیں۔ مگر کرنٹ مارے نہ بھی تب بھی وہ آدمی کی جان نکال لیتا ہے۔ میں نے دانت بھینچ لیے تھے اس کے باوجود جب اس نے سوئچ آن کیا تو میں بے اختیار اچھلا تھا اور میرے منہ سے دہاڑ نکلی تھی۔ اس نے شاید ایک دو سیکنڈ کے لیے سوئچ آن کیا تھا مگر مجھے یہ چند لمحے صدی جیسے لگے تھے۔ میرا بندھا جسم جھٹکے کھا رہا تھا اور تڑپ رہا تھا۔ مگر میں ایک حد سے زیادہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ نائیک نے سوئچ بند کیا تو کرنٹ رکا اور میری سانس بحال ہوئی۔ ذرا سی دیر میں کرنٹ نے میرا برا حال کر دیا تھا۔ پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

رامن اسی طرح جھکا ہوا دیکھ رہا تھا اس نے پوچھا۔

”اب کیا کہتے ہو؟“

میرا تھوک جواب بن کر اس کے منہ پر گرا تھا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر رومال سے منہ صاف کیا اور نائیک کی طرف دیکھا اور اس نے سوئچ آن کر دیا۔ اس بار کرنٹ زیادہ دیر تک جاری رہا تھا۔ میں لرزتا رہا اور چلاتا رہا۔ جب کرنٹ رکا تب بھی میرے حواس بحال نہیں ہوئے تھے۔ کمرا نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ منہ میں نمکین ذائقہ آرہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زبان دانتوں میں آگئی ہو۔ کرنٹ رکنے کے بعد میں کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر بے قابو سانس کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سر گھوم رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ اگرچہ بے ہوش ہونے میں عافیت تھی شاید مجھے ان دونوں کے ستم سے نجات مل جاتی مگر یہ ایسی صورتِ حال تھی کہ میں بے ہوش ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میں بے ہوش ہو جاتا اور اسی دوران میں حالات میں کوئی تبدیلی آتی تو میں اس سے فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ رامن نے میرے بال پکڑ کر جھنجوڑے اور کتے کی طرح غرایا۔ ”شہباز! بول تیرے ساتھ اور کون ہے۔“

”کوئی نہیں ہے....“ میں نے ہانپ کر کہا۔ ”اگر کوئی ساتھ ہوتا تو کیا میں تمہارے دو عام ملازموں کے ہاتھوں پکڑا جاتا۔“

”تب تم اکیلے یہاں کیا کر رہے تھے؟“

”میں نے سوچ لیا تھا کہ کنور پیلس کی کوئی گاڑی روک کر اس کی مدد سے اندر پہنچ جاؤں گا۔“

”تم جانتے ہو یہ ممکن نہیں ہے.... باہر سے آنے والی ہر گاڑی کی مکمل تلاشی لی جاتی ہے بے شک اس میں کنور فیملی کا کوئی فرد کیوں نہ ہو۔ کلیئر ہونے کے بعد ہی اندر جانے والا گیٹ کھلتا ہے۔“

”میں نے چانس لینے کی کوشش کی تھی۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ وہ رفتہ رفتہ اپنا صبر کھو رہا تھا اور یہ بات میرے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔ ایک حد سے زیادہ کرنٹ مجھے ناکارہ کر دیتا اور وقت آنے پر میں حرکت کرنے کے قابل نہ رہتا۔ اس کے علاوہ بھی وہ تشدد کے حربے آزمانے کے لیے آزاد تھے۔

”تم فضول کی بحث کر رہے ہو۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”اگر فرض کرو میرے کچھ ساتھی باہر ہیں تو میرے بغیر وہ بیکار ہیں۔“

”وہ بیکار ہیں مگر میں انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔“ رامن نے کہا۔ ”خاص طور پر تمہارے اس ساتھی کو جس کا تعلق یہیں کے قبائلیوں سے ہے اور جو تمہارے ساتھ پاکستان چلا گیا تھا۔“

میں چونکا تھا۔ اسے بیتو کے بارے میں کیسے علم ہوا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ پاکستان میں ہے۔“

میرے جواب پر حرامزادے نائیک نے رامن کے اشارے کے بغیر ہی سوئچ آن کر دیا۔ اس بار کرنٹ غیر متوقع اور شدید تھا اور زیادہ دیر تک جاری رہا تھا۔ کرنٹ بند ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک میرا جسم بے اختیار لرزتا رہا تھا۔ اس بار سر اٹھانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ پہلے سانس بے قابو تھا اور اب سانس آ ہی نہیں رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میری حالت اس قابل ہوئی کہ میں سر اٹھا سکوں۔ رامن نے کہا۔ ”میں تصدیق کر چکا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ یہاں آیا ہے۔ تمہیں وہ ٹرک والا یاد ہے جسے تم نے ہائر کیا تھا۔“

”اگر سنگھ۔“ میں چونکا۔ ”تم لوگ اس تک پہنچ گئے تھے؟“

رامن مسکرایا۔ ”تمہیں یاد ہے اس کا نام.... ہاں وہ ہمارے قبضے میں آگیا تھا۔ میرا مطلب ہے رانے اٹھالیا تھا۔“

”تھا۔“ میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”یعنی اسے چھوڑ دیا بعد میں؟“

”ہاں اب تو اس کا کریا کرم بھی ہو گیا ہوگا۔“ رامن نے یوں کہا جیسے معمولی سی بات ہو۔ اگر سنگھ کی موت کا سن کر مجھے جھٹکا لگا تھا۔ میں نے بے یقینی سے کہا۔

”اسے مار دیا.... کیا قصور تھا اس کا؟“

”تم جانتے ہو اس کا قصور۔“ رامن نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اس نے سرحد پار سے آنے والوں کی مدد کی تھی۔“

”کیا میرے ماتھے پر لکھا تھا کہ میں سرحد پار سے آیا ہوں۔“ میں نے برہمی سے کہا۔ ”میں نے اس کا ٹرک کرائے پر لیا تھا اور ہم نے اسے راستے میں چھوڑ دیا تھا۔“

”وہ بی ایس ایف کے چار آدمیوں کی لاشوں کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔“ رامن نے کہا۔ ”تم سوچ سکتے ہو فورس اور ایجنسی کے غم و غصے کا کیا حال ہوگا۔“

”ہاں جب تم لوگ اصل ذمے داروں کو نہیں پکڑ پاتے تو اپنی نااہلی کا غصہ بے گناہ اور مجبور لوگوں پر نکالتے ہو۔“ میں نے تلخی سے کہا۔

”تم اس کی نہیں اپنی فکر کرو۔“ رامن کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”وہ لڑکا کہاں ہے؟“



”تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر وہ یہاں ہوتا تو میں اس کے بارے میں بتا دیتا.... وہ ضد کر کے آگیا تھا لیکن پھر میں نے اسے واپس بھیج دیا۔ وہ ناتجربے کار تھا اور یہاں اس کا کوئی کام نہیں تھا۔“

”تم جھوٹ کہہ رہے ہو وہ یہیں ہے۔“

”تو معلوم کر لو۔“ میں نے سوئچ کی طرف دیکھا۔ ”ایسا کرو اسے فل کر دو اور کرنٹ کھول دو.... تب شاید میں زبان کھول دوں۔“

رامن نے دانت پیسے۔ ”شاید ایسا ہی کرنا پڑے۔“ لیکن اس سے پہلے وہ نائیک کو اشارہ کرتا جو سوئچ آن کرنے کے لیے بے قرار تھا، رامن کے پاس سے بیل کی آواز آئی اس نے موبائل نکال کر دیکھا اور پھر نائیک سے کہا۔ ”سب ایز اٹ از رکھنا کوئی تبدیلی نہ ہو میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

نائیک کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ رامن نے اسے مجھ سے چھیڑ چھاڑ نہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ باہر چلا گیا اس کے جاتے ہی نائیک نے خباثت سے میری طرف دیکھا۔ ”دل تو چاہ رہا ہے کہ سچ مچ تجھے روسٹ کر دوں۔“

”ہاں دل کی کیا بات ہے.... لیکن تمہارا آقا تمہیں صرف بھونکنے کا حکم دے کر گیا ہے افسوس کہ تمہیں کاٹنے کی آزادی نہیں ہے۔“

نائیک کو کئی بار میرے ہاتھوں زک اٹھانی پڑی تھی۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تب بھی اس کی عداوت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ وہ اُن خبیث فطرت لوگوں میں سے تھا جو نزدیک آنے والے ہر فرد پر اپنا ڈنک آزماتا ہے اور جن پر نہیں آزما پاتا۔ ان کا زیادہ دشمن بن جاتا ہے۔ اس نے مکروہ شکل بنا کر کہا۔ ”تمہیں کاٹ بھی سکتا ہوں۔“

مجھے اندازہ تھا کہ وہ کیا بدمعاشی کرے گا۔ اس نے کرنٹ کم کیا اور سوئچ آن کیا تھا تو میں پہلے سے تیار تھا۔ میں نے ایسی فلک شگاف چیخ ماری کہ نائیک بھی اچھل پڑا تھا۔ اس نے ایک لمحے کو کرنٹ آن کیا تھا۔ میری آواز باہر تک گئی تھی اور فوراً رامن نے اندر جھانک کر کھا جانے والی نظروں سے نائیک کو دیکھا تو وہ فوراً بھیڑیے سے بھیڑ بن گیا تھا۔ رامن کے جانے کے بعد میں ہنسا تو وہ مشتعل ہو گیا تھا مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اس بک بک میں مزید آدھا گھنٹا گزر گیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے نائیک کی گھڑی سے ہوا۔ وہ پاگل کتے کی سی بے قراری سے میرے سامنے ٹہل رہا تھا اور کئی بار اس کی گھڑی میرے سامنے آئی۔ اس بار میں نے واضح دیکھا ساڑھے گیارہ سے اوپر کا وقت ہو گیا تھا۔ مسلسل کئی بار کرنٹ کھانے سے میرا گلا خشک ہو گیا تھا اور مجھے پیاس لگ رہی تھی مگر میں پانی مانگ کر ذلیل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ پانی تو کیا ملتا نائیک کو موقع مل جاتا مجھے اذیت پہنچانے کا۔ اس لیے صبر سے برداشت کرتا رہا۔

خود پر قابو رکھنے اور ذہن پُرسکون کرنے کے لیے میں نے سانس کی ایک مشق شروع کر دی اور اس کا فائدہ بھی ہوا تھا کیونکہ نائیک نے سادی کے حوالے سے بکواس شروع کر دی تھی۔ وہ اپنی ذہنی گندگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میں نے اشتعال میں آنے کے بجائے خود کو سمجھایا کہ وہ کتا ہے اور اس کا کام ہی بھونکنا ہے میں اسے نہیں روک سکتا تھا اور جواب میں بھونک بھی نہیں سکتا تھا ہاں جلد موقع آتا تو میں اسے عملی جواب دے سکتا تھا۔ اس کی گندی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر سکتا تھا۔

وہ بھونکتا رہا اور میں سانس کی مشق کرتا رہا۔ اس مشق کے باوجود بعض اوقات میرے لیے ضبط کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ آدمی کے لیے عزت کا وار سب سے بڑھ کر ہوتا ہے اور وہ یہی وار کر رہا تھا۔ میں اسے جواب نہیں دے سکتا تھا البتہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ موقع ملنے پر اسے چھوڑوں گا نہیں جب وہ چپ ہوا تو میں نے اسے آگاہ بھی کر دیا۔

”جب مجھے موقع ملا میں تمہیں کتے کی موت مار دوں گا۔“

”ابھی تو تُو خود کتے کی موت مرے گا۔“ نائیک نے ہانپتے ہوئے کہا اور باہر چلا گیا۔ وہ میری طرف سے بے فکر تھے کیونکہ میں کسی صورت از خود اس کرسی سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ فولادی کڑوں نے میرے ہاتھ پاؤں جکڑ رکھے تھے۔ سامنے میرے سارے ہتھیار رکھے تھے اور میں بے بسی سے انہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ اچھا ہوا تھا کہ میں لیپ ٹاپ بیتو کے پاس چھوڑ آیا تھا اور میرے پاس صرف خریدا ہوا موبائل تھا۔ اس میں ایک ہی نمبر تھا اور وہ بھی سویرا کا تھا اس سے میرے دشمن کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے ہاں اگر سفیر یا وسیم کے نمبر آ جاتے تو اس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مگر مجھ سے یہ عقل مندی نہیں ہوئی کہ میں انہیں کال کرتا۔ میں نے موبائل صرف سویرا سے رابطے کے لیے لیا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ میں آتے ہوئے کنور پیلس کا ڈیجیٹل میپ بیتو کو دے آیا تھا۔ وہ میرے پاس سے نکل آتا تو رامن بہت زیادہ

مشکوک ہو جاتا۔ مشکوک وہ اب بھی تھا لیکن اس کا ذہن کسی بڑی کارروائی کی طرف نہیں گیا تھا۔ نائیک کے باہر جانے سے میں نے سکون کا سانس لیا اور دل میں دعا کی کہ اب اس کی منحوس صورت مجھے دیر تک نظر نہ آئے۔

میں نے جانچنے کے لیے کڑوں پر روز آزمائی کی لیکن یہ پتلے مگر بہت ہی مضبوط فولاد سے بنے تھے، اس کوشش میں یہ کلائیوں میں گڑ کر تکلیف دینے لگے تھے۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ یہ کڑے گھوم کر ایک ہک میں پھنس جاتے تھے اور اس ہک کا لاک ایسی جگہ تھا جہاں تک میری انگلیاں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ میں نے اس کی کوشش بھی کر کے دیکھ لی۔ کڑے اتنے تنگ تھے کہ کلائی سے نیچے ہاتھ ہلانے کی زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ یہی حال پاؤں کو جکڑے کڑوں کا تھا۔ میں نے ممکن حد تک زور آزمائی کر لی اور پھر ہار مان لی۔ میں اسی صورت میں آزاد ہو سکتا تھا جب کوئی آزاد کراتا یا کوئی غیب سے مدد ہوتی۔ میرے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ بارہ بج رہے تھے۔ طے شدہ وقت میں اب بھی دو گھنٹے باقی تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ قید خانے کی عمارت الگ تھلگ تھی اور بہت بڑی نہیں تھی مشکل سے دو ڈھائی سو گز پر تھی۔ اگر کرنل کے آدمی اس پر میزائل فائر کرتے تو امکان تھا کہ یہ پوری عمارت ملبے کا ڈھیر نہ بن جائے۔

مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ صرف ایک چیز اس عمارت کو محفوظ رکھ سکتی تھی اور وہ اس کی بہت مضبوط ساخت تھی۔ اسے خاص طور سے قید خانے کے طور پر بنایا گیا تھا اور اس کی تعمیر میں مضبوطی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ اس کی پتھروں کی دیواریں بہت موٹی تھیں اور تمام دروازے مضبوط فولاد کے تھے۔ اسی لحاظ سے اس کے اندر سریا اور دوسرا تعمیراتی سامان استعمال ہوا ہوگا۔ یعنی اسے ہر ممکن مضبوطی کے ساتھ تعمیر کیا گیا ہوگا۔ چند لمحے کے اضطراب کے بعد میں نے خود پر قابو پا لیا۔ اس قسم کا اضطراب میرے دشمنوں کو ہوشیار کر سکتا تھا۔ جو میری قسمت میں لکھا تھا وہ تو ہونا تھا تو پہلے سے پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وقت گزر رہا تھا اور کیونکہ معلوم کرنے کا ذریعہ نہیں تھا اس لیے کہنا مشکل تھا کہ کتنا وقت گزر چکا ہے۔ شاید ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

دروازہ کھلا تو چونکا۔ اندر آنے والا رامن تھا۔ وہ فکر مند لگ رہا تھا اور یہ دیکھ کر میں فکر مند ہو گیا کہ کہیں اسے کچھ سن گن تو نہیں مل گئی۔ اگر حملے کا راز فاش ہو جاتا تو پیلس کی سیکیورٹی الرٹ کر دی جاتی اور پھر کامیابی کے امکانات کم ہو جاتے۔ اول تو حملے کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر رہ جاتے اور کنور حکومت سے مدد بھی طلب کر سکتا تھا۔ پھر اس کا بھی امکان تھا کہ بڑا کنور ساوی کو لے کر یہاں سے نکل جاتا اور ہم منہ دیکھتے رہ جاتے۔ اس کے بعد ہم بے شک پورے کنور پیلس کو کھنڈر کر دیتے اور ایک ایک فرد کو موت کے گھاٹ اتار دیتے تب بھی بیکار رہتا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے کیا بڑے کنور کو یہاں میری موجودگی کا علم ہو گیا ہے؟“

”اسے پتا نہیں چلے گا۔“ وہ خشک لہجے میں بولا۔

میں ہنسا۔ ”تم سے پہلے یہی خوش فہمی راج کنور اور منشی دل جی کو بھی تھی۔“

وہ چونکا۔ ”تم منشی دل جی کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟“

”تم شاید بے خبر ہو میری کئی بار بڑے کنور سے فون پر بات ہوئی ہے اور وہ جانتا ہے میں یہاں ہوں۔“

اس بار رامن زیادہ فکر مند دکھائی دیا تھا۔ رفتہ رفتہ میرا خدشہ کم ہو رہا تھا کہ رامن شاید حملے کے بارے میں جان گیا ہے۔ میں نے ملازمین کا ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ وہی میری امید تھے کہ وہ بڑے کنور تک خبر پہنچا سکتے تھے۔ بے شک رامن نے انہیں منہ بند رکھنے کا حکم دیا ہوگا مگر ایک تو وہ ملازم تھے اور دوسرے انہیں لالچ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بڑا کنور اس جگہ کا اصل مالک تھا اور اسے میری اشد ضرورت تھی۔ جب وہ دیکھتے کہ رامن نے مجھے قید کیا ہوا ہے تو ممکن ہے انہیں خیال آتا اور وہ یہ بات بڑے کنور کے علم میں لانے کی کوشش کرتے۔ لیکن یہ مفروضہ بھی ہو سکتا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ وہ رامن کی وفاداری کا دم بھرتے۔ رامن نے کچھ دیر بعد کہا۔

”بہر حال وہ اس وقت کنور پیلس میں تمہاری موجودگی سے لاعلم ہے۔“

”ہو سکتا ہے اسے علم ہو جائے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ مسکرایا۔ ”اگر تمہارا اشارہ ان دونوں کی طرف ہے جو تمہیں لے کر آئے تھے تو وہ دونوں اسی عمارت کے ایک کمرے میں موجود ہیں اور میری مرضی کے بغیر وہ یہاں سے نہ تو کہیں جا سکتے ہیں اور نہ کسی سے رابطہ کر سکتے ہیں۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ رامن اتنا ہی عیار ثابت ہوا تھا جتنا اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس نے ان دونوں پر بھروسا کرنے کے بجائے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اب اس کے عزائم مزید واضح ہونے لگے تھے۔ اس نے میرے لیے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ وہ بڑے کنور کی لاعلمی میں اس پر عمل کر گزرتا اور اسے بعد میں بھی خبر نہ ہوتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان دونوں ملازموں کے علاوہ اور لوگوں نے بھی مجھے دیکھا ہوگا، کیا ان سے بڑے کنور کے علم میں یہ بات نہیں آئے گی؟ اگر ایسا ہی تھا تو اس کا مطلب تھا کہ رامن نے کنور پیلس میں اہم مقام حاصل کر لیا تھا اور وہ اپنی من مانی کر سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اس نے منشی دل جی کی جگہ حاصل کر لی ہو۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ یہاں کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔“

مجھے مایوسی ہوئی تھی لیکن میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں نے کبھی کسی کی مدد پر بھروسا نہیں کیا۔ مجھے صرف اللہ پر بھروسا ہے۔“

رامن نے دانت نکالے۔ ”تو بس وہی تمہاری مدد کرے گا۔“

”مجھے بھی یقین ہے اللہ تمہاری زبان مبارک کرے اگرچہ تم آدمی نہایت منحوس ہو۔“

”بانو کہاں ہے؟“ اچانک اس نے موضوع بدل دیا۔

”جب تم یہ جانتے ہو کہ جیتو میرے ساتھ آیا ہے تو تمہیں یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ بانو سرحد پار واپس جا چکی ہے۔“

”وہ پھر یہاں آئے گی اور اس بار کوئی اسے بچا نہیں سکے گا۔“

”اس کے برعکس مجھے یقین ہے اگر کبھی تم اپنی بدقسمتی سے اس کے سامنے آ گئے تو تمہیں بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔“

وہ حقارت سے مسکرایا۔ ”تم نے اسے ایسا کچھ سکھا دیا ہے تو اس کا مطلب ہے وہ میرے سامنے آ سکے گی۔“

”کچھ میں نے سکھایا ہے لیکن اب وہ جن ماہروں کے ساتھ ہے اور وہ اسے جو سکھا رہے ہیں وہ ایک وقت میں تمہارے جیسے چار آدمیوں سے مقابلہ کر سکتی ہے۔“

”میں تر نوالہ نہیں ہوں۔ اس کا اندازہ تمہیں بھی ہو گا ورنہ میں جس کھائی میں گرا تھا اس سے زندہ باہر نہیں آ سکتا تھا۔“

مجھے اعتراف تھا کیونکہ واقعی اس کا بچ جانا اور اتنی جلدی ٹھیک ہو جانا اس کی سخت جانی کی اور اچھی قسمت کی دلیل تھی۔ مگر میں اسے بانو سے ڈرا نہیں رہا تھا میں تو وقت گزاری کر رہا تھا اب وہ کسی بھی طریقے سے ہوتی اس لیے میں نے بحث جاری رکھی اور بے پروائی سے کہا۔ ”وہ اتفاق تھا کہ تم بچ گئے.... مگر بانو کے سامنے کوئی اتفاق تمہیں نہیں بچا سکے گا۔“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”شہباز تم غیر متعلقہ باتیں کر رہے ہو۔“

”تو تم متعلقہ بات کر لو۔“

”راج کنور کہاں ہے؟“ اس نے اچانک پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے سکون سے کہا۔ ”میں نے اسے شملہ کے ایک اسپتال میں جمع کرایا تھا بعد میں وہ وہاں سے غائب پایا گیا۔“

”اسے کنور پیلس لایا جا رہا تھا راستے میں اس گاڑی پر حملہ ہوا جس میں کنور تھا۔ دونوں گارڈز مارے گئے اور حملہ کرنے والے راج کنور کو ساتھ لے گئے۔“

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں حملہ میں نے نہیں کیا تھا اور راج کنور ویسے بھی میرے لیے بیکار آدمی ہے اسے ساتھ لے جانے کے بجائے میں اس کی لاش چھوڑ جانا زیادہ پسند کرتا۔“

”جھوٹ مت بولو یہ تمہارا ہی کام ہے۔“

”مرضی تمہاری.... میں تمہارے قبضے میں ہوں، تم جو چاہے الزام لگا دو۔“ میں نے شانے ہلائے۔ ”ویسے مینو میں کیا صرف کرنٹ ہے؟“

”نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔“ رامن نے دیوار پر سجے آلاتِ تشدد کی طرف دیکھا۔ ”جو کہو گے کھانے کو ملے گا۔“

”جو تمہاری مرضی ہے.... لیکن میں بتا دوں کہ تم صرف وقت ضائع کر رہے ہو۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ تم مجھ سے احمقانہ سوالات کر رہے ہو جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔“

”میں وقت ضائع نہیں کر رہا ہوں۔“ وہ بولا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ”تم نے کبھی سوچا کہ میں نے را جیسے ادارے کو چھوڑ کر کنوروں کی چاکری کیوں کی؟“

”نہیں کیونکہ میرے پاس فالتو باتیں سوچنے کا وقت

نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم نے یقیناً کسی نہ کسی مقصد سے یہ کام کیا ہے۔ البتہ ایک شبہ ہے۔ میاں ممتاز کی حویلی میں بھی تم دراصل کنوروں کے لیے کام کر رہے تھے اور وہاں کی نوکری صرف کور تھی۔''

رامن نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''اور تم کہہ رہے ہو کہ تم میرے بارے میں سوچتے نہیں ہو؟''

''تھوڑا بہت تو سب اپنے دشمنوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے میری سوچ درست ہے۔ تم وہاں بھی کنوروں کے لیے کام کرتے تھے۔''

اس نے ٹہلتے ہوئے سر ہلایا۔ ''ہاں یہ چکر دوسرا ہے میں تمہیں بتا نہیں سکتا.....''

''تمہیں بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''میاں ممتاز کا کنوروں سے کاروباری تعلق تھا۔ وہ ان سے ہیرے خریدتا تھا اور میرا خیال ہے تم وہاں کنوروں کے نگران کی حیثیت سے موجود تھے۔ شاید ادائیگیاں لیٹ کی جاتی ہوں گی۔ اس لیے تم وہاں بھیجے گئے تاکہ میاں جی کی نیت پر نظر رکھو۔''

''شہباز تم بہت خطرناک آدمی ہو۔''

''تمہیں اس معاملے میں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میں کسی کے چکر میں بلاوجہ نہیں پڑتا۔ اگر تم اور کنور مجھ سے چھیڑ چھاڑ نہ کرتے تو آرام سے اپنا کام کرتے رہتے۔ اب بھی تم مجھ سے پنگا کر رہے ہو حالانکہ میں نے تمہیں مارنے کے بجائے ایک موقع دیا اور اسی وجہ سے تم زندہ ہو۔ مگر ایک بار پھر تم میری راہ میں آئے ہو۔''

''اس بار مجبوری ہے۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''میں تمہیں کنور تک پہنچنے سے روکنا چاہتا ہوں۔''

''دوسرے لفظوں میں تم چاہتے ہو کہ بڑا کنور ٹھیک نہ ہو۔'' میں نے غور کیا۔ ''لیکن کیوں.... اگر تم راج کنور کے لیے کام کر رہے ہو تو بے وقوفی کر رہے ہو اور میں جانتا ہوں تم بے وقوفی کرنے والے آدمی نہیں ہو۔''

''راج کنور سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''تو پھر کس سے تعلق ہے....'' میں کہتے کہتے رک گیا اس کی وجہ میرے ذہن میں اچانک آنے والا خیال تھا۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''تم کیا کہنا چاہ رہے تھے؟'' اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

میں چپ رہا کیونکہ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا اور کچھ کڑیاں جو پہلے آپس میں ٹھیک سے نہیں بیٹھ رہی تھیں، اب بیٹھتی نظر آ رہی تھیں۔ رامن اچانک میری طرف جھپٹا اور اس نے جھک کر پوچھا۔ ''بتاؤ تم کیا کہہ رہے تھے اور رک کیوں گئے؟''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں تم سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔''

''نہیں تم کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے۔'' اس نے ایک بار پھر میرے بال جکڑ لیے اور انہیں جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ ''بولو تم کیا کہنا چاہتے ہو تم کیا جانتے ہو؟''

میں اپنا سر پیچھے لے جا رہا تھا وہ میری طرف جھک رہا تھا۔ میں نے کوئی ردِعمل نہیں دکھایا تھا۔ پھر جیسے ہی اس نے میرا سر چھوڑا میں نے پوری قوت سے سر آگے اچھالا۔ رامن کا منہ کچھ زیادہ ہی پاس آ گیا تھا اور اسے خمیازہ بھگتنا پڑا۔ میرا منہ اس کی ناک پر لگا تھا اور وہ ایک دہاڑ کے ساتھ پیچھے جا گرا تھا۔ اس کی چیخ سن کر باہر سے نائیک اندر آیا تھا۔ اس نے جھک کر رامن کو اٹھانا چاہا تو اس نے نائیک کو دھکیل دیا۔ رامن اٹھا تو اس کی ناک لہولہان ہو رہی تھی۔ وہ خوفناک نظر آ رہا تھا اور اس کے تاثرات بھیانک ہو گئے تھے۔ مجھے معلوم تھا وہ غصے سے پاگل ہو جائے گا اس کے باوجود میں مسکرایا۔ ''میری طرف سے ایک اور تحفہ۔''

جواب میں وہ غراتا ہوا میری طرف آیا تھا کہ اچانک ہی روشنی غائب ہو گئی۔ رامن اور نائیک بیک وقت ہکلائے۔ ''یہ.... یہ کیا ہوا؟''

وہ نہیں سمجھے تھے لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ میرے جسم میں تاریکی چھاتے ہی سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب کیا ہونا ہے۔ تاریکی ایک لمحے کے لیے ہوئی تھی دوسرے لمحے روشنی بحال ہو گئی۔ رامن وحشت زدہ ہو رہا تھا شاید اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا۔ وہ باہر کی طرف جھپٹا۔ نائیک وہیں موجود تھا۔ اس نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا اور میری طرف بڑھا تھا کہ میرے کانوں نے ایک سنسناتی آواز سنی اور پھر ایک دھمک سی ہوئی۔ دھماکے کی آواز سے پہلے نائیک کے عقب میں ایک آگ کا طوفان نمودار ہوا تھا۔ نائیک اچھل کر میری طرف آیا اور میں کرسی سمیت نیچے گرا تھا۔ دھماکے کی آواز سے پہلے میرے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے۔

**جاری ہے**



# بیت بازی

## قارئین

(کنیز فاطمہ کا جواب)

منظر علی خان.........لاہور

مجھے جو خلق کیا بے ضمیر لوگوں میں
میرے خدا مجھے بس یہ سزا ہی کافی ہے

(علی نواز بہاولپور کا جواب)

سید علی.........ملتان

لفظ کی حرمتیں چھن گئیں حروف سے
ہو گیا بے مزہ میرا طرزِ سخن

(شاہد جہانگیر شاہد پشاور کا جواب)

نسیم احمد.........جہلم

اب کس کو ہے معلوم کہ اشعار ہیں میرے
پیغام تیرے دل کو میرے دل کی طرف سے

فرزانہ امام.........کراچی

آئینہ دیکھا تو دل سے یہ صدا آئی نہاں
عمر بھر ساتھ رہے پھر بھی شناسا نہ ہوئے

نیاز احمد.........ملکانی

اس کو ہم آزاد سمجھتے ہیں مغتنم
آتے ہیں اس کے خط جو شکایت بھرے ہوئے

ملک سرفراز.........حیدرآباد

اپنے ضعف کا جو کرتی نہیں تدارک
قومیں وہ چند روزہ دنیا میں مہماں ہیں

فرزانہ ممتاز.........اسلام آباد

اس کی فقیری میں ہے قیصر و کسریٰ کی شان
خواجۂ افلاک وہ، بندۂ افلاک تو

بشیر فاروقی.........چنیوٹ

آ رہا ہے مری وحشت پہ شباب
تجھ سے ملنے کے زمانے آئے

نوشین عارف.........فیصل آباد

اسے کہنا کہ پلکوں پر نہ ٹانکے خواب کے جھالر
سمندر کے کنارے گھر بنا کر کچھ نہیں ملتا

(نسرین شفیق لاہور کا جواب)

آفتاب احمد نصیر اشرفی.........لاہور

حجرہ ہفت بلا کھول دیا ہے اس نے
اب ذرا سوچ سمجھ کے کوئی گھر سے نکلے

(بشیر احمد بھٹی بہاولپور کا جواب)

عنایت.........کراچی

اے کہ کرنوں سے تری اپنے سیہ خانے میں
چاند کا نور ستاروں کی چمک باقی رہے

صنم لاشاری.........ڈی آئی خان

ان کا مزاج تیز ہے اپنا کلام گرم
وہ آپ آ گئے مرے خط کے جواب میں

(فرزانہ تحریم شورکوٹ کا جواب)

زاہدہ فاخر.........جھنگ صدر

ملبے سے ہر مکان کے نکلے ہوئے تھے ہاتھ
آندھی کو روکنے کی بڑی کوششیں ہوئیں

(تنویر رفیق کراچی کا جواب)

سعید احمد چاند.........کراچی

ابھی پایا بھی نہیں تھا کہ اسے کھو بھی دیا
اپنی عادت ہے ہر کام میں عجلت کرنا

سلیم کامریڈ.........کھاتاں

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

(منشی عزیز مے لڈن وہاڑی کا جواب)

ناہید فاطمہ.........دینہ، جہلم

موجِ بادِ تند تھی آزاد ہر موجِ نفس
دم بدم بھٹکتے رہے ہم دم بدم چلتے رہے

منظر احسن.........شادی پور

موت کا پیغام ہے نوعِ غلامی جسے
دہر میں مردانِ حر کی ہے یہی آبرو

فیض محمد ابڑو.........سکھر

میرے عیبوں کو گننے والو بے شک مجھے سنگسار کرو
مگر اٹھائے وہ پہلا پتھر جس کا کوئی گناہ نہ ہو

(فرحت انعام، ملتان کا جواب)

نسیم الٰہی.........ملتان

بندہ مومن تجھے کس کی ہے اب جستجو
راہ بھی منزل بھی تو، رہرو رہبر بھی تو

(احمد معین سواتی، کراچی کا جواب)

گل فراز.........کوئٹہ

ساون کی جب پھوار کرے دل کو بے قرار
تم مجھ کو گل رخوں کے دیاروں میں ڈھونڈنا

سوہا سعید.........کوٹ ادو

سورج ہمیں ہر شام یہ درس دیتا ہے
مغرب کی طرف جاؤ گے تو ڈوب جاؤ گے

(زاہد حیات خان ملتان کا جواب)

اکبر الطاف شیرازی.........لاہور

وہ جس کے دم سے ہے روشن ہماری بزم خیال
ستارہ رخ ہے کوئی کہکشاں جبیں ہے کوئی

(نوشین اختر، چنیوٹ کا جواب)

اکبر خان.........کوئٹہ

تری یادوں کی پرچھائیں گلے ملتی ہے یوں دل سے
نہ فرقت ہے نہ قربت ہے نہ محفل ہے نہ تنہائی

سعید ملک.........ملتان

تم نے اک خط جو لکھا تھا سوئے راحت جاں
ہم نے اس نقش محبت کا بنایا تعویذ

جبران ملک.........ساہیوال

تجھ ہی کو سوچوں تجھ ہی کو چاہوں
مرے دل کی پہلی آرزو تو ہے

(رعنا اختر لاہور کا جواب)

الطاف فاطمہ.........لاہور

یوں جنوں بڑھ گیا ہوں خرد گھٹ گئی
دل پہ غالب ہوئے جب سے رنج و محن

آصفہ بتول.........ملتان

یاد رکھیئے مجھے دعاؤں میں
بس یہی التماس ہے اے دوست

افتخار حسن.........کوئٹہ

یقین سے بے یقیں تک سفر کے ساتھ تھا میرے
بدل کر اس نے دکھلایا کوئی کیسے بدلتا ہے

(اسما ممتاز کراچی کا جواب)

فاضل خان.........کراچی

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

(الطاف ققھو کراچی کا جواب)

اسما قاضی.........سکھر

کہتا تھا کہ ہم ساتھ جئیں ساتھ مریں گے
اب روٹھ گئے ہیں تو منانے نہیں آیا

نزہت گل.........کوئٹہ

کیا خبر کون سی صورت یہاں کس بھیس میں ہے
راز مجبوری انساں کا نہ کھولو یارو

(علی زئی پشاور کا جواب)

سلیم اختر.........شیخوپورہ

کئی دن سے بارش نے گھیرا ہوا تھا
یہ دیوار یوں ہی گری تو نہیں ناں

(زاہد خان لاہور کا جواب)

عنایت مسیح.........کراچی

ساری دنیا کو خفا کر کے تمہیں پایا ہے
تم نہ دنیا کی طرح مجھ سے خفا ہو جانا

(انصار حسین نقوی مانچسٹر کا جواب)

اشرف معروف حیدی.........کراچی

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ نگہ کی تیغ بازی، وہ سپر کی تیغ بازی

راحیل اختر.........کراچی

آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔



علمی آزمائش 102
30 مئی 2014ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام ............ ہے۔

نام: ............

پتا: ............

............

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 مئی 2014ء تک علمی آزمائش 102 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ............

پتا ............

............

محترم / محترمہ ......... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے)
63

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

# علمی آزمائش۔ 102

ادارہ

## ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماهنامه سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماهنامه پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 26 مئی 2014ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

### اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

ضلع گرداس پور کے بٹالہ میں 12 ستمبر 1905 میں پیدا ہوئے، پاکستان کے بڑے مصنفین میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے ایک ناول نے تو شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا اور اب ادب کا شہپارہ کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مصنف کا یہ ایک ناول ہی اسے ادب کی دنیا میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ ذہن پر زور دے کر اس مصنف کا نام بتائیں۔

### علمی آزمائش 99 کا جواب

مولانا الطاف حسین حالی کے والد کا نام ایزد بخش تھا۔ 1837ء میں مشرقی پنجاب کے شہر پانی پت میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں رہے تو غالب کا ساتھ رہا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد نواب آشفتہ کے ساتھ رہے پھر لاہور آگئے۔ سرسید سے روابط بڑھے تو ایک طویل نظم لکھی جس نے برِصغیر میں دھوم مچا دی۔ آج بھی وہ نظم ہر ایک کی زباں پر ہے۔ 31 دسمبر 1914ء میں فوت ہوئے۔

### انعام یافتگان

1- احمد ممتاز، بہاولپور 2- جنید خان، پشاور 3- عالیہ ضیا، سیالکوٹ

4- حامد علی بٹ، حاصل پور 5- ظہیر الاسلام، کراچی



ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے امیر الاسلام، محمد ندا حسین، ندیم ناصر، جمیل عثمانی، توفیق ملک، فیضان انصاری، بلقیس کوکب، اقبال احمد چشتی، احسن خان اچکزئی، طارق حبیب، فرقان حمیدی، فیض مسیح، جمنا اختر، محمد علی مشاہد، ثنا بخاری، آفتاب مقصود، اختر حسین، اقبال احمد چشتی، انوار علی شاہ، جاوید اقبال، ڈھوڈا مل، ثروت ناز، اختر عباس، نعیم اختر، نعمت مرزا، منظر خان، بھیکو مل، ثنا یونگی، سید عزیز الدین، محمد احمد طیر۔ لاہور سے مسز نادر شاہ، سلیم درانی، زرینہ انصاری، فلک شیر، فیض ملک، ثاقب خان، محمد پہلوان اختر، کمال حسن، شاہینہ بتول، نذیر مرزا، انور کلیم شاہ، ثنا بخاری، بہادر خان، انوار شاہ، یوسف خان، سلمان زیدی، چوہدری نیاز مسلم خان، ماسٹر قیوم محمد، کوکب گردیزی، شہباز خان، ابراہیم شاہ، بیگم انوار شاہ، نگار ملک، فیض الحسن، ظہیر الحسن قزلباش، نیاز سومرو، محمد بلال مصطفی، اسد شکیل، افتخار احمد تارا، نوشین ملک مرزا یوسف بیگ، احمد یاسین ملک، بیگم صفدر جاہ، شگفتہ مشتاق، رانا حبیب الرحمن عبدالرشید۔ ملتان سے عقیل احسن، شمروز، ناصر حسین، کلب اصغر زیدی، خاقان عباسی، ثاقب علی، فہد ریاض، خالب حسین، حبیب الرحمن، اصغر خان، فصاحت علی، نیاز فتح علی، فہیم مرزا، اصغر حسین زیدی، محمد شفیق بھٹی، محمد یحییٰ معین۔ پشاور سے مولانا ریاض محسن، قاسم جان، ندیم احسن، عصمت گل، بی بی فرحین، عباس رعنا، احمد مجاہد، تنویر احسن فاروقی، گل خان، حسن زکی، فہمیدہ گل، عجب خان، بابا شاہ، مرتضیٰ زیدی۔ شیخوپورہ سے فراز حسن، سہیل بٹ، مہدی علی خان، کوکب توقیر، خاقان سید، فدا مجید، مصطفی برلاس، ندا ممتاز، ثریا فاطمہ۔ ڈیرا غازی خان سے افتخار احمد، محمود نیاز، فتح الباری، محمد توقیر، ارشاد حسین، فہیم الدین، ناصر حسن، خان محمد خان۔ ڈیرہ اسماعیل سے فاروق چوہان، قیصر خان۔ جہلم سے جاوید محمد خان، نعمت اللہ، ندیم امتیاز۔ حیدرآباد سے امتیاز حسن، خالد نظامانی، فہد قریشی، کلیم عثمانی، محمد یاسین اندوری۔ بہاولنگر سے ضیا تسنیم، نوشین خٹک، افتخار علی، عباس علی، سعید شہزاد بخاری۔ بہاولپور سے یاسمین فرحت، فراز احسن فاروقی، خالد بٹ، فیض لاشاری، قیام الدین، نگار مصطفی۔ میانوالی سے سہاب خان۔ لیہ سے فقیر محمد۔ مظفرگڑھ سے فیضان محمد عثمان، عبادت حسن، قیصر خان، ناصر محمود، شیر خان۔ جہلم سے ابرار شیخ۔ اسلام آباد سے ذیشان شاہ، انعم بٹ، ذوالقرنین، بلال مصطفی، شریف الحسن، جاوید قیصر، فصاحت مرزا، سلام خان، نادر خان، مرید علی خاکوانی، مہر خان، صلاح الدین، اسلم خان، انور یوسف زئی، بیگم امتیاز علی دستوری، اصغر عباس۔ راولپنڈی سے فتح الدین، غضنفر عباس، شریف شاہ، قاسم جان، فیض خان، رضوان احمد ہاشمی، عدنان سعیدی، ابرار الحسن، نادر بھٹ، شیر کمال، عباس مہکری، نثار عباس حقانی، علی خان، صالح الرحمن، ڈاکٹر سعادت علی خان، فہد شیخ۔ شریف صدیقی، امام الدین، سعید عباس زیدی۔ میرپور خاص سے، کوئٹہ سے نور الحسن زیدی نور، حجاب چنگیزی، تقی چنگیزی، فرحت بابر خاقان عباسی، نوازش علی، عنایت اچکزئی۔ منڈی بہاؤالدین سے تاثیر حسین، ندا علی، احمد جاوید، زاہد علی، فرحت جان، ناصر کیانی، سعید مصطفی، سیالکوٹ سے آفاق احمد، حسن عالم، ندا آفاق، درویش جان، سید محمد مبشم رضوی، منظر خان، ارشد حسین جاوید مظہر، محمد مظہر، فرحت حسین باقر علی۔ سرگودھا سے اطہر حسین، فتح باری، ثنا اللہ، آفتاب خان۔ ٹنڈو جان محمد سے تھری اموکھ۔ ساہیوال سے محمد افضل خان (فرید ٹاؤن)۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ۔ گوجرانوالہ سے احسان الحق بھٹی ایڈووکیٹ، محمد رضا (سوئی گیس روڈ)۔ حافظ آباد سے محمد عقیل چٹھہ۔ ہوتی مردان سے محمد انور (باڑی چم)۔ پنڈی بھٹیاں سے محمد عظیم، معظم علی، عمر خان۔ وہاڑی سے منشی محمد عزیز منے، سعید احمد چوہان، محمد مدثر عزیز منے۔

ممالک غیر سے امجد علی سیال (دبئی یو اے ای) زاہد خان (مانچسٹر یوکے) اصغر سید (یوکے) ارباز خان (جرمنی) زاہد خان (زاہدان، ایران) کاشف ملک (ٹوکیو جاپان) شاہدہ طاہر محمود چودھری (ٹمن اک (یو ایس اے)

# دماغی توازن

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

السلام علیکم!

انسان نادانستگی میں اکثر ایسی غلطیاں کرجاتا ہے جس کا خمیازہ اسے تاعمر بھگتنا پڑتا ہے۔ میں تو مسلسل ایک ہی غلطی کو بار بار دوہراتی رہی نتیجہ یہ ہوا کہ میرے بچے کی زندگی تباہ ہوگئی۔ اپنی اس نادانی کو میں نے بطورِ خاص سرگزشت کے قارئین کے لیے لکھا ہے تاکہ لوگ سبق حاصل کریں۔ محبت و پیار اور لاڈ ایک حد میں رہے تو ہی اچھا ہے۔

بیگم سجاد آفریدی
(لاہور)

ممتا کی ماری میں دکھیاری اپنی محبت سے مجبور ہو کر یہ سمجھ ہی نہ سکی کہ میں اپنے بیٹے کی زندگی کس عذاب سے دوچار کررہی ہوں۔

شوہر کے انتقال کے بعد مجھے یہ وہم سا ہوگیا تھا کہ کوئی میرے بیٹے فہد کو اس طرح مجھ سے چھین کرلے جائے گا جس طرح میرا شوہر مجھ سے جدا ہوگیا۔اسے پاگل پن ہی کہا جاسکتا تھا۔لوگ کہتے بھی یہی تھے کہ شوہر کی موت کے صدمے نے مجھے پاگل کردیا ہے۔

فہد کی عمر اس وقت پانچ سال تھی۔ میں اسے پروں میں سمیٹے بیٹھی رہتی تھی کہ کوئی اسے مجھ سے چھین نہ لے۔ شوہر کا انتقال ایک حادثے کی صورت میں ہوا تھا لیکن میں یہی سمجھتی تھی کوئی اسے مجھ سے چھین کرلے گیا ہے۔ اگر فہد کو میں نے گود سے اتارا تو اسے بھی کوئی چھین کرلے جائے گا۔ وہ بچہ تھا، باہر نکلنے کی ضد کرتا تھا لیکن میں نے اس پر گلی کے دروازے بند کردیے تھے۔اس کا دل بہلانے کے لیے خود اس کے ساتھ کھیلتی تھی لیکن بچے کو تو بچے چاہیے ہوتے ہیں۔ مجبور ہو کر میں نے پڑوس کے بچوں سے کہا کہ وہ فہد کے ساتھ آکر کھیل لیا کریں۔ میں چاہتی تھی کہ وہ کھیلے بھی تو میری نظروں کے سامنے کھیلے۔ بچے جب اس کے ساتھ کھیلنے آتے تو فہد کا چہرہ چمکنے لگتا۔بچوں کے چلے جانے کے بعد وہ پھر سے اداس ہوجاتا۔ میں چاہتی تھی وہ ہر وقت ہنستا کھلکھلاتا رہے لیکن میں نے تو اس کا بچپن ہی اس سے چھین لیا تھا۔ وہ ہنستا تو ہنستا کیسے؟

اس کے ساتھ کھیلنے والے بچے بھی کچھ دن تو اس کے ساتھ کھیلنے آئے لیکن وہ بھی بچے تھے۔ انہیں بھی گھر سے زیادہ گلی میں کھیلنا اچھا لگتا تھا۔ انہوں نے فہد کو بھی بہکانا شروع کردیا کہ چلو گلی میں چل کر کھیلتے ہیں۔فہد نے مجھ سے ضد کی لیکن میں اسے ہرگز اجازت نہیں دے سکتی تھی بلکہ مجھے تو یہ گمان ہوا کہ بچے اسے بہکاتے رہیں گے اور ایک دن وہ آئے گا کہ فہد مجھے بتائے بغیر گلی میں نکل جائے گا۔میں نے بچوں کو منع کردیا کہ وہ فہد کے ساتھ کھیلنے نہ آیا کریں۔اب وہ تھا اور گھر کا سناٹا۔

میرے شوہر کے انتقال کے بعد ان کا تمام کاروبار میرے دیور نے سنبھال لیا تھا۔ دو کارخانے تھے۔ ان کی دیکھ بھال سراج ہی کے ذمے تھی۔ میرے میکے میں کوئی ایسا تھا نہیں جو دیکھ بھال کرسکتا۔ فہد کی تو خیر عمر ہی کیا تھی۔



سراج جب بھی آتا تھا میری اس حرکت پر ٹوکتا تھا کہ میں فہد کو لڑکیوں کی طرح پال رہی ہوں۔ وہی جواب میں اسے بھی دیتی تھی جو دوسروں سے کہتی تھی کہ تم لوگ یہ کیوں چاہتے ہو کہ میرے شوہر کی طرح میرا بیٹا بھی ہاتھوں سے چلا جائے۔ کچھ لوگوں نے مجھ پر یہ دباؤ ڈالنے کی بھی کوشش کی کہ میں دوسری شادی کرلوں لیکن ظاہر ہے میں یہ دباؤ کیسے قبول کرلیتی۔

مثل مشہور ہے جیسا دیس ویسا بھیس۔ رفتہ رفتہ فہد بھی اس زندگی کا عادی ہوگیا جو زندگی میں اسے دینا چاہتی تھی۔ وہ بھی لڑکیوں کی طرح گھر میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کا کوئی ہم عمر بچہ گھر میں آبھی جاتا تو فہد لڑکیوں کی طرح شرمانے لگتا۔ میرے ساتھ بھی باہر نکلتا تو سر سے پاؤں تک کانپتے ہوئے۔ سات سال کا ہونے کو آیا تھا لیکن میرے ساتھ کسی کے گھر جاتا تو میری گود میں بیٹھا رہتا۔ میں نے اس وقت بھی غور نہیں کیا کہ میں اسے کیا بنائے دے رہی ہوں۔

ظلم تو اس وقت ہوا جب اس کے اسکول جانے کی عمر نکلنے لگی۔ سب کہتے تھے اسے اسکول بھیجوں لیکن میں اس کے حق میں نہیں تھی۔

”جاہل رہ جائے مجھے منظور ہے لیکن میں فہد کو اسکول نہیں بھیجوں گی۔ کسی دن کوئی اسے مجھ سے چھین کر چلا گیا تو میں کیا کروں گی۔“

یہ ایسا کمزور جواز تھا کہ کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا لیکن کوئی کربھی کیا سکتا تھا۔ بس یہ کہہ کر چپ ہوجاتے تھے کہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود میں ایسی باتیں کررہی ہوں۔ فہد کی زندگی برباد کررہی ہوں۔

جب میں ہی فہد کو اسکول بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھی تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ ضد کرکے اسے اسکول بھیجتا بلکہ فہد کو تو اچھا ہی لگ رہا ہوگا کہ اسکول سے جان چھوٹی۔ سب بچے اسکول جارہے ہوتے اور وہ مزے سے پڑا سو رہا ہوتا۔

میرے دیور سراج نے مجھ سے بار بار کہا کہ میں فہد کو اسکول بھیجنا شروع کردوں۔ وہ کم از کم اتنا تو پڑھ لے کہ بڑا ہو کر اپنے باپ کا چھوڑا ہوا کاروبار سنبھال سکے۔ مجھے بھی لگا کہ سراج ٹھیک کہہ رہا ہے۔ فہد کو کچھ نہ کچھ تو پڑھنا چاہیے۔ میں نے اسے گھر پر پڑھانا شروع کردیا۔ وہ پڑھائی کا ویسے ہی چور تھا اور مجھ سے پڑھنے کو تو قطعی تیار نہیں تھا۔ میں نے تنگ آکر سراج سے کہا کہ وہ اس کے لیے ایک ٹیوٹر کا انتظام کردے جو گھر آکر اسے ٹیوشن پڑھا سکے۔ اس نے ایک لڑکے کا انتظام کردیا جو فہد کو پڑھانے لگا۔ شام کو مولوی صاحب آنے لگے۔ خالی وقت میں میں اسے لے کر بیٹھ جاتی۔

فہد جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا میرے دیور سراج کی آنکھیں بدلنے لگیں۔ وہ کارخانوں سے ہونے والی آمدنی کی جو رقم میرے ہاتھ پر رکھتا تھا اس میں روز بروز کمی آنے لگی۔ بہانہ وہی کہ کاروبار میں نقصان ہورہا ہے۔ بالآخر یہ نقصان اتنا بڑھا کہ ایک کارخانہ بیچنے کی نوبت آگئی۔ میں

نے ذرا باز پرس کی تو سراج ہتھے سے اکھڑ گیا۔

’’اگر مجھ پر بھروسا نہیں تو فہد سے کہو وہ کاروبار سنبھال لے۔ میں الگ ہوئے جاتا ہوں۔‘‘

’’میں نے تمہاری نیت پر شک نہیں کیا۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ نقصان ہو کیوں رہا ہے۔‘‘

’’کاروبار اسی کا نام ہے۔ نقصان بھی ہوتا ہے فائدہ بھی ہوتا ہے۔ بھائی صاحب زندہ ہوتے تو کیا نقصان نہ ہوتا؟ آج کل حالات ایسے ہیں کہ ہر کاروباری رو رہا ہے، ایک میں کیا۔‘‘

’’کارخانہ بیچ کر کیا یہ نقصان پورا ہو جائے گا؟‘‘

’’ہم یہ کارخانہ بیچ کر اس کی رقم دوسرے کارخانے میں لگا دیں گے۔ ملازمین کی تنخواہیں بھی بچیں گی اور منافع کی شرح بھی بڑھ جائے گی۔ ہمیں تو منافع سے غرض ہے دو دو کارخانے رکھ کر کیا کریں گے۔‘‘

’’جیسی تمہاری مرضی ہو کرو‘‘ میں نے کہا۔ ’’فہد کو بھی اپنے ساتھ کارخانے لے جایا کرو۔ یہ بھی عمر کے ساتھ ساتھ کاروبار کو سمجھنے لگے گا۔‘‘

’’میں تو آپ سے کب سے کہہ رہا ہوں۔ آپ ہی نے اسے لڑکی بنایا ہوا ہے۔‘‘

’’میں ڈرتی ہوں کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ تم اس کا خیال رکھنا۔‘‘

’’بھابی، وہ میرے لیے غیر تھوڑی ہے۔ میں اس کا پورا خیال رکھوں گا۔ جب میں سمجھوں گا کہ اسے کاروبار کی سمجھ آ گئی ہے میں کاروبار سے الگ ہو جاؤں گا۔‘‘

میں نے سراج سے کہہ تو دیا تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ کارخانے لے جایا کرے لیکن فہد کو آمادہ کرنا قیامت ہو گیا۔ کبھی میں اسے باہر جانے سے روکتی تھی اب وہ انکار کر رہا تھا۔ کسی صورت گھر سے نکلنے اور کارخانے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں پیچھے پیچھے پھر رہی تھی اور وہ چھپتا پھر رہا تھا۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ میں نے اسے کیا بنا دیا ہے۔ دس سال کا ہو گیا تھا اور کسی سے آنکھ ملا کر بات کرنے کے لائق نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اسے چچا کے ساتھ کارخانے بھیجنے پر رضا مند کیا۔ اس کے جاتے ہی بھرا گھر مجھے کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ نہ جانے اس پر کیا بیت رہی ہو۔ واپس گھر آتا بھی ہے یا نہیں۔ مجھے تو یہ اندیشے بھی آنے لگے تھے کہ کہیں سراج ہی اسے غائب نہ کر دے۔ بڑی مشکل سے دن گزارا۔ شام کو جب وہ گھر آیا تو میری جان میں جان آئی۔ ماسٹر صاحب پڑھانے آ گئے اور میں سوچنے لگی کہ یہ پڑھ لکھ جائے تو اس سے کہوں گی کہ گھر میں ٹیوشن سینٹر کھول لے۔ یہیں بیٹھ کر میری نظروں کے سامنے بچوں کو پڑھا لیا کرے۔ کارخانے جانے سے تو بچ جائے گا۔

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ سراج کی طرف سے یہ شکایتیں برابر آ رہی تھیں کہ فہد بے حد شرمیلا ہے۔ کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتا، کاروبار کیا سنبھالے گا۔ میں خود اسے کارخانے بھیج کر پچھتا رہی تھی۔ وہ دن بھر میری نظروں سے دور رہے یہ مجھے منظور نہیں تھا۔ میں نے اسے کارخانے جانے سے روک دیا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ دل لگا کر پڑھے اور پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دے دے۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ گھر پر رہے۔ اس نے دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اسے کہیں جانا بھی ہوتا تو میرے ساتھ چلا جاتا، میرے ساتھ چلا آتا۔

چودہ پندرہ سال کی عمر میں اس نے بہ مشکل آٹھویں کلاس کا کورس ختم کیا تھا کہ اسے جو لڑکا ٹیوشن پڑھانے آتا تھا اس کی شادی ہو گئی اور اس نے پڑھانا چھوڑ دیا۔ فہد کا اس سے ایسا دل لگا تھا کہ وہ کسی اور سے پڑھنے کو تیار ہی نہ ہوا۔ کتابیں اٹھا کر ایسی رکھیں کہ پھر کبھی نہ اٹھائیں۔ ایک مرتبہ میں پھر اس کی طرف سے فکر مند ہوئی لیکن یہ تسکین تھی کہ وہ میرا فرماں بردار بھی ہے اور میرے پاس بھی ہے۔

آمدنی میں روز بروز کمی ہونے لگی تھی۔ سراج نے صاف کہہ دیا تھا کہ کارخانہ نقصان میں جا رہا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو یہ کارخانہ بھی بیچنا پڑ جائے گا۔ مسلسل نقصان تو نہیں اٹھایا جا سکتا۔ میں عورت ذات کیا کرتی۔ فہد اس قابل نہیں تھا کہ دیکھ بھال کرتا۔ میں اس نقصان پر بھی جیسے تیسے گھر چلاتی رہی۔ میں سمجھ ضرور رہی تھی کہ سراج کی نیت خراب ہو گئی ہے۔ وہ میری مجبوری سے فائدہ اٹھا رہا ہے لیکن کیا کر سکتی تھی۔ سراج سے کچھ کہتے ہوئے بھی ڈرتی تھی کہ اگر اس نے ہاتھ اٹھا لیا تو چند روپے جو آ جاتے ہیں اس سے بھی چلی جاؤں گی۔

فہد کی عجیب حالت تھی۔ پڑھنا بھی چھوٹ گیا تھا اور کہیں آنے جانے کے لائق بھی نہیں رہا تھا۔ گھر سے نکلنے تک کا روادار نہیں تھا۔ بہت ہوتا تو گھر کے باہر کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا۔

پڑوس میں ایک لڑکی زبیدہ رہتی تھی۔ وہ بچپن سے ہمارے گھر آیا جایا کرتی تھی۔ فہد کے ساتھ کھیل کھیل کر بڑی



ہوئی تھی۔ اب بھی آتی تھی۔ میں نے ایک دن اس سے کہا کہ فہد کو پڑھنے کی طرف راغب کرے۔ وہ میٹرک کر رہی تھی لہٰذا وہ بھی فہد کو پڑھا سکتی تھی۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ وہ فہد کو پڑھا دیا کرے۔ وہ خوشی خوشی تیار ہو گئی۔ خوشی کی بات تو یہ تھی کہ فہد بھی کتابیں نکال کر بیٹھ گیا۔

وہ پابندی سے آنے لگی تھی۔ اپنی کتابیں بھی ساتھ لے آتی تھی۔ خود بھی پڑھتی رہتی اور فہد کو بھی پڑھاتی رہتی۔ وہ دونوں خوب گھل مل گئے تھے۔ میں انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ چلو اس بہانے فہد تعلیم کی طرف راغب تو ہوا لیکن جلد ہی میری ازلی فطرت عود کر آئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے یہ لڑکی میرے فہد کو مجھ سے دور لے جا رہی ہے۔ جتنی دیر وہ گھر میں رہتی ہے فہد میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا تک نہیں۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی گم صم بیٹھا رہتا ہے جیسے اُسی کے بارے میں سوچ رہا ہو۔ میں آہستہ آہستہ زبیدہ سے جلنے لگی۔ اس کی طرف سے مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ ایک دن میرے جذبات اتنے برافروختہ ہوئے کہ میں نے زبیدہ سے صاف کہہ دیا کہ وہ فہد کا پیچھا چھوڑ دے۔ ’’اگر وہ نہیں پڑھتا ہے تو نہ پڑھے۔ تم یہاں آنے کی کوشش مت کرنا۔‘‘

’’خالہ میں نے اپنی مرضی سے اسے پڑھانا شروع نہیں کیا تھا۔ آپ نے کہا تھا تو میں نے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ زبردستی اسے پڑھاؤں۔ میں اب آپ کے گھر قطعی نہیں آؤں گی بلکہ اس کو بھی منع کر دوں گی کہ وہ بھی نہ آئے۔‘‘

’’یہ تو تم بہت اچھا کرو گی۔ خس کم جہاں پاک۔‘‘

زبیدہ چلی گئی۔ دوسرے دن جب وہ نہیں آئی تو فہد نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ میں نے زبیدہ کو منع کر دیا ہے۔ وہ اب نہیں آئے گی۔ فہد کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ضرور ظاہر ہوئے تھے لیکن اس کی کیا مجال تھی کہ میرے سامنے دم مارتا۔ خاموشی سے ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے خود پر فخر ہونے لگا کہ میرا بچہ میرا کتنا فرماں بردار ہے۔

اس دن کے بعد سے وہ چپ چپ رہنے لگا تھا لیکن مجھے یہ اطمینان تو تھا کہ وہ میرے پاس ہے، زبیدہ اسے اپنے ساتھ نہیں لے گئی۔

وقت پھر دبے پاؤں گزرنے لگا۔ فہد کچھ دن اداس رہنے کے بعد پھر سے اپنی حالت پر لوٹ آیا۔ حالت ہی کیا، نہ اس کے پاس تعلیم تھی نہ کوئی ہنر۔ پورا خاندان مجھ پر تھو تھو کر رہا تھا کہ میں نے اسے کیا بنا کر رکھ دیا ہے۔ لیکن میں اب بھی مطمئن تھی کہ وہ میرے پاس تو ہے۔ کوئی اسے مجھ سے چھین کر تو نہیں لے گیا۔

فہد اب جوانی کی منزلوں میں تھا۔ اسے اب تک اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں نے اس کے ساتھ دشمنی کی تھی۔ وہ نہ پڑھ سکا تھا نہ کوئی ہنر سیکھ سکا تھا۔

وہ اب بڑا ہو گیا تھا۔ اپنا دفاع کر سکتا تھا لیکن اس کے باوجود میں اسے اپنی چارپائی سے چارپائی ملا کر سلاتی تھی کہ کہیں کوئی اسے مجھ سے چھین کر نہ لے جائے۔ ایک رات بیچ رات میں میری آنکھ کھل گئی۔ بستر دیکھا تو میری جان نکل گئی۔ میں پاگلوں کی طرح اٹھی اور پورے گھر میں اسے ڈھونڈتی پھری۔ اس کی خوشبو بھی کہیں نہیں تھی۔ میں چیخ چیخ کر آوازیں دینے ہی والی تھی کہ چھت سے کسی کی باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میرے کان کھڑے ہوئے کہ اس وقت چھت پر کون ہے۔ میں دبے پاؤں زینہ چڑھ کر اوپر گئی۔ وہاں میں نے فہد کو بیٹھے دیکھا۔ وہ اکیلا بیٹھا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دوسرا کون تھا جس سے وہ باتیں کر رہا تھا۔

’’فہد، اس وقت تم چھت پر کیا کر رہے ہو؟‘‘

’’امی گرمی لگ رہی تھی لہٰذا میں چھت پر آ گیا۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے لیکن ابھی میں نے باتوں کی آواز سنی تھی۔ تم باتیں کس سے کر رہے تھے؟‘‘

’’نہیں تو‘ میں تو باتیں نہیں کر رہا تھا۔ میں بھلا کس سے باتیں کروں گا۔‘‘ اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔

’’میں نے خود تمہاری آواز سنی تھی۔‘‘

’’آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو گی۔‘‘

اس کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ زندگی میں پہلی بار مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔ میں اسے نیچے لے کر آئی اور بڑی دیر تک اسے ڈانتی رہی۔

’’آئندہ اس طرح اکیلے چھت پر کبھی نہ آنا۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا؟‘‘

’’مجھے کیا ہونا ہے۔ اب میں بچہ نہیں رہا ہوں۔‘‘

’’تمہارا باپ بھی بچہ نہیں تھا لیکن مجھ سے دور چلا گیا۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ آئندہ جب بھی چھت پر آؤ گے میرے ساتھ آؤ گے۔‘‘

وہ چپ چاپ لیٹا سنتا رہا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ

دوبارہ سو گیا ہے تو میں اپنے خیالوں میں کھو گئی۔ مجھے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ فہد چھت پر اکیلا تھا۔ اس کے ساتھ ضرور کوئی تھا۔ کون ہو سکتا ہے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اس رات کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ بستر سے اٹھ کر چھت پر گیا ہو۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ میں ہوشیار ہو کر سونے لگی تھی اور کئی کئی مرتبہ آواز دے کر دیکھ لیا کرتی تھی کہ وہ بستر پر ہے یا نہیں۔

اس کے ساتھ چھت پر کون تھا۔ یہ راز آخر ایک دن کھل گیا۔ زبیدہ کی ماں مجھ سے ملنے آئی۔ یہ بات حیران کن ضرور تھی کیونکہ کئی سال ہو گئے تھے اس نے میرے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔ میں نے جس دن سے زبیدہ کو اپنے گھر آنے سے منع کیا تھا اس نے بھی آنا چھوڑ دیا تھا۔ اب جو وہ آئی تو میں اسے منع نہیں کر سکتی تھی۔

''زبیدہ کی ماں، کیسے آنا ہو گیا؟''

''کیا بتاؤں بہن؟ بچوں کی خاطر بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔''

''تم مجھ سے ملنے آئی ہو، بچے درمیان میں کہاں سے آ گئے۔''

''بہن پہلے یہ بتاؤ تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو۔''

''میں تم سے کیوں خفا ہونے لگی تھی۔''

''اگر خفا نہیں ہو تو ایک بات کہوں؟''

''کہو بہن۔''

''میں تم سے کچھ مانگنے آئی ہوں۔''

''کیوں شرمندہ کرتی ہو۔''

''اصولاً تو یہ بات فہد کو آپ سے کہنی چاہیے تھی لیکن وہ اتنا شرمیلا ہے کہ مجھے کہنی پڑ رہی ہے۔''

''فہد نے تم سے کچھ مانگنے کو کہا ہے؟''

''یہی سمجھ لو۔ وہ دراصل بات یہ ہے کہ زبیدہ اور فہد ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ میں بیٹی کی ماں ہو کر تم سے یہ بات کہہ رہی ہوں۔ دونوں بچوں کی زندگی اسی میں ہے کہ دونوں کی شادی کر دی جائے۔''

''زبیدہ کی ماں۔'' میں غصے سے بھر گئی۔ ''اتنی بڑی بات کہنے کی تمہیں ہمت بھی کیسے ہوئی۔''

''بہن، میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی۔ کیا دنیا میں شادیاں ہوتی نہیں ہیں۔''

''ہوتی ہیں لیکن برابر والوں میں ہوتی ہیں۔''

''ہم غریب ضرور ہیں فہد کی ماں لیکن فہد نے خود اس خواہش کا اظہار کیا ہے۔ وہ تم سے کہتے ہوئے ڈرتا تھا اس لیے مجھ سے کہلوایا ہے۔''

''تم نے کہہ دیا اور میں نے سن لیا۔ اب سواری بڑھاؤ۔ یہاں سے چلتی بنو ورنہ میرے منہ سے کچھ اور نکل جائے گا۔ چھیننے کے لیے کوئی اور نہیں میرا بچہ ہی رہ گیا تھا۔''

''میں تمہارا بیٹا کیوں چھیننے لگی تھی۔ وہ تو تمہارے ہی گھر میں رہے گا۔ بیٹی تو میری مجھ سے دور ہو گی۔ یہی دنیا کا قاعدہ ہے۔''

''میں اپنا بیٹا کسی کو نہیں دے سکتی۔''

''اس کی کہیں تو شادی کرو گی۔''

''جب کروں گی تب دیکھا جائے گا۔ آپ نے دو فہد کو اس کی بھی خبر لیتی ہوں۔''

وہ بے چاری اپنا سا منہ لے کر چلی گئی۔ ایسی بے عزتی شاید اس کی کبھی نہیں ہوئی ہو گی جیسی اب ہوئی تھی لیکن میں بھی مجبور تھی۔

اب مجھ پر ظاہر ہو چکا تھا کہ اس رات فہد کے ساتھ چھت پر کون تھا اور وہ کس سے باتیں کر رہا تھا۔ بعد میں تحقیق کرنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ہماری چھت کو زبیدہ کی چھت سے ملانے والی دیوار کی دو تین اینٹیں نکال لی گئی تھیں اور آسانی سے ایک دوسرے کی چھت پر آیا جایا جا سکتا تھا۔

فہد بہت کم باہر نکلتا تھا لیکن اس روز زبیدہ کی ماں آئی تو وہ جان بوجھ کر باہر نکل گیا تھا۔ واپس آیا تو میں نے اس سے زبیدہ کے بارے میں پوچھا۔ میری توقع کے مطابق اس نے ہر بات سے انکار کر دیا۔

''تو آپ زبیدہ سے محبت فرماتے ہیں۔''

''نہیں امی، میں تو آپ کے سوا کسی سے بھی محبت نہیں کرتا۔''

''اس کی ماں مجھے یہ بتانے آئی تھی کہ تم اس سے محبت کرتے ہو اور شادی کرنا چاہتے ہو۔''

''نہیں تو، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ خود ہی کہنے آ گئی ہوں گی۔ میں نے تو ان سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔''

''تم زبیدہ سے چھپ چھپ کر نہیں ملتے رہے ہو؟''

''نہیں، یہ بھی غلط ہے۔ میں اس سے کیوں ملنے لگا۔''

مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے لیکن مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی کہ وہ مجھ سے ڈرتا ہے۔ میں نے اس سے ایک مرتبہ پھر کہہ دیا کہ وہ زبیدہ یا اس کی ماں سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔

وقت آگے بڑھنے لگا۔

ایک دن سراج میرے پاس آیا اور کارخانے کی چابیاں میرے سامنے ڈال دیں۔

”بھابی، اب کارخانہ چلانا میرے بس سے باہر ہو گیا ہے۔ ملازموں کو تنخواہیں دینے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔ یہ چابیاں لیں اور کارخانہ خود سنبھال لیں۔“

”میں نے تو کاروبار تمہیں سونپا تھا۔ اگر میں سنبھال سکتی تو پہلے ہی سنبھال لیتی۔“

”میں نے بھی یہ سوچ کر آپ کی پیش کش قبول کر لی تھی کہ فہد بڑا ہو جائے گا تو میری جان چھوٹ جائے گی لیکن آپ نے تو اسے ایسا بنا دیا ہے کہ وہ اپنے آپ ہی کو سنبھال لے تو بہت ہے۔ میں اب ساری برائی اپنے سر نہیں لے سکتا۔ آپ کے دل میں ضرور آئے گا کہ میں بیچ میں پیسے کھا رہا ہوں۔“

”میں نے تو یہ کبھی نہیں کہا۔“

”آپ نے کہیں لیکن سوچتی ضرور ہوں گی۔“

”میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔“

”کچھ بھی ہو اب کارخانہ چلانا میرے بس میں نہیں۔ آپ اسے خود چلائیں یا بیچ دیں۔“

”اگر یہ سہارا بھی بیچ دوں تو کھاؤں گی کہاں سے۔“

”کارخانہ بیچ کر رقم بینک میں رکھوا دیں۔ کچھ مدد میں بھی کر دیا کروں گا۔ کوشش کریں کہ فہد بھی کوئی کام کرنے لگے۔“

کارخانے سے آمدنی اتنی نہیں ہو رہی تھی کہ میں لالچ میں آ جاتی۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ کارخانہ بیچ کر اکٹھی رقم بینک میں جمع کرا دی جائے۔

مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ کارخانہ بیچنے کی ذمے داری بھی سراج ہی کے سپرد کر دی۔ کتنے کا بکا، کیا ہوا، مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ اس نے معمولی سی رقم لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ میں نے وہ رقم بینک میں رکھ دی۔

اس نے کسی معمولی سی بات پر لڑ جھگڑ کر اپنا راستہ الگ کر لیا۔ اس نے کہا تھا وہ بھی کچھ مدد کرتا رہے گا۔ لیکن مدد کرنا تو درکنار، اس نے تو شکل دکھانی بھی چھوڑ دی۔

ہم جیسے تیسے گزارا کرتے رہے۔

میں سوچا کرتی تھی کہ بیٹھے بیٹھے کھاتے رہو تو قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جائے لہٰذا اب فہد کو بھی کچھ کرنا چاہیے۔ وہ کبھی گھر سے نکلا نہیں تھا، کرتا تو کیا کرتا۔ میری قابلیت بھی بس اتنی تھی کہ لوگوں کے گھروں میں کام کر سکتی تھی لیکن میں گھر سے نکل جاتی تو فہد کو کس کے سہارے پر چھوڑتی۔ وہ اب خیر سے بیس سال کا ہو گیا تھا لیکن بچوں سے زیادہ بچہ تھا۔ کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سراج کو کئی مرتبہ کہلوایا کہ فہد کو کہیں کام پر لگا دے لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد میں خود سر پر برقع رکھ کر نکلی۔ مختلف بڑی دکانوں پر گئی اور دکانداروں سے کہا کہ وہ میرے بچے کو اپنی دکان پر کھڑا کر لیں۔ جو تنخواہ دینا چاہیں دے دیں۔ ہر جگہ سے صاف جواب مل گیا کہ ہمیں ضرورت نہیں۔ بڑی تگ و دو کے بعد ایک دکاندار نے ہامی بھری۔ مسئلہ پھر وہی تھا کہ فہد کو کیسے آمادہ کروں۔ یہ مرحلہ بھی کسی نہ کسی طرح طے کر ہی لیا اور فہد کو لے کر دکان پر پہنچ گئی۔ دکاندار نے اس سے بات کی تو اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ دکاندار بھی حیران تھا کہ لڑکے کو ہو کیا گیا ہے۔

”یہ لڑکا تو یہاں نہیں چل سکتا۔“ دکاندار نے کہا۔ ”اس سے تو بات ہی نہیں ہوتی گاہکوں کو کیسے ڈیل کرے گا۔“

”ذرا شرماتا ہے۔ دو چار دن دکان پر کھڑا ہو گا تو اس کی شرم دور ہو جائے گی۔“

”اس کی یہ عمر شرمانے کی تو نہیں ہے۔“ دکاندار نے ہنستے ہوئے کہا۔

دکاندار اس انداز سے ہنسا تھا کہ میرے دل پر چھری سی چل گئی۔ بات یہ تھی کہ میں نے فہد کو لڑکیوں سے بدتر بنا دیا تھا۔ اس بات کو میں اب تسلیم کر رہی تھی لیکن دل سے مجبور تھی۔ میں اسے خود سے دور نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دکان پر کھڑا ہونے لگا تھا لیکن دن میں کئی کئی مرتبہ جا کر دیکھ آتی تھی کہ وہ دکان پر ہے بھی یا نہیں۔

میرا یہ بار بار کا دکان پر جانا بھی کام نہ آ سکا۔ اس کا شرمانا دور نہیں ہوا بلکہ بعض دفعہ تو وہ رونے لگتا تھا اور ضد کرتا تھا کہ مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ گھر آتا تو گھر آ کر بھی ضد کرتا تھا کہ اب وہ دکان پر نہیں جائے گا۔ مجھے پیسوں کا لالچ نہیں تھا اب تو مجھے یہ فکر تھی کہ وہ کسی طرح عام لڑکوں



کی طرح بن جائے لیکن شاید اب بہت وقت گزر چکا تھا۔ میں تو اسے کیا دکان سے اٹھاتی دکاندار خود ہی چھوڑ کر چلا گیا کہ یہ لڑکا ہمارے کام کا نہیں۔ میں اسے پھر گھٹنے کے زخم کی طرح سنبھال کر رکھنے لگی۔

ایک دن میں اپنے ایک دور کے رشتے دار کے گھر گئی ہوئی تھی۔ فہد بھی میرے ساتھ تھا۔ ان لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ انہیں یہ سن کر تعجب ہوا کہ اتنا بڑا لڑکا ابھی تک کچھ بھی نہیں کرتا ہے۔ میں نے بہانہ کر دیا کہ بچپن میں یہ بیمار رہتا تھا اس لیے نہ تو پڑھ سکا اور نہ کوئی کام سیکھ سکا۔ ان سے میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب چاہتی ہوں وہ کوئی کام سیکھ جائے یا کوئی ایسی نوکری اسے مل جائے جس میں کسی ہنر کی ضرورت نہ پڑے۔ ان لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں فہد کو کریانہ کی دکان کرا دوں۔ کریانہ کی دکان چلانا کوئی آسان نہیں ہوتا جبکہ میں جانتی تھی کہ اس میں کتنی صلاحیت ہے۔

”ایسا ہو سکتا ہے کہ دو تین ملازمین رکھ لیے جائیں۔ یہ صرف کیش کاؤنٹر پر بیٹھا رہے۔“ ان لوگوں نے کہا۔

”اس کے باوجود تجربے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ تو ملازمین اسے بے وقوف بنا کر چلتے بنیں گے۔“ میں نے کہا۔

”اس کے لیے یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کچھ دنوں کسی دکان پر کھڑے ہو کر تجربہ حاصل کر لے۔“

”اگر آپ کا کوئی جاننے والا ہے تو اسے اس کی دکان پر کھڑا کر دیجیے۔“

”جاننے والا کیا مطلب۔ میرا خود جنرل اسٹور ہے۔ کئی ملازمین کام کر رہے ہیں، یہ بھی کھڑا ہو جایا کرے گا۔ اب یہ اس کے اوپر ہے کتنی جلدی کام سیکھ لیتا ہے۔“

کارخانہ بیچ کر جو رقم مجھے ملی تھی وہ بینک میں رکھی تھی۔ وہ زیادہ نہیں تھی لیکن اتنی ضرور تھی کہ اس سے ایک چھوٹی سی دکان کھولی جا سکتی تھی۔ میں نے خواب دیکھ لیا کہ فہد کچھ تجربہ حاصل کر لے تو میں اسے دکان کھلوا دوں گی۔ فہد کو بھی شاید اب اپنے مستقبل کا کچھ کچھ احساس ہونے لگا تھا۔ وہ بھی اس ملازمت کے لیے تیار ہو گیا اور دکان پر جانے لگا۔

یہ دکان چونکہ میرے رشتے دار کی تھی اس لیے وہ کسی نہ کسی کام سے فہد کو گھر میں بھی بھیج دیا کرتے تھے۔ اس گھر میں ایک لڑکی نسرین بھی تھی۔ فہد اور نسرین میں نہ جانے کیا باتیں ہوئیں کہ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ نسرین کی

## مولانا نبی بخش

1276ھ۔1860ء۔1365ھ۔1945ء

لاہور کے ایک متوسط آرائیں گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اپنے وقت کے ممتاز علماء سے اکتساب فیض کیا جن میں سے مولانا معوان حسین رامپوری خطیب بادشاہی مسجد، مولانا محمد ذاکر بگوی، پیر عبدالغفار شاہ کشمیری، مولانا غلام قادر بھیروی اور مولانا غلام دستگیر قصوری کے اسماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ نے معاش کے لیے مٹھائی بنانے اور دودھ بیچنے کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ اسی لیے آپ کو حلوائی کہا جاتا ہے۔ حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری کے دست اقدس پر بیعت ہوئے اور پھر حضرت پیر سید جماعت علی شاہ لاثانی علی پور سے بیعت ہوئے۔ آپ نے مسلک اہل سنت والجماعت کی ترویج کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ بعض کے نام یہ ہیں۔ 1۔ تفسیر نبوی، پنجابی شعروں میں 15 جلد، 2، اطلاع الناس فی طلاق الثلاث۔ 3، الامتیاز بین الحقیقۃ والمجاز، 4، احسان، لاموات فی الصدقات والاسقاط۔ 5۔ جامع الشواہد، 6۔ سبیل الرشاد فی حق الاستاد۔ 7۔ اظہار انکار المنکرین۔ 8۔ تحقیق الرمان فی آداب المشائخ والاخوان، 9 النار الی مطین ذم المعاویہ وغیرہ۔ آپ نے قریباً ایک سو برس کی عمر میں 1365ھ/1945ء میں وفات پائی اور اپنی تعمیر کردہ مسجد ستی کوتوالی دہلی دروازہ لاہور میں دفن ہوئے۔ مولانا باغ علی نسیم اور اقبال احمد فاروقی ایم۔اے آپ کے مشہور شاگرد ہیں۔ مولانا باغ علی نسیم نے آپ کی یاد میں مکتبہ نبویہ قائم کیا جو دور جدید کے طباعت واشاعت کے تقاضوں کے مطابق مسلک اہل سنت والجماعت کی گرانقدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

## نجات

عربی لفظ، قرآن عزیز میں کئی مقام پر آیا ہے۔ اسلام میں نجات صرف اللہ ہی سے مانگی جا سکتی ہے۔ وہ واحدہ، لاشریک ہی عذاب سے اور مشکلات سے بچا سکتا ہے۔ اسلام کے مطابق جو کوئی بھی کلمہ اور دوسرے ارکان دین پر عمل کرے گا اسے نجات مل جاتی ہے، نجات کے متلاشی اور نیک بندوں کو ہی نجات ملے گی۔ کچھ کو گناہوں کے کفارے کی سزا ملے گی اور بعض جو منکر ہوں گے اور اللہ سے غافل رہے ہوں گے اور ایسے لوگ ہوں گے جو گناہ کبیرہ کرتے رہے ہوں گے انہیں نجات کی بجائے جہنم کی آگ ملے گی۔

مرسلہ: فہیم الدین، وہاڑی

ماں فہد کو لے کر میرے پاس آئیں۔

''بہن، فہد بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔ میں چاہتی ہوں نسرین کی اس سے شادی ہوجائے۔ ہمارے تمہارے درمیان رشتے داری بھی ہے۔ میں چاہتی ہوں یہ رشتے داری مزید پختہ ہوجائے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے فہد ہی کا تو ہے۔ میرا اکلوتا داماد ہوگا فہد۔''

فہد اتنا شرمیلا تھا کہ یہ بات وہ خود مجھ سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لیے نسرین کی ماں کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ میں نے بھی سوچا کہ اگر ایسا ہوجائے تو کیا حرج ہے۔ اس کی شادی کہیں نہ کہیں تو کرنی ہے یہیں سہی۔ کیا خبر یہ لوگ دکان ہی اس کے نام کردیں۔ میں نے یہ رشتہ منظور کرلیا۔

نسرین میرے گھر بیاہ کر آگئی۔ میری رشتے دار تھی۔ لڑکی بھی اچھی تھی۔ پھر مجھے یہ لالچ بھی تھا کہ کسی نہ کسی وقت دکان فہد کے نام ہوجائے گی۔ میں نسرین کی آؤ بھگت میں لگ گئی۔

یہ ماحول چند مہینے رہ سکا پھر میری ازلی فطرت کام دکھانے لگی۔ میں نے پہلے تو یہ مطالبہ کیا کہ دکان فہد کے نام ہونی چاہیے لیکن جب یہ مطالبہ نہیں مانا گیا تو میں نسرین کی دشمن ہوگئی۔ اسے طرح طرح سے ستانا شروع کردیا مقصد یہ تھا کہ نسرین کے گھر والے اسے تکلیف میں دیکھ کر میرا مطالبہ مان لیں اور دکان فہد کے نام کردیں۔ میں کروڑوں میں کھیلتی تھی۔ جب دو بڑے کارخانوں کی بھی فکر نہ رہی تو پھر یہ معمولی دکان کی حیثیت کیا مگر میں تو اپنی فطرت کی تسکین چاہتی تھی۔ فہد مجھ سے اتنا ڈرتا تھا کہ وہ بیوی کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ اس سے میری ہمت اور بڑھ گئی۔ نسرین تنگ آکر اپنے میکے جاکر بیٹھ گئی۔ میں نے فہد کو منع کردیا کہ وہ اس کی خیر خبر کے لیے اس کے گھر نہ جائے۔ دکان پر وہ برابر جارہا تھا۔ اس سے مجھے ڈر ہوا کہ نسرین کا باپ اس کے کان نہ بھردے۔ میں نے فہد سے کہہ دیا کہ وہ دکان پر جانا چھوڑ دے۔ وہ تو میرے حکم کا غلام بنا ہوا تھا۔ اس نے وضاحت بھی طلب نہیں کی اور دکان پر جانا چھوڑ دیا۔ وہ بھی ایسے لوگ تھے کہ انہوں نے پلٹ کر بھی نہیں پوچھا۔ میرے غصے میں اور اضافہ ہوتا گیا بلکہ بے عزتی کا احساس ہوا۔ میں نے فہد سے کہا کہ وہ نسرین کے گھر جائے اور اسے طلاق دے کر آجائے۔ کاش! وہ اس وقت میرے خلاف تن کر کھڑا ہوجاتا اور نسرین کو طلاق دینے سے انکار کردیتا۔ اس نے میرے حکم پر ... . سر جھکا دیا۔

نسرین کے گھر گیا اور اسے طلاق دے کر آگیا۔ وہ شریف لوگ تھے کہ رو دھو کر خاموش ہوگئے۔ مہر کی رقم تک طلب نہیں کی۔ میں نے دوسرے دن نسرین کا جہیز ان کے گھر پہنچا دیا۔

فہد نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ نسرین کی اس سے محبت کی شادی تھی لیکن اس نے ایک دن بھی نسرین کو یاد نہیں کیا۔ کسی کا معمولی کھلونا بھی گم ہوجاتا ہے تو وہ دو ایک روز تو اداس رہتا ہے۔ فہد پر تو اس کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ اس کے اس رویے سے میرے احساسِ جرم میں کمی آگئی۔ میں نے بھی یہ سوچنا چھوڑ دیا کہ میری طرف سے کوئی زیادتی ہوئی ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ فہد کیا کرے۔ دکان کی نوکری چلی گئی تھی۔ کچھ اور اس کے بس کا تھا نہیں۔ مجھے اپنا خواب یاد آیا کہ فہد کو دکان کھلوادی جائے۔ میں نے اس سے بات کی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس نے دکان پر کھڑے ہوکر اچھا خاصا تجربہ حاصل کرلیا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اگر میں نے پیسے لگائے تو میرے پیسے ڈوبیں گے نہیں۔ میں نے محلے ہی میں ایک دکان دیکھی اور کرائے پر لے کر اس میں تھوڑا بہت مال ڈلوادیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یہ دکان چل پڑی۔ روز بروز ترقی ہوتی گئی اور صرف ایک سال میں فہد نے یہ دکان ختم کرکے بازار میں ایک بڑا جنرل اسٹور خرید لیا۔

اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی تو میرے دل میں یہ ارمان جاگا کہ میں فہد کی شادی کردوں۔ میں نے اس سے تذکرہ کیا۔ وہ حسبِ توقع سن کر چپ ہوگیا لیکن نہ جانے کیوں چہرے سے لگ رہا تھا کہ شادی کا ذکر سن کر خوش نہیں ہوا ہے۔ اس دن مجھے یہ احساس ہوا کہ اس نے نسرین کو طلاق دے ضرور دی ہے لیکن وہ اب بھی اس کے دل میں رہتی ہے۔ اب یہ اور بھی ضروری ہوگیا تھا کہ اس کی شادی جلد سے جلد ہوجائے۔ میں نے اس کی شادی میں رضامندی دیکھ کر اس کے لیے لڑکیاں دیکھنی شروع کردیں۔

فہد کی دکان خوب چل رہی تھی۔ اس سے ہمارے گھر کے حالات بھی اچھے ہوگئے تھے۔ میں یہ بات پڑھنے والوں کو بتانا بھول گئی کہ فہد نے جو نئی دکان کھولی تھی وہ شراکت میں تھی۔ نصف سرمایہ فہد نے لگایا تھا نصف ایک اور صاحب کا تھا جو دکان پر بہت کم بیٹھتے تھے۔ زیادہ تر فہد بیٹھتا تھا۔ اس لیے آمدنی کا ساٹھ فیصد فہد لیتا تھا چالیس فیصد ان صاحب کو جاتا تھا۔

یہ بات بتانی اس لیے ضروری تھی کہ فہد کی شادی کا تعلق اس شراکت داری سے بنتا ہے۔ میں جن دنوں فہد کے لیے لڑکی تلاش کررہی تھی ''ان صاحب'' کو بھی معلوم ہوا۔ ان کا نام شمس الدین درانی تھا۔ کسی بینک سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انہوں نے فہد کی معرفت مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور پہلی ہی ملاقات میں اپنی بیٹی سمیلہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

''میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میں اس کی شادی کے لیے پریشان بھی بہت ہوں۔ فہد بہت اچھا لڑکا ہے۔ اگر سمیلہ کی شادی اس سے ہوجائے تو ہمارا کاروباری تعلق رشتے داری میں بدل جائے گا۔''

''آپ کو یہ معلوم ہے کہ فہد کی یہ دوسری شادی ہوگی۔ پہلی بیوی کو وہ طلاق دے چکا ہے۔''

''مجھے معلوم تو نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اگر طلاق ہوئی ہے تو اس میں قصور فہد کا نہیں اس لڑکی کا ہوگا۔''

''مجھے بتانا مقصود تھا تاکہ آپ اندھیرے میں نہ رہیں۔''

''اس سے آپ لوگوں کی شرافت ظاہر ہوتی ہے جس کی میں قدر کرتا ہوں۔''

میں ان کے اصرار پر ان کے گھر گئی اور ان کی لڑکی کو دیکھا۔ عمر کچھ زیادہ ہوگئی تھی لیکن تھی بہت خوبصورت۔ درانی صاحب کی بیوی بھی مجھے بہت سیدھی معلوم ہوئیں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ان کا کوئی بیٹا بھی نہیں ہے۔ فہد کو یہ پسند بھی بہت کرتے ہیں آگے چل کر شراکت داری تو محض ایک پردہ رہ جائے گی سب کچھ فہد کا ہوگا۔ فہد تو میری مٹھی میں ہے، سمیلہ کو جس رنگ میں چاہوں گی ڈھال لوں گی۔

خوب سوچ سمجھ کر میں نے فیصلہ دے دیا اور فہد کی شادی سمیلہ سے ہوگئی۔

سمیلہ کی جتنی تعریف میں نے سنی تھی وہ اس سے بھی بڑھ کر ثابت ہوئی۔ اس نے آتے ہی مجھے بستر پر بٹھادیا۔ گھر کے تمام کام اپنے ہاتھ میں لے لیے لیکن فہد کی بے جا محبت قدم قدم پر مجھے پریشان کررہی تھی۔ اول تو یہی ہوا کہ ہم ماں بیٹے ایک کمرے میں سوتے تھے۔ شادی ہوتے ہی فہد کا کمرا الگ ہوگیا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ قصوروار سمیلہ کو ٹھہرایا جاتا لیکن میرے دل میں برائی اسی کی طرف سے آئی کہ نہ یہ آتی نہ میرے کلیجے کا ٹکڑا مجھ سے الگ ہوتا۔ میں پھر کہتی ہوں یہ میرا پاگل پن ہی تو تھا مگر تھا۔

فہد کی فرماں برداری تھی کہ دکان سے آنے کے بعد سیدھا میرے پاس آکر بیٹھتا تھا۔ جو کچھ لاتا تھا میرے ہاتھ میں دیتا تھا۔ شادی کے بعد بھی اس کا یہی طریقہ رہا لیکن کچھ دنوں بعد سمیلہ نے کچھ کہا یا خود ہی اس کے دل میں آئی وہ پہلے اپنے کمرے میں جاتا پھر میرے پاس آکر بیٹھتا۔ اگر کوئی پھل وغیرہ لاتا تو سمیلہ میرے پاس لاتی کہ فہد یہ لے کر آئے ہیں۔ نہ جانے کیا کچھ اپنے پاس رکھتی کیا میرے پاس لے کر آتی۔

میرے دل میں برائی آتی گئی کہ وہ فہد کے کان بھرتی ہے۔

انہیں کہیں جانا ہوتا تو کبھی تو مجھ سے پوچھ لیتے کبھی مجھ سے صرف یہ کہہ کر چلے جاتے کہ ہم فلاں جگہ جارہے ہیں۔ یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ ان کی زندگی تھی وہ کہیں اکیلے بھی جاسکتے تھے لیکن میں تو ان کے پیچھے سائے کی طرح رہنا چاہتی تھی۔

یہ باتیں تلخیوں کا روپ دھارنے لگیں۔ میں نے وہی سلوک سمیلہ کے ساتھ روا رکھنا شروع کردیا جو کبھی نسرین کے ساتھ رکھا تھا۔

وہ ایسی صابر لڑکی تھی کہ میری ہر بات کا جواب ہنس کر دیتی تھی۔ عجیب مٹی کی بنی تھی کہ کسی بات کا اس پر اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ بس اس کی یہی عادت میری چڑ بن گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے مجھے چڑا رہی ہے۔ میں غصہ کررہی ہوں اور وہ ہے کہ ہنسے جارہی ہے۔ میں اسے چڑیل کہہ رہی ہوں اور وہ مجھے ''امی'' کہہ کر مخاطب کررہی ہے۔

جب میں بہت تنگ آگئی تو میں نے فہد سے بات کی اور وہی مطالبہ کیا جو کبھی نسرین کے لیے دہرا چکی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ سمیلہ کو طلاق دے دے۔ میں تو یہ توقع کررہی تھی کہ وہ سر جھکا لے گا لیکن یہ پہلا موقع تھا جب وہ میرے خلاف تن کر کھڑا ہوگیا۔

''آپ نے سمیلہ میں ایسی کیا بات دیکھی کہ میں اسے طلاق دے دوں۔''

''میں کہہ رہی ہوں اسے طلاق دے دو تو بس طلاق دے دو۔''

''امی، میں سمیلہ کو طلاق نہیں دے سکتا۔''

''میرے کہنے سے بھی نہیں؟''

’’میں آپ کا یہ حکم نہیں مان سکتا۔‘‘

’’تم تو دکان پر چلے جاتے ہو وہ دن بھر مجھ سے لڑتی ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔‘‘

’’امی میں اسے سمجھا دوں گا۔ اب وہ آپ سے نہیں لڑے گی لیکن طلاق کی بات نہ کریں۔‘‘

میں اس کے تیور دیکھ کر چپ ہو گئی لیکن یقین آ گیا کہ میرا بیٹا مجھ سے چھن گیا اور چھیننے والی سمیلہ ہے۔ میں نے اب تک فہد کو بچا بچا کر رکھا تھا۔ اس عورت نے اسے مجھ سے چھین لیا۔ میرے خلاف کر دیا۔

بات تھی بھی یہی۔ فہد نے آج تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کی۔ کبھی میرا حکم نہیں ٹالا تھا اور اب اس انداز سے بات کر رہا تھا۔ اس وقت بس دل میں یہی بات آئی کہ کسی طرح سمیلہ سے اسے بچایا جائے ورنہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ فہد کو بالکل ہی میرے خلاف کر دے گی۔

وہ طلاق دینے کو تیار نہیں تھا اور میں سمیلہ کو گھر میں رکھنے کی روادار نہیں تھی۔ میں زیادہ کھل کر سامنے نہیں آ سکتی تھی کیونکہ دکان میں اس کے باپ کی رقم لگی ہوئی تھی۔ میں کسی ایسی ترکیب پر غور کرنے لگی کہ سمیلہ راستے سے ہٹ جائے۔ کئی مرتبہ یہ سوچا کہ اسے زہر دے کر مار دوں لیکن زہر آتا کہاں سے۔ یہ بھی ڈر تھا کہ اگر راز کھل گیا تو میں سزا سے بچ نہیں سکوں گی۔ یہ بھی سوچا تھا کہ اسے سوتے میں مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دوں اور بہانہ کر دوں کہ کھانا پکاتے ہوئے جل گئی لیکن پھر یہ خیال آیا کہ ضروری تو نہیں کہ وہ مر ہی جائے۔ اگر بچ گئی تو سب کچھ بتا دے گی۔ اسی طرح کی اور ترکیبیں سوچتی رہی لیکن ہر ترکیب میں کوئی نہ کوئی نقص نظر آتا تھا۔

اس روز گھر میں کام کرنے والی کپڑے دھو کر چھت پر سکھانے کے لیے ڈال گئی تھی۔ قاعدہ تھا کہ دوسرے دن آ کر اتارتی تھی لیکن مغرب کے بعد جب اندھیرا پھیل گیا تو آسمان پر گھرے بادل چھا گئے۔ اندھیرے میں اندھیرا شامل ہو گیا۔ فہد اس وقت گھر پر تھا۔ میں اپنے کمرے میں تھی کہ فہد کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

’’سمیلہ، چھت پر سے کپڑے اتار لاؤ۔ بارش ہو گئی تو سب بھیگ جائیں گے۔ بوندا باندی شروع ہو گئی ہے۔‘‘

اس آواز کے سنتے ہی میرے کانوں میں برق سی کوندی۔ سمیلہ کپڑے اتارنے چھت پر جائے گی۔ موقع اچھا ہے۔ میں جھٹ اپنے کمرے سے نکلی اور زینہ چڑھ کر ایک ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ گئی جہاں اوپر آنے والے کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ کچھ دیر میں قدموں کی آواز آئی۔ کوئی اوپر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا سمیلہ اوپر آ رہی ہے۔ پھر ایک سایہ میرے قریب سے گزرا۔ رات کا اندھیرا اور بادلوں کی تاریکی، کچھ بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس سائے کو اوپر جانے دیا۔ پھر میں بھی چھت پر پہنچ گئی۔ وہ سایہ ایک ایک کر کے الگنی سے کپڑے اتار رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میری نظر بھی کمزور ہو گئی تھی اتنی کمزور کہ ٹٹول کر احساس کی آنکھ سے دیکھنا پڑتا تھا، اس پر ستم یہ کہ رات بھی کچھ زیادہ ہی کالی تھی۔ میں کچھ دیکھ ہی نہ سکی۔ وہ سایہ جس جگہ کھڑا تھا وہاں دیوار کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھی اور اس سائے کو پشت کی جانب سے گلی میں دھکا دے دیا۔ بارش کچھ تیز ہو گئی تھی۔ گلی سنسان پڑی تھی۔

اس سے پہلے کہ لوگ جمع ہوتے میں زینے سے اتری اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسی وقت سمیلہ بھاگتی ہوئی میرے کمرے میں آئی۔ اسے دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اسے تو میں نے دھکا دے دیا تھا یہ صحیح سلامت میرے سامنے کیسے کھڑی ہوئی ہے۔

’’امی، فہد کپڑے اتارنے چھت پر گئے تھے۔ پاؤں پھسلا اور نیچے گر گئے۔ گلی میں شور مچا ہوا ہے۔ باہر جا کر تو دیکھیے‘‘ اس نے صرف اتنا کہا اور باہر کی طرف بھاگی۔

میں بھاگنا بھی بھول گئی تھی۔ کمرے سے نکلی اور صحن میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اتنی دیر میں لوگ فہد کو اٹھا کر گھر میں لے آئے۔ میں صرف اتنا دیکھ سکی کہ وہ خون میں لت پت تھا۔

’’ایمبولینس کو فون کر دیا ہے لیکن فائدہ کچھ نہیں۔ اب اس میں کچھ نہیں رہا۔‘‘ کوئی کہہ رہا تھا۔ یہ سنتے ہی جیسے مجھے ہوش آ گیا۔

’’فہد کی قاتل میں ہوں۔ میں نے اسے دھکا دیا تھا۔ مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دو۔‘‘

میں چیخ رہی تھی لیکن یقین کرنے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ بیٹے کی لاش دیکھ کر بے چاری کا دماغ چل گیا ہے۔

فہد کی موت کو کئی سال گزر گئے ہیں۔ میں اب بھی یہی کہتی ہوں کہ میں نے فہد کو دھکا دیا تھا لیکن کوئی میری بات ماننے کو تیار نہیں۔ سب لوگ اب بھی یہی کہتے ہیں کہ میرا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔



# فطرت

جناب معراج رسول

آداب عرض!

مرسلہ سچ بیانی ہمارے ایک واقف کار کی ہے۔ محترمہ نے بڑی جانفشانی سے اپنی زندگی آپ بنائی ہے۔ ان کی آپ بیتی دراصل انسانی نفسیات کی عکاس ہے۔ جس کی جیسی فطرت ہوتی ہے وہ ویسا ہی ہوتا ہے۔

عمران قریشی

(کوئٹہ)

ہمارا نام رقیہ بیگم ہے۔ نسبت کے لحاظ سے ہمارا تعلق لکھنؤ سے ہے۔ تقسیم کے بعد ہم پاکستان آ گئے اور یہیں پلے بڑھے۔ میٹرک کے بعد گھر والوں نے ہمیں پڑھائی کو خیرباد کہنے کے لیے کہا تو ہم نے نہایت سعادت مندی کے ساتھ اقرار میں سر ہلا کر ان کے فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ پھر ماں باپ نے محلے کے ایک لڑکے کے ساتھ ہماری نسبت طے کرنے کی بات کی۔ تب بھی ہم نے انکار کرنا مناسب نہیں جانا اور حسبِ فطرت اقرار میں سر ہلا دیا۔ لڑکے کا نام نذیر

احمد تھا۔ میونسپل کارپوریشن میں کلرک کے عہدے پر فائز تھا۔ اس کے آگے پیچھے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اس کی سرپرستی کرنے والے ماموں کا انتقال حال ہی میں ہوا تھا۔ گھر کرائے کا تھا اور نوکری اپنی تھی۔ اس لیے پینٹ شرٹ پہنے بہت عیاشانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ویسے ہمارے ماں باپ کے کہنے کے مطابق لڑکا نہایت شریف اور فرماں بردار تھا۔ ہمارے گھر کے کام وہ بغیر چوں وچرا کیے کردیتا تھا۔ تو صاحب...... ہماری شادی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مترادف نہایت عجلت کے عالم میں سادگی کے ساتھ کردی گئی۔ یوں ہم دلہن بن کر نذیر احمد کے دو کمروں پر مشتمل مکان میں چلے آئے۔

زندگی نہایت احسن طریقے کے ساتھ گزرنے لگی۔ نذیر احمد شکل وصورت کے لحاظ سے نہایت واجبی ہونے کے علاوہ رکھ رکھاؤ کے معاملے میں نہایت حساس اور فطرت کے لحاظ سے ہمارے برخلاف حالات سے سمجھوتا نہ کرنے والے انسان تھے۔ وہ مزید سے مزید تر کی تلاش میں سرگرداں رہنے کو فخر کے قابل گردانتے تھے۔ علاوہ ازیں جھوٹ بولنا بھی ان کی عادت میں شامل تھا۔ شادی کے اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ہمیں ان کی صحیح آمدن کے متعلق جانکاری نہ ہوئی۔ جو کچھ اعداد وشمار انہوں نے ہمیں بتائے بھی تو وہ بعد میں غلط ثابت ہوئے۔ بہرکیف ہمیں صرف روٹی کپڑا اور مکان کے نام پر جو رقم مہینے کے مہینے دستیاب ہوتی تھی اسی میں گزر بسر نہایت معقول انداز میں ہوجایا کرتی تھی۔ ان باتوں کے علاوہ ہمیں ان سے مزید کوئی شکایت نہیں تھی۔

شادی کے پہلے سال ہمیں ماں بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ لڑکے کا نام نذیر احمد نے منیر احمد رکھا۔ ہم نے اقرار میں سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔ منیر احمد کی پیدائش کے ایک سال بعد نذیر احمد نے ہمیں بتایا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے خوش نہیں ہیں۔ بیرونِ ملک جا کر کوئی مناسب ذریعۂ معاش تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔ گھر میں کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ہمارا کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا کسی بھی لحاظ سے کم تر نہ تھا۔ اس لیے ہمیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ نذیر احمد کو باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ شاید یہ ان کی فطرت کا تقاضا تھا جو انہیں مجبور کررہا تھا کہ بہتر سے بہتر ذریعۂ معاش پُرآسائش زندگی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ تب ہم پر یہ حقیقت بھی آشکار ہوئی کہ وہ باہر جانے کے لیے کافی عرصے سے اپنی ماہنامہ آمدنی میں سے رقم پس انداز کررہے تھے۔ اس لیے انہیں چنداں مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہمارے اقرار یا انکار سے ان پر کوئی خاص اثر نہیں پڑنے والا تھا۔ پھر بھی ہم نے دبے الفاظ میں انہیں روکنے کی کوششیں کی۔ تب انہوں نے ہمیں یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ وہ سب کچھ اپنے بچے کے بہتر مستقبل کی خاطر کررہے ہیں۔ کچھ دنوں کی بات ہے' وہ لندن میں رہائش پذیر ہونے کے بعد ہمیں بھی بلانے کی کوششیں کریں گے۔ یوں ہم خاموش ہوگئے اور مارچ کے اوائل میں نذیر احمد ہمیں اور منیر احمد کو چھوڑ کر لندن کی جانب سدھار گئے۔

ان دنوں باہر جانا مشکل نہیں تھا۔ اگر معقول رقم آپ کی جیب میں موجود ہو تب کسی بھی ملک کا ویزا بہ آسانی دستیاب ہوجاتا تھا۔ سو نذیر احمد کو دستیاب ہوگیا اور وہ بہتر سے بہتر کی تلاش میں باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کی بدولت ہماری زندگی میں جو خلا پیدا ہوا اسے بھرنے میں منیر احمد کے ننھے وجود نے نمایاں کردار ادا کیا۔ نذیر احمد کے خطوط بھی تواتر کے ساتھ آتے رہتے تھے۔ کبھی کبھار وہ مختصر رقم بھی بھیج دیا کرتے تھے جو نہایت قلیل ہونے کے باوجود بھی ہماری گزر بسر کے لیے کافی ...... ہوتی تھی۔ ہمارے محتاط اندازے کے مطابق نذیر احمد کے بیرونِ ملک جانے کے بعد ہمارے مالی حالات پہلے سے متاثر ہوئے تھے۔ ہماری زیادہ گزر بسر ادھار پر ہونے لگی تھی۔ ان دنوں ہمیں یہ جان کر خوشی کے ساتھ کچھ پریشانی بھی محسوس ہوئی کہ ہم دوبارہ ماں بننے والی تھی۔ حالات کی تنگدستی کی بدولت ہم نے خود انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ میٹرک کی واجبی تعلیم کی بدولت ہمیں ڈھنگ کی نوکری ملنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے محلے والوں کے ساتھ باہمی مشورے کے بعد ہم نے سلائی کڑھائی کا ادارہ کھولنے کا فیصلہ کیا۔ ایک سلائی مشین ہمارے ہمراہ موجود تھی۔ دوسری ہم نے کچھ رقم پس انداز کرکے خرید لی اور اللہ کا نام لے کر ادارے کا آغاز کردیا۔ کاغذ کے چارٹ پر ''سلائی کڑھائی کا کام بخوبی سکھایا جاتا ہے '' لکھ کر دروازے کے اوپر آویزاں کردیا۔ پہلے مہینے سرسری کام کے علاوہ مزید پیش رفت نہیں ہوئی۔ لیکن دوسرے مہینے ہمارے اچھے حسنِ سلوک اور کارکردگی کی بدولت تقریباً دس لڑکیاں ادارے میں داخلے کے ارادے سے آگئیں۔ یوں کام آگے بڑھنے لگا اور مالی معاونت کا سامان بھی پیدا ہوگیا۔ اس عرصے کے دوران نذیر احمد کی



خط وکتابت میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔ پہلے جہاں ہر دس پندرہ دن کے بعد خط موصول ہوتے تھے۔ اب دورانیہ بڑھ کر مہینے کے مہینے تک جا پہنچا۔ ہمارے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے ایسا ہورہا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق وہ دو دو نوکریاں...... کررہے تھے۔ اس لیے تمام دن کام کی تھکن رات میں جکڑ لیتی ہے اسی وجہ سے خط لکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اتوار کے دن خط لکھنے کی فرصت نصیب ہوتی ہے۔ تب بازار سے راشن کی خریداری کے بعد لکھنے کا جو وقت میسر آتا ہے وہ نہایت قلیل ہوتا ہے۔ ہم نے حالات سے سمجھوتا کرلیا اور اپنے آپ کو ادارے کے کاموں میں مصروف کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ کام مزید سے مزید تر بڑھنے لگا۔ لیکن ہمارے ایامِ زچگی کی مشکلات آڑے آنے لگیں۔ خدا مسبّب الاسباب ہے۔ انہی دنوں ہمارے محلے دار نے ہمارے ساتھ کام کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں ہم نے بخوشی اقرار کرتے ہوئے اسے معقول معاوضے کی پیش کش کی جسے اس نے شکریے کے ساتھ قبول کرتے ہوئے دوسرے دن کام کا آغاز کردیا۔ ہمارے دل ودماغ دونوں سے کام کا بوجھ کسی حد تک کم ہوگیا اور ہم اپنی نجی زندگی کی جانب توجہ دینے کے قابل ہوگئے۔ انہی دنوں ہم پر عظیم سانحہ والد صاحب کی وفات کی صورت میں نازل ہوا۔ وہ کافی عرصے سے علالت کی زندگی بسر کررہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے انہیں اپنے گردشِ ایام کے متعلق بتانا مناسب نہیں جانا تھا۔ لیکن جو خدا کو منظور...... ان کا وقت پورا ہوچکا تھا۔ اس لیے حالات سے پردہ پوشی کے باوجود دل کا دورہ پڑنے کی بدولت قضائے الٰہی سے وفات پاگئے۔ ہم نے فطرت کے مطابق خدا کی مرضی کے آگے سر جھکایا اور والدہ کے ہمراہ اپنے گھر چلے آئے۔

وقت گہرے سے گہرے زخم پر بھی مرہم رکھ کر اسے بھر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ کاموں میں ایسے الجھتے چلے گئے کہ سب کچھ بھلا کر دنیا داری میں مگن ہوگئے۔ زچگی کے دن قریب آگئے تھے اور ہمیں چلنے پھرنے میں دشواری محسوس ہونے لگی تھی۔ منیر احمد بھی روز بروز چڑچڑا ہوتا چلا جارہا تھا۔ خدا نے ان پریشانیوں کا سبب اماں جی کی صورت میں فراہم کردیا۔ اماں بی ہانڈی روٹی پکاتیں۔ گھر کو صاف کرتیں اور بعد میں منیر احمد کے کاموں میں مگن ہوجاتیں۔ ہم ادارے کی پریشانیوں سے بھی دستبردار ہوچکے تھے۔ ہماری محلے دار جس کا نام ثریا جان تھا ادارے کے کام بہ احسن وخوبی سنبھالتی چلی جارہی تھی۔ انہی دنوں ہمارے محلے میں سے ایک لڑکے کا لندن جانے کا پروگرام شنید میں آیا۔ ہم فوراً اماں جی کے ہمراہ اس کے گھر جا پہنچے اور اس کی... خیریت دریافت کرنے کے بعد التجا کرنے لگے کہ خدارا لندن میں اپنے کام کی تکمیل کے فوراً بعد ہمارے شوہر کے متعلق تحقیق کرنا نہ بھولیے گا۔ تقریباً دو مہینے ہونے کو آئے ہیں۔ ہمیں ان کی جانب سے خیر وعافیت بھری کوئی چھٹی موصول نہیں ہوئی۔ نذیر احمد کا ایڈریس ہمارے دماغ میں محفوظ تھا۔ لڑکے نے ہم سے ایڈریس لینے کے بعد ہمیں تسلی دی کہ وہ ضرور نذیر احمد کے متعلق معلومات ہمیں ارسال کرے گا.... یوں ہم مطمئن ہونے کے بعد گھر آگئے۔ لڑکا لندن چلا گیا اور دن دوبارہ اداسی کے عالم میں گزرنے لگے۔ زچگی کے دوران بھی ہم دروازے پر نگاہ ٹکائے ڈاکیے کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔ ان دنوں ہمیں نذیر احمد کی یاد بہت ستاتی تھی۔ پچھلی زچگی کے دوران وہ ہمارے ہمراہ موجود تھے۔ وہ ان دنوں ہمارا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہمیں کسی بھی چیز کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ نہ جانے وہ کہاں اور کس حال میں تھے۔ ثریا جان کا کہنا تھا کہ مرد خود غرض اور بے وفا ہوتے ہیں۔ نذیر احمد یقیناً کسی میم کے ساتھ بیاہ رچانے کے بعد لندن کی شہریت حاصل کرچکے ہوں گے۔ اس کی بات ہمارے دل پر بجلی کی مانند گری۔ دل تو زخمی ہوا ہی، ساتھ میں ہماری سوچ میں بھی تبدیلی نمایاں آنے لگی۔ ثریا جان کا کہنا غلط نہیں تھا۔ ہمارے شوہر کی فطرت کی بہت سی خامیاں ہمیں یاد آنے لگیں۔ بہتر سے بہتر کی تلاش...... حسن ودولت کے شیدائی...... کبھی بھی اپنے کام سے مطمئن نہ ہونا۔ یقیناً بہتر سے بہتر کی تلاش میں انہیں ہم سے زیادہ بہتر جیون ساتھی دستیاب ہوگیا ہوگا۔ ہم میں کوئی خاص بات تو تھی نہیں جو انہیں ان کے ارادوں سے بعض رکھ سکتی۔ دکھ کی بات تو یہ تھی کہ منیر احمد کا وجود بھی ان کے پاؤں کی بیڑی نہ بن سکا۔ منیر احمد کے بعد صغیر احمد نے دنیا میں آنکھ کھولی۔ اپنے باپ کے دستِ شفقت سے محروم ہونے کے باوجود بھی وہ خاموش طبع اور صابر واقع ہوا۔ یہ حقیقت تو بعد میں آشکار ہوئی کہ وہ گونگا اور بہرا تھا۔ مایوسی اور بدگمانی کا ایک پہاڑ ہم پر ٹوٹ پڑا۔ دنیا جہان کے غم صرف ہمارے لیے ہی تھے۔ کسی بھی قسم کی خوشی کی نوید ہمارے نصیب کے ساتھ

منسلک نہیں تھی۔ وقتی طور پر ہم اپنی فطرت کو بھی بھلا بیٹھے اور خدا کے حضور سر جھکا کر بے تحاشا رونے لگے۔ گلے شکوے ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ہم خیر و عافیت کے خواستگار تھے۔ اپنی اولاد کے علاوہ شوہر کے لیے بھی......

دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد بوجھ کم ہوتا چلا گیا اور ہم نہ چاہنے کے باوجود بھی زندگی کی مصروفیات کی جانب لوٹتے چلے آئے۔ ادارے میں لڑکیوں کی تعداد بڑھ کر تیس کے قریب پہنچنے والی تھی اور سلائی مشین دو ہی تھیں۔ ہم نے اپنے اور ثریا جان کے منافع کو وقتی طور پر محدود کیا۔ پھر سلائی مشین کے علاوہ مزید سلائی کڑھائی کا سامان خریدنے بازار کی جانب چل دیے۔ رقم نہایت مختصر تھی جبکہ سامان کی لسٹ طویل تھی۔ کسی نہ کسی طرح ضرورت کی اشیا خریدنے کے بعد ہم اور ثریا جان جب گھر پہنچے تب ہمسائے میں موجود لڑکے کا خط ہمارا منتظر تھا۔ خط اس نے لندن پہنچنے کے بعد لکھا تھا۔ ہم نے بے تابی کے ساتھ لفافہ چاک کیا۔ بمشکل دو یا تین سطروں پر مشتمل خط نے ہمیں ایک دفعہ پھر توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ لڑکے کے کہنے کے مطابق جب وہ ہمارے مہیا کردہ ایڈریس تک پہنچا۔ تب مالک مکان کے کہنے کے مطابق نذیر احمد کو جاں بحق ہوئے تقریباً چھ مہینے کا عرصہ بیت چکا تھا۔ نذیر احمد روڈ ایکسیڈنٹ میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گئے تھے۔ ان کی لاوارث لاش کو چند دن سرد خانے میں رکھنے کے بعد قریبی قبرستان میں دفنا دیا گیا تھا۔

خط پڑھنے کے بعد ہم ایک دفعہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ ہماری زندگی میں باقی بچا ہی کیا تھا۔ باپ کے بعد شوہر بھی ہمیں تنہا چھوڑ گیا تھا۔ منیر احمد اور ننھے صغیر احمد کے واحد کفیل اب ہم رہ گئے تھے۔ اماں بی بڑھاپے کی ماری گھر کے کام بمشکل کرنے کے بعد چارپائی پر یوں ڈھے جاتی تھیں۔ جیسے ریت کی بوری ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ زمین پر ڈھے جانے کے بعد اپنا تمام بوجھ وہاں منتقل کر دیتی ہے۔ شوہر کی وفات کے بعد ہمارے ناتواں کاندھوں پر تمام گھر کا بوجھ اور ذمے داری منتقل ہوتی چلی گئی۔ ایسے حالات میں انسان فرار کے راستے کا تعین کرتا ہے یا پھر لوہے کی دیوار کی طرح اپنی جگہ پر ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ فرار ہونا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ ہمارے دونوں بچے ہمارے عزم و استقلال کے منتظر تھے، سو ہم حالات کے تیز و تند دھارے کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو گئے۔ صبح ادارے کا کام کرتے اور شام کو جب اماں بی تھک ہار کر چارپائی پر لیٹ جاتیں تب گھر کے کاموں کے علاوہ ہم بچوں کے کام بھی نہایت پھرتی اور تندہی کے ساتھ نمٹانے لگتے۔

وقت کو جیسے پر لگ گئے۔ دن رات یوں گزرنے لگے جیسے وقت کے پہیے کو ڈھلوان کی جانب دھکیل دیا گیا ہو۔ پانچ سال کا عرصہ پلک جھپکتے میں بیت گیا۔ منیر احمد چھ سال کا ہو گیا جبکہ صغیر احمد پانچ سال کا۔ پانچ سال کے اس عرصے کے دوران ہمارے ادارے نے بھی خوب ترقی کی۔ لڑکیوں کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ پہنچ گئی، جبکہ سلائی مشینوں کی تعداد بھی پندرہ سے تجاوز کر گئی تھی۔ ثریا جان شادی کے بندھن میں بندھنے کے باوجود ادارے سے ناتا جوڑے ہوئے تھی۔ اس عرصے کے دوران ہم نے مزید تین لڑکیوں کو سلائی کڑھائی کا کام سکھانے کے لیے متعین کیا۔ گھر میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ کرسیوں اور میزوں کا انتظام بھی کیا۔ ہمارے مالی حالات بہتری کی جانب گامزن دکھائی دینے لگے اور دن سکون کے ساتھ گزرنے لگے لیکن سکون کا ہماری زندگی میں بھلا کیا کام۔ ہمیں راس نہیں آتا تھا۔ طبیعت بے چین ہو جاتی تھی اور دل مضطرب۔ ہم اس دن کو بھی بھلا نہیں پائیں گے جب دو بجے ادارے کی لڑکیوں کو فارغ کرنے کے بعد ہم نے ثریا جان اور باقی تین لڑکیوں کو الوداع کہا اور ظہر کی نماز کے لیے وضو کرنے غسل خانے کی جانب چل دیے۔ تب اچانک ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ تب ڈاکیے کو سامنے کھڑے ہوئے پایا۔ اس کے ہاتھ میں سفید رنگ کا لفافہ تھا۔ ہم نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لینے کے بعد دروازے کو بند کر دیا اور بھیجنے والے کے نام پر نگاہ دوڑائی۔ ہمیں اپنے سر پر آسمان ٹوٹتا محسوس ہوا جب ہم نے خط کے ماتھے پر نذیر احمد کا نام لکھا ہوا دیکھا۔ جسے مرے ہوئے پانچ سال بیت چکے تھے۔ ہم نے عجلت میں لفافے کو چاک کیا۔ تب ایک طویل و ضخیم تحریر کو سامنے پایا۔ تحریر کے مفہوم کا مختصر خلاصہ ہم یہاں رقم کر رہے ہیں۔ لکھا ہوا تھا۔

سلام مسنون!

تمہاری حیرت قابلِ دید ہوگی۔ ظاہر ہے اگر مرے ہوئے کسی انسان کا خط اپنے چاہنے والوں کو موصول ہو تب ان کی حالت تمہاری حالت سے مختلف نہیں ہوگی۔ بات ہے ہی ناممکن...... میں تجسس کو ختم کیے دیتا ہوں۔ بات کچھ یوں ہے کہ تم سے شادی کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ تم میرے معیار کے مطابق کبھی بھی نہیں تھیں۔ مجھے ظاہری حسن کے علاوہ رکھ رکھاؤ، اٹھنے بیٹھنے اور بہتر پہناوے کے علاوہ پڑھی لکھی ساتھی کی ضرورت تھی۔ شادی کے بعد تم سے کھل کر بات چیت کرنے کی ہمت پیدا نہ کر سکا۔ اس لیے لندن چلا آیا۔ فرار کا یہ طریقہ درست نہیں تھا لیکن میرا مقصد کچھ اور تھا۔ میں نے یہاں اپنی پسند کی ایک غیر ملکی لڑکی کے ساتھ شادی کی اور لندن کی شہریت حاصل کر لی۔ انہی دنوں تمہاری جانب سے بھیجا ہوا لڑکا میرے متعلق معلومات کرتا ہمارے گھر تک چلا آیا۔ میں نے مالک مکان کو کچھ رقم بھینٹ چڑھانے کے بعد جھوٹ بولنے پر مجبور کیا اور اس نے میرے کہنے کے مطابق میری موت کی جھوٹی خبر معلومات کرنے والے لڑکے کو سنا دی۔ لڑکا مطمئن ہو کر واپس چلا گیا۔ مجھے افسوس تو بہت ہوا لیکن میں کیا کرتا۔ میرے ظاہر و باطن میں رتی برابر بھی فرق نہیں پایا جاتا تھا۔ منافقت کا لبادہ اپنے جسم پر چڑھانا میرے لیے ناممکن تھا۔ مجھے جو بات اچھی لگتی ہے میں اسے اچھا کہتا ہوں اور جو بات بری لگتی ہے اسے برا کہہ دیتا ہوں۔ تمہیں قبول کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں نے مختصر ڈراما کرنے کے بعد اپنی جان خلاصی کا راستہ پیدا کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں نے اچھا نہیں کیا تھا اور خدا نے اس کی سزا بھی مجھے ---- دے دی۔ میری دوسری شادی بری طرح ناکام ہو گئی۔ میری انگریز بیوی کا نام مارگریٹ تھا۔ شادی کے چند ہفتے اس نے میرے ہمراہ مطمئن انداز میں گزارے۔ اس کے بعد مکافاتِ عمل کا سلسلہ شروع ہوا۔ مارگریٹ وہی کچھ کرنے لگی جو میں تمہارے ساتھ کر چکا تھا۔ وہ میرے اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے اور ہنسنے بولنے میں خامیاں تلاش کرنے لگی۔ برا بھلا تو وہ مجھے ہمیشہ ہی کہتی تھی لیکن اب جاہل اور گنوار بھی کہنے لگی۔ اکثر وہ دوست و احباب کے سامنے بھی احتراز نہ کرتی تھی۔ یقیناً وقت اپنے آپ کو دہرا رہا تھا۔ وہ باتیں سامنے آنے لگیں جن کا موجب کبھی میں بنا تھا اور نشانہ تم بنی تھیں۔ میں مارگریٹ کے معیار پر پورا اترنے میں نااہل ثابت ہوا۔ اس لیے اس نے کچھ عرصے مجھے برداشت کرنے کے بعد طلاق دے کر فارغ کر دیا۔ میں نے یکلخت اپنے آپ کو لندن جیسے بھرپور ملک میں تنہا محسوس کرنا شروع کر دیا۔ تمہارے پاس واپس آنا ممکن نہیں تھا اس لیے مجبور ہو کر میں نے مے نوشی کا سہارا لینا شروع کیا۔ آج پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ گزرنے کے بعد میں بلا کا مے نوش قرار دیا

## نذر

تحفہ، راہ خدا میں پیش کی جانے والی چیز، جس کا کوئی خاص مقصد بھی ہو۔ یا آدھا کسی کا خرچ اپنے اوپر لازم کرے۔ قدیم زمانوں میں یہ طریقہ بڑے پیمانے پر رائج تھا کہ کسی بات کے حصول کے لیے منت مانا کرتے تھے اور پھر پورا ہونے پر جو کچھ انہوں نے منت میں نذر مانی ہو، اور جس کے نام کی مانی ہو، نذر، اسی کے نام پر قربان کر دیتے تھے۔ حضرت عمرانؑ نے اپنا بیٹا یا بیٹی نذر کرنے کی منت مانی تھی۔ اسی طرح حضرت عبدالمطلب نے اپنا بیٹا قربان کرنے کی منت مانی تھی۔ اہل اسلام نے منت، نذر و قسم کو ایک ہی درجہ دیا ہے اور جب منت مانی جائے، تو اسے پورا کرنا لازم ہے۔ عام اعتقاد یہ ہے کہ اگر منت پوری نہ کی جائے تو اللہ کی جانب سے سخت مصیبت نازل ہوتی ہے۔ منت اور نذریں اپنے حقیقی مفہوم میں صرف خدا ہی کے لیے ہیں۔ اسلامی مفکرین کے ایک بڑے طبقے کی رائے میں منت ماسوا خدا کے کسی دوسرے کے نام کی ماننا شرک ہے اور اس کا انہیں گناہ ملے گا۔ مگر جو راہ خدا میں ہو اور اس کا امر بھی جائز ہو، یعنی جس چیز کے لیے منت مانی جارہی ہے وہ حلال ہو تو، اللہ اس کے پورا کرنے پر ثواب دے گا۔ اس بارے میں سورہ بقرہ آیت 71۔270۔ میں واضح ہدایت آئی ہے ”تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو نذر بھی مانی ہو، اللہ کو اس کا علم ہے۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں، اگر اپنے صدقات اعلانیہ دو، تو یہ بھی اچھا ہے۔ لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو، تو یہ حق میں بہتر ہے۔ تمہاری بہت سی برائیاں اس طرز عمل سے محو ہو جاتی ہیں۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کو بہرحال اس کی خبر ہے۔“ احادیث میں بیان آیا ہے کہ حضور پاک نے فرمایا کہ ہر بات پر منت ماننا ٹھیک نہیں۔ مگر مان لینے کی صورت میں پورا کرنا لازم ہے۔

مرسلہ: فہیم الدین، العین (یو اے ای)

جاچکا ہوں۔ میرے دونوں گردے جواب دے چکے ہیں اور ڈاکٹر گردوں کی پیوند کاری کے علاوہ مجھے لاعلاج قرار دینے کی بات کررہے ہیں۔ زندگی وموت کے متعلق کچھ کہنا ممکن نہیں رہا۔ میں زندگی کے آخری ایام تمہارے ہمراہ گزارنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے دل سے معاف کردو تو میں ہوٹل ریمبو میں رہائش پذیر ہوں۔ جلد از جلد رابطہ کرو۔

تمہارا شوہر نذیر احمد۔

خط ختم ہوگیا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

اتنا بڑا دھوکا ہمارے ساتھ آج سے پہلے کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ ہم انہیں مردہ گردان چکے تھے لیکن وہ تو زندہ تھے۔ ان کی موت کی خبر کے بعد اماں بی اور ثریا جان کتنے ہی عرصے ہمارے پیچھے پڑی رہی تھیں کہ ہم دوسری شادی کرلیں۔ ہم نے ہمیشہ انکار کیا۔ خدانخواستہ اگر ہم ان دونوں کی بات مان لیتے تو آج کیا ہوتا۔ ان کا ہر فعل جھوٹ پر مبنی تھا۔ ہم نے دل میں تہیہ کرلیا کہ انہیں دوبارہ اپنی زندگی میں آنے کی اجازت بالکل بھی نہیں دیں گے۔ چاہے وہ کتنے ہی جھوٹ دل کو دہلا دینے والے نہ بول لیں۔ ہم اب بالکل بھی نہیں پگھلیں گے۔ پتھر کے بن جائیں گے۔

یوں ہم نے چٹھی کو نظر انداز کرنے کے بعد بھلا دیا اور کاروبارِ زندگی میں اپنے آپ کو مصروف کرنے کے بعد دل پر تالے لگا ڈالے۔ تقریباً دو ہفتے کے بعد جب عصر کی نماز سے فارغ نہیں ہو پائے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اماں بی سونے کی نیت سے اپنے کمرے کی جانب جاچکی تھیں۔ منیر احمد صحن میں تین پہیوں والی سائیکل دوڑاتا پھر رہا تھا۔ ہم نے سلام پھیرنے کے بعد منیر احمد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ وہ صحن کا دروازہ کھول کر دیکھے کہ باہر کون ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھول کر پٹ وا کردیے۔ وہ سامنے کھڑے تھے۔ پانچ چھ سال کے عرصے کے دوران ان میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ قلموں کے پاس سے بال سفید ہوگئے تھے۔ صحت مند جسم سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا اور چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ منیر احمد حیرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھے جارہا تھا۔ نذیر احمد نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھانے کی کوششیں کی۔ تب وہ بھاگ کر ہماری گود میں آچھپا۔ نذیر احمد صحن کے درمیان میں آکھڑے ہوئے۔ وہ حیرت بھری نگاہوں سے صحن میں ایک جانب رکھی ہوئی میز اور کرسیوں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ہم نے جائے نماز کوتہ کرکے ایک جانب رکھا اور تفہیمی نگاہوں کے ساتھ نذیر احمد کی جانب دیکھنے لگے۔ وہ نڈھال قدموں کے ساتھ آگے بڑھ کر برآمدے میں رکھے ہوئے پلنگ پر آبیٹھے اور ہماری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

”تم میں کچھ خاص تبدیلی نہیں آئی۔ ویسے کی ویسی ہی ہو۔ منیر احمد کافی بڑا ہوگیا ہے۔ مجھے پہچانتا نہیں ہے۔“

ہم تلخ لہجے میں بولے: ”اس معصوم کا کیا قصور..... اس نے جب سے دنیا میں آنکھ کھولی ہے آپ کو قریب نہیں دیکھا۔ پہلی دفعہ اتنے قریب دیکھ کر ڈر گیا ہے۔“

نذیر احمد نے ہماری بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”صحن میں میز اور کرسیاں موجود ہیں بھلا ان کا یہاں کیا کام؟“

ہم پھٹ پڑنے والے لہجے میں بولے۔

”آپ کے ذمّے داریوں سے فرار ہونے کے بعد محلے والے تو ہمارا خرچہ برداشت کرنے سے رہے۔ اس لیے میں نے گھر میں ادارہ کھول لیا۔“

اندرون کمرے سے اماں بی کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ ”رقیہ باہر کون ہے؟ کس کے ساتھ باتیں کررہی ہو۔“

ہم نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ”اماں بی آپ کے داماد ہیں۔ باہر آکر ان سے مل لیجیے۔ کچھ پتا نہیں ان کا ارادہ بدلنے کی صورت میں واپس لندن جانے کا پروگرام نہ بن جائے۔“

کمرے میں پلنگ کے چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ پھر اماں بی کی حیرت زدہ صورت نمودار ہوئی۔ نذیر احمد پلنگ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اماں بی نے ان کے سراپے کا جائزہ لیا۔ پھر آگے بڑھ کر نذیر احمد کے ساتھ لپٹ کر زار وقطار رونے لگیں۔ نذیر احمد کی نگاہوں میں بھی آنسو مچلنے لگے۔ انہوں نے ہاتھوں کی مدد سے انہیں پونچھنے کی کوششیں کی لیکن آنسوؤں کے ریلے نے رکنے سے انکار کردیا اور وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

ہماری آنکھوں سے بھی آنسو برسات کی بارش کے قطروں کی مانند برسنے لگے۔ منیر احمد حیرت بھری نگاہوں سے اچانک ماحول میں پیدا ہونے والے تغیر کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اماں بی نے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے نذیر احمد سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”میرے بچے تم ہمیں چھوڑ کر



کہاں چلے گئے تھے۔ ہمسائے کے لڑکے کے کہنے کے مطابق تم حادثے میں جاں بحق ہوگئے تھے۔ مجھے اس کی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا لیکن تمہاری عدم موجودگی مجھے ہمیشہ افسردہ کردیتی تھی۔“ پھر یکلخت انہوں نے نذیر احمد کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ ”تم بہت کمزور ہوگئے ہو۔ نصیبِ دشمناں تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔“

نذیر احمد سرد آہ بھرتے ہوئے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولے: ”اس دنیا میں جو کچھ بویا تھا اب کاٹنے کا وقت آگیا ہے۔ میری طبیعت ناساز ہے۔ دونوں گردے تباہ ہوچکے ہیں۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق صرف چند دنوں کا مہمان ہوں۔ اس لیے گناہوں کی تلافی کے لیے بحالت مجبوری یہاں چلا آیا ہوں۔ ورنہ شرم کی بدولت آنے کا دل نہیں کرتا تھا۔“

اماں بی نے حیرت بھری نگاہوں سے اپنے داماد کی جانب دیکھا۔ پھر پریشان لہجے میں بولیں۔ ”کیسی باتیں کررہے ہو۔ اللہ تمہیں میری زندگی بھی عطا کرے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کتنی ہے۔ رہی ڈاکٹروں کی بات تو ان کے منہ میں تو جو بھی آجاتا ہے کہہ دیتے ہیں تم فکر نہیں کرنا۔ ہم تمہیں حکیم جاوید کے مطب میں لے جائیں گے۔ انشاءاللہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔“

کمرے میں سے صغیر احمد کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ نیند سے جاگ گیا تھا۔ نذیر احمد نے چونک کر ہماری جانب تفہیمی نگاہوں کے ساتھ دیکھا۔ تب ہم نے کہا۔

”منیر احمد کا چھوٹا بھائی صغیر احمد ہے۔ آپ کے جانے کے بعد اس کی ولادت ہوئی۔“

ہمیں ان کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات ابھرتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ پُرشکوک نگاہوں سے ہماری جانب دیکھنے لگے۔ ہم نے بےپروائی کے ساتھ کمرے کا پردہ ہٹایا اور کمرے میں سے صغیر احمد کو گود میں اٹھا کر باہر لے آئے۔ وہ ہماری گود میں آتے ہی خاموش ہوگیا۔ ہم نے صغیر احمد کو اماں بی کے ہاتھوں میں تھمایا اور نذیر احمد کے لیے کھانے کا بندوبست کرنے باورچی خانے کی جانب چل دیے۔

رات کو کھانے کے بعد اماں بی نے ہمیں اپنے کمرے میں بلایا اور سنجیدہ لہجے میں کہنے لگیں۔ ”تمہارے طور طریقے مجھے نذیر احمد کے ساتھ مناسب دکھائی نہیں دیتے۔ وہ تمہارا مجازی خدا ہے۔ اگر غلطی کر بیٹھا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم اپنے ہمراہ اس کی زندگی کو بھی تباہ و برباد کرڈالو۔ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر لوٹ آئے تب اسے بھولا نہیں کہا جاتا اور یہ بھی یاد رکھو کہ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے فرشتوں سے نہیں۔ وہ فرشتہ نہیں ہے اس لیے اسے معاف کرکے اپنے گھر کو دوبارہ بنانے کی کوششیں کرو۔“

ہم نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”لیکن اماں بی وہ دھوکے باز اور خودغرض ہیں۔ آج بھی ان کا یہاں آنے کا مقصد صرف ان کی پیچیدہ بیماری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ جس کو رفع کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی حل موجود نہیں ہے۔ خدا نے بازی پلٹ کر ہماری جانب کردی ہے۔ ہمارے معاشی حالات میں بہتری پیدا ہونے لگی ہے جبکہ وہ معاشی لحاظ سے بدحال ہوتے جارہے ہیں اگر ایسا نہیں ہوتا تب وہ یہاں کبھی بھی نہیں آتے۔“

”رقیہ تحمل مزاجی کے ساتھ سوچنے کی کوشش کرو۔“ اماں بی سرد لہجے میں بولیں۔ ”اپنے متعلق سوچنا اب چھوڑ دو۔

## فلورائیڈ

فلورائیڈ کسی دھات یا غیر دھات کا فلورین کے ساتھ مرکب ہوتا ہے۔ فلورائیڈ فلورین یا ہائیڈرو فلورک ایسڈ کے کسی دھات یا غیر دھات پر عمل سے بنتے ہیں۔ دھاتوں کے فلورائیڈ عام طور پر پائیدار ہوتے ہیں اور ازخود تبدیل ہوجاتے ہیں۔ البتہ انہیں بھاپ کے ساتھ بہت زیادہ گرم کیا جائے تو آکسائیڈ میں تبدیل نہیں ہوتے۔ سوڈیم، پوٹاشیم، ایلومنیم اور چاندی (سلور) کے فلورائیڈ پانی میں حل ہوجاتے ہیں۔

## ہنری فورڈ

(1863ء۔1947ء)

موٹر کاریں بنانے والا امریکی صنعت کار۔ ریاست مشی گن میں پیدا ہوا اور سولہ سال کی عمر میں وہیں شہر ڈٹرائٹ میں ایک کارخانے میں مستری کی تربیت حاصل کی۔ بھاپ سے چلنے والے ٹریکٹر پر تجربہ کیا اور آرہ کشی مل قائم کی۔ 1887ء میں اڈیسن کمپنی کا چیف انجینئر مقرر ہوا۔ 1892ء میں پیٹرول سے چلنے والی دو سلینڈر کی ایک موٹر بنائی۔ 1899ء میں اپنی موٹر کمپنی قائم کی جو رفتہ رفتہ دنیا بھر میں موٹر بنانے کی سب سے بڑی کمپنی بن گئی۔ 1903ء سے 1950ء تک اس کمپنی نے ساڑھے تین کروڑ سے زیادہ موٹریں اور ٹرک بنائے۔ فورڈ کے مختلف کارخانوں میں دو لاکھ سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں۔

تمہاری زندگی تو جیسے تیسے کر کے گزر گئی لیکن ان معصوموں کا کیا ہوگا۔ جب کل کو بڑے ہو کر اپنے باپ کے متعلق پوچھیں گے۔ منیر احمد کی خیر ہے۔ لیکن صفیر احمد معذور ہونے کے علاوہ محتاج بھی ہے۔ اسے ماں کے علاوہ باپ کے سائے کی بھی ضرورت ہے۔ اس کی معذوری کا لحاظ کرو اور گھر کو بنانے کی کوششیں کرو۔ اس معاشرے میں مرد کے بغیر چلنا ممکن نہیں ہے اور معذور بچے کے ہمراہ چلنا تو ناممکن ہے۔"

ہم نے نا چاہنے کے باوجود بھی اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کمرے میں چلے آئے۔ یوں ہمارا اور نذیر احمد کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے دوبارہ چل نکلا۔ ہم نے بھی حالات سے سمجھوتا کرنے میں ہی بہتری جانی اور نذیر احمد کی خامیوں کو نظر انداز کر کے ایک دفعہ پھر اپنے رشتے کو مستحکم کرنے میں لگ گئے۔

نذیر احمد کا مزید جھوٹ اس وقت سامنے آیا جب ہم انہیں اپنے ہمراہ لے کر ڈاکٹر کے کلینک میں گئے۔ ڈاکٹر نے الٹراساؤنڈ کرنے کے بعد ہمیں بتایا کہ بے تحاشا شراب نوشی کی بنا پر ایک گردے نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن دوسرا گردہ صحت مند ہے۔ اگر کچھ احتیاط کی جائے تب معاملہ سنگین نہیں ہے۔ مردہ گردے کو سرجری کے ذریعے باہر نکالنے کے بعد نذیر احمد کسی بھی قسم کے بھاری کام کے لائق نہیں رہیں گے۔ اور اگر آپ ایسا نہیں چاہتے ہیں تب رقم خرچ کر کے مزید گردے کی دستیابی کی کوششیں بھی کی جا سکتی ہے۔ دوسرا گردہ لگنے کے بعد نذیر احمد مکمل طور پر صحت یاب انسان کی حیثیت سے اپنی موجودہ زندگی کے کاموں میں عمل دخل کے قابل ہو سکتے ہیں۔

سوچ بچار کے لیے اس نے ہمیں ایک مہینے کا وقت دے دیا اور ہم دونوں میاں بیوی اس کی تحریر کردہ دوائیوں کی پرچی تھامے کلینک سے باہر نکل آئے۔ دوائی لینے کے بعد ہم نے گھر کا رخ کیا۔ نذیر احمد بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے پاس رقم نہ ہونے کے برابر تھی۔ گردے کا آپریشن کرنا ہی ممکن نہیں تھا۔ دوسرے گردے کی دستیابی بالکل ہی ناممکن تھی۔ انہوں نے بات چیت کرنا ترک کر دی اور خاموش رہنے لگے۔ ہم سے ان کی پریشانی دیکھی نہیں گئی اور ہم موجودہ مسئلے کے حل کے متعلق نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنے لگے گردے کی دستیابی کے لیے رقم کا حصول ہمارے اختیار سے باہر تھا۔ لیکن آپریشن کی رقم کا بندوبست ہم ادھار لے کر با آسانی کر سکتے تھے۔ رات کو ہم نے کھانے کے بعد نذیر احمد اور اماں بی سے بات چیت کی اور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا کہ ہم اپنا گردہ نذیر احمد کو دینا چاہتے ہیں۔

اماں بی اور نذیر احمد دونوں ہکا بکا رہ گئے۔ ہماری موجودہ حکمتِ عملی اماں بی کی سوچ سے بالاتر تھی۔ ظاہر ہے اپنے غیر ذمّے دار شوہر کے لیے اتنی بڑی قربانی دینا ان کے لحاظ سے حماقت کے علاوہ اور کیا معنی رکھتا۔ نذیر احمد خاموش ہی رہے۔ انہوں نے بات چیت کرنے سے مکمل احتراز کیا لیکن سوچ بچار میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اس بات کی نشاندہی کر رہی تھیں کہ وہ اپنے گزشتہ رویّہ پر نادم تھے اور موجودہ رویّہ ان کے اختیار سے باہر تھا۔ اماں بی نے ہمیں تنہائی میں لے جا کر سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ لیکن، ہم دل میں تہیہ کر چکے تھے اس لیے ہم نے ان کی باتوں کو نظر انداز کر دیا اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے فیصلے پر قائم رہے۔

چاہے ہمارا شوہر غیر ذمہ دار ہی سہی...... ہے تو ہمارا شوہر ہی ہمیں اس کی فطرت اچھی نہیں لگتی تھی لیکن اس کے وجود سے ہم ٹوٹ کر محبت کرتے تھے اور گردہ تو کیا جان بھی قربان کر سکتے تھے۔

دوسرے دن ہم نے ادارے کی سلائی مشینیں بیچ ڈالیں۔ گھر میں کچھ رقم جمع پونجی کی صورت میں موجود تھی۔ باقی کا بندوبست ہم نے ہمسایوں سے ادھار لے کر کیا۔ بمشکل تمام آپریشن کی رقم دستیاب ہو سکی اور ہم ڈاکٹر کے کلینک جا پہنچے۔ ڈاکٹر شام کو کلینک میں بیٹھنے کے علاوہ صبح کے وقت اسپتال میں ڈیوٹی دیتا تھا۔ انہوں نے ہم دونوں کا خون ٹیسٹ کیا۔ خوش قسمتی سے ہم دونوں کے خون کا گروپ یکجا تھا۔ شوگر وغیرہ کے ٹیسٹ کے بعد ہمیں اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا گیا۔ گھر کی تمام ذمّے داری اماں بی اور ثریا جان کے کاندھوں پر منتقل ہو گئی۔ ادارے کا کام بھی متاثر ہوا۔ ایک سلائی مشین اور ساٹھ سے اوپر لڑکیاں...... لیکن انہیں ہمارے معاشی حالات کے متعلق بخوبی آگاہی ثریا جان نے فراہم کر دی تھی اور تمام لڑکیاں ہمارے حق میں دعا گو... ہونے کے علاوہ اس مشکل گھڑی میں ہمارا مکمل ساتھ دینے کے لیے بھی کمر بستہ تھیں۔ یوں کام دھکم سے ہی سہی لیکن چلتا رہا اور ہمارا آپریشن اماں بی اور ادارے کی لڑکیوں کی دعاؤں کی بدولت بخیر و عافیت مکمل ہو گیا۔ کچھ عرصہ اسپتال میں رہنے کے بعد ہم گھر واپس چلے آئے۔ ٹانکے کھلنے تک ہم دونوں کو بھاری کام سے احتراز کی نصیحت کی گئی۔ مزید



دوائیوں کا خرچہ ہماری بے چینی کا سبب بن رہا تھا۔ اوپر سے ادھار واپس کرنے کا وعدہ بھی پریشانی کا باعث تھا۔ اس لیے ہم آرام کی نصیحت کو نظر انداز کرتے ہوئے ادارے کے کاموں میں مگن ہو گئے۔ ادارے کے کام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کی ٹائمنگ میں بھی زیادتی کر دی۔ مشینوں کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہ اقدام نہایت کار آمد ثابت ہوا۔ لڑکیوں کو گروپ کی صورت دے دی۔ ایک گروپ اگر سلائی مشین پر کام کر رہا ہوتا تب دوسرا گروپ کٹنگ میں مشغول ہوتا تھا۔ جو لڑکیاں فارغ ہوتیں تھیں انہیں ہم ڈرائنگ اور لکھائی کے کاموں میں مصروف کر دیتے تھے۔ لیکن پھر بھی سلائی مشینوں کا مسئلہ گمبھیر صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ ہم نے گھر کے اخراجات کو کم کر کے بچت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن دوائیوں کے اخراجات آڑے آنے لگے۔ تب بحالت مجبوری سلائی کڑھائی سکھانے والی تین لڑکیوں کو فارغ کر دیا۔ ہمارے گمبھیر ہوتے ہوئے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ثریا جان نے بھی وقتی طور پر معاوضہ لینے سے انکار کر دیا۔ ہمیں ایسا کرنا مناسب نہیں لگا تھا۔ لیکن وہ اپنے فیصلے پر بضد رہی۔ تب، ہم خاموش ہو گئے۔ ادارے کے وقت میں توسیع کرنے کی بدولت اور سلائی کڑھائی سکھانے والی تین لڑکیوں کو نکالنے کی وجہ سے اب ہمیں عام حالات سے زیادہ کام کرنا پڑتا تھا۔

ٹانکے کھلنے کے دن قریب آتے چلے جا رہے تھے۔ لیکن ہمیں کاموں سے فرصت نصیب نہیں ہوتی تھی۔ ان دنوں ایک مزید بات میں نے محسوس کی۔ نذیر احمد، منیر احمد کے ساتھ نہایت احترام محبت اور گرم جوشی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ لیکن صفیر احمد کے ساتھ ان کا رویّہ ہمیشہ سرد رہتا تھا۔ شاید ایسا صفیر احمد کی معذوری کی بدولت تھا۔ ہمیں افسوس .... ہوتا تھا نذیر احمد کی فطرت اب بھی نہیں بدلی تھی۔ حسن اب بھی ان کی نگاہوں میں اہمیت کا اختیار رکھتا تھا۔ کمزوری انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ بہر حال ہمارے ٹانکے کھل گئے۔ لیکن کچھ ادویات ایسی تھیں جو کافی عرصے تک استعمال کرنی تھیں۔ یعنی ایک اضافی خرچہ...... ہم نے حسبِ فطرت اسے قبول کیا اور گھر کی جانب لوٹ آئے۔ صحت مند ہو جانے کے باوجود نذیر احمد کوئی بھی کام کرنے سے پرہیز کیا کرتے تھے۔ ہماری توجہ دلوانے پر وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ہمیں خاموش کروا دیا کرتے تھے کہ آپریشن کے بعد انہیں نہایت کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے کچھ

## نجوم

نجم کی جمع، وسیع و عریض آسمان پر ان گنت ستارے، جن کا آپس میں فاصلہ بھی بے پناہ ہے۔ ان میں صرف 8 ہزار کے لگ بھگ نجوم کو انسانی آنکھیں دیکھ سکی ہیں۔ قرآن پاک میں زمین و آسمان کے علاوہ ان کا ذکر بھی موجود ہے۔ جن میں ان کی تخلیق کے تین واضح مقصد بتائے گئے ہیں۔ 1۔ حسن آسمان میں اضافہ 2۔ شیطان کے لیے پتھر (سورہ xv11-5) 3۔ رات کے وقت قافلوں کی راہبری۔ قطب ستاروں اور ایسے ہی بہت سے ستاروں کی مدد سے انسان ماضی میں راہبری حاصل کرتا رہا۔

## علم نجوم

سیاروں کے اثرات سے موسمی و جغرافیائی حالات کا پتا لگانا۔ اس کا ماہر منجم کہلاتا ہے جو ایک قسم کا کاہن ہے اور کاہن ساحر ہے اور ساحر کافر۔ اسلام میں اس علم کی کوئی گنجائش نہیں۔ ستاروں سے جب وہ مستقبل کا پتا کرتا ہے تو بالواسطہ وہ غیب بتلاتا ہے جو اللہ کے سوا کسی کو نہیں معلوم۔ ان کی طرف سے بتائی ان باتوں کے بارے میں جو بعض اوقات سچی نکل جاتی ہیں۔ حدیث نبوی ہے کہ ایک آدھی سچی بات شیطان، سو جھوٹ ملا کر اپنے دوست کے کان میں ڈال دیتا ہے، ان کے بارے میں ایک مقام پر فرمان ہے کہ یہ قوم میں گمراہی پیدا کرتا ہے۔ سائنس اس بات پر اعتقاد رکھتی ہے کہ مختلف قسم کے نجوم مختلف اعضائے انسانی کو متاثر کرتے ہیں۔ جنہیں پڑھ کے انسانی مستقبل و ماضی کی تشہیر کی جاتی ہے۔ اس کے لیے فرضی طور پر جو زائچہ بناتے ہیں وہ فرضی زائچہ کہلواتا ہے۔ اسی طرح زندگی کا زائچہ، ولادت کا زائچہ وغیرہ بھی بنتے ہیں۔ اسلام میں یہ ہے کہ زندگی ستاروں کے اثر سے نہیں بنتی، بلکہ خدا، کوشش انساں اور ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے دیتا ہے۔

مرسلہ: نبیل انصاری، کوٹ ادو

عرصہ آرام کے علاوہ مزید کام نہیں کرسکتے۔

ہم نے حیرت بھری نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا لیکن کہا کچھ بھی نہیں۔ اب یہ حیرت میں مبتلا کردینے والی بات تھی کہ گردے کا آپریشن ہم دونوں کا ہی ہوا تھا۔ نذیر احمد کو گردے کی سہولت میسر آئی تھی جبکہ ہمیں اپنے ایک گردے سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ اس کے باوجود ہمیں کمزوری محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن انہیں ہوتی تھی۔ ہم نے انہیں گردہ صرف اس لیے دیا تھا تاکہ وہ کام کاج کرکے اپنے مختصر کنبے کی کفالت کا باعث بن سکیں۔ لیکن وہ تو الٹا مزید بوجھ بننے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ بہرحال آپریشن ہوگیا اور ہمارا نکھٹو شوہر بھی ہمارے پلے پڑگیا۔ نقصان سراسر ہمارا ہوا۔ ادارے کی مالی پوزیشن متاثر ہوئی اور ادھار علیحدہ چڑھ گیا۔

ٹانکے کھلنے کے فوراً بعد، ہم نے کمر باندھی اور پہلے سے زیادہ محنت، کرنے کے علاوہ گھر کے اخراجات میں کمی کرتے ہوئے بچت بھی شروع کردی۔ ثریا جان ہمارے ہمراہ بلامعاوضہ کام کررہی تھی۔ ہم نے لاکھ چاہا کہ وہ مناسب نہ سہی لیکن معمولی معاوضہ ضرور لے۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح انکاری رہی۔ سو، ہم نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا مناسب جانا۔ تین عدد سلائی مشینوں کی خریداری کے بعد ہم نے بچت کردہ باقی رقم کی ماہانہ کمیٹی ڈالنی شروع کردی۔ ہمیں جتنی بھی رقم اضافی دستیاب ہوتی۔ اسے اپنے کمرے میں موجود لوہے کی الماری کی دراز میں محفوظ کرکے رکھ دیتے۔ حیرت انگیز طور پر اس سال کے اوائل میں ہمارے پاس کام مزید سے مزید تر بڑھنے لگا۔ کام بڑھا تو بچت میں بھی اضافہ ہوا اور رقم کمیٹی کی صورت میں جمع ہونے کے بعد ہماری الماری کی دراز میں منتقل ہوتی چلی گئی۔ سال سے زیادہ کا عرصہ بے اندازہ محنت کے دوران بیت گیا۔ لیکن نذیر احمد نے کام کرنے کی ہامی نہیں بھری۔ ہمارے حالات ایک دفعہ پھر ترقی کی جانب گامزن ہوتے دکھائی دینے لگے تھے۔ لیکن ترقی و تمدن یا پھر خوشحالی ہمیں نصیب نہیں آئی تھی۔ یہ بات تو آپ سب بھی بخوبی جان چکے ہوں گے۔ جب بھی ہمیں بہتری کا کوئی راستہ دکھائی دیتا وقت کی دیوار درمیان میں حائل ہوجاتی۔ بہرحال، ہم ہر روز رات کو اپنے پاس جمع کردہ رقم کا حساب کتاب کرتے تھے۔ نذیر احمد ایسا کرتے ہوئے بخوبی دیکھتے تھے۔ ہم اس بات کو یکسر فراموش کرچکے تھے کہ نذیر احمد کی فطرت میں وفا نہیں ہے۔ اور بہتر سے بہتر کی تلاش ان کی زندگی کا مقصد تھا۔

وہ ہمیں رقم گنتے ہوئے بغور دیکھتے رہتے تھے۔ ہم ان کے ارادوں سے لاعلم تھے۔ ورنہ حفاظتی اقدام ضرور کرتے ان کے ارادوں سے آگاہی تو ہمیں تب حاصل ہوئی جب ایک دن صبح سویرے نیند سے بیدار ہونے پر ہم نے اپنے سرہانے کے پاس خط کو موجود پایا۔ جبکہ نذیر احمد غیر حاضر تھے۔ ہم نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ خط کو کھولا۔ لکھا ہوا تھا۔

" تمہارا دل دکھانے کا افسوس مجھے تادم زندگی رہے گا۔ لیکن یہاں رہنا میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ اس لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن واپس جارہا ہوں۔ باہر جانے کے لیے مجھے رقم کی اشد ضرورت تھی سو تمہاری جمع پونجی ہمراہ لیے جارہا ہوں۔ کام ملنے کے فوراً بعد رقم واپس بھجوانے کی کوشش کروں گا۔ کچھ اور محلے والوں سے بھی رقم ادھار لی ہے تمہارے نام کا سہارا لے کر...... خدا سے دعا کرنا کہ کام جلد از جلد دستیاب ہوجائے تاکہ رقم بھی جلد از جلد بھجوانے کی کوشش کروں۔ تمہارا احسان زندگی بھر بھلا نہیں پاؤں گا۔ ننھے منیر احمد کو میری جانب سے پیار دینا۔ صفیر احمد کی مناسبت سے میں کچھ کہنے کے قابل اس لیے نہیں ہوں کہ اس کی پیدائش میری نگاہوں میں مشکوک ہے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ میری اولاد میں سے نہیں ہے۔ اس لیے معذرت کے ساتھ خط کو انہی سطروں کے دوران ختم کرتا ہوں۔ ناراض نہیں ہونا لیکن دل میں بات رکھنے کی عادت مجھے کبھی بھی نہیں رہی سو دل کا بوجھ ہلکا کیے جارہا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔ بہت زیادہ محنت سے احتراز کرنا۔ زیادہ محنت تمہاری صحت کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔

خط ختم ہوگیا۔ ہماری آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر ملال کی کیفیت موجود نہیں تھی۔ شاید اب ہم ان باتوں کے عادی ہوچکے تھے۔ اس نے جو کچھ بھی کیا تھا اپنی فطرت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے کیا تھا اور ہمیں اب اپنی فطرت کے مطابق سرکو اقرار میں ہلا کر زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنا تھا۔ سو، ہم تیار تھے اس لیے ہم نے دوپٹے کو سر پر اوڑھا اور ناشتا تیار کرنے کے لیے باورچی خانے کی جانب چل دیے۔ ادھار کی کثیر رقم اتارنے کے لیے بے انتہا کام کرتا تھا۔ اور، ہم اب بھی پُرعزم ہیں۔



# محبت جرم ہے

محترم ایڈیٹر
السلام علیکم!
یہ سچ بیانی میں ایک دوست کی ہے۔ انسان اپنے سینے میں کیسے کیسے درد چھپائے جی رہا ہے یہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

فرمان
(سرگودھا)

اس نے مجھے یہ کہانی سنائی اور میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

میں تو اسے ایک عام سا آدمی سمجھا تھا۔ ایسا آدمی جو صبح دفتر جاتا ہے اور شام کو گھر واپس آنے کے بعد دوستوں یا بیوی سے گپ شپ کرکے سوجاتا ہے۔ جس کی زندگی عام سی ہوتی ہے۔ جس میں کوئی ہلچل نہیں۔ کوئی زندگی نہیں۔

لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس نے اپنے سینے میں کتنا بڑا طوفان چھپا رکھا ہے۔ وہ کتنا عظیم آدمی ہے۔ اس کا

نام جلال تھا۔
جلال سے میری ملاقات میرے ایک جاننے والے نے کروائی تھی۔ میں اس وقت طارق روڈ کے ایک ہوٹل میں چائے پی رہا تھا کہ میرا جاننے والا دکھائی دے گیا۔
جاننے والے کا نام سفیر تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر جلدی سے میری میز کے پاس آگیا۔ جلال بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔
''ارے فرمان صاحب، کہاں ہوتے ہیں آج کل۔'' سفیر نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔
''بھائی، تم تو جانتے ہو کہ میرا کام ہی ایسا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بس ذرا فرصت نہیں ملتی۔''
''فرمان صاحب، یہ ہیں میرے دوست جلال۔'' اس نے اپنے ساتھ والے کا تعارف کروایا۔
میں نے اس سے بھی ہاتھ ملالیا۔ جلال اس وقت ایک عام سا آدمی دکھائی دیا تھا۔ ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جو اپنی طرف متوجہ کرسکتی۔
البتہ ایک بات نوٹ کی میں نے کہ اس کی آنکھیں بہت بجھی بجھی تھیں۔ غم زدہ آنکھیں جن میں کوئی چمک نہیں، کوئی جذبہ نہیں۔ جیسے بجھی ہوئی لکڑیاں ہوتی ہیں۔
میں ایسے لوگوں سے بہت بور ہوا کرتا ہوں۔ ایسے پریشان حال لوگ فوراً ہی دکھوں کی داستان سنانے بیٹھ جاتے ہیں۔ انہیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ وہ جس کو اپنی کہانی سنا رہے ہیں، وہ اس کہانی میں دلچسپی لے رہا ہے یا نہیں۔
لیکن اس وقت میری توقع کے برعکس جلال نے ایسی کوئی کہانی نہیں سنائی۔ اس کے برعکس وہ بہت شگفتہ باتیں کرتا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک دفتر میں کام کرتا ہے۔
اس کی باتیں تو بہت شگفتہ تھیں۔ لیکن اس کی آنکھیں اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ان میں وہی غم انگیز تاثر تھا۔
جیسے وہ کوئی روبوٹ ہو۔ احساسات سے عاری۔
پھر اچانک باتیں کرتے کرتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ معاف کیجئے گا، مجھے دیر ہورہی ہے۔ بچی کو ٹیوشن سے لینا پڑتا ہے۔''
''کم از کم چائے تو پیتے جائیں۔''
''نہیں صاحب، اس وقت بالکل فرصت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''پھر کبھی سہی۔''
اور وہ ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی دوسری بات یہ ہوئی کہ سفیر کا کوئی کلائنٹ اس کے پاس آگیا۔ سفیر ایک اسٹیٹ ایجنٹ ہوا کرتا تھا۔ میں سفیر سے جلال کے بارے میں کچھ پوچھ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ بھی اپنے کلائنٹ کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ شاید وہ اسے کوئی پلاٹ یا مکان دکھانے لے گیا ہوگا۔
کچھ دیر بعد میں بھی ہوٹل سے باہر آگیا۔ ظاہر ہے میں وہاں بیٹھ کر کیا کرتا۔
چار پانچ دنوں کے بعد وہ شخص جلال مجھے پھر اسی علاقے میں دکھائی دے گیا۔ اس بار وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ ایک پیاری سی بچی بھی اس کے ساتھ تھی۔
میرے اندازے کے مطابق وہ بچی دس یا گیارہ برس کی ہوگی۔ اس کے لیے یہی کہہ سکتے تھے کہ وہ بہت کیوٹ ہے۔ جلال مجھے پہچان کر تیزی سے میرے پاس آگیا۔
''فرمان صاحب، معاف کیجئے گا، میں اس دن اسی بچی کو لینے چلا گیا تھا۔ اسی لیے آپ کی چائے پیے بغیر اٹھ گیا تھا۔''
''نہیں، نہیں بچی کو لینا زیادہ ضروری تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ماشاللہ بہت پیاری بچی ہے آپ کی۔''
''بیٹا انکل کو سلام کرو۔'' جلال نے بچی سے کہا۔
بچی نے شرماتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''بیٹا نام کیا ہے تمہارا۔''
''حمیرہ۔'' اس نے جواب دیا۔
''میری بیٹی بہت ذہین ہے فرمان صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''اپنی کلاس میں فرسٹ آیا کرتی ہے۔ اس وقت ساتویں میں ہے۔''
''واہ!'' میں نے تعریف کی۔
''اچھا فرمان صاحب، اجازت دیں۔'' جلال نے کہا۔ ''پھر ملاقات ہوگی۔''
دونوں باپ بیٹی ایک طرف چلے گئے۔ میں بہت دیر تک دیکھتا رہا تھا۔
کئی دنوں کے بعد جلال سے پھر ملاقات ہوگئی، راہ چلتے ہوئے۔ اس بار بھی بچی اس کے ساتھ ہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''جلال صاحب، لگتا ہے آپ کو اپنی بچی سے بہت محبت ہے۔ ہر وقت اس کو ساتھ ہی رکھتے ہیں۔''
''یہ میری مجبوری ہے فرمان صاحب۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں اس کو کہیں اور رکھ نہیں سکتا۔''
''ماں کے پاس۔''
''نہیں فرمان صاحب، میں ہی اس کی ماں ہوں اور



میں ہی اس کا باپ ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ نیک بخت ایک کربناک زندگی گزار کر اللہ کو پیاری ہوچکی ہے۔''
''اوہ!'' مجھے یہ سن کر افسوس ہوا تھا۔ ''یعنی اس کی والدہ نہیں ہیں۔''
''نہیں، دو سال ہوئے ان کا انتقال ہوچکا ہے۔'' اس نے کہا۔
''اوہ!'' میں نے افسوس ظاہر کیا۔
''فرمان صاحب، اگر آپ کے پاس وقت ہو تو میں کسی دن آپ کو اپنی داستان سنانا چاہتا ہوں۔'' جلال نے کہا۔ ''آپ کو میری کہانی سن کر یہ پتا چلے گا کہ کچھ لوگوں کے لیے زندگی کتنی بے رحم ہوجاتی ہے۔''
''ضرور۔'' میں نے کہا۔ کیونکہ اب مجھے خود بھی اس شخص میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ ''آپ جب چاہیں تشریف لے آئیں۔ میں مغرب کے بعد گھر پر ہی ہوتا ہوں۔''
''میں کل ہی حاضر ہوجاؤں گا۔'' اس نے کہا۔
''لیکن آپ مجھے اپنے بارے میں کیوں بتانا چاہتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔
''اس لیے کہ میں اب دل پر پتھر رکھے رکھے تھک چکا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''کیا آپ یقین کریں گے کہ میرے بارے میں آپ کے دوست سفیر کو بھی بہت کم معلوم ہے۔ کسی سے اپنے دکھ شیئر کرنے کو دل ہی نہیں چاہا۔ پہلی بار آپ کو بتانے کی کوشش کروں گا۔''
''مہربانی آپ کی کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔'' میں نے کہا۔
''تو میں کل شام کو آرہا ہوں آپ کے پاس۔ اور ہاں یہ بچی بھی میرے ساتھ ہی ہوگی۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔''
''ارے، اعتراض کیسا۔ یہ تو بہت اچھی بچی ہے۔''
دوسری شام کو میں نے جلال اور اس کی بچی کے لیے کیک وغیرہ منگوا کر رکھ لیے۔ اس کے علاوہ کارٹونز کی دو تین سی ڈیز بھی خرید لیں۔ تاکہ بچی اس میں مصروف رہے اور ہم باتیں کرسکیں۔ جلال شاید تفصیل سے کچھ بتانا چاہتا تھا۔ دوسری شام کو وہ دونوں آگئے۔
بچی نے بہت خوبصورت ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ وہ گڑیا معلوم ہورہی تھی۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ آج وہ مجھ سے کچھ مانوس سی تھی۔
میں نے بچی کو کارٹون لگا کر ٹی وی کے سامنے بٹھا دیا پھر کیک اور دوسری چیزیں اس کے سامنے لا کر رکھ دیں۔ اپنے اور جلال کے لیے چائے بنائی اور ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔
بہت دیر کے بعد جلال نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''فرمان صاحب، میں آپ کو ایک بات بتاؤں تو آپ مذاق تو نہیں سمجھیں گے؟''
''نہیں بھائی، میں مذاق کیوں سمجھنے لگا۔''
''میں اس بچی کو باقاعدہ اغوا کر کے لایا ہوں۔'' اس نے کارٹون دیکھتی ہوئی بچی کی طرف اشارہ کیا۔
''کیا...!'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اغوا کیا ہے؟''
''جی ہاں۔'' اس نے اپنی گردن ہلائی۔ ''اس کے نانا کے گھر سے اغوا کیا ہے میں نے۔'' اس نے بتایا۔ ''کیونکہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔''
''یار صاف صاف بتا دیں۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ میں سوچ سوچ کر مر جاؤں گا۔''
''یہ بہت ہی عجیب اور دکھوں بھری کہانی ہے فرمان صاحب۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میری کہانی میں سوائے کرب اور انسانی بے رحمی کی مثالوں کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔''
وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کے چہرے پر دکھوں کی لکیریں گہری سے گہری ہوتی چلی گئیں۔

☆☆☆

ماہ نور بہت اچھی تھی۔ بہت خوبصورت اور بہت ذہین۔
سب سے کمال کی خوبی اس کی شگفتہ مزاجی تھی۔ ذرا سی دیر میں لاجواب کر دیا کرتی۔ نہ جانے کتنے اشعار یاد تھے اسے جن کا وہ برمحل استعمال کیا کرتی۔
وہ ایسی لڑکی تھی جس کو حاصل کرنے کی خواہش ہر ایک ...کو ہوسکتی ہے۔ وہ میری سگی پھوپی زاد تھی۔ ہم رشتے کے حوالے سے قریب تھے لیکن زندگی کے انداز کے لحاظ سے دور تھے۔
میرے پھوپا ایک دولت مند انسان تھے۔
گاڑیوں کے کئی شوروم کے مالک تھے۔ ان کے علاوہ انہوں نے مختلف کاروبار میں حصہ لے رکھا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق وہ کروڑ پتی سے کچھ زیادہ ہی ہوں گے۔

ان کی تین اولادیں تھیں۔ جبران، فرقان اور ماہ نور۔ ماہ نور سب سے چھوٹی تھی۔ خالد صاحب یعنی میرے پھوپا ایک بدتمیز، خشک مزاج اور متکبر قسم کے انسان تھے۔

انہوں نے کبھی ہم لوگوں پر توجہ نہیں دی۔ بلکہ شاید انہیں یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ ہمارے نام کیا ہیں۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ایسے مزاج رکھنے والے شخص کی بیٹی مزاج میں بالکل برعکس تھی۔

پھوپا کے دونوں بیٹے بالکل اپنے باپ کے مزاج کے تھے۔ جابر، ظالم اور ضدی قسم کے۔ وہ بھی ہمارے گھر نہیں آئے۔ انہیں شاید یاد بھی نہیں ہوگا کہ ان کا کوئی ماموں زاد بھائی بھی ہے۔

مختصر یہ کہ اس گھر میں ماہ نور ایک سچے روشن چراغ کی طرح تھی۔ پھوپا اور میرے دونوں کزنز کو شاید اس بات کا گمان بھی نہیں ہوگا کہ ان کی اکلوتی بہن مجھ جیسے غربت زدہ شخص سے محبت کرنے لگے گی۔

یہ بالکل انہونی تھی۔ لیکن محبت طاقت ہی ایسی ہے۔ وہ اپنی راہیں خود بنا لیتی ہے۔ اسے کسی کی دولت یا مفلسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ آنکھیں بند کرکے کسی کے بازوؤں میں سمٹ آتی ہے اور اسی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ماہ نور سے میرا رشتہ اسی انداز سے استوار ہوا تھا۔

دھیرے دھیرے، جیسے خنک ہواؤں کے جھونکے سحر زدہ سے کر دیتے ہیں۔ ہم دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو پسند کیا اور ایک دم سے ہمیں محبت کا ادراک ہو گیا۔

ایسا لگا جیسے ہم ایک دوسرے ہی کے لیے بنے ہوں۔ ظلم اور جبر کے اس ماحول میں تو ہم ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے تھے اسی لیے ہماری ملاقاتیں باہر ہونے لگیں۔ کبھی فلاں پارک میں، کبھی فلاں ریستوران میں اور کبھی کبھی ماہ نور ہمارے یہاں بھی آ جاتی۔

میرے گھر والے ماہ نور کو اپنے یہاں دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہوں کہ اتنے دولت مند اور مغرور شخص کی بیٹی کے دل میں اپنے خاندان کی محبت ہے۔ انہیں ابھی یہ نہیں معلوم تھا کہ جو محبت ماہ نور کو یہاں تک کھینچ لائی ہے وہ خاندان والوں کی نہیں بلکہ صرف میری محبت ہے۔

ایک دن ماہ نور نے مجھ سے کہا۔ ”جلال، تم کم از کم ممانی کو تو بتا دو کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

”اس سے کیا ہوگا۔“

”بے وقوف ہو تم۔ ممانی ہمارے یہاں تمہارے رشتے کی بات چھیڑ دیں گی۔“

”ماہ نور، میرا خیال ہے کہ یہ مرحلہ آسان نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے ڈیڈ یعنی پھوپا صاحب اور تمہارے بھائی کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ ہمارے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں گے۔“

”لیکن محبت نے ایسی باتوں کی کب پروا کی ہے۔ تاریخ گواہ ہے۔“

”لیکن بدقسمتی سے تمہارے گھر والوں کا سبجیکٹ تاریخ نہیں بلکہ معاشیات اور طاقت ہے۔“ میں نے کہا۔

’ہونے دو۔ لیکن کم از کم ہم تو اپنی حجت تمام کرلیں۔“

حجت تمام کرنے کے لیے میں نے جب اپنے گھر میں بات کی تو سب حیران رہ گئے۔ ”کیا پاگل ہو گئے ہو۔“ اماں نے کہا۔ ”تم کو معلوم ہے اگر اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو تمہارا ظالم پھوپا اور اس کے بیٹے تمہارا کیا حشر کریں گے۔“

”جانتا ہوں اماں۔ لیکن یہ حشر صرف میرا ہی نہیں بلکہ ماہ نور کا بھی ہوگا اور وہ اس کے لیے تیار ہے۔ آپ کم از کم ایک بار ان لوگوں تک بات تو پہنچا دیں۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔“

”یعنی تم پیچھے نہیں ہٹو گے۔“

”نہیں اماں، اب نہیں۔“ میرے لہجے میں پختگی تھی۔

اماں نے مجبور ہو کر جب ابا سے بات کی تو ان کا بھی یہی ردِعمل تھا۔ انہوں نے مجھے سمجھایا۔ ”دیکھو بیٹا، یہ ٹھیک ہے کہ تم کوئی گناہ نہیں کر رہے۔ اپنی ایک خواہش کا اظہار کر رہے ہو۔ لیکن یہ خواہش جان لیوا ہے۔ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ خود میری سگی بہن بھی میرے لیے اجنبی سی ہو گئی ہے۔ دولت اور طاقت نے اس کی آنکھیں بند کر دی ہیں۔ ایسی صورت میں تمہاری یہ خواہش تمہیں سوائے دکھوں کے اور کچھ نہیں دے گی بیٹا۔“

”ابا، یہ بات مجھ سے زیادہ ماہ نور جانتی ہے۔“

”وہ بے وقوف لڑکی ہے۔“

”آپ اسے بے وقوف کہہ لیں۔ لیکن اس کے



ارادے اٹل ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ کسی صورت پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔ وہ بھی اپنے باپ ہی کی بیٹی ہے۔“

”تم دونوں آگ سے کھیل رہے ہو۔“

”ہم جلنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ صرف ایک بار ان لوگوں تک بات پہنچا دیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے بعد ہمارا کام ختم ہو جائے گا۔“

میں نے ابا سے کبھی ایسی بات نہیں کی اور نہ ہی میرے لہجے میں کبھی ایسی خود اعتمادی آئی ہوگی۔ لیکن محبت نے بلا کی توانائی بھر دی تھی۔ ماہ نور نے یہ بتایا تھا کہ محبت کرنے والے بہت طاقت ور ہوتے ہیں۔

بہرحال میرے مجبور کرنے کے بعد میرے والدین پھوپا اور پھوپی کے گھر چلے گئے اور وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ وہاں ان کے ساتھ بہت حقارت اور ذلت کا سلوک کیا گیا۔ اس رشتے کو بری طرح ٹھکرا دیا گیا۔

دونوں اپنی آنکھوں میں آنسو اور ذلت کا احساس لیے واپس آ گئے تھے۔

مجھے بھی یہ سب سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔ اصولاً تو اس کہانی کو یہیں پر ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن یہ ابتدا تھی۔ اصل کہانی تو اس انکار کے بعد شروع ہوئی تھی۔

جب ہم دونوں ملے تو ماہ نور اور بھی زیادہ پُرعزم تھی۔ ”بس، ہم نے حجت تمام کرلی۔“ اس نے کہا۔

”تو پھر اب بتاؤ، اب کیا کرنا ہے۔“

”شادی۔“ اس نے کہا۔ ”وہی جو ہم نے پہلے سوچ رکھا تھا۔“

”کس طرح۔“

”ہمارے پاس اور بھی آپشن ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”جیسے کورٹ میرج۔“

”کیا کہہ رہی ہو ماہ نور۔ ہمارے خاندان میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔“

”ہمارے خاندان میں تو محبت ہی کبھی نہیں ہوئی۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن ہم نے یہ روایت بریک کی ہے۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی کرنا ہے۔“

”ماہ نور، اب میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم ابھی سے دشواریوں کا اندازہ لگا لو۔ تم نے اس ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں جہاں دولت کی ریل پیل ہے۔ تم اس گھر میں رہتی ہو جس کا غسل خانہ بھی ہمارے گھر سے اچھا ہے۔ ہم بسوں اور ویگنوں والے لوگ ہیں اور تم نے

صرف گاڑیاں دیکھی ہیں۔ یہ مفلسی برداشت کرلو گی؟''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ ہم نے محبت کی ہے۔ مول تول اور سودے بازی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمیں ہر حال میں زندگی گزارنی ہوگی۔ چاہے وہ جیسی بھی ہو۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔''

اور ہم نے کورٹ میرج کرلی۔ اس کے بعد ہم دونوں کی زندگی اتنی بھیانک ہوگئی جس کا ہم نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

انہوں نے میرے ماں باپ کو تو کچھ نہیں کہا۔ لیکن وہ میرے اور ماہ نور کے پیچھے پڑ گئے، سب سے پہلا حادثہ یہ ہوا کہ میں جس فرم میں کام کر رہا تھا اس فرم میں میری ساکھ بھی بہت اچھی تھی۔ وہ لوگ میرا بہت خیال کرتے تھے۔ ایک دن باس نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔ ''جلال صاحب، آج سے آپ کی جاب ختم کی جارہی ہے۔''

''ختم کی جارہی ہے! وہ کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔'' باس نے روکھے پن سے کہا۔ ''آپ اپنا حساب کرلیں۔''

میں جب بددل ہو کر گھر واپس آیا تو ماہ نور اس وقت بھی میرا حوصلہ بڑھاتی رہی۔ ''ارے، یہ پریشانی کس بات کی ہے۔ جاب ہی ختم ہوئی نا، زندگی تو ختم نہیں ہوئی۔ دوسری مل جائے گی۔''

''لیکن کیوں ماہ نور کیوں۔ مجھے تو اس بات کا دکھ ہے کہ آخر اچانک جاب کیوں ختم ہوگئی۔''

''میں ایک بات بتاؤں۔ آپ کو چاہے یقین ہو یا نہ ہو۔ آپ کی جاب ختم کرانے میں میرے ڈیڈ کا ہاتھ ہے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔''

''ایسا ہی ہوا ہوگا وہ ایک طاقتور انسان ہیں۔ اس قسم کے نہ جانے کتنے چٹکلے ان کے پاس ہیں۔ انہوں نے ابتدا کردی ہے۔''

میرے پھوپا اور ان کے صاحب زادوں نے اس کھیل میں اس وقت شدت پیدا کردی جب انہوں نے کرائے کے لوگوں سے مجھ پر قاتلانہ حملہ کروایا۔

ظاہر ہے یہ کارنامہ ان کے علاوہ اور کون کرسکتا تھا۔ مجھ جیسے انسان کی دشمنی ہی کس سے تھی۔ ہماری یہ عادت تھی کہ ہم ہر شام قریبی پارک میں جا کر بیٹھ جایا کرتے۔

اس طرح ماہ نور کے ساتھ بیٹھنا اس سے باتیں کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس کے قرب کا ہر لمحہ میرے لیے ہمیشہ ہی خوشگوار رہا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔

عجب لڑکی تھی۔ خدا نے اس میں کتنا صبر اور کتنا حوصلہ دے دیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے صبر اور حوصلے کی قوت بڑھتی جارہی تھی۔

کتنے تکلیف دہ ماحول میں وہ میرے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔ لیکن اس نے کبھی اف تک نہیں کی۔ وہ یہی کہا کرتی۔ محبت عظیم ہے، وہ اپنے راستے خود بنالے گی۔ میرے گھر والوں کو ایک دن اس بات کا احساس ہو جائے گا۔ بہرحال اس شام بھی ہم دونوں پارک ہی میں تھے۔ جب ماہ نور اچانک بری طرح چونک پڑی۔ وہ خوفزدہ ہو رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ دبا کر کہا۔ ''جلال، میں نے ابھی ابھی جبران بھائی کو دیکھا ہے۔''

''جبران کو۔''

''ہاں۔ وہ ہمیں گھورتے ہوئے سامنے والے پودوں کے پیچھے چلے گئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''ان کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔''

''کمال ہے میں نے نہیں دیکھا۔''

''میں نے دیکھا ہے نا اس لیے بتا رہی ہوں۔ جبران بھائی کے ارادے اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ وہ ہماری طرف اشارہ کر کے ان دونوں سے کچھ کہہ رہے تھے۔''

''پھر تو یہ خطرے والی بات ہے۔'' میں بھی پریشان ہوگیا تھا۔

''ہاں۔ ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔''

لیکن ہم وہاں سے نہیں نکل سکے تھے۔ ہمیں دیر ہوگئی تھی۔ ایک گولی چلی جو میرے شانے میں پیوست ہوگئی۔ میں چیخ کر ایک طرف الٹ گیا تھا۔ وہ گولی جھاڑیوں کے پیچھے سے چلائی گئی تھی۔

پارک میں ذرا سی دیر میں ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔ اس افراتفری میں جبران اور اس کے بندے فرار ہوگئے تھے۔

ماہ نور کا رو رو کر اور چیخ چیخ کر برا حال ہو رہا تھا۔

کسی نیک آدمی نے ایمبولینس اور پولیس کو فون کر کے بلا لیا تھا۔ مجھے جس وقت ہاسپٹل پہنچایا گیا میں زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش ہوگیا تھا۔



آنکھ کھلی تو ماہ نور میرے بستر کے پاس ہی تھی۔ میں ہاسپٹل میں تھا۔ اس نے رو رو کر اپنی آنکھیں سجالی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ بری طرح رونے لگی تھی۔

''بس بس، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم یہ سوچو کہ خدا ہمیں محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے میں بچ گیا ہوں۔''

''پولیس تمہارا بیان لینا چاہتی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تم نے تو پولیس کو کچھ نہیں بتایا نا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں ابھی نہیں۔''

''بس، تم ان سے یہی کہتی رہنا کہ تمہیں نہیں معلوم کہ حملہ آور کون تھا۔ ان سے کہنا کہ ہماری کسی سے دشمنی نہیں ہے۔''

''لیکن میں تو جبران کا نام لوں گی۔''

''نہیں، ایسا مت کرنا۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ الٹا ہم اور مصیبت میں پھنس جائیں گے۔''

مختصر یہ کہ ہم نے یہ جاننے کے باوجود کہ یہ حملہ کس نے کروایا ہے، کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ پولیس کو بتانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ میرے پھوپا اور ان کے بیٹے بہت طاقتور تھے۔ وہ میرے لیے کچھ بھی کرسکتے تھے۔ میں نے تو ایک گولی کھا کر اپنی جان پر ایک مصیبت برداشت کرلی تھی۔ لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ ماہ نور اس لپیٹ میں آئے۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد میرے ماں باپ یکے بعد دیگرے چل بسے۔ گو کہ یہ طبعی موت تھی مگر صدمہ تو ہونا تھا۔ صدمے نے مجھے پاگل کر کے رکھ دیا تھا۔

آپ یقین کریں، میں نہ جانے کتنے دنوں تک بالکل سکتے کی سی کیفیت میں رہا تھا۔ اگر اس وقت ماہ نور میرے ساتھ نہیں ہوتی تو شاید میں خودکشی کر کے مرجاتا۔

ماں باپ کے بغیر زندگی میں رہ کیا گیا تھا۔ اس وقت ماہ نور نے سہارا دیا۔ اس دوران ایک ستم یہ ہوا کہ جہاں میری دوسری ملازمت تھی، وہ ملازمت بھی ختم ہوگئی۔

ظاہر ہے روتے ہوئے انسان کو کوئی کب تک برداشت کرسکتا ہے۔ انہوں نے بھی برداشت نہیں کیا۔ اس عالم میں بھی بے چاری ماہ نور ہی کام آئی۔ اس نے ایک اسکول میں جاب کرلی اور میں نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔

میرے پاس ایک بائیک ہوا کرتی تھی۔ کئی بار دل چاہا کہ میں وہ بائیک بیچ دوں۔ گھر میں فاقے تک ہونے لگے تھے۔ بے چاری ماہ نور نے ایسی بھیانک زندگی کہاں دیکھی ہوگی۔ اس لیے میں سوچتا کہ بائیک کے پیسوں سے کچھ دن تو سکون سے گزر جائیں گے۔ لیکن اس وقت بھی ماہ نور ہی آڑے آئی۔ اس نے سمجھایا کہ بائیک نہیں رہی تو میں جو بھاگ دوڑ کر رہا ہوں وہ کہاں سے کروں گا۔ ایک سواری بہت بڑا آسرا ہوا کرتی ہے۔

اس کا سمجھانا بعد میں بہت کام آیا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ مجھے آٹھ ہزار روپوں کی ایک ملازمت مل گئی۔ خود اندازہ لگائیں آٹھ ہزار کیا ہوتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ اسی میں دو ہزار کی ایک معمولی سی کوٹھری ہم نے کرائے پر لے لی۔ ہر وقت ماہ نور کے ماں باپ کا خوف بھی لگا رہتا تھا۔

ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے کو زندہ رکھنے کے لیے صرف محبت تھی۔ ہم محبت ہی کے سہارے زندگی گزارے جارہے تھے۔

ہمارے یہاں پہلی خوشی اس وقت آئی جب یہ پتا چلا کہ ماہ نور ماں بننے والی ہے۔ یہ بہت عجب دن تھے۔ عجب لمحات تھے۔ ہم اپنی کوٹھری میں ایک دوسرے کے ساتھ لیٹے ہوئے آنے والے بچے کے خوبصورت دنوں کے خاکے بنایا

## ای ایم مورگن فورسٹر

1970-1879ء

انگریز ناول نویس، لندن میں پیدا ہوا۔ کنگ کالج کیمبرج میں تعلیم پائی۔ جان ڈکنز (آئندہ کا مشہور ادیب) اس کا ذاتی دوست تھا۔ 1903ء میں دوستوں کے ساتھ مل کر انڈی پنڈنٹ ریویو (Independent Review) نکالا۔ 1920ء میں لیبر پارٹی کے اخبار ''ڈیلی ہیرلڈ'' کا مدیر مقرر ہوا۔ 1912ء اور پھر 1922ء میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں دو سال مصر میں رہا۔ 1927ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں ناول کی تکنیک پر چند خطبات دیئے۔ اس کا سب سے مشہور ناول (A Passage to india) 1924ء میں شائع ہوا۔

مرسلہ: زاہد خان، ڈی آئی خان

کرتے۔ ایک دوسرے کو یقین دلاتے رہتے کہ آنے والی صبح بہت روشن اور خوشگوار ہوگی۔

ایک بہت عام سے اسپتال میں ہماری بچی حمیرہ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس وقت ہم دونوں بہت بری طرح روئے تھے۔ کیونکہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

نہ بچی کے لیے ڈھنگ کے کپڑے تھے اور نہ وہ ضروری چیزیں جو نوزائیدہ کے لیے ہوا کرتی ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں یقین تھا کہ یہ دن بھی گزر جائیں گے۔

ہم اس بچی کی پرورش کرتے رہے۔ تین سال کی ہوئی تو ہم نے اسے اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسی اسکول میں جہاں ماہ نور نے ملازمت کی تھی۔

اس وقت زندگی ایک ڈگر پر آنے لگی تھی۔ میں اپنی ڈیوٹی پر چلا جاتا اور ماہ نور بچی کو لے کر اسکول چلی جاتی۔ دونوں دوپہر کو واپس آجاتے تھے۔

اسی طرح چھ سال گزر گئے۔ ہماری حمیرہ بہت پیاری اور ذہین بچی ہے۔ آپ تو اسے دیکھ ہی رہے ہیں۔ اور جب یہ چھ سال کی ہوئی تو ایک دن اچانک ماہ نور کا فون آیا۔ میں اس وقت اپنی ملازمت پر تھا۔ ماہ نور بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔ ''خدا کے لیے جلدی پہنچیں، جلدی۔''

میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے تھے۔ یقیناً کوئی خاص بات ہوگی۔ میں رکشا لے کر گھر پہنچ گیا۔ ماہ نور دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے بری طرح رونا شروع کر دیا۔ وہ صرف حمیرہ حمیرہ بول رہی تھی۔

''ارے کیا ہوا حمیرہ کو، کہاں ہے ہماری بچی؟'' میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

''وہ اسے لے گئے۔'' اس نے روتے ہوئے بتایا۔

''کون لے گیا۔''

''میرے گھر والے۔'' اس نے کہا۔ ''دونوں بھائی تھے۔ گاڑی میں آئے اور اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔''

''اس وقت حمیرہ کہاں تھی۔''

''وہ برابر والے مکان میں قرآن پڑھنے گئی تھی۔'' ماہ نور نے بتایا۔ ''دونوں گھروں میں فاصلہ ہی کتنا ہے۔ لیکن اسی درمیان اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ جلال، اگر بچی نہیں ملی تو میں مرجاؤں گی۔ مرجاؤں گی میں۔''

''فکر مت کرو۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''یہ تو پتا چل گیا نا کہ اسے کوئی اور نہیں لے گیا۔ تمہارے گھر والے ہی لے گئے ہیں۔ گھبراؤ نہیں، حوصلہ رکھو۔ ہم اپنی بچی کو واپس لے آئیں گے۔ اسے ہم سے کوئی الگ نہیں کر سکتا۔''

''ہم ابھی چلتے ہیں۔'' ماہ نور نے کہا۔ ''میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں ماں ہوں اس کی۔''

''ہاں آؤ۔ ابھی چلتے ہیں۔''

ہم دونوں فوری طور پر رکشا کر کے وہاں پہنچ گئے۔ میں شادی کے بعد پہلی بار اس گھر میں داخل ہوا تھا۔ جو اب میری سسرال بھی تھی۔ لیکن کیسی سسرال تھی؟ اور کن حالات میں ہم آئے تھے۔

خود اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں ہمارا استقبال کس طرح ہوا ہوگا۔ دونوں بھائیوں نے گیٹ پر ہی ہمیں روک لیا تھا۔ اس وقت ماہ نور نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ''میری بچی واپس کرو۔ مجھے بچی چاہیے۔ دے دو میری بچی۔''

ان لوگوں نے ہمیں شاید اس لیے اندر آنے کی اجازت دے دی ہوگی کہ کہیں تماشا نہ کھڑا ہو جائے۔ ہماری بچی حمیرہ ڈرائنگ روم ہی میں موجود تھی۔

وہ ہمیں دیکھ کر روتی ہوئی ہم سے آ کر لپٹ گئی۔ ''نہیں رہنا ہے، مجھ کو یہاں نہیں رہنا ہے۔''

میری پھوپی یعنی ماہ نور کی ماں بھی ڈرائنگ روم میں موجود تھیں۔ خدا کی پناہ کیا واقعی محبت اتنا بڑا گناہ تھا کہ کسی ماں نے بھی آنکھیں پھیر لی تھیں۔

نہ جانے انہوں نے محبت جیسے جذبے سے آنکھیں پھیری تھیں یا میری مفلسی سے۔ بہرحال ہم دونوں اس گھر کے لیے قابلِ نفرت ہو گئے تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ بچی بھی ہماری طرف لپک رہی ہے تو انہوں نے بچی سے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ دھتکار دیا اُسے۔

اور ہم بچی کو لے کر واپس آگئے۔

پھر یہاں سے ہماری زندگی کے وہ کربناک سلسلے شروع ہوئے جو آج تک ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم بہت خوش تھے کہ ہماری حمیرہ ہمیں واپس مل چکی ہے۔

ایک رات اچانک ماہ نور نے اپنے گلے میں کچھ تکلیف محسوس کی۔ میں نے اسے پانی گرم کر کے اس میں نمک ملا کر دیا تا کہ وہ غرارے کر لے۔ میرا خیال تھا کہ گلے میں ہلکی خراش ہوگی جو ٹھیک ہو جائے گی۔

لیکن صبح اس کی حالت اور خراب ہو چکی تھی۔ تکلیف بہت زیادہ تھی۔ میں اسے قریب کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے آیا۔ اس نے بہت دیر تک معائنہ کرنے کے بعد کئی

ٹیسٹ لکھ کر دے دیے۔ ''یہ ضرور کروالیں۔ کیونکہ یہ مجھے گلے میں معمولی خراش نہیں معلوم ہورہی۔''

تھوڑے بہت پیسے میرے پاس تھے۔ میں نے ان پیسوں سے اس کے ٹیسٹ کروائے۔ اور جو رپورٹ سامنے آئی وہ بہت بھیانک تھی۔ میری ماہ نور کو کینسر تھا۔ گلے کا کینسر۔

کینسر ایک دہشت ہے۔ خوف ہے۔ موت کی علامت ہے۔ یہ زندگی ویران کردیتا ہے۔ انسان کو تڑپا تڑپا کر مارتا ہے۔ یہ کسی پر رحم نہیں کرتا۔ اس کے آنے سے گھر برباد ہو جاتے ہیں۔

تو ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس سے ہماری پریشانی کا اندازہ لگائیں کہ میں کینسر کی اس مریضہ کو اپنی بائیک پر ہاسپٹل لے جایا کرتا تھا۔ حمیرہ کے لیے پڑوس کی ایک خاتون مہربان ہوگئی تھیں۔ وہ ان ہی کے پاس رہ جایا کرتی تھی۔

میں نے ماہ نور کے لیے کیا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ جس کی زندگی ہی بیمار ہو، وہ اپنی زندگی بچانے کے لیے کس حد تک نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے علاج کے اخراجات کے لیے میں نے دفتر سے واپسی پر ایک پیٹرول پمپ پر پارٹ ٹائم ملازمت شروع کردی۔

میری ننھی سی بچی اس دوران اپنی ماں کی خدمت میں مصروف رہتی۔ خدا جانے اپنی ماں کو اس حال میں دیکھ کر اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔

گھر واپس آکر میں خود روٹیاں بناتا تھا۔ میں نے ایک بار ماہ نور سے پوچھے بغیر اس کے گھر والوں کو بھی اس کی کیفیت سے آگاہ کردیا۔ لیکن کمال ہے کہ انہوں نے پلٹ کر بھی نہیں پوچھا۔ پتا نہیں نفرت کی یہ کون سی منزل تھی۔ میں نے ایسا تو کبھی نہیں سنا تھا۔ لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

انہوں نے اپنی زندگی کی کتاب سے ہمارا چیپٹر ہی نکال دیا تھا۔ ہم سب ان کے لیے مرگئے تھے۔ پھر کئی مہینوں کے بعد ماہ نور کی آواز بھی بند ہوگئی۔ وہ بول بھی نہیں پاتی۔

مجھ سے باتیں کرنی ہوتیں تو لکھ کر بتاتی۔ اس نے اپنی اس بیماری کے دوران اپنی ڈائری لکھنی شروع کردی تھی۔ وہ ڈائری اس کے اعلیٰ ادبی ذوق کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔

اسے بے شمار اشعار یاد تھے۔ اس کا معیار بہت اچھا تھا۔ اپنی ڈائری میں اس نے جگہ جگہ پر اشعار استعمال کرکے اپنے اس ذوق کا ثبوت دیا ہے۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ غذا کے لیے نلکی لگادی گئی اور میں ہی اسے لیکوئڈ پلایا کرتا تھا اسی نلکی کے ذریعے اور اس دوران میری بچی کھڑی دیکھتی رہتی۔

آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس ننھی سی جان کے کیا احساسات ہوتے ہوں گے۔ اس نے دنیا کو کن نگاہوں سے دیکھا ہوگا۔ اس کے لیے دنیا کیا تھی۔ ایک میں، ایک اس کی ماں اور ایک چھوٹی سی کوٹھری، بس۔

یہ تھی ہماری کائنات اور اس کائنات میں صرف ہم تین تھے۔ میں، ماہ نور اور ہماری بچی حمیرہ۔ اور کوئی بھی نہیں تھا۔ آج ہم صرف دو رہ گئے ہیں۔ میں اور میری بچی۔

ماہ نور نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔ ایک ہچکی آئی۔ خون کی وومیٹنگ ہوئی اور اس نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

ماہ نور تو مرگئی۔ لیکن محبت ابھی زندہ ہے۔ اس کے گھر والے بے وقوف تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ شاید محبت مرجاتی ہے۔

لیکن وہ آکر دیکھ لیں۔ محبت ابھی بھی زندہ ہے۔ میری حمیرہ کی شکل میں۔ یہ بالکل اپنی ماں کی طرح ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ جب میں مر رہا ہوں گا تو حمیرہ کے بچے بھی اسی شکل اور اسی مزاج کے ہوں گے۔ یعنی محبت کا یہ سفر جاری رہے گا۔

اسے کوئی نہیں مارسکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ چاہے اس کے پاس کتنی ہی دولت اور طاقت ہو۔ وہ محبت کو نہیں مارسکتا۔ اب تو آپ سمجھ گئے نا کہ میری یہ بچی ہر وقت میرے ساتھ کیوں رہتی ہے۔ یا میں اس کو اپنے ساتھ کیوں رکھتا ہوں۔ کیونکہ اس دنیا میں ہم دونوں کا کوئی نہیں ہے۔ کوئی رشتہ نہیں۔ کوئی دوستی نہیں۔

جلال نے اپنی کہانی ختم کردی۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ میں نے اس بچی کو دیکھا۔ وہ پیاری سی بچی کارٹون دیکھنے میں مصروف تھی۔ شاید اسے معلوم بھی نہیں ہوگا کہ ذرا سی دیر میں اس کے باپ نے اپنی پوری زندگی دہرادی ہے۔

جلال اپنی بچی کو لے چلا گیا۔ اور میں آج بھی یہ سوچ رہا ہوں کہ دولت اور طاقت کے اس بازار میں محبت کیا جرم ہے؟



# گاڑی والی

جناب مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
لکھنا لکھانا میرا پیشہ نہیں صرف شوق ہے، کئی اخبار و جرائد میں لکھتا رہا ہوں لیکن سرگزشت کے لیے یہ میری پہلی تحریر ہے۔ گزشتہ دنوں قبرستان میں اس سرگزشت کے مرکزی کردار سے ملاقات ہوئی اور میں نے اس کی آپ بیتی لکھ دی۔ یقیناً قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

ریحان باسط
(ملتان)

میں قبرستان میں فاتحہ پڑھنے گیا تھا کہ میں نے ایک عجیب سی قبر دیکھی۔

میرا مطلب ہے کہ قبر تو کوئی عجیب نہیں ہوتی لیکن اس کچی قبر میں گاڑیاں دھنسی ہوئی تھیں۔ کھلونے والی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں۔ جو عام طور پر بچوں کے لیے دکانوں پر مل جاتی ہیں۔

بازار میں ہر ماڈل کی کھلونا گاڑیاں مل جاتی ہیں۔ ان میں میٹل کی بھی ہوتی ہیں اور پلاسٹک کی بھی۔

مجھے حیرت اس لیے ہوئی کہ قبروں پر موم بتیاں، اگر بتیاں یا پھول وغیرہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس قبر پر گاڑیاں رکھی گئی تھیں۔

پھر خیال آیا کہ کسی بچے کی قبر ہوگی۔ جو کھلونا گاڑیوں سے کھیلتا ہوگا اور اس کی ناگہانی موت کے بعد اس کے والدین نے اپنے بچے کو اس طرح یاد کرنے کا انداز اپنا لیا ہوگا۔

لیکن قبر کے کتبے نے میرے اس خیال کی نفی کر دی۔ وہ کسی خاتون کی قبر تھی اور اس کی عمر ساٹھ برس... لکھی ہوئی تھی۔ ساٹھ برس کی عورت کھلونا گاڑیوں سے کیا کھیلتی ہوگی کہ اُسے اس طرح یاد کیا جا رہا تھا۔

میرے خاندان کے بہت سے لوگ اس قبرستان میں آرام کر رہے ہیں اس لیے میرا اکثر آنا ہوتا تھا لیکن اس بار میں بہت دنوں کے بعد آیا تھا۔ اسی لیے اس قبر کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

''اِدھر آؤ۔'' میں نے قبروں پر پانی ڈالنے والے کو آواز دی۔

وہ اپنی بالٹی لیے ہوئے میرے پاس آ گیا۔ ''جی صاحب، پانی ڈال دوں۔''

''پانی کو چھوڑو۔'' میں نے دس کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''یہ بتاؤ یہ قبر کس کی ہے؟''

''جی صاحب۔'' اس نے دانت نکال دیے۔ ''بہت سا لوگ یہی پوچھتا ہے۔''

''تو بتاؤ نا۔''

''یہ ایک عورت کا قبر ہے صاحب۔'' اس نے بتایا۔

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ اس پتھر پر سب لکھا ہوا ہے۔ اکبری نام ہے اس کا۔ میں ان گاڑیوں کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ یہ کس نے لگائی ہیں۔''

''ہاں صاحب، ایک عورت آتی ہے وہ لگا کر جاتی ہے۔''

''لگا کر جاتی ہے۔ کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے صاحب کہ اس قبر کو بنے ہوئے صرف دو مہینے ہوئے ہیں۔ اس پر تاریخ بھی لکھا ہوا ہے۔ جب اس کو دفن کیا گیا تو اس دن کچھ نہیں ہوا۔ پھر ایک جمعرات کا روز ایک عورت آئی۔ اس کے پاس چار پانچ گاڑیاں تھیں۔ اس نے یہ گاڑیاں قبر پر مٹی میں لگا دیں اور میرے کو پیسے دیے کہ خبردار ان کو ہٹانا نہیں۔ ہم کو کیا کرنا تھا صاحب، ہم نے گاڑیوں کو ویسے ہی رہنے دیا۔ دوسری جمعرات کو وہ پھر ایسی گاڑیاں لے کر آ گئی اور لگا کر چلی گئی۔ بس یہ ہے کہانی صاحب۔''

''عجیب بات ہے۔ اس عورت کے علاوہ اس قبر پر کون آتا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''کوئی نہیں صاحب، میں نے تو نہیں دیکھا۔'' اس نے بتایا۔

''کیا وہ ہر جمعرات کو آتی ہے۔''

''پچھلی جمعرات کو نہیں آیا تھا صاحب۔ آج جمعرات ہے آج شاید آ جائے۔''

وہ قبروں پر پانی ڈالنے آگے بڑھ گیا۔ میں اس گاڑیوں والی قبر سے کچھ فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا کہ وہ کہیں مجھے اس قبر کے پاس دیکھ کر واپس نہ چلی جائے۔

بالآخر بہت انتظار کے بعد ایک عورت خود کو چادر میں لپیٹے اسی قبر کی طرف آتی دکھائی دے گئی۔ میں نے اسے دیکھ کر خود کو اور چھپا لیا تھا۔

وہ اسی قبر کے پاس آ کر رک گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی چادر اتار دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپر تھا۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ وہ ایک جوان اور خوبصورت عورت تھی۔ اس کا چہرہ یہ بتا رہا تھا کہ وہ تعلیم یافتہ بھی ہوگی۔

اس نے اپنا شاپر کھولا اور اس میں سے دو کھلونا گاڑیاں نکال کر قبر پر رکھ دیں۔ اور اسی وقت میں آڑ سے نکل کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر سٹپٹا گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں آگے بڑھ جاؤں گا لیکن میں تو اسی کے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بہت نروس دکھائی دینے لگی تھی۔

''محترمہ۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''کسی مُردے کو ایصالِ ثواب کا یہ طریقہ میں پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں۔''

وہ کوئی جواب دیے بغیر چلنے لگی۔ میں لپک کر ایک بار پھر اس کے سامنے آ گیا۔ ''پلیز! صرف یہ بتاتی جائیں کہ یہ سب کیا ہے۔ ورنہ میں حیرت سے پاگل ہو جاؤں گا اور اس کی ذمے داری آپ پر ہوگی۔''

میں نے اس انداز سے یہ بات کی کہ اس کی وحشت کچھ کم ہو گئی۔ اس بار اس نے کہا۔ ''دیکھیں، یہ میرا معاملہ ہے۔ آپ کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔''

''بالکل یہ آپ کا معاملہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن



اب یہ میرا معاملہ بھی ہو گیا ہے۔''

''وہ کس طرح۔''

''میں کہانیاں لکھتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''اور آج مجھے ایک سبجیکٹ مل گیا ہے۔ میں معلوم کیے بغیر چین سے نہیں رہوں گا۔''

''اوہ! تو آپ کہانیاں لکھتے ہیں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''جی ہاں۔''

''پھر تو میں آپ کو یہ کہانی ضرور سناؤں گی۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کسی دن میرے دفتر آ جائیے گا۔ میں پریمیئر انشورنس میں کام کرتی ہوں۔''

''آپ کا دفتر کہاں ہے۔''

''شاہراہ فیصل پر۔ لال کوٹھی کے پاس۔'' اس نے بتایا۔

''کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ جب میں آپ کے پاس پہنچوں تو آپ مجھے پہچاننے سے انکار کر دیں۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ مسکرا دی۔ ''آپ کسی دن بھی آ جائیں۔ ویسے نام کیا ہے آپ کا۔''

''ریحان باسط۔'' میں نے بتایا۔

''میں نے شاید آپ کی کہانیاں پڑھی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ضرور پڑھی ہوں گی۔''

''آپ خواتین کے موضوع پر لکھتے ہیں۔''

''ظاہر ہے۔ کائنات میں خواتین سے بڑا موضوع اور کیا ہو سکتا ہے۔''

وہ پھر مسکرا دی۔ ''ٹھیک ہے، اب میں چلتی ہوں۔''

ہم دونوں ایک ہی ساتھ قبرستان کے گیٹ سے باہر نکلے تھے۔ وہ ایک گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ یہ چھوٹی سی لیکن نئے ماڈل کی خوبصورت گاڑی تھی جس سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی مالی پوزیشن بھی ٹھیک ہی ہوگی۔ جبکہ میرے پاس ابھی تک بائیک ہی تھی۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف اور میں اپنی بائیک کی طرف آ گیا تھا۔

تجسس اتنا شدید تھا کہ میں دوسرے ہی دن اس کے دفتر پہنچ گیا۔ پریمیئر انشورنس کا دفتر تلاش کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہاں پہنچ کر اپنی اس حماقت کا احساس ہوا کہ میں نے اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں تھا۔ اب اسے کس طرح تلاش کرتا، کیا کہتا۔ یہی کہ قبرستان والی سے ملنا ہے۔

لیکن شکر ہے کہ ایسی نوبت نہیں آئی۔ وہ سامنے ہی دکھائی دے گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ خود ہی میرے پاس آ گئی۔ ''تو کہانی نگار صاحب آخر آپ پہنچ ہی گئے۔'' اس نے کہا۔

''جب کردار دلچسپ ہو تو میں اس کے لیے دنیا کے دوسرے کونے تک بھی جا سکتا ہوں۔''

''آپ کو کردار میں دلچسپی ہے یا کہانی میں۔'' اس نے سوال کیا۔

''دونوں میں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور ہاں، یہاں آ کر میرے ساتھ ایک الجھن ہو گئی تھی۔ اگر آپ سامنے دکھائی نہ دیتیں تو میں آپ کو قبرستان والی کے نام سے پوچھتا۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''میرا نام عالیہ رحمان ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''آئیں میرے کیبن میں آ جائیں۔''

اس کا کیبن چھوٹا لیکن خوبصورت تھا۔ شیشے کی دیواریں، سلیقے کا فرنیچر۔ اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس دفتر میں اس کی پوزیشن اچھی خاصی ہے۔

بیٹھنے کے بعد اس نے انٹرکام پر چائے کے لیے کہہ دیا تھا۔

''جی جناب، اب میں آپ کو بتانا شروع کرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''سب سے پہلے تو یہ جان لیں کہ وہ قبر میری مرحومہ ساس کی ہے۔''

''ساس!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں۔'' وہ مسکرا دی۔ ''آپ کا کیا خیال تھا کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں۔''

''جی ہاں۔ لگتی تو ایسی ہی ہیں۔''

''ریحان باسط صاحب، یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس نے ہمیشہ اچھی زندگی کے خواب دیکھے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ لڑکی میں تھی۔ ایک غریب خاندان میں پرورش پانے والی لڑکی۔ جس کے پاس صرف آرزوئیں تھیں، خواب تھے اور ان خوابوں کی تکمیل صرف اسی صورت میں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی تعلیم پر توجہ دے۔ خوب محنت کرے۔ ہمارے طبقے کے پاس آگے بڑھنے کا یہی ایک ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ اچھی تعلیم۔''

میں نوٹس لیتا جا رہا تھا۔ پھر میں نے دریافت کیا۔ ''عالیہ رحمان صاحبہ، آپ کے والد اور بھائی وغیرہ۔''

"والد ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے۔" اس نے بتایا۔ "جن کی بہت کم پنشن آیا کرتی۔ جبکہ ایک بھائی مجھ سے بڑا ہے۔ وہ بے چارہ کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا' جبکہ چھوٹا پڑھ رہا تھا۔" مشکل سے ہمارے گھر میں پندرہ بیس ہزار مہینے کے آیا کرتے، کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس مہنگائی کے دور میں اتنے پیسوں کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔"

"جی ہاں' اس کا اچھی طرح اندازہ ہے کیونکہ میں خود بھی ایسے ہی حالات سے گزر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اماں یہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح بھی میری شادی ہو جائے۔ تاکہ کم از کم میرے نصیب میں تو اچھے دن آجائیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ آج کل یہ نہیں دیکھا جاتا کہ فلاں لڑکی کتنی خوبصورت ہے یا اس کا خاندان کیسا ہے۔ یا وہ کس مزاج اور کردار کی ہے۔ یہ سب نہیں دیکھتے۔ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ فلاں لڑکی کے باپ کے پاس کتنی دولت ہے۔ ظاہر ہے میں اس معیار پر پورا نہیں اتر سکتی تھی۔ اسی لیے کئی رشتے آئے اور ہماری غربت دیکھ کر واپس چلے گئے۔"

"اور آپ کی تعلیم؟" میں نے پوچھا۔ "اس کا کیا ہوا۔"

"میں نے اس کا سلسلہ تو جاری رکھا۔" اس نے کہا۔ "میں یہ بتا چکی ہوں کہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی آپشن نہیں ہوتا۔"

"چلیں' یہ تو ہر دوسرے گھر کی کہانی ہے۔"

"ہاں' لیکن میری اس کہانی کا نیا موڑ تب آیا جب ابو کے ایک دوست نے اپنے بیٹے فراز کا رشتہ میرے لیے بھیجا۔" اس نے بتایا۔ "ابو نہ جانے کیوں اس رشتے کے لیے بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ وہ ہر قیمت پر چاہتے تھے کہ میری فراز سے شادی ہو جائے۔ بلکہ انہوں نے ایک بار فراز کو مجھ سے ملوا بھی دیا تھا اور وہ مجھے پسند بھی آ گیا تھا۔ اس کے بعد فراز کی ماں اور اس کا باپ باقاعدہ رشتہ لے کر ہمارے یہاں آ گئے۔"

میں اس کی کہانی سنتا رہا۔ ابھی تک اس کی کہانی میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جو مجھے دلچسپی لینے پر مجبور کرتی۔

"جناب' ان لوگوں کے میرے گھر آنے کے بعد ہی میری اس کہانی میں جان پیدا ہوئی ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ لوگ آئے۔ انہوں نے مجھے پسند بھی کر لیا لیکن فراز کی ماں کی خواہش تھی کہ ان کے بیٹے کو جہیز میں گاڑی ضرور دی جائے۔"

"اوہ تو یہ بات ہوئی۔"

"جی ہاں۔ خود سوچیں ہمارے حالات ایسے کہاں تھے کہ ہم ایک موٹر سائیکل بھی دے سکتے۔ اور کہاں گاڑی۔ جو میرے والدین کے بس میں ہی نہیں تھا۔ اس وقت میرے والدین کے چہرے دیکھنے کے قابل تھے۔ انتہا یہ تھی کہ فراز کا باپ اپنے دوست کی بھی پروا نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے آگے بھیگی بلی بنا بیٹھا تھا۔ بہرحال یہ ہوا کہ اس دن کوئی بات طے کیے بغیر وہ لوگ چلے گئے۔"

"ظاہر ہے کہ اس کے بعد یہ رشتہ تو ختم ہی ہو گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ بلکہ فراز ہی سے میری شادی ہوئی۔" اس نے بتایا۔

"ارے وہ کس طرح۔"

"وہ اس طرح کہ بے چارے ابو نے ہمیں دھوکے میں رکھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لوگ بغیر گاڑی کے شادی کے لیے مان گئے ہیں۔ جبکہ سچائی یہ تھی کہ انہوں نے خاموشی کے ساتھ ان لوگوں کو یقین دلا دیا تھا کہ شادی کے چھ مہینوں کے بعد وہ کہیں سے کار دلوا دیں گے۔"

عالیہ بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔ میں اس وقت اس کے دکھ کا اندازہ کرنے لگا تھا۔

"بہرحال فراز سے میری شادی ہو گئی۔" عالیہ نے آگے بتانا شروع کیا۔ "فراز اتنا اچھا ثابت نہیں ہوا جتنا میں نے اسے سمجھا تھا۔ وہ اپنی ماں کے سامنے دم بھی نہیں مار سکتا تھا۔ اس کی ماں یعنی میری ساس پورے گھر کی حاکم تھی۔"

"کمال ہے۔ میں تو ایسی عورتوں کے بارے میں صرف سنا کرتا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ میں بھی سنتی تھی لیکن میں نے اس گھر میں جا کر دیکھ لیا۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "شادی کے کچھ ہی دنوں کے بعد اس نے ہنگامہ شروع کر دیا کہ میرے ابو نے جس گاڑی کا وعدہ کیا تھا وہ آج تک نہیں آئی اور اس وقت پتا چلا کہ بے چارے ابو ان کمینوں سے کیا وعدہ کر بیٹھے ہیں۔"

"آپ نے اپنے ابو سے بھی بات کی ہو گی۔"

"ہاں۔ جب مجھے یہ پتا چلا تو میں ابو پر جا کر بہت ناراض ہوئی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو ایسے وعدے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس پر انہوں نے کہا کہ بیٹا کیا کرتا۔ یہ



شادی تو ہونی تھی نا اسی لیے۔"

"شوہر کا کیا رویہ ہوا کرتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ میں نے بتایا نا کہ وہ تو اپنی ماں کے سامنے اُف بھی نہیں کر سکتا تھا۔" عالیہ نے کہا۔ "بہرحال ایک دن یہ ہوا کہ میرے گھر میں ایک نئی کار آ گئی۔ یہ ابو نے دلوائی تھی۔"

"اوہ! وہ کس طرح؟"

"امی کی زیورات بیچ کر اور دوستوں سے قرض لے کر۔" اس نے بتایا۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ میں یہ جان کر شاک میں آ گئی تھی۔ لیکن اس بے رحم عورت پر ابو کی اس قربانی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ تو گاڑی کو اس طرح استعمال کیے جا رہی تھی جیسے اس کا حق ہو۔ اب مجھے اس عورت سے وحشت ہونے لگی تھی۔ آپ اسے نفرت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر میرا بس چلتا تو میں گاڑیوں کی اس لالچی عورت کے ساتھ نہ جانے کیا کر بیٹھتی۔ اور ایک دن تو انتہا ہو گئی جب اس نے دوسری گاڑی کی بھی فرمائش کر دی۔"

"کیا!" یہ سن کر خود میں بھی حیران رہ گیا تھا۔ "دوسری گاڑی کی فرمائش؟"

"ہاں۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔ "ایک دن وہ مکار عورت میرے پاس منہ بنا کر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا۔ "بیٹی' خدا تمہارے ابو کا بھلا کرے۔ انہوں نے گاڑی دے کر بہت بڑا کام کیا ہے۔"

"جی اماں' جو کچھ بھی ان کے بس میں تھا وہ کیا ہے۔"

"لیکن بیٹا یہ تو بتاؤ ایسی گاڑی کا فائدہ کیا ہوا۔"

"کیا مطلب۔" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا فائدہ......"

"دیکھو نا بیٹا' وہ گاڑی تو فراز آفس لے کر چلا جاتا ہے اور میں رشتے داروں کے یہاں ٹیکسی اور رکشے میں جایا کرتی ہوں۔"

"تو پھر۔" میں نے غصے سے پوچھا۔ "اب کیا چاہتی ہیں آپ؟"

"بیٹی' اپنے ابو سے کہو کہ ہمارے استعمال کے لیے تو ایک گاڑی دے دیں۔ جو گاڑی دی تھی وہ تو ماشاءاللہ داماد کے کام آ رہی ہے۔ کچھ ہمارا بھی تو بھلا ہو۔"

"اماں سے!" غصے اور حیرت سے مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

## نسخ

جو آیت کسی آیت کی جگہ بہتر طور پر لے لے وہ ناسخ کہلاتی ہے۔ قرآن مجید میں اس بارے میں یوں ارشاد آیا ہے۔ "ہم اپنی کوئی آیت نہیں کرتے منسوخ، اگر ہم اسے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کی مثل لے آتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"2:6-1۔ "اور جب ہم کوئی آیت کسی آیت کی جگہ بدل دیتے ہیں اللہ ہی اس (کی مصلحتوں) کو خوب جانتا ہے، جو نازل فرماتا ہے۔"

ان سے مراد لیا گیا ہے کہ خدائے واحد نے قرآن کریم میں بعض آیتیں منسوخ کی ہیں۔ ابن عمر سے بخاری میں روایت ہے کہ دو آیتیں منسوخ کی ہیں۔ مگر ابن جریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عمر منسوخی کے قائل نہ تھے۔ اس طرح ابن عباس کے بارے میں ہے کہ وہ منسوخی کے قائل تھے اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ نہیں تھے۔

مرسلہ: سلیم درانی، کراچی

"بیٹا' میں لالچی عورت نہیں ہوں۔" اس نے کہا۔ "ہمیں نہیں چاہیے کوئی نئی گاڑی۔ کوئی پرانی ہو وہی کام آ جائے گی۔ سنا ہے اسی نوے ہزار میں اچھی خاصی مل جاتی ہے۔"

اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہو چکا تھا، اسی لیے میں بھڑک اٹھی۔ "اماں' آپ نے کیا میرے ابو کو کوئی کروڑ پتی ارب پتی سمجھ رکھا ہے۔ آپ کو تو اچھی طرح معلوم ہے کہ پچھلی گاڑی بھی انہوں نے کس طرح دی تھی۔ آپ کی بے تکی اور ناجائز خواہش کی وجہ سے میری ماں کے زیورات بک گئے ہیں۔ میرے باپ پر ہزاروں کا قرض ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود آپ ایک اور گاڑی کی فرمائش کر رہی ہیں۔ کمال ہے۔"

میری کھری کھری باتیں سن کر وہ تقریباً سکتے میں رہ گئی تھی۔ اس کو شاید گمان بھی نہیں ہوگا کہ میں اس طرح بھڑک بھی سکتی ہوں۔ وہ مکار اور بے رحم عورت اس وقت تو خاموش ہو کر چلی گئی۔ لیکن اس کے بعد اس نے میری زندگی عذاب کر دی۔ اس نے میرے ساتھ کیا کیا ستم نہیں ڈھائے

کہ میں بتا نہیں سکتی۔ اور بات اتنی تھی کہ میرا غریب باپ اس کو ایک اور گاڑی نہیں دلا سکتا تھا۔ اور جانتے ہیں، جب میرے والدین کو اس عورت کی ان حرکتوں کا پتا چلا تو میرا باپ دل کا مریض ہو کر چل بسا۔"

"چل بسا! کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے پوچھا۔

"ابو کا انتقال اسی صدمے سے ہو گیا۔" اس نے بتایا۔

"اوہ!" میں نے افسوس ظاہر کیا۔ "لعنت ہو اس عورت پر۔"

"آگے بھی سنیں۔ باپ کی موت کے بعد اس عورت نے ایک ستم یہ کیا کہ فراز کو میری طرف سے اتنا بھڑکایا کہ اس نے مجھے طلاق دے دی۔"

"پھر تو واقعی بہت ظلم ہوا ہے آپ کے ساتھ۔"

"اس عورت نے مجھ سے طلاق دلوا کر فراز کی شادی ایک ایسی لڑکی سے کروادی جس کے باپ نے اپنی بیٹی کو بغیر کہے ہوئے گاڑی دے دی تھی۔"

"کیا طلاق کے بعد آپ کی گاڑی آپ کو واپس ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ان لوگوں نے وہ گاڑی بھی رکھ لی تھی۔" عالیہ نے بتایا۔ "ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے۔ ہمارے پاس نہ تو اتنا وقت تھا اور نہ اتنے پیسے تھے کہ کورٹ اور کچہری کے چکر میں پڑتے۔ اسی لیے ہم نے ساری چیزوں پر لعنت بھیج دی۔ میرے لیے تو یہی بہت تھا کہ ایک لالچی اور خود غرض خاندان سے میری جان چھوٹ گئی تھی۔ اس وقت میں تو کچھ نہیں کر سکی تھی لیکن خدا تو نا انصاف نہیں ہے۔ اس کی گرفت تو بہت سخت ہوا کرتی ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو ضرور سزا دیتا ہے۔ ایک گاڑی نے ہی اسے ٹکر ماری اور وہ موقع ہی پر تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ گاڑی پر جان دینے والی کی جان ایک گاڑی ہی نے لے لی تھی۔"

"واقعی اس کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اب تو آپ سمجھ گئے نا کہ یہ کیا کہانی ہے۔ اب میں اس کی قبر پر جا کر گاڑیاں رکھ دیتی ہوں کہ ان گاڑیوں کو اپنی بخشش کا ذریعہ بنا۔ فرشتوں کو دکھا۔ ان کو بتا کہ اسے گاڑیوں کی شہید کہا کریں۔ بس یہ ہے میرے اس جنون کی داستان کہ میں کس طرح اس عورت کی قبر کو کھلونا گاڑیوں سے ڈھانک دیا کرتی ہوں۔ اس کی روح کو سکون پہنچانے کا اس سے اچھا طریقہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس کی قبر کے ہر طرف گاڑیاں ہی گاڑیاں ہوں۔"

اس نے اپنی کہانی ختم کر دی تھی۔

اس کے کیبن میں سناٹا چھا گیا تھا۔ کیسی عجیب کہانی تھی اس کی۔ اس دنیا میں کیسی عورتیں ہوا کرتی ہیں۔ لالچ کا مرض انہیں کس طرح لاحق ہو جاتا ہے۔

"ریحان باسط صاحب، کیسی لگی میری کہانی؟" اس نے پوچھا۔

"بہت تکلیف دہ۔" میں نے کہا۔ "یہ عورت کے کردار کا ایک نیا پہلو ہے۔"

"نیا نہیں، بہت پرانا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی شکلیں مختلف ہوں۔ لیکن اس قسم کی عورتیں ایسا ہی کیا کرتی ہیں۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بعد کیا ہونا ہے۔ میں نے چونکہ تعلیم حاصل کر لی تھی۔ اس لیے اس دفتر میں جاب مل گئی اور اب ایک تنہا زندگی گزار رہی ہوں۔"

"کیا آپ نے اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے نہیں سوچا۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں بہت تھک چکی ہوں۔"

میں اس کے پاس سے چلا آیا۔ مجھے ایک بہت اچھی کہانی مل گئی تھی۔ عالیہ نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ ایک حساس لڑکی تھی۔ اس نے بہت دکھ اٹھائے تھے لیکن زندگی سے ہار نہیں مانی تھی۔

ایک دن میں نے اسے فون کیا۔ وہ میری آواز سن کر خوش ہو گئی تھی۔ "ارے اس دن کے بعد سے کہاں غائب ہو گئے تھے کہانی نگار صاحب۔"

"عالیہ میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ پہلے مجھے کہانی سے دلچسپی تھی لیکن اب کہانی کے کردار سے بھی دلچسپی ہو گئی ہے۔"

"اوہ...!" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"اور دوسری بات یہ ہے کہ گرچہ میرے پاس صرف ایک بائیک ہے۔ لیکن مجھے گاڑی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

میرا اشارہ سمجھ کر وہ ہنس پڑی۔ اور اب ہم دونوں کئی برسوں سے ایک خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔



آغا شہمیر کی زبان سے نکلنے والے وہ تین جملے زہر میں بجھے خنجر کی طرح اس کے دل کو چیر گئے تھے۔ "کاش...... چوٹ اتنی گہری تو ہوتی کہ میں مر گئی ہوتی۔" روکنے کی لاکھ کوشش کی مگر آنسو بے قابو ہو گئے۔ وہ بھتیجے سے صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ "تم بیٹے ہو میرے پھر بھی اتنے بے زار ہو گئے، مجھے ڈلوا دو کسی خیراتی اسپتال میں۔" شہمیر نے کیا کہا وہ نہیں سن سکی، بس پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی، دل میں ایک خیال بار بار آتا کہ کیا رشتے بھی مر جاتے ہیں؟

آج پانچواں دن تھا آغا شہمیر کا ڈیڑھ سالہ بیٹا برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف دوڑا، سیڑھیوں کی اونچائی کی نسبت بچے کے قدم ننھے تھے گر جانے کا ڈر تھا۔ وہ بے اختیار بچے کو پکڑنے کے لیے دوڑی۔ بھول گئی کہ عمر کے اس دور میں جب وہ چھیاسٹھ برس کی ہو چکی ہے اس کے قدم ننھے بچے کے قدموں سے زیادہ بے توازن ہو سکتے ہیں۔ پھر اچانک ہی بچے نے اپنا رخ بدلا اپنی ماں کو آتے دیکھ کر وہ اس کی طرف پلٹ گیا۔ مگر وہ یعنی ساجدہ بی بی بچے کی محبت میں بے قرار بن بیاہی دادی اور بچے کے باپ کی پھوپی سیڑھی کے پاس قدم روک نہ پائی، تین سیڑھی نیچے صحن میں جا گری۔ ٹانگ کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹ گئی۔ ہنگامی حالت میں اسے اسپتال لے جایا گیا۔ شہر کے بڑے ماہر ہڈی جوڑ کے ڈاکٹر نے علاج کیا، پلاستر چڑھا دیا گیا۔

بہت لوگ عیادت کے لیے آئے۔ آخر کو سائیں آغا شہمیر کی پھوپی تھی بالکل ماں جیسی۔ تیسرے روز اسپتال سے گھر منتقل کر دیا گیا کہ گھر میں خدمت اور دیکھ بھال زیادہ عمدہ طریقے سے ہو سکے گی۔ آنسوؤں کی رفتار دوبارہ تیز ہو گئی۔ شہمیر کی کہی باتیں پھر سماعت میں گونجنے لگیں۔ "کون سا نوکر فرصت سے ہے جو ہر وقت تمہارے حضور ہاتھ باندھے کھڑا رہے۔ تمہارے احکامات کی تعمیل کرتا رہے۔ تمہاری بہو کو میکے جانا ہے۔ آج کل اس کے میکے میں بڑے بڑے افسروں کی دعوت ہے اور تم تو اس قابل بھی نہیں کہ حویلی کی دیکھ بھال ہی کر لو۔ مصیبت بن گئی ہو نوکروں کے لیے۔" ہائے رب آج میں اتنی ناکارہ ہو گئی ہوں۔ ہچکیوں، سسکیوں میں وہ بار بار دہرا رہی تھی۔

# ادھوری

محترم مدیر اعلیٰ

السلام علیکم!

یہ جن محترمہ کی سرگزشت ہے وہ آج بھی ہمارے محلے میں رہتی ہیں اور ان کی زندگی ہر ایک کے لیے سبق ہے اسی وجہ سے میں نے سرگزشت کے لیے لکھا کہ اس ڈائجسٹ میں سبق آموز کہانیاں ہی چھپتی ہیں۔

فاطمہ زہرا
(لاہور)

مجھ کو معلوم نہیں میرے والد کا انتقال کب ہوا تھا۔ بس جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنی والدہ کو مشین پر بیٹھے مشین کی طرح کام کرتے پایا تھا۔ کیونکہ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا اس لیے میری ماں نے مجھے اسکول میں داخل کروادیا تھا لیکن میں اپنے گھر کے حالات دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا۔ جب میں نویں کلاس میں آیا تو مجھے ایک ٹیوشن مل گئی۔ چونکہ میں خود ایک اچھا طالب علم تھا اس لیے جلد ہی مجھے کچھ اور ٹیوشنز مل گئیں کہ نہ صرف میں اپنا خرچہ خود اٹھانے لگا بلکہ تھوڑے بہت پیسے گھر پر بھی دینے لگا۔ میں کیونکہ بہت زیادہ حساس واقع ہوا ہوں اس لیے گھر کے حالات سے نظریں نہیں پھیر سکتا تھا۔ میں نے مائیکرو بائیولوجی میں ایم ایس سی کرلیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے مارکیٹنگ میں ایم بی اے میں داخلہ لے لیا۔ جیسے ہی میں تعلیم سے فارغ ہوا ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی میں میڈیکل ریپ کی پوسٹ مل گئی جہاں پر مجھے بہترین تنخواہ کے ساتھ ساتھ موٹر سائیکل بھی مل گئی۔ اب میں نے اپنی ماں کو کام

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

اس بار میں اپنے ایک دوست کی کہانی لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اس نے کس طرح ایک یرغمال بیوی کو آزاد کرایا یہ خود میں تعریف کے قابل ہے۔ مرد شادی کے بعد خود کو ہر حال میں برتر رکھنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے خواہ وہ اس کا اہل ہو یا نہ ہو۔ امید ہے یہ کاوش آپ کو بھی پسند آئے گی۔

سہیل جعفری

(کراچی)

# یرغمال

آج ساجدہ بی بی کو وہ سب یاد آرہا تھا جو اس نے اس طرح بھلا دیا تھا جیسے سلیٹ پر لکھے کو بچے گیلے کپڑے سے مٹا دیتے ہیں۔ آنسوؤں کے سمندر میں بہتی وہ چونتیس سال پیچھے جا پہنچی۔

دو بھائیوں کی ایک ہی بہن، بڑی لاڈلی بڑی پیاری۔ خوبصورتی اللہ نے بخشی، خوب سیرتی ماں کی تربیت اور فطرت سے ملی۔ باپ اور بھائی سب ہی اس کو چاہنے والے۔ جوان ہوئی تو رشتہ چچا کے بیٹے سے طے پایا۔ نواب شاہ سے دادو تک پھیلی زمینوں اور باغات کے مالک گل زمان آغا نے آسانی سے یہ رشتہ بھائی کے گھر نہیں کیا تھا۔ شاہ زمان آغا نے بڑے بھائی کے در کے اتنے پھیرے لگائے تھے کہ چوکھٹ گھس گئی۔ تب یہ رشتہ مل سکا تھا۔ ساجدہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے نور زمان چچا کے گھر بہانے بہانے سے جا پہنچتا۔ چچا، چچی کو خوش رکھنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا اور آخر کامیاب ہو ہی گیا۔

حویلی سے ایک ایک فرلانگ دور تک کا علاقہ روشنی سے بقعۂ نور بنا، رات میں بھی دن کا سماں پیش کر رہا تھا۔ کئی دن پہلے سے تقریبات کا آغاز ہو چکا تھا۔ بڑے بیٹے اور لاڈلی بیٹی ساجدہ کی شادی ایک ساتھ کی جارہی تھی۔ ماں کو صرف یہی فکر تھی کہ کوئی کمی نہ رہ جائے۔ ہر روز نئے سرے سے یہ سوال اٹھتا کہ جہیز میں کچھ کمی تو نہیں رہ گئی۔ مہمانداری میں کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی، کوئی ایسا تو نہیں رہ گیا جہاں دعوت نامہ نہ پہنچا ہو۔

آخر وہ دن آگیا، بڑے بیٹے کی برات حیدرآباد روانہ ہوئی۔ دھوم دھام سے دلہن بیاہ کر گھر آگئی۔ اگلے روز بیٹے کا ولیمہ اور ساجدہ کی برات تھی۔ برات آگئی۔ گردونواح کے تمام چھوٹے بڑے زمیندار شادی میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے افسران نے آکر تقریب کو چار چاند لگا دیے۔ محفل کی رونق بڑھانے کو حیدرآباد کے بازارِ حسن سے مہنگی ترین رقاصہ بلائی گئی۔

دولھا سندھ کے روایتی لباس میں بڑی شان سے گھوڑے سے اترا، ولیمے والا دولھا آنے والے دولھا سے گلے ملا اور دونوں بڑی شان سے مسند نشین ہوئے۔

سازندے تیار بیٹھے تھے اور رقاصہ اشارے کی منتظر تھی۔ بڑی ادا سے اٹھی اور دولھا کے سامنے پہنچ کر استقبالی آداب کیا اور اجازت چاہی۔ سر کی معمولی جنبش سے اجازت دے دی گئی۔ ساز بج اٹھے، گھنگروؤں کی جھنکار کے ساتھ رقص شروع ہوگیا۔

دولھا نور زمان آغا جو بچپن سے آج تک صرف ساجدہ کو چاہتا تھا، ساجدہ کو مانگتا تھا ناچتی رقاصہ کے رقص میں ایسا محو ہوا کہ نظریں ہٹانا بھول گیا۔ وڈیرے گل زمان نے ہاتھ کے اشارے سے رقص رکوایا اور قاضی صاحب کی طرف دیکھ کر نکاح کے لیے اشارہ کیا۔

گھنگروؤں کی جھنکار کا رکنا تھا تو وہ ہوا جو کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ کوئی سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ دولھا نے اچانک اٹھ کر رقاصہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور سامنے بٹھا دیا پھر تحکمانہ انداز میں قاضی سے کہا۔ "نکاح پڑھاؤ قاضی مگر اس لڑکی سے"۔

دولھا اور دلہن دونوں کے باپ ایک ساتھ چیخ پڑے۔ "کیا کہہ رہا ہے تو"

"میری شادی میری پسند سے ہوگی۔ یہ لڑکی مجھے پسند ہے"۔

دولھا نے اس انداز سے کہا کہ محفل میں سناٹا چھا گیا۔ محفل اجڑ گئی۔ خوشیاں خاک میں مل گئیں۔ برات لوٹ گئی۔ نہ لوٹتی تو لوٹا دی جاتی۔ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیا ہوا؟ اور جواب سب کی طرف سے یہی کہ "اللہ کی مرضی"۔

پھر وہی ہوا۔ جائداد جاگیر کے لیے ایک لڑکی پھر پتھر کی بنا دی گئی۔ بیٹی کے حصے کی جائداد اگر چچا کے گھر جاتی تو گھر میں رہتی۔ پرائے لوگوں کو کیسے حصے دار بنایا جاسکتا ہے۔ اس کا حل سوچا جانے لگا۔ آخر باپ اور بھائیوں نے فیصلہ کرلیا۔ ایک سال بعد ساجدہ کا نکاح قرآن شریف سے پڑھا دیا گیا اور نکاح کے چار مہینے بعد بڑے بھائی کا ڈیڑھ ماہ کا بیٹا اس کی گود میں ڈال دیا گیا۔ وہ ڈیڑھ ماہ کا شمیر اس کا وارث قرار پایا۔

محبت میں اندھی ساجدہ نے سب کچھ بھتیجے کے نام کردیا۔ ساجدہ کا جینا، سونا جاگنا سب شمیر کے نام وقف ہوگیا۔ وہ بھی اس سے اتنا مانوس تھا کہ وہ ماں سے بڑھ کر ماں بن گئی۔ بچے کے پیار اس کی ہر خوشی میں وہ یہ بھول گئی کہ بچہ اس کا نہیں اس کے بھائی کا ہے۔ اٹھائیس برس گزر گئے۔ بڑے ارمانوں سے وہ اس کی دلہن بیاہ کر لائی اور پھر دادی بھی بن گئی۔ پوتا ڈیڑھ برس کا ہوگیا۔

اسی ڈیڑھ برس کے بچے کو گرنے سے بچانے کی کوشش میں خود برآمدے سے نیچے گری اور......

اور آج وہی راج دلارا، وہی پیارا جس کی ماں نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو اس کی ماں سمجھتی رہی اس کے پاس کھڑا کہہ رہا ہے۔

"کسی نوکر کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ ہر وقت تمہارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہے اور تمہارے احکامات کی تعمیل کرتا رہے۔"

"ہائے میرے رب! میں ماں بنی وہ بھی ادھوری۔"

کرنے سے قطعی منع کر دیا اور دن رات خوب محنت کرنے لگا۔ کیونکہ ہماری جاب ڈاکٹروں کے کلینک اور اسپتال کے اوقات کار کے ساتھ شروع ہوتی ہے اس لیے مجھ کو دن کے علاوہ رات کو بھی وزٹ کرنا پڑتا تھا۔ ہماری جاب کی ایک ریکوارمنٹ یہ بھی ہے کہ ہم اچھا اور صاف ستھرا لباس پہنیں، ٹائی لگائیں اور پرفیوم اسپرے کریں۔ میں یہ باتیں آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ میری جاب کی نیچر بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ خیر مجھے جاب کرتے ہوئے دس ماہ ہی ہوئے تھے کہ ہماری کمپنی سالانہ کانفرنس کے لیے ہمیں سری لنکا لے گئی۔ وہاں کانفرنس میں مجھ سمیت پانچ لڑکوں کو ان کی بہترین پرفارمنس اور تعلیمی معیار کی بنیاد پر فیلڈ منیجر بنا دیا گیا (اس تمام عرصے میں میں نے ایم بی اے مکمل کر لیا تھا) جبکہ فیلڈ منیجر سے زونل سیلز منیجر بننے کے لیے مجھے مزید تین سال انتظار کرنا پڑا۔ میری پرفارمنس سے میرے مارکٹنگ منیجر بہت خوش تھے اور وہ اکثر مجھے اپنے گھر بھی بلاتے رہتے تھے۔ میری عمر اس وقت تقریباً ستائیس سال ہو چکی تھی اور میری والدہ کو میری شادی کی بہت فکر رہتی تھی مگر مجھے اپنی تین جوان بہنوں کی زیادہ فکر تھی۔ دو بہنوں کی منگنی ہو چکی تھی اور تیسری بہن کی بات چیت چل رہی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ دو بہنوں کی شادی ایک ساتھ کر دوں گا اور تیسری بہن کی شادی اپنے ساتھ کروں گا۔ اس تمام عرصے میں جبکہ میری اچھی نوکری ہو گئی تھی میں نے ایک کام یہ کیا تھا کہ اپنی بہنوں کے لیے ایک اچھی لیڈی ٹیوٹر کا بندوبست کر دیا جو انہیں گھر آ کے پڑھاتی تھیں۔ اس طرح میری تینوں بہنوں نے پرائیویٹ گریجویشن کر لیا تھا۔

میری جاب اس طرح کی تھی کہ جب میں دورے پر ہوتا تھا تو مجھے کئی کئی دن گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ پورے سندھ اور بلوچستان کے تمام علاقے میرے انڈر میں تھے اور میں مہینے میں پندرہ دن سے زیادہ باہر ہی رہتا تھا۔ میں بچپن ہی سے گھر کے کھانے کا عادی تھا اس لیے ہوٹل کا کھانا مجھے ٹھیک طرح ہضم نہیں ہوتا تھا۔ اگر کبھی کبھار کا معاملہ ہوتا تو میں برداشت بھی کر لیتا مگر آدھے مہینے سے زیادہ ہوٹل کا کھانا میرا پیٹ قطعی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ مجھے کمپنی کی طرف سے اجازت تھی کہ میں بڑے سے بڑے ہوٹل میں بھی کھانا کھا سکتا تھا۔ مگر میں اپنی عادت سے مجبور تھا اسی لیے میں نے اپنی کمپنی سے بات کی کہ میں اپنے کھانے کا انتظام کر لوں گا مگر میں بل نہیں پیش کر سکوں گا اس لیے مجھے ایک فکسڈ اماؤنٹ دلا دیا جائے تاکہ میں جہاں انتظام کروں وہاں پے منٹ کر دوں۔ کمپنی کی طرف سے اجازت ملنے کے بعد میں نے مختلف میڈیکل ریپ سے بات کی اور اپنا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا۔ اس طرح تقریباً ہر شہر میں مناسب پیسوں میں میرے کھانے پینے کا انتظام ہو گیا بعض میڈیکل ریپس تو پیسے بھی نہیں لے رہے تھے۔ مگر میں نے ان سے کہا کہ بھائی یہ پیسے میں اپنی جیب سے نہیں دے رہا بلکہ کمپنی ادا کر رہی ہے تو یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ سکھر کے ایک میڈیکل ریپ نے میرے لیے رہنے کا بھی انتظام کر دیا کہ آپ کو ہوٹل میں اتنا آرام نہیں ملے گا جتنا کہ اس گھر میں۔

سکھر میں گھنٹا گھر کے قریب ہی ان کا گھر تھا صرف دو میاں بیوی تھے اور اچھا خاصا بڑا گھر تھا۔ ایک کمرا انہوں نے میرے لیے خالی کر دیا جس میں اٹیچ باتھ بھی تھا۔ میں نے بازار سے ایک بیڈ، کولر، میز کرسی وغیرہ لے لیے تھے۔ اس کمرے کا ایک دروازہ گھر میں کھلتا تھا' جبکہ دوسرا باہر کھلتا تھا جس میں' میں نے اپنا تالا ڈال دیا تھا۔ اس طرح میرا جب دل چاہتا آتا اور جب مجھے جانا ہوتا کمرا لاک کر کے چلا جاتا تھا۔ میرے جانے کے بعد میرے کمرے کی صفائی ہوتی تھی اس لیے مجھے کبھی کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کھانا بہت لذیذ ہوتا تھا اور جیسے ہی میں آتا تھا گرم روٹی کے ساتھ کھانا مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ جب میرا موڈ ہوتا تھا میں دروازہ بجا کر چائے بھی مانگ لیتا تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ میں ادائیگی کیا کرتا تھا' میری ادائیگی کے عشر عشیر بھی نہیں جو آرام اور سکون مجھے وہاں میسر تھا۔ جہاں میں ٹھہرا تھا اس کا شوہر کسی فیکٹری میں نائٹ انچارج تھا اور وہ صبح دس بجے تک آیا کرتا تھا اور وہی وقت میرے گھر سے نکلنے کا ہوتا تھا۔ میرے سکھر والے میڈیکل ریپ کی بہن اس شخص منہاج سے بیاہی گئی تھی اور کیونکہ میں اس کے بھائی کا باس تھا اس لیے اس کی بہن میری بہت خدمت کرتی تھی۔ میں نے اب تک ایک آدھ بار کے علاوہ کبھی اس کی جھلک نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی میں اس قسم کا انسان ہوں کہ تاکا جھانکی کروں۔ ایک رات میں نے کھانا کھانے کے بعد چائے پینے کی خواہش ظاہر کی کیونکہ مجھے پورے ہفتے کی رپورٹ مکمل کر کے بھیجنی تھی اس لیے چائے کا کہہ کر میں میز پر بیٹھ کر اپنا کام کرنے لگا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ کتنی دیر گزر چکی ہے کیونکہ میں اپنے کام میں منہمک تھا۔ اچانک



مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے برابر میں کھڑا ہوا ہے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو ایک انتہائی حسین لڑکی میرے پاس کھڑی تھی' اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور ہکلاتے ہوئے کہنے لگا" آپ نے خوامخواہ زحمت کی مجھے بلا لیا ہوتا۔ اس نے جواب دیا کہ میں کافی دیر سے دروازہ بجا رہی تھی لیکن آپ کام میں مصروف تھے۔

یہ میری پہلی مختصری بات چیت اور ملاقات تھی۔ وہ چائے رکھ کر چلی گئی اور میں رپورٹ مکمل کرنے میں مشغول ہو گیا اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ وہ دروازہ کھول کر خود ہی کھانے کی ٹرے لانے لگی اور چائے پہنچانے لگی۔ میں بہت واجبی سی شکل کا انسان ہوں مگر مجھے کپڑے پہننے کا ڈھنگ ہے اس لیے لباس پہن کر میں کافی ٹھیک ٹھاک لگنے لگا ہوں۔

کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے کوئٹہ جانا پڑا پھر وہاں سے بلوچستان کے دیگر علاقوں کا دورہ بھی معمول کے مطابق ہوا اور واپسی پر مجھے تین دن تک کانفرنس میں شرکت کرنا پڑی۔ اس سے فارغ ہوا تو مجھے سکھر جانا تھا مگر والدہ کی بیماری کی وجہ سے نہ جا سکا اور تقریباً ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ پھر میں اپنے شیڈول کے مطابق سکھر پہنچا تو کافی رات ہو چکی تھی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میرے پاس کمرے کی چابی ہوتی تھی تو میں نے اپنا کمرا کھول کر سامان رکھا اور لائٹ جلائی تو میں حیران رہ گیا کیونکہ میرے بیڈ پر نسرین (منہاج کی بیوی کا نام نسرین تھا) سو رہی تھی۔ ابھی میں کھڑا پریشان ہی ہو رہا تھا کہ اب میں کیا کروں، کسی ہوٹل کا رخ کروں یا کرسی پر بیٹھ کر باقی رات بتاؤں کہ نسرین کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور جلدی سے اندر چلی گئی۔ میں بہت دیر تک حیران و پریشان کھڑا رہا پھر میں لباس بدل کر بستر پر لیٹ گیا جو کہ اب بھی اس کے وجود کی وجہ سے مہک رہا تھا۔

صبح ناشتے کے وقت اس نے مجھ سے پوچھا کہ اس بار بہت دن لگا دیے آنے میں۔ میں روز آپ کا انتظار کرتی تھی اور کل بھی میں انتظار کرتے کرتے آپ کے بیڈ پر ہی سو گئی تھی۔ مجھے ایک سرشاری کا احساس ہوا کہ کوئی میرا بھی انتظار کرتا ہے لیکن پھر یہ سوچ کر شرم محسوس ہونے لگی کہ میں ایک شادی شدہ عورت کے بارے میں ایسا سوچ رہا ہوں۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ میں اس کی بات کا کوئی جواب دوں اس لیے خاموشی سے ناشتا کرنا شروع کر دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک تو میرے جواب کا انتظار کرتی رہی پھر کہنے لگی "آپ ناراض ہیں کیا مجھ سے۔"

میں ایک دم بوکھلا گیا "میں آپ سے کس رشتے سے ناراض ہونے لگا۔"

یہ جملہ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا تھا بعد میں مجھے اس کی سنگینی کا احساس بھی ہوا تو میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ نسرین ہلکے ہلکے مسکرا رہی تھی۔ پھر وہ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہری کیونکہ یہ وقت اس کے شوہر کے آنے کا تھا اور میں بھی تیار ہو کے باہر نکل گیا۔ دوپہر کو کھانے کے لیے آیا اور جب دروازہ بجایا تو کوئی بھی نہیں آیا۔ میں نے کئی بار کوشش کی مگر جب کوئی نہیں آیا تو مجبوراً مجھے ہوٹل سے کھانا کھانا پڑا۔

رات میں' میں ذرا دیر سے گھر آیا۔ فریش ہو کر میں نے دروازہ بجایا تو پھر کوئی جواب نہیں آیا۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی کہ یہ کیا ماجرا ہے جب کئی بار دروازہ بجانے پر بھی کوئی نہیں آیا تو میں اندر داخل ہو گیا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میں اندر جا رہا تھا اس لیے مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اندر کمرے کس رخ پر بنے ہوئے ہیں۔ بہرکیف اندر داخل ہونے کے بعد پہلے کمرے میں گیا تو وہ خالی تھا۔ اس طرح ہر کمرا دیکھ لیا مگر پورے گھر میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا' میں پھر ہوٹل گیا کھانا کھایا اور آ کر سو گیا۔

اب مجھے صبح ناشتے کی فکر تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ کیا ہوا تھا۔ آخر نسرین گھر اس طرح چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی۔ یہ وہ سوالات تھے جنہوں نے مجھے رات بھر پریشان رکھا۔ صبح میں نے ناشتا باہر کیا تھا۔ پھر میں نے اس میڈیکل ریپ کو بلوایا اور اس سے پوچھا کہ اس کی بہن کہاں ہے تو پتا چلا کہ اس کی بہن اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ میں نے مزید پوچھا کہ کیا بات ہو گئی۔ لیکن وہ بیچارہ کچھ بھی نہیں بتا سکا کہ اس کی بہن کیوں گھر آ گئی۔ اب مجھے یہ پریشانی لاحق ہو گئی کہ میں کھانا کہاں کھاؤں گا۔ میں یہ بات پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ہم ایک جگہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ روز ہی ٹھہرتے ہیں پھر ہم دوسرے شہر چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح سے سکھر میں بھی میرا قیام تین سے چار دن رہتا تھا اور میں پیسے پورے مہینے کے ادا کرتا تھا تاکہ مجھے کوئی پریشانی نہ ہو۔ اب میرے لیے نئی پریشانی کھڑی ہو گئی تھی اور اس کا تذکرہ میں نے یعقوب سے بھی کر دیا (سکھر کا میڈیکل ریپ) اس نے کہا کہ سر آپ میرے گھر تینوں وقت کا کھانا

کھالیں اور سونے وہیں چلے جایا کریں، اس طرح آپ کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ مجھے بھی صرف کھانے کی فکر تھی اس لیے میں باقی دن وہیں کھاتا رہا اور یعقوب کے منع کرنے کے باوجود بھی ادائیگی کردی۔ اس تمام عرصے میں نسرین سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ اب اس گھر سے مجھے عجیب سی وحشت ہونے لگی تھی اور میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے واپسی پر میں نے یعقوب کو بلایا اور چابی اس کے حوالے کی تو اس نے کہا کہ چابی اپنے پاس رکھیں کیونکہ باجی ایک دو دن میں اپنے گھر واپس جانے والی ہیں۔

جب سے میں سکھر سے واپس آیا تھا میری عجیب کیفیت تھی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ کیا مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے لیکن وہ تو ایک شادی شدہ عورت ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

میری کیفیت اسی شعر کے مانند تھی۔ میں نے ایک ہفتے کی چھٹی لی اور اپنی گاڑی میں سکھر روانہ ہوگیا۔ سکھر پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ میرے کمرے کی صفائی کی گئی ہے۔ میں ابھی کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ نسرین اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور مجھ سے پوچھنے لگی کبھی تو اتنا انتظار کراتے ہیں کہ آدمی انتظار میں ہی سوکھ جائے اور کبھی اتنی جلدی واپسی کہ ایک ہی ہفتے میں واپس آگئے۔ ویسے میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے جاتے وقت آپ کو اطلاع نہیں دی اور آپ کی خدمت بھی نہ کرسکی۔ میں نے نسرین سے کہا کہ آپ میرے پاس کچھ دیر بیٹھ سکتی ہیں۔ میں اس بار صرف آپ کی خاطر آیا ہوں۔ نسرین تھوڑی دیر کے لیے حیران ہی رہ گئی اور پھر یوں گویا ہوئی۔ ”آپ صرف میری خاطر آئے ہیں، آپ مجھے اس قدر اہمیت دے رہے ہیں، آخر کیوں؟“

میں نے کہا کہ آپ کچھ دیر بیٹھ جائیں تاکہ میں آپ سے تفصیل سے بات کرسکوں۔

میرے کہنے سے وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی کہ اگر آپ برا نہ مانیں تو پہلے مجھے کچھ باتیں کرنے دیں پھر آپ اپنی بات کیجیے گا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ آپ پہلے بات کرلیں۔ نسرین نے مجھے بتایا ”میں اپنے اسکول کی بہترین طالبات میں سے تھی اور میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی مگر ہمارے حالات حد سے زیادہ ہی خراب تھے۔ نجانے میں کیسے اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے تھی کیونکہ صرف میرے والد کمانے والے تھے اور ہم سات افراد کھانے والے تھے۔ میں سب سے بڑی تھی اور مجھ سے چھوٹا بھائی جو آج کل آپ کے ساتھ کام کررہا ہے وہ بھی اسکول میں پڑھ رہا تھا اور اس کی تعلیم مجھ سے زیادہ ضروری تھی۔ اس لیے میرے والد نے مجھے میٹرک کے بعد گھر بٹھالیا اور گریجویشن میں نے پرائیویٹ کیا۔ جب میں بی اے کررہی تھی تو میرے بہت سے رشتے آئے اور ان میں سب سے اچھا رشتہ میرے والدین کو منہاج ہی کا لگا۔ کیونکہ ان کا ذاتی گھر تھا۔ اچھی آمدنی تھی اور ماں کے علاوہ کوئی دوسرا قریبی رشتے دار بھی نہیں تھا۔ یہی سب دیکھتے ہوئے میرے والدین نے میری شادی منہاج سے کردی اور میں دلہن بن کر اس گھر میں آگئی۔ پہلی رات بہت ارمانوں والی رات ہوتی ہے، دولہا اور دلہن دونوں کے لیے لیکن میرے سارے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔ میں ان کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی اور جب میں نے تھک کر تھوڑی دیر کے لیے ٹیک لگائی تو مجھے کچھ علم نہیں رہا کہ میں کہاں گئی۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ یہ کرسی پر بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں اور ایش ٹرے پوری سگریٹ سے بھری ہوئی ہے۔ میں ایک دم سیدھی ہوکر بیٹھ گئی اور دل ہی دل میں شرمندہ ہورہی تھی کہ نجانے یہ رات کے کس پہر آئے تھے اور مجھے سوتا دیکھ کر ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں اسی کمرے میں تھی جہاں اس وقت آپ ہیں۔ میں اٹھ کر باتھ روم گئی اور منہ دھوکر واپس آگئی پھر میں بیڈ پر بیٹھ کر انتظار کرتی رہی لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں میرے وجود کا احساس تک نہیں ہے۔ آخر بہت دیر بعد مجھ سے گویا ہوئے کہ نسرین تم باتھ روم جاؤ اور نہا کر آجاؤ کیونکہ امی اب دروازہ بجانے والی ہیں۔ میں حیران رہ گئی کہ نہانے کی ضرورت ہی نہیں ہے تو میں کیوں نہاؤں۔ جب میں کافی دیر یونہی بیٹھی رہی تو یہ اٹھ کر میرے پاس آئے اور میرے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور رونے لگے کہ مجھے معاف کردینا۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں تمہارے ہی کیا کسی کے بھی قابل نہیں ہوں۔ اب میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم چاہو تو ابھی سب کو بتادو اور نہیں تو میں تمہارا احسان مند رہوں گا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اب تم فوراً نہالو اور یہی بتانا کہ رات خیریت سے گزری۔

اب ان کا عیب چھپاتے چھپاتے کئی سال ہوچکے ہیں اور میں گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہوں اور یہ



بات اپنے والدین سے بھی چھپائی ہوئی ہے۔ میری ساس اپنے پوتے پوتی کی آس لگائے اس دنیا سے گزر گئیں اور اسی طرح میری والدہ بھی اکثر مجھ سے پوچھتی رہتی ہیں، اب انہیں شک سا ہوگیا ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ انہوں نے کئی بار مجھ سے پوچھا بھی مگر میں ان سے جھوٹ بولتی آرہی ہوں۔ اس دن بھی منہاج سے لڑ کر میں اس لیے چلی گئی تھی کہ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ یہ کراچی والا (یعنی کہ آپ) جب آتے ہیں تو میں رات کی ڈیوٹی پر ہوتا ہوں تو تم اپنی پیاس اس سے بجھالیا کرو اور اگر تمہارا کوئی بچہ ہوگیا تو میں اسے اپنا نام دے دوں گا۔ یہ بات مجھ سے برداشت نہیں ہوئی اور میں ان سے لڑ کر چلی گئی۔ لیکن یہ مجھے منا کرلے آئے۔ اب میں اس زندگی سے تنگ آگئی ہوں اور میں منہاج سے چھٹکارا حاصل کرکے کسی دوسرے شخص سے شادی کرنا چاہ رہی ہوں۔ میں نے آپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور مجھے احساس ہے کہ میں دل ہی دل میں آپ سے پیار کرنے لگی ہوں۔ گوکہ یہ بات مجھے زیب نہیں دیتی کہ میں خود سے یہ بات کروں لیکن میں کیا کروں میں بہت مجبور ہوں۔ میں کوئی گری پڑی لڑکی نہیں ہوں کہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے اِدھر اُدھر منہ ماروں۔ دوسرے یہ کہ میں نے آپ کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی پڑھ لی ہے اور مجھے امید ہے کہ آج آپ یہی بات کرنے میرے پاس آئے ہیں۔

میں نے جواب دیا کہ تم نے میرے دل کی بات کہہ کر میری بہت بڑی مشکل آسان کردی ہے ورنہ میں پریشان تھا کہ میں کس طرح تم سے اپنے دل کی بات کہہ سکوں گا۔ شاید اسی کو کہتے ہیں کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جائے۔ منہاج کیونکر طلاق دے گا۔ دوسرا مسئلہ میرے گھر والوں کا بھی تھا کہ ان کو کیسے منایا جائے۔ میری چھوٹی بہن مجھ سے بہت زیادہ قریب ہے اس لیے میں نے اس کے ذریعے والدہ کو کہلوادیا کہ میں کہاں شادی کرنا چاہ رہا ہوں۔ میری والدہ نے مجھے بلایا تو میں نے ایک ایک بات ان کے گوش گزار کردی، کچھ بھی نہیں چھپایا۔ والدہ کا کہنا تھا کہ تم جہاں کہو گے وہیں تمہاری شادی ہوگی۔ لیکن ایک بار نسرین کے شوہر سے مل کر اس کی تصدیق تو کرلو۔ میں نے جواب دیا کہ امی وہ شخص اپنی خامی کو کبھی بھی ظاہر نہیں ہونے دے گا اور سارا الزام نسرین کے سر پر ہی ڈال دے گا۔

اب دوسرا مرحلہ منہاج سے بات کرنے کا تھا۔ میں

## نجف اشرف

عراق میں کوفہ سے چھ میل مغرب کی جانب ایک گاؤں اور عبادت گاہ۔ کوفہ کے قریب واقع ہے۔ یہ دریائے فرات کے قریب ہی ہے۔ یہیں بمطابق روایات نجف کا گاؤں آباد ہوا اس لیے اسے نجف الکوفہ بھی کہا جاتا ہے۔ ابن بطوطہ 726ھ میں یہاں آیا تھا، یعقوبی کے مطابق ایک زمانے میں النجف کی جگہ ساحل سمندر ہوا کرتا تھا۔ ابن بطوطہ کے مطابق یہ عراق کا ایک اہم شہر ہے اور یہاں کی آبادی بیس ہزار کے لگ بھگ ہے جن میں ایرانی اور عربی شامل ہیں۔ ابن بطوطہ کے مطابق یہاں حضرت نوحؑ اور حضرت آدمؑ کے مقابر بھی ہیں۔ حضرت علیؑ کا مزار مبارک بھی یہیں ہے جس کی زیارت کو بہت سے لوگ آتے رہتے ہیں۔ یہاں بہت نہریں اور جھیلیں بنائی گئی ہیں جو بعد میں خشک ہوگئیں۔ پرانے نقشوں میں اب بھی ان کے آثار ملتے ہیں۔

## نجم الدین کبریٰ

خاندان کبرویہ کے سردار۔ حیات رواں 504ھ تا 618ھ رہی۔ نام ”احمد“ کنیت ابوالخباب اور کبریٰ لقب تھا۔ والد کا نام عمر بن محمد بن عبداللہ جنوبی تھا۔ سلطان سنجر کے زمانے میں پیدا ہوئے۔

لوگ آپ کو شیخ ولی تراش بھی کہتے ہیں۔ لقب کی وجہ تحصیل علم و مناظرہ کا شوق بتایا جاتا ہے اور دوسرے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ غلبات وجد میں جس کسی پر آپ کی نظر پڑتی وہ درجہ ولایت کو پہنچ جاتا۔ مولانا رومؒ کا یہ شعر بھی انہی کے بارے میں ہے۔

یک نظر فرما کہ مستغنی شوم زا بنائے جنس
سگ کہ شد منظور نجم الدین سگاں را سرور است

شیخ صاحب نے ابتدا میں کتاب شرح السنہ پڑھی۔ بعدازاں خوزستان پہنچے اور وہاں شیخ اسماعیل کے مرید ہوگئے۔ یہ سماع کے قائل تھے اس لیے آپ بھی بوجوہ یہاں کے محفل سماع میں شریک رہتے۔ وہیں شیخ عمارؒ سے بھی فیض حاصل کیا۔ بعد میں انہی کے حکم پر مصر چلے گئے۔ وہاں شیخ روزبہان کی خانقاہ میں ٹھہرے۔ یہیں آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ روزانہ بہت سے افراد آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے۔ آپ کے نامور مریدوں میں شیخ مجدالدین بغدادی، بابا کمال حموی، شیخ جمال الدین گیلی، شیخ نجم الدین رازی، شیخ سعد الدین حموی وغیرہ شامل ہیں۔ شیخ مجدالدین بغدادی نے تحفۃ البررہ نامی کتاب میں آپ کی ملفوظات محفوظ کردی ہیں۔ جب تاتاری، شاہ محمد خوارزم کی تلاش میں آپ تک پہنچے تو آپ نیزا تھام کر لڑے مگر ایک تیر آپ کے سینے میں لگا جس سے جانبر نہ ہوسکے اور شہید ہوئے۔

مرسلہ: خولہ عطاری، میرپورخاص

اپنے معمول کے دورے پر سکھر گیا اور خاص طور پر منہاج سے بات چیت کرنے کے لیے اس کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر بیراج پر لے گیا۔ وہاں میں نے منہاج سے بات چیت شروع کی لیکن مجھے احساس ہوا کہ مجھے بات چیت کرنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ حیران کن تھی کہ میں منہاج سے صرف ایک بار ملا تھا جب کمرے کی بات چیت کی تھی تب، اس کے بعد سے اب تک ہمارے درمیان کبھی کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ سب کچھ یعقوب کے ذریعے انجام پاتا تھا۔

اس لیے منہاج بھی بہت حیران تھا مگر وہ بھی جہاں دیدہ آدمی تھا اور مجھ سے بہت کرید کرید کر سوال کر رہا تھا اور میں بہت محتاط انداز میں جواب دے رہا تھا۔ آخر میں نے منہاج سے ایک دم ہی کہہ دیا کہ منہاج تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو اور اسے آزاد کر دو۔ یہ بات سن کر منہاج اس طرح اچھلا گویا بم پھٹ گیا ہو اور اس نے نہایت بدتمیزی سے مجھ سے کہا۔ ”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ میں اپنی بیوی کو طلاق کیوں دوں؟ کیا اس نے تم سے کہا ہے کہ اسے طلاق دلواؤ؟ یاد رکھو مجھے اپنی بیوی سے بہت محبت ہے اور میں اسے ہرگز طلاق نہیں دوں گا۔ تم ہوتے کون ہو ہمارے ذاتی معاملات میں دخل دینے والے۔ تم صرف ایک پے انگ گیسٹ ہو اور اس حد سے آگے نہیں بڑھو اور ہاں اب تم میرے گھر میں نہیں رہ سکتے فوراً اپنا سامان اٹھاؤ اور رفو چکر ہو جاؤ۔“

میں نے بہت تحمل سے منہاج کی بات سنی اور اس سے کہا۔ ”خالی محبت سے کچھ نہیں ہوتا شوہر اور بیوی میں تب تک محبت پروان نہیں چڑھتی جب تک وہ دونوں ایک دوسرے کے جسمانی تقاضوں کو پورا نہ کریں۔“

”اوہو! تو گویا نسرین نے تم کو سب کچھ بتا دیا ہے حالانکہ میں نے اسے اپنی جان کی قسم دی تھی۔ میں نے اس سے پہلی رات ہی کہہ دیا تھا کہ یہ شادی میں نے اپنی والدہ کی وجہ سے کی ہے۔ میری والدہ نے مجھے قسم دی تھی کہ اگر میں نے شادی نہیں کی تو وہ مجھے دودھ نہیں بخشیں گی۔ انہوں نے اپنا دوپٹا میرے قدموں میں ڈال دیا تھا اس لیے میں مجبور ہو گیا تھا اور میں نے نسرین سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر تم نے یہ بات کسی کو بتائی تو میں خودکشی کرلوں گا اور میں اپنا علاج کرا رہا ہوں۔ بہت جلد صحت یاب ہو جاؤں گا۔“

میں نے جواب دیا ”نسرین نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ تم اپنا علاج کروا رہے ہو لیکن جب پانچ سال میں کچھ نہیں ہوا تو اب کیا ہوگا۔ اس نے تمہارے لیے بہت بڑی قربانی دی ہے اور میرے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی کو بتانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ لیکن اگر تم نے اسے آزاد نہیں کیا تو وہ عدالت سے رجوع کرے گی اور تمہارا میڈیکل چیک اپ پوری پول کھول دے گا۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ فوری طور پر نسرین کو طلاق دے دو۔ تمہارے پاس ایک جواز یہ ہے کہ نسرین بانجھ ہے اور آج تک تمہیں اولاد کی نعمت نہیں دے سکی تاکہ تمہارا بھرم رہ جائے۔“

اب منہاج خوشامدوں پر اتر آیا کہ مجھ پر رحم کرو۔ میں بہت مجبور ہوں۔ میں نے جواب دیا۔ ”رحم تم کرو نسرین پر۔ اب اس کے صبر کو اور مت آزماؤ۔ آخر اس کی بھی کچھ خواہشات ہیں۔“

منہاج کہنے لگا ”تو میں نے اسے کب روکا ہے کہ وہ اپنی ضروریات تم سے پوری کر سکتی ہے لیکن میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔“

مجھے منہاج کی ذہنیت پہ بہت غصہ آیا اور میں نے اس کی خوب خبر لی۔ میں نے کہا ”تم اپنی بیوی کو مجبور کر رہے ہو کہ وہ حرام کاری کرے۔ تم کو ڈوب مرنا چاہیے۔ تم اس قدر گندی سوچ کے حامل ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری بے عزتی نہ ہو اور تمہارا راز راز ہی رہے تو آج ہی گھر جا کر نسرین کو طلاق دے دو ورنہ کل تمہیں عدالت سے نوٹس مل جائے گا اور جو بات آج تک کسی کو معلوم نہیں ہوئی وہ کل سب کی زبان پر ہوگی اور لوگ تم پر تھوکیں گے۔ تم نے ایک لڑکی کو پانچ سال تک یرغمال بنا کر رکھا۔ اور ہاں میں تم کو چھوڑ کر ہوٹل چلا جاؤں گا۔ مجھے اپنے سامان کی فکر نہیں وہ تم لے لینا اور یہ لو کمرے کی چابی۔“

منہاج نے گھر جا کر نسرین کو خوب خوب سنائیں لیکن اب نسرین بھی تنگ آچکی تھی اور میں نے بھی نسرین کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اگر تم منہاج کی باتوں میں آگئیں تو زندگی بھر اس کے چنگل سے نہیں نکل سکو گی۔ جب منہاج نے دیکھا کہ اس کی باتوں کا نسرین پہ کوئی اثر نہیں ہو رہا تو وہ خوشامدوں پر اتر آیا کہ میں اپنا علاج کرا رہا ہوں۔ مجھے مت چھوڑو میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا لیکن نسرین ٹس سے مس نہ ہوئی اور مجبوراً منہاج کو طلاق دینا پڑی۔ نسرین نے اس سے مہر کا مطالبہ بھی نہیں کیا اور سامان سمیٹ کر گھر چلی



گئی۔ اس کے والدین پریشان ہو گئے نسرین نے انہیں بتایا کہ منہاج اکثر مجھ کو بانجھ ہونے کا طعنہ دیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میری ماں اپنے پوتے پوتی کو کھلانے کا ارمان لیے دنیا سے چلی گئی۔ آج بھی میرا ان سے جھگڑا ہوا تو منہاج نے مجھے طلاق دے دی۔ اب وہ کورٹ سے لیٹر تیار کرا کے مجھے بھیج دے گا۔ اس کا بھائی یعقوب اور والد منہاج کی خبر لینے کے لیے جانے لگے تو نسرین نے انہیں روک لیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا چاہے آپ اسے ماریں یا پیٹیں۔

نسرین کی والدہ نے بھی یہ بات انہیں سمجھائی کہ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ رات ان کے لیے قیامت سے کم نہیں تھی۔

ایک دو دن بعد میرے پاس یعقوب کا فون آیا کہ سر اگر آپ سکھر آئیں تو ہوٹل میں ٹھہر جایئے گا یا میرے گھر لیکن وہاں نہیں جایئے گا۔ میں نے انجان بن کر پوچھا کیوں؟ سب خیریت تو ہے؟ پہلے تو جھجکا مگر پھر کہنے لگا کہ دراصل منہاج نے باجی کو طلاق دے دی ہے۔ اس لیے اب وہ وہاں نہیں رہتیں۔ میں نے فون پر افسوس کا اظہار کیا۔ تقریباً 3 ماہ گزرنے کے بعد میں اپنی والدہ کو لے کر سکھر گیا۔ میں نے یعقوب کو فون پر پہلے ہی اطلاع دے دی تھی کہ میں اپنی فیملی کے ساتھ آرہا ہوں اور تمہارے گھر بھی آؤں گا۔ میرے ساتھ میری بہنیں بھی ہوں گی۔

میں نے اپنی والدہ کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کیا بات کرنی ہے اور صرف نسرین ہی کی بات کریں کسی دوسری کو پسند نہ کرلیں۔

یعقوب کے گھر والے بہت اچھی طرح پیش آئے اور ہماری خاطر مدارات کیں لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ یعقوب کچھ بے چین سا نظر آرہا تھا۔ میں نے دریافت کیا خیریت تو ہے لیکن وہ ٹال گیا۔ جب اس کے والد کچھ دیر کے لیے اٹھے تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ سر آپ کی فیملی کیا کسی خاص مقصد سے آئی ہے۔ میں نے کہا خاص نہیں بہت ہی خاص مقصد سے آئی ہے اور تمہیں جلد پتا چل جائے گا۔ یعقوب کے والد صاحب جو کہ بلانے پر اندر چلے گئے تھے۔ واپس آئے تو ان کے انگ انگ سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔ انہوں نے مجھے اٹھا کر گلے لگایا اور بے اختیار رو پڑے۔ انہوں نے میری پیشانی چومی۔ یعقوب بہت ہی حیران کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس کے والد نے اسے بھی گلے لگایا اور بتایا کہ تمہارے باس کی والدہ نسرین کے لیے رشتہ لے کر آئی ہیں اور انہوں نے نسرین کو پسند بھی کرلیا۔ ہم نے ان سے کوئی بات نہیں چھپائی اور صاف صاف بتا دیا کہ نسرین بانجھ ہے اور اسی لیے اسے طلاق بھی ہو گئی ہے۔ لیکن یہ پھر بھی نسرین کو اپنی بہو بنانے پر مصر ہیں۔ یعقوب ایک دم میرے گلے لگ کر بچوں کی طرح رونے لگا اور کہنے لگا سر آپ بہت گریٹ انسان ہیں۔

واپسی پر میری والدہ کچھ خاموش تھیں وہ خوش تو تھیں مگر پھر بھی کوئی بات ایسی ضرور تھی جو مجھے کھٹک رہی تھی۔ مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور میں نے ان سے پوچھ لیا۔ انہوں نے کہا کہ نسرین کی والدہ اصرار کر رہی تھیں کہ چھوٹی بیٹی ان کو دے دو۔ میں نے کہا کہ امی یہ تو بہت خوشی کی بات ہے آپ تو جانتی ہیں کہ جہاں اس کی بات چیت چل رہی تھی وہ لوگ بہت لالچی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہاں یہ خوش بھی نہیں رہے گی جبکہ میں یعقوب کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ انتہائی ایماندار اور بہترین لڑکا ہے۔ اس کی پرفارمنس اتنی اچھی ہے کہ بہت جلد پروموٹ ہو جائے گا۔ لوگ بھی اچھے ہیں اور ان کی لڑکی بھی ہمارے گھر ہوگی تو اس بات کا بھی یہ خیال رکھیں گے۔ میرا تو خیال ہے کہ آپ انہیں ہاں کہہ دیں۔ اس طرح میں اپنی شادی کے ساتھ ساتھ چھوٹی کے بوجھ سے بھی آزاد ہو جاؤں گا۔ نسرین ایک سال کے اندر اندر میری ہو گئی۔

اس کا میری زندگی میں آنا تھا کہ میں ترقی پہ ترقی کرتا چلا گیا اور میں چند ہی سالوں مارکیٹنگ منیجر بن گیا۔ اس تمام عرصے میں میرے ہاں تین بچے ہوئے اور میری والدہ کچھ عرصے بیمار رہنے کے بعد اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ نسرین نے میری والدہ کی اتنی خدمت کی کہ وہ ..... کہا کرتی تھیں کہ اتنی خدمت تو میری اولاد نے بھی ... نہیں کی۔ یعقوب آج کل زونل سیلز منیجر ہے۔ اس کے بھی تین بچے ہیں اور میری بہن بھی اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔ ابھی کچھ عرصے پہلے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھی تھی کہ سکھر میں ایک شخص نے اپنی شادی کے دوسرے دن چھت سے لٹک کر خودکشی کرلی۔ جب تفصیلات پڑھیں تو یہ خبر منہاج کے بارے میں تھی۔ دراصل اس کی بیوی نے دوسرے ہی دن اپنے گھر والوں کو بتا دیا تھا کہ اس کا شوہر اس کے قابل نہیں۔

میرا کوئی ارادہ نہیں تھا اپنی کہانی لکھنے کا لیکن یہ خبر میری کہانی کا محرک بن گئی۔ حالانکہ نسرین مجھے روکتی رہی لیکن میں نہیں مانا۔

# کامیاب

محترم معراج رسول
السلام علیکم!
لوگ دوسروں کی زندگی کے واقعات لکھتے ہیں لیکن میں نے اپنے حالاتِ زندگی لکھے ہیں الفاظ کو نئی شکل ضرور دی ہے تاکہ پڑھنے میں مزہ آئے لیکن کہانی سوفیصد سچ ہے۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میں اپنا نام ظاہر نہیں کرسکتا اس لیے آپ اسے بے نام کے نام سے شائع کردیں۔

بے نام
(اسلام آباد)
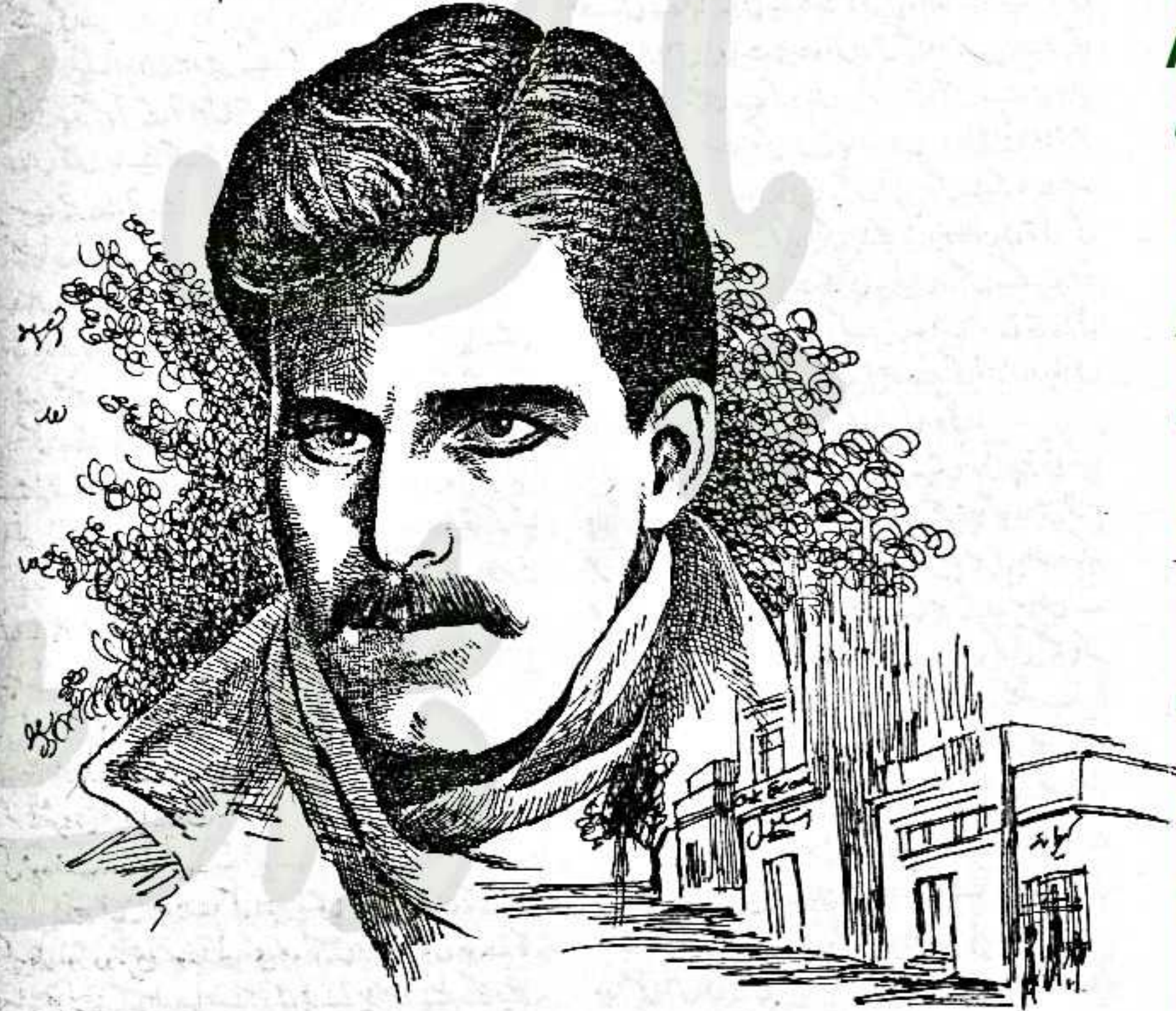
''تو آپ نے ماسٹر کر رکھا ہے۔'' اس نے چشمے کے عقب سے میری طرف دیکھا۔

''جی جناب... اور وہ بھی انگلش میں۔'' میں نے بتایا۔

''آپ بنا کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ماسٹر کرکے ماسٹر ہی بننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''پھر تو غلط جگہ آگئے۔ یہ کوئی اسکول یا کالج نہیں ہے جہاں آپ کو ماسٹر کی نوکری مل سکے۔''

''ٹیکنوکریٹ پلیز۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''ماسٹر بننا نوکری نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک سعادت ہوتی ہے۔''

''تو پھر یہ سعادت آپ کہیں اور جا کے حاصل کریں۔'' اس نے کہا۔ ''ہمارے یہاں آپ کے لائق کوئی جاب نہیں ہے۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' میں وہاں سے اٹھ کر آگیا۔

یہ میری آٹھویں ناکامی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں نے ماسٹر کرلیا ہے۔ اب میرے لیے آسانیاں ہی آسانیاں ہوں گی۔

میں نے انگلش میں ماسٹر کیا ہے۔ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا مجھے۔ لیکن ہوا یہ کہ میں جہاں جہاں بھی گیا سوائے ناکامی کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔

آٹھویں ناکامی کے بعد میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب میں اپنی ماسٹر کی ڈگری چھپا جاؤں گا۔ خود کو صرف گریجویٹ ہی ظاہر کروں گا۔ نتیجہ میری توقع کے عین مطابق نکلا۔ مجھے ایک بہت بڑے سپر اسٹور میں منیجر کی جاب مل گئی۔ اس اسٹور کا مالک بہت سرپھرا انسان تھا۔ اس نے انٹرویو کے دوران مجھ سے کہا۔ ''ارے بابا، میرے کو اس سے کیا لینا دینا کہ تم نے بی اے میں فرسٹ کلاس لیا تھا یا تھرڈ کلاس، اپنے کو تو کام چاہیے کام۔ اور وہ بھی پوری ایمانداری کے ساتھ۔''

''باس، ایمانداری کی تو فکر ہی نہ کریں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھ غریب کے پاس ایمانداری کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔''

''تو ٹھیک ہے بابا، کل صبح سے اپنا کرسی سنبھال لو۔''

اور دوسرے دن سے میں نے اس سپر اسٹور میں کام کرنا شروع کردیا۔ بہت بڑا اسٹور تھا۔ دن بھر میں ہزاروں کی فروخت ہو جاتی تھی۔

مجھے ایک چھوٹا سا کمرا دے دیا گیا تھا۔ جس میں کمپیوٹر اور دوسری سہولیات بھی موجود تھیں۔ پہلے ہی دن اسٹور کا کیشیئر میرے پاس ایک آدمی کو لے کر آگیا۔ ''سر۔ یہ خادم صاحب ہیں۔ ہمارے اسٹور میں مصالحے سپلائی کرتے ہیں۔''

''تو پھر۔''

''پھر یہ کہ مصالحوں کا اسٹاک ختم ہونے والا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ آرڈر لکھ کردے دیں۔''

''بھائی اپنے مصالحے تو دکھاؤ۔'' میں نے خادم سے کہا۔

''خادم اور کیشیئر نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں نے جب اپنی بات دہرائی تو اس خادم نے کہا۔ ''جناب، چیک کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پچھلے منیجر تو بس آرڈر دے دیتے تھے۔''

''لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میں ایک بار دیکھوں گا۔''

خادم اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کیشیئر نے کہا۔ ''سر، یہ آدمی ہمارے بھروسے کا ہے۔ ہزاروں کا لین دین ہے اس سے۔''

''وہ ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے اپنا اطمینان کرلینے دیں۔''

خادم دو پیکٹ لے کر آگیا۔ اس نے وہ دونوں پیکٹ میز پر میرے سامنے رکھ دیے۔ میں نے ایک پیکٹ کو کھول کر سونگھا اور بھڑک اٹھا۔ ''خادم صاحب، یہ آپ کیا مال سپلائی کررہے ہیں۔ اس میں تو ملاوٹ ہے۔''

''صاحب، میں برسوں سے یہی مال سپلائی کررہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ برسوں سے لوگوں کو ملاوٹ کی چیزیں کھلا رہے ہیں۔''

''آپ یہ بتائیں کہ آپ کو آرڈر دینا ہے یا نہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔ میں اس مال کا آرڈر تو ہرگز نہیں دوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ جاسکتے ہیں۔''

دوسری صبح اسٹور کے مالک نے مجھے اپنے پاس بلالیا تھا۔ وہ بہت اکھڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ''مسٹر، یہ تم نے کل خادم سے مال لینے سے منع کیوں کردیا۔''

''سر، اسٹور کی بھلائی کے لیے۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ شخص دو نمبر کے مصالحے سپلائی کرتا تھا۔''

''تو پھر اس سے تمہیں کیا تکلیف تھی۔''

''سر، آپ ہی نے تو کہا تھا کہ ایمانداری سے کام کرنا۔''

''بے وقوف! میرا مطلب یہ تھا کہ تمہاری ایمانداری میرے ساتھ ہونی چاہیے۔ اور تم پبلک کے ساتھ ایمانداری کرنے چلے ہو۔''

''سر، آپ کی بھلائی بھی تو اس میں ہے نا۔''

''نہیں، اس میں میری کوئی بھلائی نہیں ہے۔'' وہ

غرایا۔ ”تم نے یہاں ایک دن کام کیا ہے۔ اس کے پیسے لو اور جاؤ یہاں سے۔ تمہاری ایمانداری تو مجھے تباہ کردے گی۔“

میں نے غصے میں آکر اس سے ایک دن کے پیسے بھی نہیں لیے اور اس مالک اور اس کے اسٹور پر لعنت بھیجتا ہوا وہاں سے آگیا۔

گھر جب جلدی پہنچا تو والد صاحب چڑھ دوڑے۔ ”ابے، آج کیا کارنامہ کرکے آیا ہے۔“

”ابا، آج میں نے ایماندار ہونے کا ثبوت دے دیا ہے۔“

”وہ تو پچھلے کئی برسوں سے دیتا چلا آرہا ہے۔“

”لیکن آج تو میں نے ثابت کردیا ہے کہ میں حق پر ہوں۔“ میں نے کہا۔

”بتا تو سہی، کیا کردیا ہے۔“

میں نے پوری کہانی سنادی۔ والد صاحب اپنا اور میرا سر پیٹنے لگے۔ ”تو اس طرح بھوکا مرے گا۔ اب جب اسٹور کا مالک ہی اس قسم کی چیزیں فروخت کرتا ہے تو پھر تجھے کس بات کی پریشانی ہے۔“

”ابو وہ آدمی اپنے گاہکوں کی صحت تباہ کررہا ہے۔“

”ابے ایسی بے تکی ایمانداری نے تیری زندگی تباہ کردی ہے۔“

”کچھ بھی ہو میں اپنے اصولوں سے نہیں ہٹ سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی کہ پہلے جب اولاد غلطیاں کرتی تھی تو والدین اسے سیدھی راہ پر لے آتے تھے۔ لیکن اب والدین خود غلط راستے بتارہے ہیں اور اس اولاد کو برا بھلا کہتے ہیں جو حق اور انصاف کے راستے پر ہے۔“

والد صاحب ذرا سی دیر کے لیے کچھ شرمندہ محسوس ہونے لگے۔ پھر انتہائی دکھ بھرے لہجے میں بولے۔ ”میرے بیٹے، میں جانتا ہوں کہ تو حق اور انصاف کے راستے پر چل رہا ہے لیکن اب زندگی بہت بدل چکی ہے۔ آج کا انسان کچھ اور ہوگیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو سچا ہے لیکن دوسری سچائی یہ ہے کہ تیری بہن کی شادی کے لیے پیسے چاہئیں۔ غسل خانے کی چھت ٹوٹ گئی ہے۔ اس کی مرمت ہونی ہے۔ گھر میں راشن ختم ہوتا جارہا ہے۔ تیری ایمانداری سے یہ سب ٹھیک نہیں ہوسکتا۔ بہن کے جہیز کے پیسے نہیں آسکتے۔ چھت کی مرمت نہیں ہوسکتی اور راشن کے پیسے نہیں آسکتے۔“

”یہ سب اپنی جگہ بالکل درست ہے ابا۔ لیکن اصل چیز ہے اپنے اصولوں پر ڈٹے رہنا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ اسے امتحان سمجھیں۔ پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔“

”اس امتحان کا رزلٹ آنے تک تو ہم سب اوپر پہنچ چکے ہوں گے۔“

”کوئی بات نہیں ابا۔ بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”سقراط بقراط سب اس امتحان سے گزرے ہیں۔ اپنے مرزا غالب تک کے یہاں فاقے ہوا کرتے تھے۔“

”ان ہی لوگوں نے تو تیرا دماغ خراب کررکھا ہے۔“

”ان ہی لوگوں نے روشنی دی ہے ابا۔“

والد صاحب یک جھک کر خاموش ہوگئے۔ لیکن میں سوچ میں پڑگیا تھا۔ کیا واقعی میں ہی غلطی پر تھا؟ آج کل تو ہر طرف بے ایمانی اور جھوٹ کا دور ہے۔ پھر میں کیوں ایمانداری اور سچائی کا جھنڈا تھامے کھڑا ہوں۔ کیا مل رہا ہے مجھے۔ سوائے ناکامیوں کے۔

میں بہت بددل ہوکر اپنے ایک دوست کامل کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بے چارہ کئی بار مجھے اسی موضوع پر لیکچر دے چکا تھا۔ ”دیکھ بھائی، تیری یہ اصول پسندی اس دور میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتی۔ جو برائی کے گڑھے میں گر رہا ہے اسے بچانے کی کوشش نہ کرو۔ بلکہ ایک دھکا اور دے دو۔“

میری شکل دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ میں پھر ناکام ہوکر واپس آیا ہوں۔ ”کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تمہاری صورت پر لکھا ہوا ہے کہ سچائی کے جراثیم نے تمہارا پھر نقصان کردیا ہے۔“

”ہاں بھائی ایک بڑے اسٹور میں ایک بڑی اچھی جاب مل گئی تھی۔“ میں نے بتایا۔ ”لیکن پھر وہی ہوا جو اب تک ہوتا آیا ہے۔“

میں نے اسے پوری کہانی سنادی۔

وہ بری طرح ہنسنے لگا تھا۔ ”بھائی میرے تمہارے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔“ اس نے کہا۔ ”جب دنیا نے ایمانداری اور سچائی کے چکر میں سقراط تک کو زہر پلا دیا تو تم کس کھیت کی مولی ہو۔“

”یار، اب تو میں بھی تنگ آچکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”زندگی عذاب ہوکر رہ گئی ہے۔ گھر میں پیسوں کی ضرورت ہے اور میں سچائی کو لیے بیٹھا ہوں۔“



”چلو کچھ عقل تو آنے لگی۔“

”اب تم مشورہ دو کہ میں کیا کروں۔“ میں نے پوچھا۔

”جھوٹ بولو۔ الٹی بات کرو۔“ اس نے کہا۔ ”اسی میں بھلائی ہے۔ جتنا غلط بول سکتے ہو بولو، پھر دیکھو کہ تمہارے لیے کیسے راستے کھلتے ہیں۔“

”یار، کل ایک اسکول میں انٹرویو کے لیے بلایا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”پرائمری درجے کا پرائیویٹ اسکول ہے۔ لیکن مجبوراً جانا پڑ رہا ہے۔“

”ضرور جاؤ۔ لیکن سچ کا جھنڈا لے کر مت بیٹھ جانا۔“

میں بھی دوسرے دن غلط بیانی کا ارادہ کرکے ہی اسکول میں انٹرویو دینے پہنچ گیا تھا۔ اسکول کا جو مالک تھا وہی پرنسپل تھا۔

”خوب!“ اس نے میری سی وی دیکھ کر اپنی گردن ہلائی۔ ”لگتا ہے آپ کو کہیں جاب نہیں ملی۔“

”یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا۔“

”بھائی آپ ایم اے انگلش ہیں اور پرائمری کو پڑھانے آرہے ہیں۔“

”جناب! بات یہ ہے کہ نوکریاں تو میرے آگے پیچھے بھاگتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں چاہتی ہیں کہ میں ان کو جوائن کرلوں۔ سیلری بھی میری توقع سے بڑھ کر مل رہی ہے۔ لیکن میں اپنے مزاج کی وجہ سے جاب نہیں کرپارہا۔“

”وہ مزاج کیا ہے۔“

”بچوں کو ایجوکیٹ کرنا۔ بچوں کو پڑھانا۔“ میں نے بتایا۔ ”کاش! میں اگر کوئی سپر نیچرل ہوتا تو پاکستان کے ہر بچے کو میں ہی پڑھایا کرتا۔ تاکہ ان کی بنیاد درست ہو۔“

”واہ!“ وہ شخص بے انتہا متاثر ہوچکا تھا۔ ”بہت کمال کا جذبہ ہے آپ کا۔“

”جی جناب، بچوں کا مستقبل بن جائے تو ملک کا مستقبل بن جائے گا۔“

”میں آپ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن پرابلم یہ ہے کہ اسکول آپ کو اتنی سیلری نہیں دے سکتا۔“

”وہ رہنے دیں جناب، میں یہاں اپنے جذبے کے لیے آیا ہوں، سیلری کے لیے نہیں جو بھی مل جائے۔“

## بنونجار

قدیم عرب کا مشہور قبیلہ جو اپنی مردم خیزی کی بدولت مشہور ہے۔ اس قبیلے میں نامور شاعر اور بڑے بڑے سپاہی پیدا ہوئے، اسلام آنے پر اس قبیلے کے بہت سے افراد مشرف بہ اسلام ہوئے۔

## نجاریہ (251ھ)

فرقہ معتزلہ کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بانی کا نام حسین ابن محمد نجار ہے۔ ابن عون اور ابی یوسف اس فرقہ کے بہت بڑے عالم اور محقق گزرے ہیں۔ ان دونوں نے اپنے فرقہ کے بنیادی عقائد کی تشریح و توضیح پر کئی کتابیں لکھیں۔ دوسرے فرقوں کے علماء سے خدا تعالیٰ کی صفات پر بڑے بڑے مناظرے کیے اور ان مناظروں میں کامیابی حاصل کی۔ عباسی خلفاء کو بھی ان لوگوں نے کافی حد تک متاثر کیا۔ ایک دور ایسا بھی آیا جبکہ اس فرقہ کے علماء نے حکومت وقت کو دوسرے فرقوں کے علماء کو قتل کرانے کے فعل پر اکسایا اور قتل کرایا۔ یہ گروہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا قطعی منکر ہے اور دیگر فرقوں کے ہاں مروجہ صفاتی علم غیر ضروری سمجھتا ہے۔ اس فرقہ کے عقائد یہ ہیں۔ خدا قدیم ہے اور بولنے کی طاقت رکھتا ہے۔ محض یہی ایک صفت اس میں موجود ہے۔ قرآن مجید مخلوق ہے۔

## نجاست

پاکیزگی کا الٹ، گندگی، ناپاکی، غلاظت، جمع نجاسات، اسلام پاکیزگی، طہارت وصفائی کا درس دیتا ہے۔ نجاست ایسی عادتوں کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ مسجد میں داخل ہونے سے پہلے، نماز پڑھنے سے پہلے صفائی ضروری ہے۔ نہ صرف کھانا کھانے کے بعد بھی صفائی رکھنا ضروری ہے۔ اسی لیے مسواک کرنا سنت قرار پایا ہے۔ سگ سے بچنا چاہیے۔ جب یہ کسی برتن کو چھولے تو سات بار دھولیا کرو یہ بات ابوہریرہؓ سے روایت ہے، اسی طرح ابن عباس سے روایت ہے کہ دباغت سے کھال پاک ہوجاتی ہے۔ حضرت معاذؓ کی طرف سے روایت ہے کہ گھاٹ، سڑک اور سایہ یہاں رفع حاجت کی قابل ملامت عادت سے پرہیز کیا جانا ضروری ہے۔ جب کسی صورت آدمی ناپاک ہوجائے تو اسے چاہیے کہ تین بار کلمہ پڑھ کر پانی سے اچھی طرح دھوئے۔

مرسلہ: ضیاء چوہان، خان پور

اس نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھادیا۔ ”تو پھر کل صبح سے آکر بچوں کو تعلیم دینا شروع کردیں۔ جزاک اللہ!“

میں نے گھر آکر جب سب کو یہ خبر سنائی تو سب کے منہ بن گئے۔ ”یہ لو انگلش میں ایم اے، اتنا پڑھا لکھا آدمی اور پرائمری کے بچوں کو پڑھانے چلا ہے۔“

اس وقت اماں نے میری ہمت بندھائی۔ ”چلو اتنا تو ہوا کہ ایک کام شروع ہوا ہے۔ آگے بھی راستے نکل ہی آئیں گے۔“

میں دوسرے دن گھر والوں کی دعائیں لے کر اسکول پہنچ گیا جہاں میرا تعارف کروایا گیا اور ایک کلاس روم میں بھیج دیا گیا۔

بہت پیارے پیارے بچے تھے۔ لیکن ان پیارے بچوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ میں انہیں غلط بتانے کے لیے آیا ہوں۔ سچائی کا حشر تو دیکھ ہی چکا تھا۔

میرے سامنے جو کتاب آئی وہ جغرافیہ کی تھی۔ میں نے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بچو! ایک بات تو پہلے اپنے دھیان میں رکھ لو کہ یہ دنیا گول نہیں بلکہ چپٹی ہے۔“

”نو سر۔“ ایک پیاری سی بچی جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ ”نو سر! دنیا تو گول ہے۔“

”کس نے بتایا۔“

”سب بتاتے ہیں سر! امی، ابو، ٹیچرز اور خود اس کتاب میں بھی لکھا ہے کہ دنیا گول ہے۔“ اس نے کہا۔

”وہ سب غلط کہتے ہیں۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہی سچ ہے۔“

ذرا سی دیر میں کلاس روم کے کئی بچے دوڑتے ہوئے باہر چلے گئے۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ پرنسپل ہی کے پاس میری شکایت لے کر گئے ہوں گے۔

اور یہی ہوا۔ ذرا سی دیر میں مالک نما پرنسپل فوں فوں کرتا ہوا آگیا۔ ”یہ آپ بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں کہ دنیا چپٹی ہے۔“

”جی جناب! میں یہی بتا رہا ہوں۔“

”آپ پاگل تو نہیں ہوگئے۔ کیوں الٹی بات بتا رہے ہیں۔“

”اس کی دو وجوہات ہیں جناب۔“ میں نے کہا۔ ”پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اتنی کم تنخواہ میں تو دنیا چپٹی ہی رہے گی۔ اس کو گول کروانا ہو تو میری سیلری بڑھائیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ دنیا جھوٹ اور غلط بیانیوں کی ہے۔ اور یہی باتیں آگے چل کر ان بچوں کے کام آئیں گی۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ واقعی پاگل ہیں۔“ اس نے فیصلہ سنا دیا۔ ”برائے کرم آپ تشریف لے جائیں۔“ اور میں وہاں سے تشریف لے گیا۔

اپنے دوست کامل کے پاس پہنچ کر میں نے پوچھا۔ ”یار یہ بتا کہ جب سچ بولو تو نقصان... اور جھوٹ بولو تو نقصان۔ اب کروں تو کیا کروں۔“

”جہنم میں جاؤ تم۔“ وہ بھڑک اٹھا۔ ”عقل کے اندھے۔ ایسی سامنے کی باتیں غلط نہیں بتائی جاتیں۔ اب کون یقین کرے گا کہ سورج ٹھنڈا ہے اور چاند کی کرنیں گرم ہوتی ہیں۔ لوگ تمہیں پاگل خانے بھیج دیں گے۔“

”تو پھر کیا کروں میں۔ کیا بولوں؟“

”مکاری سیکھ لے بھائی مکاری۔ مصلحت، جیسا دیس ویسا بھیس۔ اسی میں کامیابی ہے۔ تیری ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ تجھے مکاری نہیں آتی۔ تو نہیں جانتا کہ کس موقع پر کیا بات کرنی ہے۔ بس یہ سیکھ لے۔ کامیابی ہی کامیابی ہے۔“

”اور یہ ہنر آئے گا کہاں سے؟“

”ہاں۔ میرے پاس اس کے لیے بھی راستہ ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میرے ماموں کے ایک جاننے والے ہیں۔ بہت بڑے سیاست داں۔ ان کو ایک پرسنل سیکریٹری کی ضرورت ہے۔ تم ان کے سیکریٹری بن کر ان سے سارے گُر سیکھ لو۔ کامیابی تمہارے ہاتھ چومے گی۔“

”یار خدا کے لیے میری ان سے بات کرا دو۔“ میں نے کہا۔ ”اب تو مجھے کچھ بن کر ہی دکھانا ہے۔“

اور اب میں خود اس سیاست دان کی ٹکر کا سیاست دان ہوگیا ہوں۔ میں نے ایک سال ان کا پرائیویٹ سیکریٹری بن کر وہ سارے حربے سیکھ لیے جو اُن کی کامیابی کی علامت تھے اور زندگی میں ان سے دو ہاتھ آگے نکل گیا۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس الیکشن میں، میں نے ان ہی کے مقابل کھڑے ہو کر ان کو شکست دے دی ہے۔ میں اس کہانی میں اپنا اصل نام ظاہر نہیں کر رہا اور نہ ہی سیاست دان صاحب کا نام بتا رہا ہوں۔ اگر آپ جاننا چاہتے ہیں تو خود اپنے طور پر پتا لگائیں کہ کس سیاست دان کے پرائیویٹ سیکریٹری نے ان کو الیکشن میں شکست دی ہے۔



# اپنی آگ

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم!

اپنے ہی محلے کے ایک گھر کی کہانی کو میں نے الفاظ میں ڈھالا ہے تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔ امید ہے میری روانہ کردہ سچ بیانی سے قارئین سبق ضرور حاصل کریں گے

مینہ تاج
(کراچی)

حلیم آج صبح ہی سے بہت پریشان تھا۔ آج اس کے بیٹے کریم کی فیس جانا تھی۔ کریم نے ایک دن پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اگر کل میری فیس نہ گئی تو میں اسکول نہیں جاؤں گا۔

”کیوں بیٹا! کیوں اسکول نہیں جاؤ گے؟“ ماں نے بہت پیار سے پوچھا تھا۔

”امی! کلاس میں ٹیچر سب کے سامنے فیس کے لیے کہتی ہیں۔ جو بچے فیس لے کر نہیں آتے، انہیں کھڑا کر دیتی ہیں۔ دوسرے بچے ان پر ہنستے ہیں۔“ کریم نے منہ بنا کر کہا۔

”تم پریشان مت ہو بیٹا!“ حلیم نے کہا۔ ”کل میں تمہاری فیس ضرور بھجوا دوں گا۔“

اس نے بہلا پھسلا کے کریم کو تو اسکول بھیج دیا تھا۔ اب خود پریشان بیٹھا تھا کہ فیس کا بندوبست کہاں سے

کرے۔ اسے دو تین جگہ سے امید تھی لیکن ان لوگوں نے بھی ہاتھ تنگ ہونے کی معذرت کر لی تھی۔

حلیم نے بہت شوق سے بیٹے کو ایک اعلیٰ اسکول میں داخل کرایا تھا۔ وہ خود تو گریڈ بارہ کا سرکاری ملازم تھا لیکن چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے۔ بڑا آدمی بننے کے لیے اچھی تعلیم ضروری تھی اور اچھی تعلیم کے لیے اچھی فیس کی ضرورت پڑتی ہے۔ ابھی تو کریم صرف چھٹی جماعت میں تھا۔ آگے مزید اخراجات منہ کھولے کھڑے تھے۔

وہ اسی خیال میں غلطاں تھا کہ اس کی بیوی نے خاموشی سے اپنا ایک کڑا اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

حلیم نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے زینت؟''

''آپ کو نظر نہیں آرہا کہ یہ کیا ہے؟'' زینت نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یہ کڑا کریم سے زیادہ تو نہیں ہے۔''

''اب تم بھی مجھے ذلیل کرو گی؟'' اس نے شاکی نظروں سے زینت کو دیکھا۔

''اس میں ذلیل کرنے والی کون سی بات ہے۔'' زینت نے کہا۔ ''میں اپنے بیٹے کو دے رہی ہوں۔''

حلیم کو خود بھی دفتر جانا تھا اس لیے اس نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور کڑا خاموشی سے جیب میں ڈال لیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حلیم کی ترقی ہوتی گئی اور کریم کے تعلیمی اخراجات بڑھتے گئے۔

اخراجات پورے کرنے کے لیے حلیم نے ایک جگہ پارٹ ٹائم ملازمت بھی کر لی۔ وہ دن رات کام کر کے کریم کے اخراجات پورے کرنے کے قابل ہو گیا۔

کریم تھا بھی بہت ہونہار اور ذہین، وہ ہمیشہ نمایاں نمبر لے کر کامیاب ہوتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کریم اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی میں آگیا۔

حلیم اپنے بیٹے کو ایم بی اے کرانا چاہتا تھا۔ اس دور میں ایم بی اے خال خال ہی ہوتے تھے۔ ہر شخص اپنے بچوں کو ڈاکٹر یا انجینئر بنانے کے درپے تھا۔ حلیم کے افسر صدیقی صاحب نے اسے مشورہ دیا تھا کہ اب ڈاکٹر یا انجینئر کی اتنی قدر نہیں ہے۔ اپنے بیٹے کو ایم بی اے کراؤ۔ آج کل ایم بی اے کی بہت مانگ ہے۔ میرا بیٹا بھی ایم بی اے ہی کر رہا ہے۔

حلیم نے بھی تہیہ کر لیا کہ میں بھی کریم کو ایم بی اے کراؤں گا۔

ایم بی اے میں داخلہ بھی ہرا یرے غیرے کو نہیں ملتا تھا۔ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے باقاعدہ ٹیسٹ ہوتے تھے۔ اس مرحلے پر کریم نے باپ کا سر فخر سے بلند کر دیا اور بغیر کسی سفارش کے میرٹ پر اسے ایم بی اے میں داخلہ مل گیا۔

ان دنوں زینت کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اسے مسلسل بخار رہنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں پر ورم آگیا تھا۔ اس نے زینت کا ڈاکٹری معائنہ کرایا تو معلوم ہوا کہ اسے بلڈ پریشر کے ساتھ ساتھ شوگر کی بھی شکایت ہے۔ اس کی شوگر خطرناک حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے باقاعدگی سے علاج اور پرہیز کرنے کی ہدایت کی تھی۔

جس دن کریم کا داخلہ ہونا تھا۔ اس دن زینت کی حالت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ حلیم اسے اسپتال میں داخل کرانا چاہتا تھا لیکن پھر اس کے پاس اتنے پیسے نہیں بچتے کہ وہ کریم کی داخلہ فیس بھی دے سکتا۔ زینت نے اس سے کہا کہ میری فکر چھوڑیں۔ میں تو لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جاؤں گی۔ آپ کریم کا داخلہ کرا دیں۔ اس کے مستقبل کا سوال ہے۔

حلیم کو ایک مرتبہ پھر ہار ماننا پڑی۔ کریم کو ایم بی اے میں داخل کرا دیا گیا لیکن زینت بیٹے کی مزید ترقی نہ دیکھ سکی اور ایک دن چپکے سے آنکھیں موند لیں۔

حلیم اس کی موت پر بلک بلک کر رو دیا۔ وہی تو اس کا بہت بڑا سہارا تھی۔ اس نے اپنی زندگی بیٹے کے مستقبل کے لیے قربان کر دی تھی۔ اگر اس کا علاج بروقت ہو جاتا تو وہ مرتی ہی کیوں لیکن اگر اس کا علاج ہوتا تو پھر کریم کا ایڈمیشن کیسے ہوتا؟ یوں بھی اس کے تمام زیور ایک ایک کر کے بک گئے تھے۔

حلیم اب بیٹے کے لیے نئے سرے سے جی رہا تھا۔

ایم بی اے کا رزلٹ آیا تو کریم کی دوسری پوزیشن تھی۔ اس دن حلیم کے ساتھ ساتھ کریم بھی ماں کو یاد کر کے بہت رویا۔

فوراً ہی کریم کو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ حلیم ریٹائر ہونے والا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اللہ نے اس کے لیے بڑھاپے کا سہارا پیدا کر دیا تھا۔

حلیم نے اچھے وقتوں میں گھر بنالیا تھا۔ کریم کو ملازمت ملی تو اسے وہ گھر پرانا اور چھوٹا لگنے لگا۔ اس لیے باپ پر زور دیا کہ یہ مکان بیچ کر ڈیفنس یا کلفٹن میں بنگلا خرید لیں۔



حلیم کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ ڈیفنس جیسے علاقے میں مکان خرید سکتا۔ اس کے پاس لے دے کے یہ مکان تھا یا پھر نارتھ کراچی میں ایک پلاٹ تھا جو اسے دفتر کی طرف سے الاٹ ہوا تھا۔

اس کا یہ مسئلہ یوں حل ہوا کہ ان ہی دنوں وہ ریٹائر ہو گیا۔ اسے گریجویٹی کی اچھی خاصی رقم ملی۔ اس نے اپنا مکان اور پلاٹ بیچا اور اپنی گریجویٹی کی پوری رقم لگا کر ڈیفنس میں ایک ادھورا بنا ہوا ایک بنگلا خرید لیا۔ ادھورا اس لیے کہ مالک نے یہ بنگلا بنانا شروع ہی کیا تھا کہ امریکا سے اس کا فیملی ویزا آگیا۔ وہ بنگلے کو اسی حالت میں چھوڑ کر امریکا چلا گیا۔ وہ شخص اس کے پرانے دوست رشید کا شناسا تھا اس لیے حلیم کو یہ بنگلا بہت کم قیمت پر مل گیا۔ پھر حلیم نے اس بنگلے کو مکمل کرایا اور پانچ سال کے عرصے میں وہ ایک جدید اور شاندار بنگلے میں تبدیل ہو گیا۔

اب کریم کا معیارِ زندگی بہت بلند ہو چکا تھا۔ دفتر کی طرف سے اسے جدید ماڈل کی گاڑی بھی مل گئی تھی۔ وہ آئے دن گھر میں اپنے دوستوں کی دعوتیں کرتا تھا۔ کھانے کا سامان ہوٹلوں سے آتا تھا۔ یہ بازاری کھانے حلیم کو بالکل پسند نہیں تھے۔ وہ سنجیدگی سے اب کریم کی شادی پر غور کر رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر زینت زندہ ہوتی تو اب تک کریم کی شادی ہو چکی ہوتی۔

زینت کے نہ ہونے سے حلیم خود بھی بہت اچھا کھانا پکانے لگا تھا۔ اس دن حلیم نے بہت اہتمام سے کریم کے لیے بریانی، چکن کڑھائی اور شامی کباب بنائے تھے۔ کریم دفتر سے آیا تو اس کے ہاتھ میں وزنی سا ایک شاپر بھی تھا۔

وہ نہا دھو کر کھانے کی میز پر بیٹھا تو حلیم نے اس کے آگے اپنے پکائے ہوئے کھانوں کی ڈشیں رکھیں۔

''اونو ابو!''

کریم نے کہا۔ ''روز وہی تھرڈ کلاس، غریبوں والے کھانے...... مجھ سے نہیں کھائے جاتے۔ یہ کھانا آپ خود ہی کھالیں۔ میں اپنے لیے کھانا لے کر آیا ہوں۔''

اس نے اپنا لایا ہوا شاپر کھولا۔ اس میں زنگر برگر، فرنچ فرائز اور الگ سے چکن کے دو بڑے بڑے ٹکڑے پڑے تھے۔ کریم نے فریج سے کولڈ ڈرنک نکالی اور اپنا لایا ہوا برگر مزے لے لے کر کھانے لگا۔ آج کریم نے پہلی دفعہ اس کے پکائے ہوئے کھانوں کو ٹھکرایا تھا۔ اس کا دل ٹوٹ کر رہ گیا۔ اس نے نم آنکھوں کے ساتھ وہ تمام ڈشیں ایک ایک کر کے کچن میں پہنچا دیں اور وہاں بیٹھ کر دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ حلیم نے ایرانی بلیوں کا ایک جوڑا بھی پال رکھا تھا۔ اس نے سارا کھانا بلیوں کے آگے رکھ دیا۔

پھر تو اکثر یہ ہونے لگا۔ کریم کو باپ کی ہر بات دقیانوسی لگنے لگی۔ وہ اس کے لائے ہوئے کپڑوں پر ناک بھوں چڑھاتا، اس کی چیزوں میں کیڑے نکالتا۔

حلیم نے اپنے دوست رشید اور کئی دوسرے دوستوں سے کہہ رکھا تھا کہ کریم کے لیے کوئی لڑکی بتائیں۔

وہ لوگ ابھی لڑکی تلاش ہی کر رہے تھے کہ کریم نے ایک اور دھماکا کر دیا۔ اس نے بتایا کہ میں اپنی ایک دوست ذکیہ سے شادی کر رہا ہوں۔

''ذکیہ کون ہے بیٹا؟'' حلیم نے پوچھا۔ ''کس خاندان سے تعلق ہے؟''

''ذکیہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔'' کریم نے جواب دیا۔

''اس کے گھر والوں سے تو ملواؤ۔''

اگلے ہی ہفتے ذکیہ کی ماں اور باپ حلیم کے گھر آدھمکے۔ ان کے ساتھ ان کا ایک بیٹا بھی تھا۔

ذکیہ کی ماں چہرے سے بہت تیز طرار لگ رہی تھی۔ اس نے باتوں باتوں میں حلیم کے بنگلے کی تعریف کی پھر بنگلے کا یوں گھوم پھر کر جائزہ لیا جیسے وہ یہاں بیٹی کی شادی کی بجائے بنگلا خریدنے آئی ہو۔

ذکیہ کا باپ بھی فربہ جسم اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا مکار آدمی تھا۔

حلیم کو پہلی ہی نظر میں وہ لوگ پسند نہیں آئے۔

''شیخ صاحب!'' حلیم نے پوچھا۔ ''آپ کا مشغلہ کیا ہے؟''

حلیم کی بات سن کر وہ بھونڈے انداز میں ہنسا اور بولا۔ ''ارے صاحب اس عمر میں کیا مشغلہ! مشغلے تو جوانی میں ہوتے ہیں۔'' وہ نہ جانے مشغلے کو کن معنوں میں لے رہا تھا۔

حلیم کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔ یہ کریم کن جاہلوں میں شادی کرنے جا رہا تھا۔ حلیم نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''شیخ صاحب! میرا مطلب ہے کہ آپ کرتے کیا ہیں؟''

''میرا آڑھت کا کاروبار ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پھلوں اور سبزیوں سے لے کر دالیں، چاول اور چینی

تک ہر چیز کی آڑھت کرتا ہوں۔"

"ذکیہ کو آپ نے کہاں تک تعلیم دلائی ہے؟" حلیم نے پوچھا۔

"لڑکیوں کو زیادہ پڑھا کر کیا لینا ہے خان صاحب!" اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو دسویں کے بعد ہی ذکیہ کو گھر بٹھالیا تھا۔ ویسے بھی لڑکیاں کالج اور یونیورسٹی جائیں تو آوارہ ہو جاتی ہیں۔"

اس سے بات کر کے حلیم کی طبیعت سخت مکدر ہوئی۔ کریم اپنی ہونے والی ساس کو گھر کا کونا کونا دکھا رہا تھا۔

ان کے جانے کے بعد حلیم نے بیٹے سے کہا "کریم! اب تم مجھ سے جھوٹ بھی بولنے لگے ہو؟"

"میں سمجھا نہیں ابوجی!" کریم نے کہا۔

"تم نے تو کہا تھا کہ ذکیہ کالج میں تمہارے ساتھ پڑھتی تھی۔"

"وہ میں نے اس لیے کہا تھا ابوجی کہ آپ راضی نہ ہوتے۔"

"کیا تم ان جاہلوں میں رشتہ کرنے کو راضی ہو؟" حلیم نے درشت لہجے میں پوچھا۔ آج ایک عرصے بعد اسے اتنا شدید غصہ آیا تھا۔ کریم ہمیشہ اس کے اس غصے سے ڈرتا تھا۔

"سوری ابوجی!" کریم نے مرجھا کر کہا۔ "یہ لوگ تو کچھ حد سے زیادہ ہی جاہل ہیں۔ میں وہاں شادی نہیں کروں گا۔"

حلیم نے بیٹے کو گلے سے لگالیا۔

پھر اس نے امجد صاحب کے عزیزوں میں کریم کا رشتہ طے کر دیا۔

سعدیہ بہت سلجھی ہوئی اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ خوبصورت بھی تھی اور خوش اطوار بھی!

کریم کی شادی ہوئی تو حلیم کے سر سے ایک بہت بڑی ذمے داری کا بوجھ ہٹ گیا۔

سعدیہ نے آہستہ آہستہ نہ صرف کریم کے سارے کام سنبھال لیے بلکہ اس نے تو پورے گھر پر قبضہ جمالیا اور غیر محسوس طریقے پر حلیم اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گیا۔ حلیم کو بالکل امید نہیں تھی کہ سعدیہ جیسی پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی لڑکی ایسا کر سکتی ہے؟ مگر وہ بھول رہا تھا کہ یہ دور مفاد پرستی کا ہے۔ لوگ صرف اپنا سوچتے ہیں۔

سعدیہ کو تو اب حلیم کا وجود ہی کھٹکنے لگا تھا۔ اس کی وجہ سے کئی دفعہ کریم بھی باپ کی بے عزتی کر چکا تھا۔ اب وہ بات بات پر حلیم کو جھڑکنے لگا۔

حلیم کا دل ٹوٹ کر رہ گیا۔ وہ سارا دن اپنے کمرے میں بند اسکیچز بناتا رہتا۔ اسکیچز بنانا اس کا شوق تھا۔ اس شوق سے اس نے کمایا بھی بہت تھا۔ شوقین لوگ ایک ایک اسکیچز دس دس ہزار اور بیس بیس ہزار کا خریدتے تھے۔

جب وہ زیادہ پریشان ہوتا تو اپنے ماموں زاد کے گھر لاہور چلا جاتا اور وہاں مہینے دو مہینے رہ آتا۔

یہاں بھی لے دے کر اس کے گنتی کے چند دوست تھے۔ ان میں سے رشید سے کچھ زیادہ ہی دوستی تھی۔ رشید اکثر اس کے پاس آجاتا تھا۔

حلیم نے محسوس کیا تھا کہ سعدیہ کو رشید کا آنا بھی کھلتا ہے۔ اس نے بہانے بہانے سے رشید کو اپنے گھر آنے سے روک دیا۔ اب وہ اکثر خود ہی رشید کے گھر چلا جاتا اور پورا پورا دن اس کے ساتھ شطرنج کھیل کر گزار دیتا۔

کچھ دن سے حلیم کو سانس کی بیماری بھی ہوگئی تھی۔ سانس کا دورہ عموماً اسے سوتے میں لگتا تھا۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا اور دیر تک کھانستا رہتا۔

سعدیہ اس کی کھانسی سے بھی بہت تنگ تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ حلیم کو دھکے دے کر گھر سے نکال دے۔ وہ شاید ایسا کر بھی گزرتی لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ بنگلا حلیم کے نام ہے تو اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

حلیم نے سعدیہ کو کہتے سنا۔ "جان تو کیا ہمیں ابوجی کی موت کا انتظار کرنا ہوگا؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو سعدیہ! وہ میرے باپ ہیں، تمہارے بھائی بھی تو تمہارے باپ کے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔" کریم کے لہجے میں طنز تھا۔

حلیم نے یہ باتیں اتفاق سے سن لی تھیں۔ اس کی بلی کمروں کی پچھلی طرف گیلری میں گھس گئی تھی۔ حلیم بلی کو وہاں سے نکالنے گیا تھا کہ اس نے یہ باتیں سن لی تھیں۔ پھر انتہائی غیر محسوس طریقے پر کریم بھی اس سے کھنچ گیا۔

ان ہی دنوں کریم کے دفتر کے ایم ڈی لاہور سے تبدیل ہو کر کراچی آگئے۔ دفتر کا ہر شخص ان کی خوشنودی میں لگ گیا۔ کریم نے بھی انہیں ڈنر کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی۔

جب سے کریم نے بڑے صاحب کو دعوت دی تھی، وہ گھر کو کئی بار سیٹ کر چکا تھا لیکن اسے تھوڑی دیر بعد وہ



سیٹنگ پسند نہ آتی تو وہ نئے سرے سے سیٹنگ میں لگ جاتا۔ سعدیہ بھی اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ وہ دونوں مختلف باتوں پر ایک دوسرے سے الجھتے۔ پھر نئے سرے سے کام میں مصروف ہو جاتے۔

حلیم کئی دن سے گھر میں غیر معمولی ہلچل دیکھ رہا تھا۔ گیٹ پر نیا پینٹ ہو رہا ہے۔ کبھی لان کی صفائی ہو رہی ہے۔

اس دن حلیم کو شدید دھچکا لگا جب کریم نے مین گیٹ پہ لگی ہوئی اس کی نیم پلیٹ اتار کر ایک طرف پھینک دی اور اپنے نام کی چمکتی ہوئی پیتل کی نیم پلیٹ دروازے پر نصب کر دی۔ پیتل کے ابھرے ہوئے خوبصورت حروف میں کریم اے خان لکھا ہوا تھا۔ حلیم احمد خان کے نام کی تختی نزدیکی کیاری میں پڑی تھی۔

حلیم نے سب کی نظر بچا کر وہ نیم پلیٹ اٹھالی اور اسے جھاڑ پونچھ کر اپنی الماری میں بند کر دیا اور خود دیر تک روتا رہا۔ اس نے سوچا، اچھا ہی ہوا زینت مر گئی ورنہ اس سے یہ صدمے کب برداشت ہوتے۔ وہ اپنے ہی گھر میں مہمان بن کر رہ گیا تھا۔ اب تو بیٹا اور بہو دونوں اسے آنکھیں دکھانے لگے تھے، بات بات پر جھڑکنے لگے تھے۔ ان کا سلوک حلیم کے ساتھ بالکل ایسا ہی ہو گیا تھا جیسے وہ ان کا گھریلو ملازم ہو۔ اچھے گھرانوں میں تو بوڑھے گھریلو ملازمین کی بھی عزت ہوتی ہے۔

حلیم اکثر سوچتا تھا کہ میری تربیت میں کہاں خامی رہ گئی؟ میں نے تو اپنے طور پر کریم کی بہترین تربیت کی تھی۔ اسے بہترین تعلیم سے آراستہ کیا تھا۔ حلیم نے سوچا، اگر میں بھی کریم کو کسی پیلے اسکول میں پڑھاتا تو آج اسے اتنی شاندار ملازمت ملتی نہ اتنی خوبصورت اور تعلیم یافتہ بیوی۔ بس۔ یہی میری غلطی تھی کہ میں نے اپنا تن پیٹ کاٹ کر کریم کو انتہائی مہنگے اسکول میں تعلیم دلائی۔ پھر وہ خود کو ملامت کرتا کہ یہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ میرا بیٹا ایک کامیاب اور خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے اور مجھے کیا چاہیے۔

وہ لان میں دیر تک بیٹھا سوچتا رہا اور آم کے اس درخت کو دیکھتا رہا جو زینت نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا لیکن اسے پھل کھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ازل سے یہی ہوتا آیا ہے۔ بزرگ کوئی پھل دار درخت لگاتے ہیں تو یہ نہیں سوچتے کہ اس کے پھل کھانے کا موقع ملے گا یا نہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم اس درخت کے پھل نہیں کھا سکے تو کیا ہوا، ہماری اولاد تو کھا سکے گی۔

اچانک وہ چونک اٹھا۔ سعدیہ اس کے نزدیک آکر چیخی تھی۔

"ابوجی! آپ یہاں بیٹھے ہیں؟"

"کیوں بہو، کیا یہاں نہیں بیٹھنا چاہیے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ یہاں بیٹھے رہے تو کام کون کرے گا؟"

"کیا کام ہے بہو؟" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

جواب میں سعدیہ نے اس کے ہاتھ پہ ایک لمبی چوڑی فہرست رکھ دی۔

وہ گھر کے ملازم سے سودا سلف نہیں منگاتی تھی۔ اسے یہ خدشہ رہتا تھا کہ ملازم سودے کے پیسوں کے سلسلے میں ہیر پھیر کرے گا۔

اس نے چپل اتار کر جوتے پہنے اور بازار جانے کو تیار ہو گیا۔

دفتر کا کوئی پرانا آدمی اسے دیکھ لیتا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہ کرتا۔ اب سے دو تین برس پہلے حلیم بہت خوش لباس اور جامہ زیب ہوا کرتا تھا۔ وہ لباس کے سلسلے میں خصوصی اہتمام کرتا تھا۔ اب تو اس کے شب و روز ہی بدل گئے تھے اور وہ خود کو واقعی گھریلو ملازم سمجھنے لگا تھا۔

اس نے داڑھی رکھ لی تھی جو اس کے چہرے پر بہت بھلی لگتی تھی لیکن ملگجی شلوار سوٹ اور دھول میں اٹے ہوئے بغیر پالش کے جوتے اس کی شخصیت پر پانی پھیر دیتے تھے۔

وہ کبھی کبھی خود بھی حیران ہوتا تھا۔ اس نے اپنا یہ حلیہ خود ہی بنایا تھا۔ اگر وہ پہلے ہی دن سے کریم اور سعدیہ کے ساتھ سخت رویہ اپناتا تو ان دونوں کی اتنی جرأت نہ ہوتی۔

وہ سودا لے کر گھر پہنچا تو اسے پھر سعدیہ کی جھڑکیاں سننا پڑیں۔ "کہاں رہ گئے تھے ابوجی! آپ تو جہاں جاتے ہیں بیٹھ جاتے ہیں، راستے میں مل گیا ہوگا کوئی اور بوڑھا۔ وہ بھی اپنی بہو کے خلاف زہر اگل رہا ہوگا۔ آپ نے بھی خوب دل کے پھپھولے پھوڑے ہوں گے۔"

"مجھ سے اس قسم کی باتیں مت کرو سعدیہ!" حلیم ناگواری سے بولا۔

سعدیہ نے چونک کر اسے دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔

گھر میں صبح ہی سے ہنگامہ تھا۔ جھاڑ پونچھ، قالینوں اور پردوں کی صفائی، فرنیچر کی صفائی اور ایک ایک چیز کی نئے سرے سے سیٹنگ! سعدیہ نے اپنی مدد کے لیے پڑوس کے گھر کی ملازمہ رحمت بی کو بھی بلالیا تھا۔ رحمت بی ہر قسم کے

کھانے پکانے میں ماہر تھیں۔
وقت تیزی سے گزر گیا اور شام کے سائے گہرے ہو گئے۔ کریم نے آخری بار گھر کا جائزہ لیا۔ ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی تھی۔ سعدیہ اور کریم دونوں ہی گھر کے کونے کونے کا جائزہ لے رہے تھے۔ کریم نے خوش دلی سے کہا۔ ”گڈ، ویری گڈ مسز سعدیہ کریم!“

جواب میں سعدیہ ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی اور بولی۔ ”کریم وہ ابو جی......“

کریم بھی بدمزہ ہو گیا۔ ”یار ابو جی کے بارے میں تو پہلے میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“

اس نے سوچا کہ ابو جی کو ان کے دوست رشید انکل کے گھر چھوڑ آتے ہیں لیکن پھر خود ہی اس نے اپنے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ اتنی مشکل سے تو ان سے جان چھوٹی تھی۔ اب پھر وہ انہیں اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

”ایسا کریں ابو جی کو رات بھر کے لیے ماموں کے گھر بھجوا دیں۔“ سعدیہ نے کہا۔

”فضول باتیں مت کرو سعدیہ!“ کریم نے اسے جھڑک دیا۔ ”ابو جی ماموں کے گھر کسی بھی حالت میں نہیں جاتے۔ شروع ہی سے ابو اور ماموں کے درمیان ناچاقی تھی۔“

پھر وہ ابو جی کے کمرے میں گھس گیا۔ حلیم دیوار کی طرف منہ کیے کان سے ٹرانسسٹر لگائے خبریں سن رہا تھا۔

کریم نے ٹرانسسٹر ان کے ہاتھ سے لے لیا اور بولا۔ ”ابو جی! مہمان آئیں تو آپ اپنے کمرے میں رہیے گا۔“

”کیوں؟“ حلیم نے حیرت سے پوچھا۔

”دعوت میں میرے دفتر کے ایم ڈی کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے لوگ ہوں گے۔ وہ نہ جانے کیا کہہ دیں اور آپ جواب میں کچھ اور کہیں اس لیے کہہ رہا ہوں۔ آپ کا کھانا آپ کے کمرے میں بھجوا دوں گا۔“ یہ کہہ کر کریم تیز تیز قدموں سے باہر چلا گیا۔

حلیم نے تلخی سے سوچا۔ ”یہ مجھے بالکل ہی جاہل سمجھتا ہے۔ میں نے تو ایسی دعوتوں میں شرکت کی ہے جہاں وزیر اعلیٰ اور گورنر مہمانوں میں شامل ہوتے تھے۔ میں ریٹائرمنٹ سے قبل گریڈ سترہ کا افسر تھا۔ سعدیہ تو سمجھتی ہے کہ میں کسی سرکاری دفتر میں چپراسی تھا۔“

برآمدے سے گزرتے ہوئے کریم کی نظر ایک آرام کرسی پر پڑی۔ کرسی کیا وہ صوفہ ہی تھا۔

اس نے سعدیہ سے کہا۔ ”ہم ابو جی کو اس صوفے پر بٹھا دیں گے۔ اس طرح ان کی نیند اور خراٹوں سے بھی نجات مل جائے گی اور میں مہمانوں کے سامنے سبکی سے بچ جاؤں گا۔“

وہ دوبارہ کمرے میں آیا اور حلیم سے بولا۔ ”ابو جی، ذرا میرے ساتھ آئیں۔ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر باہر برآمدے میں لے آیا۔ ”اب ذرا اس صوفے پر بیٹھیے۔“

حلیم نے الجھ کر کریم کو دیکھا اور بولا۔ ”بات کیا ہے بیٹے؟“

”آپ ذرا اس صوفے پر بیٹھیں۔“ کریم نے اس مرتبہ درشت لہجے میں کہا۔

حلیم جلدی سے بیٹھ گیا۔ نہ صرف بیٹھ گیا بلکہ اپنے دونوں پاؤں بھی صوفے پر رکھ لیے۔

”یہ کیا کر رہے ہیں ابو جی!“ سعدیہ چیخ کر بولی۔ ”مہمانوں کے سامنے آپ یوں گنواروں کی طرح بیٹھیں گے؟“ پھر وہ نرم لہجے میں بولی۔ ”صوفے پر ہمیشہ پاؤں نیچے کر کے بیٹھا کریں۔ مہمان کیا سوچیں گے کہ بیٹا تو کنونیٹیں پڑھا ہے اور باپ کو صوفے پر بیٹھنے کی بھی تمیز نہیں۔“

”ابو جی! آپ وہ جوڑا پہن لیجیے گا جو میں نے آپ کو عید پر دلوایا تھا۔“

”اور پلیز، یہ ٹوٹا پھوٹا جوتا کہیں پھینک دیں۔ چپل بھی وہی پہن لیں جو آپ کو عید پر دلوائی تھی۔“ سعدیہ نے کہا۔

”ہاں، ابو جی!“ کریم نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”اپنی رولیکس گھڑی بھی نکال لیں۔“

حلیم جھنجلا کر بولا۔ ”مہمان دعوت میں آ رہے ہیں یا میرے بردکھوے کو؟ میں تو اپنے کمرے میں ہی ٹھیک ہوں۔“

”تا کہ آپ وہاں پھیل کر سو جائیں اور مہمانوں کو آپ کے خراٹے سن کر کوفت ہو۔“ سعدیہ نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

سعدیہ کو گھر کی سجاوٹ کے ساتھ ساتھ ابو جی کا اہتمام بلکہ ان کے نخرے اٹھانا پڑ رہے تھے۔

رات آٹھ بجے تک ہر چیز تیار تھی۔ حتیٰ کہ گھر کے ملازم نے بھی ہوٹل کے بیروں والی مخصوص وردی پہن لی



تھی۔

تھوڑی دیر بعد مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔

حلیم پروگرام کے مطابق اسی صوفہ نما کرسی میں دھنسے بیٹھے تھے۔ مہمان تو رہے ایک طرف وہ تو کسی بھی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔

پارٹی عروج پر تھی اور حلیم نے اب تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ ہال کمرے سے برتن کھنکنے اور مہمانوں کے بلند آہنگ قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ حلیم نے ملازم کو بلایا اور کہا۔ ”میرا کھانا یہیں لے آؤ۔“

ملازم ان کے لیے وہیں سب کچھ لے آیا۔ حلیم نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ حلیم نے سوچا جب میں انگلیاں چاٹتا رہ گیا ہوں تو مہمانوں کو بھی پسند آئے گا۔ وہ کھانا کھا کر پھر اسی انداز میں بیٹھ گیا، جیسی کریم نے ہدایت کی تھی۔

پیٹ بھرا ہو تو پھر نیند بھی خوب آتی ہے۔ حلیم تو یوں بھی بھرپور نیند لینے کا عادی تھا۔ نہ جانے کب اور کیسے اس کی آنکھ لگ گئی۔

مہمان کھانے سے فارغ ہوئے تو کریم انہیں اپنا گھر دکھانے لگا۔ برآمدے میں نکلتے ہیں کریم کی نظر ابو جی پر پڑی۔ ابو جی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئے تھے۔ ان کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا اور حلق سے زوردار خراٹوں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

بڑے صاحب نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”بے چارے کو نیند آئی تو کرسی ہی پر سو گیا۔“

حلیم کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے ارد گرد اتنے لوگوں کو دیکھ کر وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ اس نے بے اختیار کہا۔ ”السلام...... علیکم!“

”وعلیکم السلام!“ بڑے صاحب نے جواب دیا اور ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

”ابو جی!“ کریم کا لہجہ کچھ سخت تھا۔ حلیم کو مہمانوں کے سامنے ذلیل ہونا اچھا نہیں لگا۔ ”سر، ہاتھ ملا رہے ہیں۔“

حلیم نے دونوں ہاتھوں سے بڑے صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ اس کوشش میں حلیم کی ٹوپی سر سے ڈھلک کر کان میں اٹک گئی۔ مہمان حلیم کو اس حلیے میں دیکھ کر منہ دبا دبا کر ہنسنے لگے۔

کریم کو شدید ذہنی کوفت محسوس ہو رہی تھی، پھر وہ

## نجاشی

لفظ نجوش سے بنا ہے جس کے معنی بادشاہ کے ہیں، یہ لقب حبشہ کے بادشاہوں کا رہا ہے جو ہزار ہا سالوں سے وہاں حکومت کرتے چلے آئے ہیں۔ ابتداء میں نجاشی اور اس کی قوم عیسائی تھی۔ یہاں مسلمان تجارت وغیرہ کی غرض سے آیا جایا کرتے تھے۔ ایک جنگ میں اٹلی نے اس ملک پر قبضہ کر کے یہاں کے بادشاہ ہیل سلاسی کو نکال باہر کیا تھا، مگر جنگ عظیم دوئم کے بعد اسے اپنا ملک واپس مل گیا۔

## نیگوش نجاشی

نجاشی بادشاہوں میں سے ایک شاہ حبشہ متوفی 6ھ بمطابق 631ء اس کا اصل نام اصمعہ تھا۔ نبوت کے پانچویں برس جب قریش کے ظلم و جور سے تنگ آ کر مسلمانوں نے ہجرت حبشہ کی تو اس نے پناہ دی۔ اس کے بارے میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ”نجاشی کے مرنے کے بعد ہم لوگ باہم گفتگو کرتے تھے کہ اس کی قبر پر ہمیشہ نور دکھائی دیتا ہے۔“

## نجد

عرب کا کوہستانی علاقہ، وہاں کا مرکزی صوبہ، ایک اہم شہر ریاض بھی اسی میں شامل ہے۔

## نجس

گندہ، ناپاک، پلید، مکروہ تحریمی، ناقابل استعمال، جو اشیاء ان ـــ میں آتی ہوں نجس العین کہلاتی ہیں۔ شرعاً ان کا استعمال جائز نہیں۔ مثلاً شراب اور ایسے ہی دوسرے مشروبات، خون اور جسمانی فضلے، ان جانوروں کا دودھ جن کا گوشت نہ کھایا جاتا ہو۔ اسی طرح کتے بھی نجس العین ہیں۔ انہیں چھونا ناپاکی کی علامت ہے۔ جس گھر میں یہ ہوں، وہاں رحمت کے فرشتے نہیں جاتے۔ اس طرح سور، مردار وغیرہ خدا نے حرام قرار دے دیے ہیں۔ ان کے بارے میں سورہ بقرہ 173، سورہ انعام 146، سورہ مائدہ 3 اور سورہ نحل میں واضح طور پر ارشاد باری تعالیٰ درج ہے۔ شراب اور ایسے مشروبات کے بارے میں متعدد احادیث سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

مرسلہ: راحیلہ جونیجو، کوٹری

بات کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”سر، اصل میں میرے فادر بہت ہی سیدھے سادے اور سمپل آدمی ہیں۔ زندگی بھر گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر کے علاوہ کہیں گئے ہی نہیں ہیں۔ فارغ اوقات میں ابو جی سب سے الگ تھلگ اسکیچز بنانے میں لگے رہتے ہیں۔“ کریم زبردستی وضاحتیں دیے جا رہا تھا۔

”اسکیچز!“ بیگم صاحبہ پھڑک کر بولیں۔

”ہاؤ سویٹ، کہاں ہے اسکیچز؟ بھئی ہمیں بھی تو دکھاؤ اپنے ابو جی کے ہاتھوں کا کمال!“

حلیم ابھی تک کھڑا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی توجہ ہٹی تو وہ خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکل گیا اور اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔

پھر اسے مہمانوں کے رخصت ہونے کی آوازیں آئیں۔

دوسرے ہی لمحے سعدیہ ابو جی کے کمرے میں داخل ہوئی اور چیخ کر بولی۔ ”جب آپ سے بار بار یہ کہا گیا تھا کہ سوئیے گا مت، پھر بھی آپ سو گئے؟ آپ نے تو مہمانوں کے سامنے ہماری ناک کٹوا دی۔“

جب سے کریم کی شادی ہوئی تھی، حلیم نے غصہ کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن اس وقت سعدیہ کے لہجے پر اسے ایک دم غصہ آ گیا۔ زیادہ غصہ اس لیے بھی آیا کہ کریم بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے بھی اپنی بیوی کو نہیں ٹوکا۔

حلیم بھنا کر بولا۔ ”کیوں بہو، کیا مہمان سوتے نہیں ہیں جو تمہاری ناک کٹ گئی اور ناک ان لوگوں کی کٹتی ہے جن کے چہروں پر بھی ناک ہوتی ہے۔“

”یہ آپ مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہیں؟“ سعدیہ بپھر گئی۔

”میرا لہجہ ابھی تم نے دیکھا ہی کہاں ہے بہو! مجھے مینرز اور ایٹی کیٹس سکھانے چلی ہو۔ آئندہ اپنی حد میں رہنا اور میرے معاملات میں دخل مت دینا۔“

”کریم!“ سعدیہ چیخی۔ ”دیکھ رہے ہو اپنے باپ کی حرکت؟“

”ابو جی!“ کریم نے چیخ کر کہا۔

”اپنی آواز نیچی رکھو۔“ حلیم اس پر الٹ پڑا۔ ”میں تم لوگوں کی ہر بات اس لیے برداشت کرتا رہا کہ ایک دن تمہیں خود ہی احساس ہوگا لیکن تمہاری بدتمیزی میں تو کمی آنے کی بجائے اضافہ ہی ہوا ہے۔“

”ابو جی!“ سعدیہ شدید غصے کی حالت میں بولی۔

”شٹ اپ!“ حلیم نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ آئندہ مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرنا۔“ پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”میرے لیے میری پنشن ہی بہت کافی ہے۔ اور سعدیہ بی بی میں کوئی جاہل آدمی نہیں ہوں بلکہ ایم اے پاس ہوں۔ تم نے تو مجھے جوتوں میں ڈال کر پہن لیا۔“ پھر وہ کریم سے مخاطب ہوا۔ ”میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو سبھی چونک اٹھے۔ کریم نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا اور بولا ”ہیلو...... جی بیگم صاحبہ...... جی بالکل آپ ہی کا گھر ہے۔ میں کوشش کروں گا۔“ وہ ٹیلی فون پر بات کر کے آیا تو وہ بہت خوش تھا، پھر اس کے چہرے پر پشیمانی اور ندامت کے تاثرات نمودار ہوئے اور وہ حلیم سے بولا۔ ”ابو جی، بیگم صاحبہ کا ٹیلی فون تھا۔ وہ آپ کے بنائے ہوئے اسکیچز دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ انہیں خود بھی اسکیچز بنانے کا شوق ہے لیکن وہ آپ کے اسکیچز دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ آپ کو کام کرتے ہوئے دیکھیں۔“

”بیٹا! مجھ سے بڑھاپے میں ایسی مشقت نہیں ہوگی۔ پھر میری نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔ اب میرے کام میں اتنی صفائی نہیں آ سکتی۔ تم ایسا کرو، انہیں بازار سے خرید کر دے دو۔“

”ابو جی بیگم صاحبہ آپ ہی کے ہاتھ کا بنایا ہوا اسکیچز چاہتی ہیں۔ دیکھیے اگر بیگم صاحبہ آپ کے کام سے خوش ہوں گی تو وہ بڑے صاحب سے میری ترقی کی سفارش بھی کر دیں گی اور ممکن ہے بڑے صاحب مجھ سے خوش ہو کر مجھے منیجر بنا دیں۔“

بیٹے کی ترقی کے بارے میں سنا تو حلیم نے خوش ہو کر کہا۔ ”بیٹا! میری اس معمولی سی محنت سے تیری ترقی ہو جائے گی تو منیجر بن جائے گا؟ اگر ایسا ہے تو میں بیگم صاحبہ کے لیے ایک نہیں کئی اسکیچز بنا سکتا ہوں۔“

حلیم کے کمرے سے واپسی پر کریم نے سعدیہ کو آنکھ ماری اور بولا۔ ”یہ بوڑھے محبت کے دو بولوں سے پگھل جاتے ہیں۔“

”لیکن مرتے نہیں ہیں۔“ سعدیہ جلے کٹے انداز میں بولی۔



# آہٹ

مکرمی جناب
السلام علیکم!
ایک ایسی سرگزشت بھیج رہا ہوں جسے عقل کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جا سکتا مگر یقین کریں یہ سب کچھ حرف بہ حرف سچ ہے اور میری امی بھی اس کی گواہ ہیں۔ وردہ میری امی کا نام ہے۔

آصف اقبال
(گوجرانوالہ)

پہلا مرڈر نسیم صاحب کا ہوا تھا۔

نسیم صاحب جو اس گھر کے سربراہ تھے۔ ساٹھ پینسٹھ کی عمر کے لیکن ان کی صحت ابھی تک شاندار تھی، وہ اپنی فرم کی دیکھ بھال خود کیا کرتے۔

پورے گھر پر ان کا رعب تھا۔

اپنی جوانی میں وہ زبردست شکاری بھی رہے تھے۔ ایک دلیر انسان جس نے ساری زندگی جدوجہد میں گزاری تھی۔

ان کے گھر میں چھ افراد تھے۔ نسیم صاحب، ان کی

بیوی نائلہ بیگم جو خود بھی اپنے شوہر کی طرح ایک باوقار خاتون تھیں۔ دو بیٹے، اکبر اور اظہر۔ اکبر بڑا بیٹا جس کی شادی ہو چکی تھی اور جو اپنی بیوی وردا کے ساتھ اسی گھر میں رہا کرتا اور ایک بیٹی شبنم جو سب سے چھوٹی تھی اور تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

کچھ دنوں سے ایک مہمان بھی آکر ٹھہرا ہوا تھا' قدیر یہ ان مہمانوں میں سے تھا جن کو گھر والے پسند نہیں کرتے، مجبوراً برداشت کرتے ہیں۔

قدیر بھی ایسا ہی تھا۔

وہ نسیم صاحب کی بیگم نائلہ کا سوتیلا بھائی تھا جس کی ساکھ اچھی نہیں تھی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اس نے نائلہ سے منت سماجت کی تھی۔ نسیم صاحب اسے برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن نائلہ بیگم کی سفارش پر قدیر کو انیکسی میں جگہ دے دی گئی تھی۔

گھر کے افراد میں سب سے چھوٹی ایک بچی تھی۔ اکبر اور وردا کی بیٹی جو ابھی صرف تین مہینے کی ہوئی تھی۔ بہت خوبصورت اور تندرست۔ اس بچی کی سب سے قابل توجہ چیز اس کی خوبصورت آنکھیں تھیں جو دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتیں۔

نسیم صاحب اور نائلہ کے کمرے ایک دوسرے سے ملحق تھے۔ درمیان میں ایک دروازہ رکھا گیا تھا۔ نسیم صاحب تنہا سونے کے عادی تھے۔ وہ رات گئے تک تیز روشنی میں مطالعہ کیا کرتے اور نائلہ بیگم کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی، ان کا کمرا اس لیے بھی الگ ہو گیا تھا۔

نسیم صاحب عام طور پر بہت جلدی اٹھ جایا کرتے لیکن جب اس صبح وہ ناشتے کی میز پر نہیں آئے تو گھر والوں کو تشویش ہونے لگی۔ سب نے جا کر دروازے پر دستک دی پھر جب اندر سے خاموشی رہی تو پھر دروازہ توڑ دیا گیا۔

نسیم صاحب کی لاش قالین پر پڑی ہوئی تھی۔ بہت بے دردی سے ان کا مرڈر کیا گیا تھا۔

اس گھر میں ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔

نائلہ بیگم اپنے شوہر کی ایسی لاش دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اس وقت صرف چھوٹے بیٹے اظہر نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔ اسی نے فون پر پولیس کو اطلاع دی تھی۔

یہ اتفاق تھا کہ اس علاقے کا ایس پی جاوید انور وردا کا قریبی عزیز ہوتا تھا۔ ایک ذہین اور محنتی شخص' وہ فوراً ہی پولیس کی نفری کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔

پولیس والوں نے معمول کی کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ تصویریں، فنگر پرنٹس وغیرہ۔ جاوید انور کی وجہ سے تفتیش کے مراحل دوسرے دن کے لیے اٹھا رکھے گئے تھے۔ وہ دن انہیں تدفین کے انتظامات کرتے ہوئے گزارنا پڑا تھا۔

دوسری صبح جاوید انور ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کیس اسی کے پاس آیا تھا۔ نائلہ بیگم نے بھی کسی حد تک خود کو سنبھال لیا تھا۔

جاوید کے لیے بات کا آغاز بہت مشکل ہو رہا تھا اس گھر سے اس کے بہت پرانے مراسم تھے۔ یہ گھر اس کی کزن وردا کا تھا اور اس گھر کے سب سے اہم فرد کو بہت بے دردی سے ہلاک کر دیا گیا تھا۔

"آنٹی سب سے پہلے میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہوں گا۔" اس نے نائلہ بیگم کی طرف دیکھا۔ "کیونکہ آپ کا کمرا ان کے کمرے کے برابر میں تھا۔ آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ کو کچھ محسوس ہوا۔ میرا مطلب ہے کہ کسی قسم کی آواز، کچھ افراتفری۔"

"نہیں، کچھ بھی نہیں۔" نائلہ بیگم نے جواب دیا۔ "کچھ بھی محسوس نہیں ہوا، گہری خاموشی رہی تھی۔"

"حالانکہ ان کا قتل اس طرح ہوا ہے جیسے کسی درندے نے ان پر حملہ کر دیا ہو۔" جاوید انور نے بتایا۔ "پورا سینہ ادھڑا ہوا ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ قاتل نے کس آلے سے انہیں قتل کیا۔ تلاش کے باوجود پولیس کو آلۂ قتل نہیں مل سکا ہے۔"

"بیٹا۔ اب میں کیا بتا سکتی ہوں۔" نائلہ بیگم کی آواز بجھی ہوئی تھی۔ "جو کچھ ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔"

"اکبر۔" جاوید انور نے اکبر کی طرف دیکھا۔ "بہت پرانا گھسا پٹا سوال ہے لیکن مجبوراً کرنا پڑتا ہے، کیا انکل کی کسی سے مخالفت تھی یا دشمنی وغیرہ۔"

"ہرگز نہیں۔" اکبر نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی۔ "یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ پاپا ایسے آدمی بھی نہیں تھے۔"

"ایک الجھن یہ بھی ہے کہ دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔" جاوید انور نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ کسی کے دستک دینے پر انہوں نے خود ہی دروازہ کھولا ہو اور اس کو رخصت کر کے دروازہ بند کر دیا ہو۔"

"لیکن اس سے بھی بات نہیں بن رہی ہے۔" اظہر نے کہا۔ "کیونکہ قتل کے وقت تو دروازہ اندر سے بند تھا۔"

"ہاں یہ بھی الجھن ہے۔" جاوید انور سر ہلا کر بولا۔



"اب ایک ہی امکان رہ گیا ہے کہ مارنے والا آنٹی کے کمرے سے برابر والے کمرے میں داخل ہوا ہو۔"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" نائلہ نے کہا۔ "کیونکہ میں اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں کرتی۔"

"اور وہ آپ ہی کے دروازے سے نکل کر باہر چلا گیا ہو۔"

"لیکن ایسا کون ہو سکتا ہے۔ گھر میں ہمارے علاوہ اور ہے کون؟" وردا نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب مجھے گھر کے ہر فرد سے تفتیش کرنی ہو گی۔"

☆☆☆

وردا بہت خوفزدہ تھی۔ نسیم صاحب اس کے سسر ہی نہیں بلکہ باپ کی طرح تھے۔ انہوں نے وردا کو بہت محبت دی تھی۔ بہت خیال رکھا تھا اس کا، اپنی بیٹی شبنم کی طرح اس سے پیار کرتے تھے۔

لیکن کسی بے رحم قاتل نے انتہائی بے رحمی کے ساتھ ان کی جان لے لی تھی۔ کیوں، اس کا جواب فی الحال کسی کے پاس نہیں تھا۔

اس نے ایس پی جاوید انور کو ایک بات نہیں بتائی تھی کہ اس نے قدیر کو رات کے وقت نسیم صاحب کے کمرے کے باہر منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔

قدیر ایک آوارہ اور بدقماش قسم کا شخص تھا لیکن نائلہ بیگم اس سے بہت پیار کرتی تھیں کیونکہ وہ ان کا اکلوتا بھائی تھا۔ سوتیلا ہی سہی۔ نائلہ بیگم کی نگاہوں میں قدیر کی بہت اہمیت تھی۔ وردا اسی لیے قدیر کے بارے میں کچھ بتا کر اپنی ساس کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اگر یہ بات غلط ثابت ہو جاتی تو نائلہ بیگم وردا کے لیے بہت سخت ہو جاتیں۔ لیکن دوسری طرف نسیم صاحب کے قاتل کا سراغ بھی بہت ضروری تھا۔

اس نے سر میں درد محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب بھی وہ کچھ سوچنا شروع کرتی اس کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔

سر درد کی دوا ہر وقت اس کے پاس ہی ہوتی تھی۔ اس نے دوا کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اسی وقت اسے کچھ محسوس ہونے لگا۔ کوئی غیر فطری احساس جیسے وہ کمرا کسی قسم کی بھن بھناہٹ سے بھر گیا ہو۔ خوف کے سائے ہر طرف رینگ رہے ہوں۔ یہ بھن بھناہٹ نہ جانے کیسی تھی جو پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔

وردا نے گھبرا کر بچی کی طرف دیکھا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں اس طرح کھلی ہوئی تھیں جیسے وہ یہ پوچھ رہی ہوں کہ مما یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اور اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی، وہ چونک گئی۔

اس دستک کے ساتھ ہی کمرے سے وہ غیر فطری دباؤ اچانک ختم ہو گیا۔ وہ پراسرار بھن بھناہٹ بھی کہیں غائب ہو گئی تھی۔

وردا نے جا کر دروازہ کھولا۔ شبنم کھڑی ہوئی تھی۔ دن بھر روتے رہنے سے اس کی آنکھیں سوج سی گئی تھیں۔ وردا اس کا ہاتھ تھام کر اندر لے آئی تھی۔

شبنم اس سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ اب کمرے کی فضا مزید سوگوار ہو گئی تھی۔

"بھابی یہ سب کیا ہو گیا۔" شبنم نے مسہری پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں ہو گیا یہ سب۔ پاپا تو بہت اچھے آدمی تھے۔ کسی نے ان کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔"

"خدا جانے۔ تم یہ بتاؤ' امی نے کچھ کھایا؟"

"نہیں۔ میں اسی لیے تو آپ کے پاس آئی تھی کہ آپ ہی ان سے کہیں۔ میری تو وہ بات ہی نہیں سنتیں۔"

وردا نے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ شبنم نے وردا سے کہا۔ "بھابی صندل کو یہیں چھوڑ جائیں میرے پاس، میں اسے دیکھ لوں گی۔ آپ جا کر امی کو سنبھالیں۔"

وردا نے بچی شبنم کے حوالے کر دی۔ شبنم کو باپ کی موت نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے ابو کتنے اچھے انسان تھے۔ کتنا پیار کرنے والے۔ کتنا خیال رکھنے والے۔

اچانک شبنم کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کمرے میں سناٹا سا دوبارہ بھر گیا ہو۔ یہ ایک غیر فطری احساس تھا۔ سناٹا اپنا مکمل احساس دلا رہا تھا۔ اس کمرے کو جیسے کسی نے اچانک ساؤنڈ پروف بنا دیا ہو۔ باہر کی کوئی آواز اندر نہیں آ رہی تھی۔ سوائے ایک بھن بھناہٹ کے۔

بہت سی مکھیاں ایک ساتھ بھن بھنا رہی تھیں۔ لیکن ایسی پریشان کر دینے والی بھن بھناہٹ مکھیوں کی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ کوئی اور بات تھی۔

شبنم نے بوکھلا کر دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ اس کمرے سے نکل جانا چاہتی تھی۔ دروازے کے پاس جا کر اسے صندل کا خیال آیا۔ وہ واپس آئی لیکن صندل بستر

پرنہیں تھی۔

اس نے صندل کو بستر پر لٹا دیا تھا۔ پھر وہ اچانک کہاں غائب ہوگئی تھی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی، اس کے ساتھ ہی کمرے میں موجود وہ احساس ایک دم ختم ہوگیا۔

وہ بھن بھناہٹ بھی غائب ہوگئی تھی اور شبنم نے بستر سے نیچے گری ہوئی بچی کو بھی دیکھ لیا تھا جو زور زور سے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ شاید وہ کروٹ لے کر نیچے گر پڑی تھی۔ شبنم نے صندل کو گود میں اٹھا لیا تھا۔ وردا کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

''کیا بات ہے شبنم خیریت تو ہے۔'' وردا نے شبنم کے خوفزدہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بھابی۔ میں اس کمرے میں۔'' شبنم کی آواز اٹکنے لگی تھی۔ ''اس کمرے میں کچھ ہے نہ جانے کیسا لگا تھا جیسے ہزاروں مکھیاں بھن بھنا رہی ہوں۔''

''اوہ گاڈ۔'' وردا نے ایک گہری سانس لی۔ ''شبنم کچھ دیر پہلے خود مجھے بھی ایسا ہی احساس ہوا تھا۔''

☆☆☆

اور اس رات اس گھر میں دوسرا خون بھی ہوگیا۔ یہ خون قدیر کا تھا۔ نائلہ بیگم کے بھائی کا۔ اس کا خون بھی اسی انداز میں ہوا تھا جیسے نسیم صاحب کا ہوا تھا۔ اسی بے رحمی کے ساتھ اس کے جسم کی بھی دھجیاں ہوگئی تھیں۔

نائلہ بیگم کو چار دنوں کے بعد دوسرا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا تھا۔

جاوید انور چکرا کر رہ گیا تھا۔ نسیم صاحب کی موت کے بعد اس نے قدیر پر دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔ قدیر کا پچھلا ریکارڈ گو اس کے سامنے تھا۔

اس کا خیال تھا کہ شاید نسیم صاحب کی موت میں قدیر کا ہاتھ ہوگا لیکن اب قدیر کی موت نے پوری صورت حال ہی تبدیل کر دی تھی۔ اس گھر کی فضا ماتمی ہو کر رہ گئی تھی۔

چار دنوں میں یہ دوسرا جنازہ اٹھا تھا۔ قدیر کی لاش کمرے میں نہیں بلکہ باہر لان پر پائی گئی تھی۔ خود نائلہ بیگم ہی نے یہ لاش دریافت کی تھی۔ ان کی چیخ و پکار سے پورا گھر جمع ہوگیا تھا۔

قدیر کی تدفین دن بھر کی کارروائی کے بعد مغرب سے پہلے کر دی گئی تھی اور اب سب اداس اور خوفزدہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ اب کسی میں افسوس کرنے کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔

اس گھر کے ملازمین خوفزدہ ہو کر چلے گئے تھے۔ وردا اور شبنم سب کے لیے چائے بنا کر لائی تھیں۔

جاوید انور بھی ایک طرف سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک بار پھر اسی قسم کے سوال و جواب۔ گرچہ مجھے اندازہ ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ بہت حیرت انگیز اور بھیانک ہے۔''

''جاوید۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا کہہ رہی ہے۔'' اکبر نے پوچھا۔

''وہی پچھلی کہانی کہ شاید کسی درندے نے ایسا کیا ہے۔'' جاوید نے جواب دیا۔

''لیکن اس گھر میں درندہ کہاں سے آگیا۔'' اظہر جلدی سے بول پڑا۔ ''فرض کیا کہ قدیر ماموں لان پر تھے اسی لیے کسی درندے کو موقع مل گیا لیکن ابو تو کمرے کے اندر تھے۔ وہ کیسے کسی درندے کا شکار ہوگئے۔''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔'' جاوید نے ایک گہری سانس لی۔ ''بہت الجھا ہوا کیس ہے۔ قتل کا کوئی محرک تو ہوا کرتا ہے لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''سنیں۔'' وردا نے اپنے شوہر اکبر کو مخاطب کیا۔ ''کیوں نہ ہم یہ مکان چھوڑ دیں۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' اکبر نے پوچھا۔ ''کیا موت ہمارا پیچھا چھوڑ دے گی۔''

''میرا خیال ہے کہ وردا کا مشورہ بالکل صحیح ہے۔'' جاوید نے کہا۔ ''کیونکہ اس مکان میں اس خونی کی آمد و رفت ہوگئی ہے۔ اگر وہ کوئی درندہ ہے تو بھی۔ کوئی انسان ہے تب بھی۔''

''بیٹے۔'' نائلہ بیگم کی آواز سنائی دی۔ اتنی دیر کے بعد وہ پہلی بار بولی تھیں۔ ''ہم اس مکان کو چھوڑ کر کہاں جا سکتے ہیں۔ البتہ پولیس کو چاہیے کہ وہ گھر والوں کی حفاظت کا بندوبست کردے۔''

''وہ تو کرنا ہی ہوگا آنٹی۔'' جاوید نے کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کوئی ان نیچرل سلسلہ ہو۔'' اکبر سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کوئی آسیب یا کوئی اور بلا ٹائپ کی چیز۔''

''ارے نہیں۔'' جاوید نے تردید کی۔ ''اس دور میں ایسی باتیں نہیں ہوا کرتیں اور ہم پولیس والے تو ویسے بھی ان خرافات کو نہیں مانتے۔''



''تو پھر کیا ہے؟''

''آنٹی یہ بتائیں اس گھر میں پرانے بنے ہوئے تہ خانے تو نہیں ہیں۔'' جاوید نے کہا۔ ''کیونکہ مکان تو بہت قدیم ہے۔''

''ہاں قدیم تو ہے۔ نسیم صاحب کے والد نے خریدا تھا۔ ساٹھ ستر سال پہلے۔'' نائلہ بیگم نے بتایا۔ ''ہوسکتا ہے کہ اس زمانے کا کوئی تہ خانہ ہو۔ کم از کم میں نے تو نہیں دیکھا۔''

''میں نے اسی لیے پوچھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی بے رحم قاتل تہ خانے میں آکر چھپ گیا ہو۔''

''اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے کمروں میں تہ خانوں کے راستے نکلتے ہوں۔'' شبنم نے کہا۔ ''اسی لیے ہمیں سب سے پہلے ابو کے کمرے کی تلاشی لینی چاہیے۔''

نسیم صاحب کے کمرے کو ان کی موت کے بعد بند کر دیا گیا تھا لیکن اس وقت اسی کمرے کو کھول کر کمرے کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ ایک ایک گوشے، ایک ایک دیوار کو ٹھونک پیٹ کر دیکھا جا رہا تھا۔

بالآخر اس کمرے میں تہ خانے کی موجودگی کا پتا چل ہی گیا۔

☆☆☆

لکڑی کی بھاری الماری کے پیچھے تہ خانے میں اترنے کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

وہ خفیہ دروازہ الماری کے پیچھے سے دریافت ہوا تھا۔ وہ سب دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ تہ خانے میں اترتی ہوئی سیڑھیوں کو دیکھ رہے تھے۔ جس کے اختتام پر نہ جانے کیا ہوسکتا تھا۔

دن میں گھپ اندھیرا تھا۔ جاوید نے خواتین کو منع کر دیا تھا کہ وہ تہ خانے میں نہ اتریں لیکن کوئی بھی اس کے لیے راضی نہیں ہوا تھا۔ وردا اپنی بچی کو بھی گود میں اٹھائے ہوئے لے آئی تھی۔

جاوید کے کہنے پر ایک پیٹرومیکس روشن کر دی گئی اور سب آہستہ آہستہ تہ خانے میں اترنے لگے اور اچانک سیڑھیاں جیسے آکٹوپس بن گئیں۔ ان کے قدم جم کر رہ گئے تھے۔

ایسا محسوس ہوا جیسے وقت ساکت ہوگیا ہو۔ سناٹے کا ایسا غیر فطری احساس انہیں پہلے کبھی نہیں ہوا ہوگا۔ ایک پراسرار سا رگوں میں خون کو منجمد کر دینے والا سناٹا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہزاروں، لاکھوں مکھیوں کی بھن بھناہٹ۔ یہ بھن بھناہٹ ایک لے ایک آہنگ پر تھی لیکن شاید وہ مکھیوں کی بھن بھناہٹ نہیں تھی بلکہ ہزاروں اور لاکھوں لوگوں کی دھیمی دھیمی آوازیں تھیں۔ ایک آہنگ پر جیسے کوئی گیت گایا جا رہا ہو۔ کوئی پراسرار اور انوکھا گیت جس کے بول ان کی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ لیکن ان کے دلوں پر دہشت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

اور اسی وقت ایک آواز گونجی۔ ہنسنے کی آواز، یہ وردا اور اکبر کی بچی کی آواز تھی۔ وہ نہ جانے کس بات پر قلقاریاں لے رہی تھی۔ اس کی معصوم آواز نے ان سیڑھیوں پر چھائے ہوئے طلسم کو ختم کر دیا تھا۔ اب کچھ بھی نہیں تھا، نہ کوئی بھن بھناہٹ تھی اور نہ کسی قسم کے سناٹے کا کوئی احساس۔ سب کچھ نارمل ہو چکا تھا۔ تہ خانہ صرف ایک پرانا تہ خانہ تھا جس کا فرش گرد آلود تھا اور جس کی دیواریں جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھیں۔

''کیا آپ لوگوں نے کچھ محسوس کیا تھا؟'' جاوید نے ان لوگوں سے پوچھا۔

''ہاں ہم سبھوں نے محسوس کیا۔ حیرت انگیز سناٹا۔ اس کے بعد بھنبھناہٹ۔''

''بچو یہاں سے باہر چلو۔'' نائلہ بیگم کی آواز گونجی۔ ''یہ جگہ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔''

نائلہ بیگم کو شبنم اور وردا کے ساتھ اوپر بھیج دیا گیا جب کہ جاوید، اکبر اور اظہر نے تہ خانے کی تلاشی لینی شروع کر دی لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

صرف تہ خانہ تھا۔ ایسا تہ خانہ جہاں شاید برسوں سے کسی کا گزر نہ ہوا ہو، وہاں ایسی کوئی پراسرار بات نہیں تھی، کوئی بھید نہیں تھا۔

اچانک اکبر کی نگاہ ایک جانب گئی۔ ایک دیوار کے ساتھ مٹی کا ایک بہت بڑا ڈھیر رکھا ہوا تھا۔ جیسے یا تو مٹی کا کوئی ٹیلہ ہو یا پھر کسی چیز کو مٹی سے ڈھانپ دیا گیا ہو۔

اکبر کے توجہ دلانے پر انہیں جوش سا آگیا تھا۔ اظہر دوڑ کر مکان سے ویکیوم کلینر لے آیا تھا جو بیٹری سے آپریٹ ہوتا تھا۔ ذرا سی دیر میں پورے تہ خانے میں گرد اڑنے لگی تھی۔ ڈھیر کے نیچے سے ایک صندوق برآمد ہوا۔

صندوق کی مٹی صاف ہوئی تو پتا چلا کہ وہ لکڑی کا ایک قدیم طرز کا صندوق تھا جس کی ایک بہت موٹی اور مضبوط کنڈی تھی۔ بہت مشکلوں سے تینوں نے مل کر وہ صندوق

کھولا تھا۔

صندوق میں بوسیدہ کپڑے تھے اور ان کے اوپر ایک رجسٹر سا رکھا ہوا تھا۔ اس رجسٹر کی حالت یہ بتا رہی تھی کہ وہ بھی بہت پرانا ہے۔

وہ اس رجسٹر کو لے کر تہ خانے سے باہر آ گئے۔ تہ خانے کے دروازے کو احتیاط سے بند کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

وہ ڈائری یا رجسٹر تسیم صاحب کے دادا جسیم صاحب کی تھی۔

اس وقت رات ہو چکی تھی۔ وہ سب لاؤنج میں بیٹھے اس ڈائری کو سن رہے تھے۔ ڈائری پڑھنے کی ذمے داری اکبر نے لی تھی کیونکہ اس کی اردو اچھی تھی اور وہ ہر طرح کی طرزِ تحریر پڑھ لیا کرتا تھا۔

کمرے کی بوجھل فضا میں چائے کی چسکیوں کے درمیان ڈائری پڑھ کر سنائی جا رہی تھی۔

”میرا نام جسیم الدین ہے۔ میں ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آیا ہوں۔ میرے پاس کچھ پیسے تھے۔ جن سے میں نے کراچی میں اپنا کاروبار شروع کر دیا اور یہ مکان خرید لیا جس کے تہ خانے میں میں نے اپنی یادداشت قلم بند کر کے رکھ دی ہے کہ شاید کوئی اس ڈائری کو پڑھ لے اور اس مکان کو چھوڑ کر چلا جائے۔ یہ مکان بلاؤں کا مسکن ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ بلا کہاں سے آتی ہیں اور ان کی نوعیت کیا ہے۔ لیکن ان بلاؤں نے میری زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے۔

میں نے کراچی میں ایک شریف اور نیک لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ عابدہ نام ہے اس کا۔ میں نے یہ مکان اس لیے خریدا تھا کہ یہ مکان تقریباً ویسا ہی ہے جیسا میں ہندوستان میں چھوڑ کر آیا تھا۔ اس مکان سے اپنائیت محسوس ہوئی اور میں نے اسے خرید لیا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ میں ایک عذاب خرید رہا ہوں۔

دو سال تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم بہت سکون کے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔ میرے ساتھ دو بھائی بھی تھے۔ ان کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ ہم سب ایک ہی مکان میں رہا کرتے تھے۔

دو سال کے بعد خدا نے مجھے ایک بیٹا دیا۔ جس کا نام میں نے نعیم رکھا تھا۔ وہ ایک خوبصورت اور صحت مند بچہ تھا۔ وہ اسی گھر میں پرورش پاتا رہا۔

جب وہ تین سال کا تھا تو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ کہیں غائب ہو گیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر ہم نے پورے گھر میں اسے تلاش کر لیا لیکن اس کا پتا نہیں چل سکا۔ ہماری تو جان نکل گئی تھی۔ نعیم ہماری زندگی تھا۔ اس کا اس طرح اچانک غائب ہو جانا ہمارے لیے انتہائی پریشان کن تھا۔

اتفاق سے میں نے اس مکان کے ایک کمرے میں ایک تہ خانے کی سیڑھیاں دیکھ لیں۔ نہ جانے کس خیال کے تحت میں سیڑھیاں اترتا ہوا تہ خانے میں آ گیا اور نعیم یہاں موجود تھا۔

وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک بچی بھی تھی۔ نعیم اس بچی کے ساتھ کھیل میں مصروف تھا۔ وہ بچی میری آنکھوں کا دھوکا نہیں تھی۔ میں نے اسے نعیم کے پاس دیکھا تھا۔

فرش پر کھلونے بھی موجود تھے۔ میں دوڑتا ہوا نعیم کے پاس پہنچا اور وہ بچی اچانک غائب ہو گئی جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئی ہو یا اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

میں اس وقت بہت خوفزدہ تھا لیکن نعیم کی فکر بھی ہو رہی تھی۔ اسی لیے میں اسے گود میں اٹھا کر جلدی سے تہ خانے سے باہر آ گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ تاکہ کسی اور کو تہ خانے کی موجودگی کا پتا نہ چل سکے۔

میں نے دوسروں کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سب خوفزدہ ہو جائیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ بچی کوئی انسانی مخلوق نہیں تھی لیکن اس کا نعیم سے میل جول مجھے بہت خوفزدہ کر رہا تھا۔

اس رات اس گھر میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ ایک احساس تھا۔ شاید ایسا احساس پہلے کبھی کسی کو نہ ہوا ہو۔ میں اپنے کمرے میں تھا۔ رات زیادہ نہیں گزری تھی۔ شاید دس گیارہ بجے ہوں گے۔

وہ احساس بہت عجیب تھا۔ ایک بے پناہ سناٹا۔ میرا خیال ہے کہ ایسا سناٹا کسی نے بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ سناٹا کسی جاندار شے کی طرح گرفت میں لیے جا رہا تھا۔ اس سناٹے کے شاید کئی بازو تھے جو آہستہ آہستہ جکڑ رہے تھے پھر بھن بھناہٹ ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ لاکھوں مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں لیکن نہیں وہ مکھیاں نہیں تھیں بلکہ سیکڑوں مرد اور عورتیں گا رہے تھے، آہستہ آہستہ۔

قریب تھا کہ ایسا بھیانک اور انوکھا احساس میرا دم نکال دیتا۔ نعیم رونے لگا۔ حالانکہ اس وقت وہ نیند میں تھا



اور نیند ہی میں رو رہا تھا۔ اس کے رونے کی آواز پورے کمرے میں گونج کر رہ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ سحر اچانک ختم ہو گیا۔

میرے ہاتھ پاؤں جو سناٹے نے باندھ دیے تھے کھل گئے۔ بھن بھناہٹ ختم ہو گئی۔ نعیم کے رونے کی آواز نے میری بیوی عابدہ کو بھی اس سحر سے کھینچ لیا۔

سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ایک کمرا، میاں بیوی اور بچہ بستر پر لیٹے ہوئے بچہ رو رہا تھا یہ ایک عام سا منظر تھا لیکن میں عابدہ کو کیا بتاتا کہ اس عام سے منظر سے پہلے میں نے کیسا محسوس کیا تھا۔

اتنا ضرور ہوا کہ میں نے اس کمرے میں اپنے طور پر کچھ پڑھ کر حصار کھینچ دیا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اس مکان میں کچھ ہے۔ کوئی انوکھی اور پراسراری چیز جس نے ہمیں اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا ہے۔

حصار کھینچ لینے کے بعد پھر رات بھر کچھ نہیں ہوا۔ میں نے رات کو یہ سوچ لیا تھا کہ دوسری صبح کسی عامل سے بات کروں گا لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ مجھے کچھ یاد ہی نہیں رہا۔ دوسری مصروفیات کچھ ایسی نکل آئیں کہ ذہن سے سب کچھ نکل گیا تھا۔

پھر دوسری رات کچھ بھی نہیں ہوا۔ دوسری رات، تیسری رات، چوتھی، پھر کئی دن، کئی ہفتے، کئی مہینے سب کچھ اس حد تک نارمل رہا کہ میں یہ سوچنے لگا کہ یہ سب کہیں میرا وہم تو نہیں تھا۔

لیکن نہیں یہ میرا وہم نہیں تھا۔ کئی مہینوں کے بعد ایک بار پھر وہ بچی دکھائی دے گئی۔ وہ اس بار تہ خانے میں نہیں بلکہ کمرے میں دکھائی دی تھی۔ نعیم اس وقت سو رہا تھا۔ عابدہ نعیم کو چھوڑ کر ایک دن کے لیے اپنی ماں کے پاس گئی ہوئی تھی کیونکہ اس کی ماں کی طبیعت بہت خراب تھی۔

رات کے دو یا تین بجے ہوں گے جب اچانک کسی احساس سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ کمرے میں ہلکی قوت کا بلب جل رہا تھا اور اس کی روشنی میں وہ بچی دکھائی دے گئی تھی۔

وہ بستر کے پاس نعیم کے برابر کھڑی نعیم کو دیکھے جا رہی تھی۔ میں اسے سکتے کے عالم میں دیکھتا رہ گیا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ منجمد خواب، بھیانک۔

اس بچی نے اپنا ایک ہاتھ نعیم کے سینے کی طرف بڑھایا اور اسی وقت میں نے ایک چیخ ماری۔ یہ ایک اضطراری عمل تھا۔ میں چیخ اٹھا تھا۔

میری چیخ سن کر اس بچی نے میری طرف دیکھا۔ میرے خدا کیا بھیانک چہرہ تھا اس کا۔ دنیا بھر کی خباثت اور بے رحمی اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی گرچہ اس کی ہنسی بے آواز تھی لیکن وہ رگوں میں لہو کو سرد کر دینے والی ہنسی تھی پھر وہ نعیم میں داخل ہو گئی۔

ہاں، میں بہ ہوش و حواس یہ تحریر کر رہا ہوں کہ وہ نعیم کے جسم میں کسی ہیولے کی طرح سما گئی تھی۔ میں نے ایسی

بات پہلے بھی نہیں دیکھی ہوگی۔

وہ کسی ٹارچ کی باریک لکیر کی طرح سمٹتی ہوئی نعیم کے بدن میں داخل ہوگئی تھی۔ اس منظر اور اس کیفیت کو میں بیان نہیں کرسکتا۔ میں نے پاگلوں کی طرح نعیم کو جھنجوڑ ڈالا۔ اسے گود میں اٹھا کر کمرے کے باہر دوڑ لگا دی۔ اس وقت میں شاید اپنے ہوش میں نہیں تھا۔

مختصر یہ کہ میں نے سب کو یہ صورتِ حال بتائی لیکن شاید کسی کو بھی میری بات پر یقین نہیں آیا تھا کیونکہ بظاہر نعیم میں کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بالکل نارمل تھا ہمیشہ کی طرح۔

لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ میں نے جو کچھ اب تک دیکھا اور محسوس کیا تھا وہ میرا واہمہ ہرگز نہیں تھا۔ ایک سچائی تھی جو ایک بھیانک خواب کی طرح مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔

پھر ایک دن اچانک ایک بزرگ سے ملاقات ہوگئی۔ ملاقات کیا ہوئی وہ خود ہی ہمارے پاس آگئے تھے۔ میں اور نعیم اس وقت ایک ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔ نعیم اس وقت گیارہ بارہ برس کا ہو چکا تھا کہ وہ بزرگ ہمارے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے اور ان کی نگاہیں نعیم پر جمی ہوئی تھیں۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی، جب کہ نعیم گھبرایا ہوا تھا۔ ان کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں ان کے رعب میں آ گیا تھا۔ پھر میں نے ہمت کر کے ان سے دریافت کرلیا۔

’’جناب آپ میرے بچے کو اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے نا۔‘‘

’’خاموش ہو جاؤ۔‘‘ وہ غرائے۔ ’’تم ایک بلا کو اپنے ساتھ لیے گھوم رہے ہو۔‘‘

’’جناب یہ میرا بیٹا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ بلا کیسے ہوگیا؟‘‘

’’بلا اس کے اندر ہے بے وقوف۔‘‘ وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔ ’’کیا تم نہیں جانتے؟‘‘

’’جی ہاں۔‘‘ میں نے اپنی گردن ہلائی۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ ’’جی جناب اس کے ساتھ کچھ ہوا تو تھا۔ میں اب تک حیران ہوں۔‘‘

’’بتاؤ مجھے۔ سب کچھ بتاؤ۔‘‘

میں نے انہیں پوری کہانی سنا دی کہ میں نے کیا دیکھا تھا۔ نعیم کے ساتھ کیا کیا ہوا تھا۔ سناٹے کا احساس، بھن بھناہٹ میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ بے چارہ نعیم اس وقت بہت حیران ہو کر یہ سب سن رہا تھا کیونکہ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا ہوگا۔

’’سمجھ گیا میں۔‘‘ انہوں نے سن لینے کے بعد ہنکاری لی۔ ’’یہ بلا برسوں سے اس بچے کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔ ہزاروں سال قدیم مصری فرعونوں کے دور سے تعلق ہے اس کا۔ یہ آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بہت جان لیوا ہے۔ آگے چل کر یہ تمہارے بچے کی زندگی عذاب کردے گی۔‘‘

’’محترم بزرگ جب آپ نے یہاں تک معلوم کرلیا ہے تو خدا کے لیے اس کی جان چھڑائیں۔‘‘

’’چلو اب میرے ساتھ۔‘‘ بزرگ نے کہا۔ ’’ایسے معاملات میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔‘‘

میں فوراً نعیم کو لے کر ان کے ساتھ چل پڑا کیونکہ میں ان بزرگ کا قائل ہوگیا تھا۔ خدا نے انہیں نعیم کی حفاظت کے لیے اس ہوٹل میں بھیج دیا تھا۔

ہم اس علاقے میں آگئے جسے جمشید کوارٹر کہا جاتا ہے۔ یہ بہت پرانا علاقہ ہے، شاید پاکستان بننے سے بھی پہلے کا۔ ان بزرگ کا قیام ایک کوارٹر میں تھا۔ صرف دو کمرے تھے اور دونوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔

انہوں نے فوراً ہی نعیم کو ایک جائے نماز پر بٹھا کر اس پر دم کرنا شروع کردیا۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ جیسے جیسے دم کرتے جا رہے تھے ویسے ویسے نعیم کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں پھر شاید وہ بے ہوش ہو کر جائے نماز پہ لڑھک گیا تھا۔ اس کے بے ہوش ہو جانے کے بعد ان بزرگ نے پانی پر دم کر کے نعیم پر اس کے چھینٹے مارنے شروع کردیے۔

نعیم اکڑنے لگا۔ پھر اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔ اس کا بدن زور زور سے جھٹکے لے رہا تھا۔ پھر میں نے ایک حیرت انگیز مشاہدہ کیا۔

اب سے برسوں پہلے جس طرح ایک روشنی سی نعیم کے جسم میں داخل ہوئی تھی اسی طرح وہ روشنی اب اس کے بدن سے باہر بھی نکل رہی تھی۔

میں دم بخود یہ سب دیکھے جا رہا تھا پھر روشنی کا وہ ہیولہ ایک بچی کی شکل اختیار کرنے لگا۔ یہ وہی بچی تھی جس کو میں نے برسوں پہلے دیکھا تھا۔ بالکل وہی وہ روشنی کی طرح سمٹتی پھیلتی ہوئی نعیم کے جسم سے باہر نکل رہی تھی۔

اتنا ہی نہیں بلکہ وہ کچھ کہہ بھی رہی تھی۔ شروع شروع میں اس کی آواز صاف نہیں سنائی دے رہی تھی پھر واضح ہوتی چلی گئی۔



وہ دھمکیاں دے رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کبھی پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس وقت تو جا رہی ہے لیکن وہ نسل در نسل منتقل ہوتی رہے گی پھر اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ’’تمہیں تو میں تباہ کر کے رہوں گی‘ برباد کردوں گی جس طرح تم نے مجھے برباد کیا ہے۔ مجھے گھر سے نکالا ہے۔‘‘

پھر وہ غائب ہوگئی ایک شعلہ سا چمکا اور معدوم ہوگیا۔ وہ بزرگ بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے جب کہ نعیم اب بالکل پرسکون تھا گرچہ وہ ابھی تک سویا ہی ہوا تھا لیکن اس کی سانسیں معمول پر آچکی تھیں۔

’’جناب کیا تھا یہ سب؟‘‘ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

’’ایک ایسی بلا جو چلی بھی گئی اور نہیں بھی گئی۔‘‘ بزرگ نے بتایا۔ ’’یہ بلا عشطار کہلاتی ہے، بہرحال فی الحال تو تمہارا بیٹا اور تم لوگ اس سے محفوظ ہوگئے ہو لیکن یہ نسل در نسل تمہارے ساتھ چلے گی اور جہاں تمہیں کمزور پایا وہاں تم پر قابو پالے گی۔‘‘

’’جناب کیا اس سے بچاؤ کا کوئی طریقہ نہیں ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

بزرگ نے کتابوں کے درمیان میں تلاش کر کے ایک چھوٹی سی کتاب نکالی جو ڈائری کی طرح تھی۔ ’’یہ لے جاؤ۔‘‘ انہوں نے وہ ڈائری میری طرف بڑھا دی۔ ’’اس میں دعائیں ہیں۔ ان کو پڑھتے رہنا۔ اپنی اولادوں کو دینا۔ خدا نے چاہا تو پھر تم سب محفوظ رہو گے ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔‘‘

نعیم اس دوران بے دار ہو چکا تھا۔ وہ حیران نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا اسے شاید خبر بھی نہیں تھی کہ کیا کیا ہو چکا ہے۔

میں ان بزرگ کا شکریہ ادا کر کے نعیم کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ گھر والوں کو ہدایت کردی کہ وہ یہ دعائیں پڑھتے رہیں اس وقت میں نے کسی کو پوری تفصیل نہیں بتائی تھی۔

پھر اور بہت سے سال گزر گئے پھر کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ نعیم کی شادی ہوگئی بڑا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام نسیم رکھا گیا۔ خاندان پھلتا پھولتا رہا۔ میں بوڑھا ہو چکا تھا کئی طرح کے امراض لاحق ہو رہے تھے۔

اتنے برس گزر جانے کے باوجود میں اس ڈائری کی دعائیں ضرور پڑھتا رہتا تھا۔ میں نے اس تہ خانے میں یہ

ولید بن عبدالمالک جانثار اسلام اپنے والد عبدالمالک کی وفات کے بعد 86ھ ماہ شوال میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر 38 برس تھی۔ نہایت بارعب اور سخت گیر انسان تھا۔ یہ عادتیں خلیفہ بننے کے بعد بھی برقرار رہیں۔ قدردان اسلام تھا۔ تلاوت باقاعدگی سے کرتا تھا۔ یتیموں، عاجزوں، درویشوں اور دوسرے بے کسوں کی سنا کرتا تھا۔ خوب خبر گیری کرتا تھا۔ علم و ہنر سے اس کی خاص رغبت تھی۔ فن تعمیرات کا بھی دلدادہ تھا۔ اکثر وقت عمارات‘ فوج وجدیہ کی تعمیر میں صرف کرتا تھا۔ قاہرہ کی عظیم مسجد کو بھی اس نے اپنی طرز کے مطابق ازسرنو تعمیر کرایا اور مرصع کیا۔ سادگی پسند نہ تھا۔ میلان یونان وفارس کی نفاست کی طرف تھا۔ مگر حق وجہاد کا دیوانہ تھا۔ اپنے نوسالہ عہد حکومت میں متعدد گمراہ حکومتوں کے تختے الٹ دیے اور علم اسلام بلند کیا۔ اس کے عہد میں طیانہ، ترکستان کے دارالخلافہ اور اس کے مفصلات، سمرقند جس کا نام پہلے اندلس، مارکنڈا تھا اور روم وقسطنطنیہ کے متعدد علاقے فتح ہوئے۔

ڈائری رکھ لی تھی۔ یہ تہ خانہ میرا گوشۂ تنہائی تھا۔ میں اکثر یہیں آ کر بیٹھ جایا کرتا۔ کتابیں پڑھتا رہتا یا حسب توفیق عبادت وغیرہ کیا کرتا۔

ایک دن میں جب حسب معمول اس ڈائری کی دعائیں پڑھنے کے لیے تہ خانے میں داخل ہوا تو مجھے وہ ڈائری نہیں مل سکی جب کہ وہ تہ خانے میں صندوق کے اوپر ہی رہتی تھی لیکن اس وقت وہ کہیں نہیں تھی۔

میں پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرتا رہا پھر میں تہ خانے سے باہر جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف دوڑا تو تہ خانے کا دروازہ بند تھا۔ یہ ایک نئی بات تھی۔

اس کے بعد ڈائری میں ایک تاریخ درج تھی۔ ’’آج مجھے اس تہ خانے میں بند ہوئے تین دن ہوگئے۔ میرے خدا میں کیسی اذیت میں ہوں۔ دروازہ کھلوانے کی ہر ممکن کوشش کر چکا ہوں لیکن ناکام رہا۔ رات اور بھی بھیانک ہوتی ہے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا‘ مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں مطالعے کے لیے جہاں کتابیں لایا تھا وہاں ضروری باتیں نوٹ کرنے کے لیے قلم اور رجسٹر وغیرہ بھی لے آیا تھا۔ نہ

جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ میں اب اس تہ خانے سے باہر نہیں نکل سکوں گا۔ یہ میری زندگی کے آخری لمحات ہیں۔ اسی لیے میں نے اپنی یادداشت لکھنی شروع کردی ہے۔"

اس کے بعد ایک اور تاریخ تھی اور شاید کانپتے ہاتھ سے لکھا گیا تھا۔ پندرہ دن ہوگئے ہیں۔ میں اب مرنے والا ہوں حلق میں کانٹے سے۔"

اس کے بعد یادداشت ختم ہوگئی تھی۔

سب سنانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اکبر نے رجسٹر ختم کرکے ایک طرف رکھ دیا۔ "ہاں یاد آیا مجھے۔" نائلہ بیگم کی آواز ابھری۔ "تم لوگوں کے دادا حضور کی لاش تہ خانے ہی میں پائی گئی تھی۔"

☆☆☆

اس رات پھر ایک اور موت۔ یہ موت خود نائلہ بیگم کی تھی۔ ان کو بھی اسی انداز سے قتل کیا گیا تھا۔ ایس پی جاوید انور اس وقت بہت جذباتی ہورہا تھا۔ اس نے بچ جانے والے افراد سے کہا۔ "خدا کے لیے تم لوگ یہ مکان چھوڑ کر کہیں چلے جاؤ آج ہی کیونکہ پولیس انسانوں کا تو مقابلہ کر سکتی ہے لیکن یہ واقعات غیر انسانی ہیں۔ وہ رجسٹر بھی یہی بتا رہا ہے اور جس انداز سے یہ سب ہورہا ہے اس سے بھی یہی بات ظاہر ہورہی ہے۔"

"تم تو پولیس والے ہو کیا تم بھی ان واقعات کے قائل ہو۔" اکبر نے پوچھا۔

"بے وقوف آدمی۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔" جاوید نے کہا۔ "پولیس ایسی باتوں کو نہیں مانتی لیکن جو کچھ ہورہا ہے اس کا بھی تو کوئی جواز نہیں ہے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ مکان چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کم از کم ایک اطمینان تو ہوگا کہ تم لوگوں نے ناگہانی موت سے بچنے کی کوشش کرلی تھی، آگے جو خدا کی مرضی۔"

"ہاں بھائی، چلیں یہاں سے۔" شبنم روتے ہوئے بولی۔ "ورنہ وہ بلا ہم سب کو مار دے گی۔"

"لیکن فوری طور پر ہم کہاں جاسکتے ہیں۔" اکبر نے کہا۔

"کلفٹن میں میرا ایک فلیٹ ہے۔" جاوید نے بتایا۔ "بہت بڑا فلیٹ ہے اور فرنشڈ بھی ہے۔ تم سب اسی وقت وہاں شفٹ ہو جاؤ بعد میں پولیس اس مکان کے حالات دیکھتی رہے گی کہ اصل کہانی کیا ہے؟"

اس مشورے پر اسی وقت عمل ہوا تھا۔

وہ سب فوری طور پر جاوید کے بڑے فلیٹ میں شفٹ ہوگئے تھے۔

کسی دوسرے حالات میں اگر نائلہ بیگم کی موت واقع ہوتی تو یہ صدمہ مہینوں ان کی زندگی میں شامل رہتا لیکن حالات ایسے تھے کہ انہیں افسوس کرنے اور رونے کا وقت بھی نہیں مل رہا تھا۔ ایک بے رحم موت ان کے تعاقب میں تھی کہ نائلہ بیگم کے بعد اب کس کی باری تھی۔

انہوں نے مکان تو بدل لیا تھا لیکن وہ خوف ان پر مسلط ہوکر رہ گیا تھا۔

"اب میں آپ لوگوں کو ایک اور مشورہ دیتا ہوں۔" جاوید نے کہا۔ "آپ لوگ الگ الگ کمروں میں نہ سوئیں لاؤنج بہت بڑا ہے آپ سب اسی میں ایک ساتھ سوئیں۔ کم از کم رات بھر ایک دوسرے کی نگرانی کرتے رہیں گے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ بلا یہاں بھی آگئی ہو گی۔"

"کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن احتیاط ضروری ہے، ویسے میں نے دو سپاہیوں کی ڈیوٹی دروازے پر بھی لگا دی ہے۔ رات بھر نگرانی کرتے رہیں گے۔"

"خدایا یہ ہم کس عذاب میں پھنس گئے۔" اظہر پریشان ہوکر بولا۔

"بھائی کیوں نہ ہم کسی عامل کو بلا کر لے آئیں۔" شبنم نے کہا۔ "میں نے ایسے لوگوں کے بارے میں بہت سنا ہے۔"

"شبنم ٹھیک کہتی ہے۔" جاوید نے اس کی تائید کی۔ "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آج کل کے زیادہ تر عامل فراڈی ہیں اب کسی مستند آدمی کو کہاں سے تلاش کیا جائے۔"

"اس شہر میں کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔" اکبر نے کہا۔ "تم بھی اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کرو اب تو مجھے بھی یقین ہو چلا ہے کہ یہ کوئی انسانی نہیں بلکہ شیطانی کارنامہ ہے۔"

جاوید کے مشورے پر وہ سب ایک ہی کمرے میں سوئے تھے۔ اس کے باوجود دوسری صبح شبنم مردہ حالت میں پائی گئی تھی۔ اس کا بھی وہی حال ہوا تھا جو دوسروں کا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

"اب رونے کے لیے صرف ہم تین رہ گئے ہیں۔" اکبر نے کہا۔ "میں، اصغر اور وردا۔"



"اور یہ ہماری بچی بھی تو ہے۔" وردا جنونی کیفیت میں بولی۔ "ہمارے ساتھ بھی یہی ہونے والا ہے پھر اس کے بعد اس کا کیا ہوگا۔ کون اس کو دیکھے گا۔ کون اس کی پرورش کرے گا۔"

جاوید ایک طرف سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا کچھ دیر بعد اس نے اپنی گردن اٹھائی۔ "یہ بتاؤ کہ تم لوگوں کو کسی قسم کا احساس نہیں ہوا تھا؟"

"نہیں بالکل نہیں۔" اصغر نے بتایا۔ "ہم بہت دیر تک جاگتے رہے تھے۔ اس کے بعد ہمیں نیند آگئی تھی۔"

"بلکہ اب یاد آرہا ہے کہ ہماری یہ نیند بھی ان نیچرل تھی۔" وردا نے کہا۔ "ایسی گہری نیند جیسے برسوں کے بعد سوئے ہوں اور کسی نے تھپک تھپک کر سلا دیا ہو۔"

"اور اس دوران اس بلا نے بے چاری شبنم کا خون کردیا۔" جاوید کی آواز بہت شکستہ ہورہی تھی۔ "افسوس تو یہ ہے کہ میں تم لوگوں کی کوئی مدد نہیں کرسکا۔ دیکھتے دیکھتے کتنوں کا خون ہوگیا اور ہم سوچتے ہی رہ گئے لیکن اب۔ اب شاید ایسا نہ ہو۔"

"کیوں اب ایسی کون سی بات ہوگئی۔" اکبر نے پوچھا۔ "اب تم کس طرح اسے روک سکو گے؟"

"میں نہیں۔ غلام قادر بابا روکیں گے۔" جاوید نے بتایا۔ "بہت بڑے بزرگ ہیں۔ ایسے لوگ عام طور پر نظر نہیں آتے۔ انہیں تلاش کرنا پڑتا ہے اور کیسی عجیب بات ہے کہ اس کیس میں ایک پولیس آفیسر... کسی عامل کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہے۔"

"تو یہ غلام قادر بابا تمہیں کیسے مل گئے؟"

"خود میرے پاس آئے تھے۔" جاوید نے بتایا۔ "تمہیں شاید یہ نہ معلوم ہو کہ تمہارے اس گھر اور اتنے مرڈر کی کہانی ہر طرف پھیل گئی ہے غلام قادر بابا ان خبروں کو سن کر میرے پاس خود ہی پہنچ گئے اور ایک گھنٹے کے بعد یہاں بھی آنے والے ہیں اسی لیے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اب ایسا کوئی کیس نہیں ہوگا۔"

"کاش وہ بزرگ پہلے ہی مل چکے ہوتے؟" وردا نے کہا۔

"ہر کام میں خدا کی مصلحت ہوتی ہے، ہوسکتا ہے کہ خدا کو ان کی زندگی منظور نہ ہو ان کی موت اسی انداز سے آئی ہو۔"

ایک اطمینان سا ان کے چہروں پر دکھائی دینے لگا تھا۔ لیکن یہ اطمینان اس وقت ختم ہوگیا جب انہیں یہ پتا چلا کہ راستے میں غلام قادر بابا کی گاڑی کا شدید ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور اسپتال لے جاتے ہوئے وہ دم توڑ گئے تھے۔

☆☆☆

وہ ایک ویرانہ تھا۔ وردا اپنی بچی کو گود میں اٹھائے بے تحاشا دوڑتی چلی جارہی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں جارہی ہے، کس طرف جا رہی ہے۔ اسے بس فرار ہونا تھا خود کو بچانا تھا اپنے بچے کو بچانا تھا موت شاید اس کے تعاقب میں تھی وہ موت جو ادھیڑ کر رکھ دیتی ہے۔

اس صبح اس نے اکبر اور اظہر دونوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس بلا نے ایک ساتھ دو کو اپنا شکار کیا ہو۔

لیکن اس صبح پورا کمرا خون سے بھرا ہوا تھا۔ اکبر اور اصغر دونوں ہی مر چکے تھے ویسی ہی بے بسی اور درندگی کی

پہلے والوں کا مقدر ہوئی تھی۔
وردا پر ایک وحشت طاری ہو گئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ کھڑی رہی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان دونوں کی لاشوں کو دیکھتی رہی تھی پھر اس نے جھپٹ کر بچی کو اپنی گود میں اٹھایا اور کسی پاگل کی طرح دوڑتی ہوئی اس کمرے، اس گھر اور اس بلڈنگ سے باہر آ گئی۔

اس وقت اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا صرف ایک خوف تھا۔ موت کے بے رحم ہاتھوں کا خوف اور یہ خوف بھی اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی گود میں روتی ہوئی بچی کے لیے تھا۔ وہ ہر قیمت پر اسے بچانا چاہتی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ننھی مدیحہ کو کس طرح بچا سکے گی اس گھر کے کتنے لوگ بے رحم موت کا شکار ہو چکے تھے اور کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکی تھی۔ خود پولیس والے بھی ہار مان کر خاموش ہو گئے تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اپنی بچی کو اس بلا کے ہاتھوں سے محفوظ کر لے گی۔

وہ ایک ماں تھی۔ اسے اپنی ممتا کی طاقت پر پورا بھروسا تھا۔ یقین تھا اسے کہ وہ اپنی بچی پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گی۔

اسے بس اپنی بچی کو لے کر بھاگ نکلنا ہے، کہاں یہ اسے نہیں معلوم تھا۔ بس کہیں بھی کسی بھی ایسی جگہ جہاں وہ تعاقب کرتی ہوئی موت اس تک نہ پہنچ سکے۔

راستہ چلتے ہوئے لوگ حیرت سے اس عورت کو دیکھ رہے تھے جو ایک بچی کو اپنے سینے سے لگائے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ ایک جنونی کیفیت میں اردگرد سے بے نیاز ہو کر۔ جیسے کوئی قوت اسے دوڑائے لیے جا رہی ہو۔

اسے جب ہوش آیا جب اس کے پاؤں نڈھال ہونے لگے تو اس نے جان لیا کہ وہ اپنے پرانے مکان کے گیٹ پر کھڑی ہوئی تھی۔ اسی مکان کے گیٹ پر جس کو چھوڑ کر یہ لوگ جاوید کے فلیٹ میں منتقل ہوئے تھے۔ وہی مکان جہاں کے بعد دیگرے کئی لوگوں کا خون ہو چکا تھا۔ جس مکان میں ایک پُراسرار تہ خانہ تھا اور جس مکان کو پولیس نے سیل کر دیا تھا۔

یہ اس کا اپنا مکان تھا۔ وہ اس کے ہر راستے، ہر کمرے سے واقف تھی۔ وہ گیٹ سے داخل ہوتی ہوئی کمرے میں پہنچی۔ وہاں سے لاؤنج میں آئی۔ لاؤنج کے بعد وہ نسیم صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی اور اب وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ بچی کو اس نے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔

نہ جانے کیوں اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کی بچی اس تہ خانے میں محفوظ رہ سکے گی۔

تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور بچی اس کی گرفت سے نکل کر تہ خانے کے فرش پر جا گری۔

وردا ایک چیخ مار کر بچی کی طرف جھپٹی۔

اور اسی وقت کچھ ہوا۔ ایک ان ہونی سی بات۔ وہ جو کچھ بھی دیکھ رہی تھی یہ اس کا خواب یا واہمہ نہیں تھا۔

سامنے ہی ایک نورانی صورت بزرگ کھڑے تھے۔ انہوں نے ہی بچی کو گرنے سے پہلے روک لیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے تھے۔ ”میری بچی! شیطان کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو، اس کی قوت ایک حد سے زیادہ نہیں ہے، فکر نہ کرو ظلم کی رات ختم ہو گئی ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ تم خود آ گئیں، میں اس بلا کے پیچھے یہاں آیا تھا اور اب وہ اپنے انجام کو پہنچ گئی ہے۔ شاید خدا تمہارے دل سے ڈر نکالنا چاہتا تھا اسی لیے تمہیں یہاں لے آیا۔ اب بے فکر ہو کر اس گھر میں رہو۔“ پھر وہ بزرگ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے برابر سے گزر کر باہر نکل گئے۔

اس واقعہ کو کئی دہائی گزر گئیں لیکن وردا اسے بھول نہیں پائی ہے۔ مدیحہ نے ایم اے کیا اور اب اپنے سسرال میں ہے۔ اتنے بڑے گھر میں وردا اکیلی رہتی ہے مگر اسے اب ذرا بھی خوف نہیں آتا ہے۔

شمارہ اپریل 2014ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیشکش……آپ کا انتخاب

☆ اول: مادر وطن……ثانیہ
☆ دوم: خاطر دنیا……ماریہ اسد
☆ سوم: شارٹ کٹ……رمیز انصاری

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے